حصّہ چہارم
سخن ور
تذکرہ شعرا اور شاعرات
سلطانہ مہر
ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

سخن ور

حصّہ چہارم

تذکرۂ شعرا اور شاعرات

تصنیف و تالیف: سلطانہ مہر

مہر بک فاؤنڈیشن

لاس اینجلس، ریاست ہائے متحدہ امریکہ

MEHER BOOK FOUNDATION

20873 East Walnut Canyon Road.

Walnut, CA 91789 U.S.A

Ph: (909)444-0065 - Fax: (909)444-0077

نام کتاب سخن ور چہارم
مؤلفہ و مصنفہ سلطانہ مہر
سنِ اشاعت 2000ء
ناشر مہر بک فاؤنڈیشن پاکستان وامریکا
کمپوزنگ محمد ابرار احمد۔ ایس آر گرافکس،
47، پریس چیمبرز، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی
تزئین سیّد اظہر عباس جعفری
طباعت ذکی سنز۔ آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔ فون: 2636611
قیمت 400روپے پاکستان میں۔ $20 امریکی ڈالر۔

Add: MEHER BOOK FOUNDATION
20873 East Walnut Canyon Road
Walnut, CA 91789, U.S.A
Ph:(909) 444-0065-Fax:(909) 444-0077
E-mail: REHAN@aol.com

انتساب

بے باک شاعر، صحافی اور اپنے شریکِ سفر

سعید رضا سعیدؔ ..... کے نام

سلطانہ مہرؔ

کمرہ بند کیے بیٹھے تنہائی کا رونا روتے ہو

کھڑکی کھول کے نیچے دیکھو کتنے سارے اپنے لوگ

سعید رضا سعید
24/1/79

فہرست

میں مشفق خواجہ سے متفق ہوں

ڈاکٹر گیان چند جین

سلطانہ صاحبہ پہلے آپ کی بیش بہا کتاب "سخن ور دوئم" ملی تھی، میں خاموشی سے ہضم کر کے بیٹھ گیا، کوئی رائے نہ دی۔ اب "سخن ور سوئم" ملی ہے۔ اب تو مجھے اپنا تاثر دینا ہی چاہیے۔ قلم برداشتہ لکھ رہا ہوں اور پہلا مسودہ ہی بھیج رہا ہوں تاکہ سچی رائے ہو، اس میں کوئی بناوٹ ملمع سازی نہ ہو۔

میں نے دونوں جلدوں میں علماء کے تمہیدی تعارفی نوشتے پڑھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ مہر کی مادری زبان اردو نہیں، گجراتی ہے لیکن وہ جس لہجے سے بولتی ہیں اور جس انداز سے لکھتی ہیں اس سے تو سوفی صد اہلِ زبان معلوم ہوتی ہیں۔ مجھے ان کے نثری تذکرے پا کر خوشی ہوئی کہ میں بنیادی طور سے نثر کا آدمی ہوں۔ امریکا میں غیر تخلیقی نثر یعنی تنقید و تحقیق لکھنے والوں کا قحط ہے۔ ایسے میں مہر صاحبہ نے ہم عصر شعراء اور اب نثر نگاروں کا تذکرہ لکھنے کا کٹھن کام اپنے ذمے لیا، یہ بڑی بات ہے۔ قدما کا تذکرہ لکھنا سہل ہے کہ اس کے لیے مواد موجود ہے۔ معاصرین کا تذکرہ لکھنا ٹیڑھی کھیر ہے کہ اس کے لیے خود ہی کنواں کھودنا ہوتا ہے تاکہ خود بھی پانی پی سکیں اور دوسروں کے حلق کو بھی تر کر سکیں۔ میں جانتا ہوں کہ ایک ایک شاعر سے لکھانے کے لیے مولفہ کو کتنی بار لکھنا اور فون کرنا پڑتا ہوگا۔ ہمارے شاعروں کی امت تو شہرت اور اشتہار کی رسیا ہوتی ہے۔ وہ جواب دینے میں تامل کیوں کرتے ہیں اس کی اصل وجہ ایک سوال نامے کو سر کرنا ہے۔ شاعر، نقاد و محقق تو ہوتے نہیں، آپ کیوں انہیں مجبور کرتی ہیں کہ اردو شعریات اور لسانیات کے ماضی میں جھانکیں اور مستقبل کی پیشن گوئیاں کریں۔ سوالنامے اور جواب نامے کو القط کیجیے۔ ہر شاعر اور نثر نگار سے اس کا سوانحی خاکہ اور مطبوعات کی تفصیل پوچھیے پھر دیکھیے کتنی جلدی جواب ملتا ہے۔

میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی رائے سے متفق نہیں کہ اس تذکرے میں پاکستانی شعرا بھی شامل ہوں۔ میں مشفق خواجہ سے اتفاق کرتا ہوں کہ ہندوستانی شعراء نہ ہوں۔ دراصل برِ صغیر ہند یعنی ہندوپاک میں بسنے والے تمام معاصرین کو القط کر دینا چاہیے کہ وہ تو اردو ادب کا سمندر ہیں۔ ان

ممالک میں تو شعرا انڈی ڈل کی طرح ہیں۔ لکھنؤ میں ایک جناب عرفان ہاشمی (یا ان سے مماثل نام) ہیں انھوں نے کبھی اُتر پردیش کے، کبھی لکھنؤ و اودھ کے حالیہ شاعروں کے تذکرے لکھے، آپ تھے اور آپ ہیں، وغیرہ۔ کوئی 10 جلدیں تو تیار کر چکے۔ سلطانہ مہر صاحبہ اگر آپ نے ہندوپاک کی انجمن میں دراندازی کی تو 20 جلدوں کا مخلانۂ جاوید تعمیر کرنے کے لیے تیار رہیے۔ میری رائے میں صرف ہندوپاک کے باہر کے فن کاروں تک محدود رہیے تو خیر ہو گی۔

حمایت علی شاعر صاحب کا مضمون قابلِ قدر اور فکر انگیز ہے۔ تحقیق کے میدان میں وہ خواتین کے کاموں کی وسعت سے واقف نہیں۔ ان کا کارواں کارواں ہے۔ کئی ڈی لٹ اور سند پی ایچ ڈی ہیں۔ خاتون محققین کے کاموں پر اتنی موٹی کتاب لکھی جاسکتی ہے جتنی کلی فورنیا کی بعض گوری خواتین ہوتی ہیں۔ مہر صاحبہ کے تذکروں سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ امریکہ کے جس معاصر کے بارے میں جاننا چاہوں دیکھ لیتا ہوں۔ خواتین کے خاکوں میں اکثر ان کی تاریخ و معمولات نہیں ہوتی۔ اس سے مجھے بڑی جھنجلاہٹ ہوتی ہے۔ تذکرے اور سوانحی خاکے کی پہلی اینٹ اور سب سے اہم اطلاع تاریخِ ورود ہوتی ہے۔ خواتین کیوں شرماتی ہیں۔ خود مہر صاحبہ نے اپنا سنِ ولادت نہیں دیا۔ جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں سے کیا ڈر۔ سوانح دے رہی ہیں تو نقطۂ آغاز کیونکر پوشیدہ رکھیں گی۔ اس تذکرے کی ایک دلچسپ بلکہ سب سے زیادہ دلچسپ چیز شعرا اور شاعرات کے فوٹو ہیں۔ کچھ دل فریب ہیں، کچھ اوسط درجے کے، ڈراؤنا کوئی نہیں۔ میں نے توجہ سے تلاش کی کہ کوئی شکل میرے بُشرے کے برابر یا اس سے بھی زیادہ بدنما ہے کہ نہیں، مجھے ناکامی ہوئی۔ تصویر دیکھ کر صاحبِ تخلیق سے نصف ملاقات ہو جاتی ہے بشرطیکہ تصویر حالیہ ہو اوائل زمانہ کی نہ ہو نوجوانی کے تو میرے فوٹو بھی ایسے برے نہیں۔

سلطانہ مہر صاحبہ شاعرہ ہیں، افسانہ و ناول نگار ہیں، صحافی ہیں اور محقق ہیں اور خدا جانے کیا کیا ہیں۔ ان کے حوصلے کی داد دیتا ہوں کہ اتنے اچھے دلچسپ، دل فریب اور معلومات افروز تذکرے تالیف کر رہی ہیں۔ میں ان کے کاموں کو دل و جان سے پسند کرتا ہوں۔ 21 جولائی 1999ء

ثقافتی تاریکی میں اردو کی شمع

ڈاکٹر ستیہ پال آنند

اردو میں Concordance وضع کرنے کا بیڑہ بہت کم لوگوں نے اٹھایا ہے ماضی میں جو تذکرے مرتب کیے گئے، وہ تذکرہ نویسی کی ذاتی پسندیدیا ناپسندید گی کے حوالے س کی شخصیت کی چھلنی سے گزر کر ہم تک پہنچے ہیں۔ فی زمانہ بھی ذاتی اور نظریاتی پیمانے تذکرہ نویسی کے احوال ناموں میں بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ بر صغیر میں، خصوصی طور پر پاکستان میں کچھ برسوں سے ایک سال میں مطبوعہ چیدہ چیدہ نگارشات کا تذکرہ بھی اس مطمع نظر سے کہا جاتا رہا ہے۔ جہاں جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے وہاں جامعات کے اساتذہ اور اسکالروں کو بھی یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ آگے آکر اس کام کو ہاتھ میں لیں اور آنے والے اسکالروں کے لیے تحقیق مساحت (Survey) اور تالیف پر مبنی باضابطہ ریکارڈ چھوڑ جائیں۔

سلطانہ مہر کا دم غنیمت ہے کہ وہ دیارِ مغرب کی ثقافتی تاریکی میں اردو کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں 'سخنور' کی تالیف و تدوین تن تنہا کر لینا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، یعنی جو کام جامعات نہیں کر سکیں، وہ سلطانہ مہر اس خوبصورتی سے کرتی ہیں کہ داد دیئے بغیر رہا نہیں جاتا۔ ان کا کامل ہنر یہ ہے کہ ایک جامع سوالنامے کے تحت شعر اور شاعرات کے جوابات پر مبنی جو مواد اکٹھا کرتی ہیں اسے کھنگال کر اس میں سے وہ سب جوہر نکال لیتی ہیں جو ایک تذکرہ نویسی کے فن کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ تحقیق کے ہنر میں اس طرح کے مواد کو Primary Source کہا جاتا ہے۔ 'سخنور' میں مشمولہ "انٹریز (Entrees) کو آپ کسی بھی نظر سے دیکھ لیں، ان میں مدیرہ اور مؤلفہ کی ذاتی پسندیا ناپسندید گی کا شائبہ تک نظر نہیں آئے گا۔ یہی تذکرہ نولیس کی ایمانداری ہے کہ وہ بغیر لاگ یا دوہاگ کے مشمولہ مصنفین کے اپنے خیالات کو قاری تک پہنچنے دے۔

'سخنور' کا چوتھا شمارہ ایک اچھے، ایماندار، صحت مند خاندان کا نیا فرد ہے اور اس کی پذیرائی ہونا ضروری ہے۔

کام آگئی دیوانگی اپنی......!

آغا بابر (مرحوم)

نیویارک

کسی کے سامنے سفید کاغذ رکھ کر کہیے تو۔۔۔۔ ”اس خالی کاغذ کو ایک گھنٹے میں بھر دو۔ کوئی مضمون کسی کو خط کوئی اپنے اندر کا خیال جو جی چاہے لکھو۔ پانی سے جیسے منکا بھرتے ہو اس خالی کاغذ کو اپنی کسی قسم کی تحریر سے بھر دو۔“

قلم اٹھاؤ تو پسینے چھوٹ جائیں۔ یہ سفید کاغذ اللہ بچائے بہت بڑا چیلنج ہوتا ہے آدمی کے لیے۔

لکھنے والے جو لوگ ہوتے ہیں اللہ والے لوگ ہوتے ہیں۔ لکھنا ایک نعمتِ خداوندی ہے کہ ہزار انسانوں میں سے ایک کو ملتی ہے۔ دینے والا سات آسمانوں پر بیٹھا ہوا وہی ارض و سما کا مالک۔ مالکِ کل، مختارِ مطلق۔ یہ نگینے جس سے کاغذ کا منکا بھرا جاتا ہے خدا کسی کسی کو دیتا ہے جس کو یہ خزانہ مل جائے وہی ہتھ بھرا۔

لکھنے والے کے پاس اتنے نگینے کہاں سے آتے ہیں؟ یہ تو اس کی رگِ جاں میں ہوتے ہیں۔

عورت جو خود عورت کا بہت بڑا تحفہ ہے۔ بقول علامہ اقبال ”وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ“ نگینے توڑنے کا ہنر اس کو بھی آتا ہے۔ ہمارے کلچر اور تہذیب میں ایسی خواتین بھی رہیں جو گھر گرہستن بھی ہوں گھر داری بھی کریں تو، اپرات بھی سنبھالیں۔ بچوں کی پرورش بھی کریں اور ساتھ ہی ساتھ قلم اور کاغذ کا رشتہ بھی ٹوٹنے نہ دیں کہ یہ بھی تخلیق کے درجے میں ان کی اولاد برابر ہے۔

آج کی کاپی میں ہم ایک ایسی خاتون کا ذکر کرنا چاہ رہے ہیں ہماری طرح سے جن کی عمر کا بیشتر حصہ قلم اور کاغذ کی محبت میں گزرا ہے۔

ان کو ہم نے جانا نہ دیکھا۔ ان کی کتابیں دیکھیں ان کے کام کو جانا۔ اس کاغذ پر آپ ہم کو ان سے مخاطب ہو کر دو باتیں کرنے کی اجازت دیں جن کا نام سلطانہ مہر ہے۔

سلطانہ مہر تم ایسی تخلیق کار لگتی ہو جس کے طور اطوار مہذب ہوں جس کے باطن میں سلیقہ مندی ہو یہ سب کچھ آپ کی تحریروں سے نمایاں ہے۔ آپ دل گداز رکھتی ہیں۔ مبتلائے الم رہیں تو رہیں مگر فسادِ روح میں مبتلا نہ ہوئیں۔ کتنی بڑی بات ہے۔ وہ جو زوال پذیر جبلت کہلاتی ہے آپ کو کبھی بھی مغلوب نہ کرپائی۔ آپ کو اس جذبۂ نفاست نے بچالیا جو آپ کے باطن میں پوشیدہ تھا۔ اس نے اچھا کیا۔ ادب نے اپنی پناہ میں لے لیا۔ اچھا کیا:

چلو اچھا ہوا کام آگئی دیوانگی اپنی
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

بے انتہا جذبوں کا مجموعہ زندگی ہوتی ہے۔ جذبے مجروح ہونے لگیں تو آدمی چڑ جاتا ہے۔ جو بہادر ہوتے ہیں وہ نہیں ہوتے۔ آپ بہادر نکلیں۔ اب کا وہ پودا جو ایک روز ایک لمحے کے لیے باطن کی سرزمین سے اگا تھا، آپ نے آبیاری کر کے خیال کی کیاریوں کو سیدھے رُخ کی ہیشگی دے دی۔ آپ کتنی بہادر ہیں کہ تحریر کا جذبہ آپ کے لیے دامانِ دردمندی و شادمانی بن گیا۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے آپ نے بہت جی مارا ہوگا۔ ظاہر ہے جنونِ ادب کے صحرا میں راستہ تلاش کرنا کوئی اتنا آسان تو نہیں ہوتا جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔ ان کو کیا پتہ کہ چاند کے پڑوس میں بسنے والی کہکشاں کو مٹھی میں لے لینا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ آپ کتنی خوش قسمت رہیں کہ تعمیری وجدان نے آپ سے اتنی ساری کتابیں لکھوالیں۔ دیکھیے تو آپ پر کس کس طرح سے اللہ کی بخشش سایہ فگن رہی۔ سوچیے تو حکمتِ ادب کس کس طرح سے آپ کی ہمدم اور دمساز بنی رہی۔ آپ کی صلاحیتوں کو جِلا ملتی رہی۔ آپ نے سب وقتوں اپنی زبان اپنی تہذیب اپنی ثقافت کا کن کن سطحوں پر علم بلند رکھا۔ چار ناول کوئی لکھ کر دکھائے اتنی ساری کہانیاں لکھیں۔ افسانوں کے تین مجموعے چھپے۔ دوسری طرف کو قلم نے جنبش دکھائی تو کتاب ''ساحر کا فن اور شخصیت'' ظہور میں آئی۔ پھر 1977ء میں ''اقبال دورِ جدید کی آواز'' کتاب بن کر منصۂ شہود پر آئی۔ آپ ماہنامہ ''روپ'' کی مدیرِ اعلیٰ رہیں۔ روزنامہ ''جنگ'' اور روزنامہ ''انجام'' سے منسلک رہیں۔ صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ کراچی یونیورسٹی سے ایم اے صحافت کی ڈگری لی تو بس امکانات سہل ہوتے چلے گئے۔ یہ کیا کم بخشش خداوندی تھی کہ حالات سنورنے لگے اور آپ کی بے قرار اور مضطرب روح کو ادب نے گود لے لیا۔ لوگ چیخے، سلطانہ مہر کی گھریلو زبان اردو نہیں۔ ''جو زبان جانتا ہو زبان دانی وہی ہے۔ زبان اس کی کنیز ہے جو زبان کا آقا ہے۔

صحافت کا برسوں کا تجربہ سلطانہ مہر کی جھولی میں پڑا ہے اور قلم اس کا موتی پرونا جانتا ہے۔ اس قلم کے پیچھے سلطانہ مہر کی بے قرار روح مصروفِ عمل رہتی ہے جو ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے کی دُھن کو تازہ دم رکھتی ہے۔ رہی بات فکری جدوجہد کی تو اس پر کبھی کبھی تالے نہیں پڑتے۔

بہاؤ یہ آپ رُکے توڑ کے۔ رشتہ قلم اور کاغذ کا کب ٹوٹتا ہے۔ دریا اپنی خشک مٹی سے آپ سوکھ جائے تو پڑے اپنی خشک مٹی میں۔ جائے بھاڑ میں۔ قلم کو جتنا کام کرنا تھا کر گیا۔ نئی راہیں کھول گیا۔ آئندہ والوں کو میراث دے گیا۔ اسی طرح سے تو چراغ سے چراغ جلتا ہے اور ادب کی راہ داریاں روشن رہتی ہیں۔

ادب کی راہداریوں میں بھی کئی خوانچے خالی پڑے ہیں نظر پڑ جائے تو پڑ جائے۔

لکھنے والے کو نئے نئے خیالات اکساتے رہتے ہیں۔ نئی نئی باتیں قارئین کو اچھی لگتی ہیں۔ ان کی معلومات میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ پارسی برادری کے متعلق عام طور پر لوگ بے خبر ہوتے ہیں جتنے منہ اتنی باتیں۔ اس طبقے کے رسم و رواج اپنے ہیں جن سے بہت ہی کم لوگوں کو علم ہوتا ہے۔ پاکستان کی معروف اور منفرد پارسی خاتون سدھوا انگریزی زبان میں ناول لکھتی ہیں۔ ان کا ایک ناول چھپا تھا "Crow Eater"۔ اس ناول میں انہوں نے پارسی معاشرت کی عکاسی کی تھی اور ناول کا ہر باب پچھلے باب سے ارفع و اعلیٰ ہوتا چلا گیا تھا۔ پڑھنے والوں کو معلومات کا خزانہ ملا۔ نہال ہو گئے۔

یہ ظاہری بات ہے اور اصول کی بات ہے کہ کسی بھی معاشرت کی عکاسی کرنے میں جرأت اور بے باکی سے کام لینا پڑے گا۔ ورنہ حقیقت اور حقائق کی آئینہ بندی نہ ہو پائے گی۔ قلم پر بددیانتی کا الزام لگے گا۔ دیکھئے نا عکس بند ہو گی تو نگاہ کا کیمرا چاروں طرف گھومے گا۔ تحریر اٹھکیلیاں کرے گی۔ سلطانہ مہر نے اپنے ناول "جب بسنت رُت آئی" میں بمبئی کے میمن اور بوہری برادری کی معاشرت کی بڑی انصاف پسندی اور دلیری کے ساتھ عکاسی کی ہے جس نے اس ناول کو زندگی کے بہت قریب لا کھڑا کیا ہے اور یہی وہ خوبی ہے جو ناول کو امتیازی سطح پر لے آئی ہے۔

ہر دم جواں ہر دم رواں کی۔ بے قراری جو تخلیق کار کو ودیعت ہوتی ہے وہ جذباتی اور جمالیاتی تہذیب کے پھولوں کو ہر وقت تر و تازہ دیکھنا چاہتی ہے۔ یہ جذبہ فراواں اپنی روانی نہیں کھونے پاتا۔

مار دیا مار دیا۔ ادب میں ایک خوانچہ خالی پڑا تھا۔ اس پر سلطانہ مہر کی نظر پڑی تو تڑپ اٹھی۔ بہادری نے پھر ہاتھ پکڑا۔ تذکرہ شاعروں اور شاعرات کا مرتب کرنے کو اکسا رہا تھا۔ ہر خیال اپنی خوبی سے مالامال ہوتا ہے۔ سلطانہ مہر کے ہاں وہ جبلت جو زوال پذیر کہلاتی ہے کبھی بھی اس کو مغلوب نہ کر پائی تھی۔ اب مغلوب کیسے ہوتی۔ اخبار میں خواتین کے صفحے کی Page Edi-tor نے شاعروں اور شاعرات کو سوالنامہ بھیجنے شروع ہوئے۔ کئی یوں نے سوالنامے پُر کیے۔ کئی یوں نے کہا جاؤ جی۔ باؤلی عورت ہے۔ یہ نہ آج تک ہو پایا ہے نہ ہو گا اور پھر عورت کے

ہاتھوں سے شاعری کا تذکرہ مرتب ہوگا۔ جی واہ۔ ہوش کے ناخن لو۔ کیا پدی کیا پدی کا شوربا۔

سلطانہ مہر کی ہمت اور حوصلے پر آفرین ہے کہ اس نے پدی کا شوربا بنا کر رکھ دیا اور اتنا مزیدار بنایا کہ یہ "گورما" دیر تک دستر خوان پر چنا جائے گا۔ اس موضوع پر آنے والی کتابوں کا ماخذ بنے گا۔ بات یہ ہے ادب کوئی ایک مزاج کا پیدا نہیں ہوتا۔ ادب انگڑائیاں لیتا ہے۔ رم خوردہ غزال کی طرح کلیلیں بھرتا کدکڑے مارتا ہے کبھی یہاں کبھی وہاں۔ کبھی زمانہ تھا جب شعراء کے تذکرے لکھے جاتے تھے۔ تذکرہ نویسی بھی ادب کا ایک اہم حصہ ہوتا تھا۔ پھر اس کو پالا مار گیا۔

ہمارے گھر کی لائبریری میں ایک کتاب ہوتی تھی جہازی سائز کی مومی کاغذ پر عمدہ کتابت نام کتاب کا تھا "خم خانۂ جاوید"۔ ہم اسکول کے وقتوں میں اس کو کھول کر کبھی دیکھتے تو بہت متاثر ہوتے۔ شاعروں کا تذکرہ تھا۔ ان کا بچپن، ان کی عادتیں، ان کا کلام۔ اس وقت خم خانۂ جاوید ہمارے لیے بڑا مشکل لفظ تھا۔ آج ہم خود خم خانۂ جاوید بنے ہوئے ہیں کہ ہمارا کون سا نثر پارہ ایسا ہے جس میں کسی شاعر کا شعر موجود نہ ہو۔ خاکم بدہن نثر لکھنے والوں میں تنہا ایسا نثار ہوں جس کو اتنے سارے شعر یاد ہیں۔ تخلیقی لہروں کی آہستہ خرامی میں شعر ایسا حُسن پیدا کرتا ہے کہ اس کا جواب نہیں۔ شعروں کی رفاقت اور شعروں کی سخاوت ہمیشہ سے ہماری دولت بنی رہی ہے۔

اردو میں شعر کہنے والے شاعر لوگ اور شاعرات خواتین "لوگ" اب دنیا بھر میں خوشگوار ہواؤں کی طرح پھیل گئے ہیں۔ سلطانہ مہر نے "سخن ور" کے نام سے دو کتابیں مرتب کر ڈالی ہیں۔ حصہ اوّل اور حصہ دوئم۔ دونوں جلدوں میں شعراء اور شاعرات کا تذکرہ ہے۔ مناسب سوالنامے کے جواب میں انہوں نے جو مناسب جانا کتاب مرتب کرنے والی خاتون کو لکھ بھیجا۔ شعرا اور شاعرات نے اپنے اپنے حالات کے ذیل میں جو لکھا ہے وہ بڑا دلچسپ ہے۔ نوع بہ نوع کے طباع اور مزاجوں سے آشنا کرتا ہے کہ ہم سب کس کس مٹی سے بنے ہیں۔ تربیت میں کیا کیا عناصر نے تربیت بندی کی۔ کدھر کو آئے کدھر نکل گئے۔ شاعرات اور شاعروں کی تصویریں بھی ان کی تحریروں کے ساتھ ہیں۔ ان کے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک شعر بھی ان کی تصویر کے نیچے ہے۔ نیویارک کی دو کہنہ مشق اور عمدہ شعر کہنے والی شاعرات حصہ دوئم سے غائب ہیں۔ شاید انہوں نے سوالنامے بھر کر نہ بھیجے ہوں دونوں کے مزاج میں بدرجہ وافر استغنا ہے۔ یہ بھی تو شعر کہنے والے کے یہاں ہوتا ہے۔ میری مراد صبیحہ صبا اور فرحت زاہد سے ہے۔ یہاں کے سینئر شاعر حنیف اخگر صاحب نے تعارف میں کون سی بات ہے جو نہیں کہہ دی۔ خود ستائش کا ہم مزہ لے گئے۔ ایک بڑی عمدہ بات جو اس کتاب کے پڑھنے کے بعد ہم پر آشکار ہوئی وہ یہ کہ شاعرات شعر کہنے میں کسی سے کم نہیں۔ یورپ امریکہ کنیڈا عرب امارات اور مشرق وسطیٰ میں

وہ خوب کہہ رہی ہیں۔ مزید بر آں بڑے خلوص اور دردمندی سے بچوں کو اردو زبان کی طرف لانے کی تاکید کرتی ہیں۔ غوثیہ سلطانہ شکاگو سے کہتی ہیں "میں اردو کے مستقبل سے پر امید نہیں ہوں۔ آج کے اردو بولنے والے ادیبوں اور شاعروں پر یہ بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس زبان کی بقا کے لیے عملی قدم اُٹھائیں۔ آج کے مشاعرے کمرشل ہو گئے ہیں لہٰذا بچوں کے لیے گھریلو شعری نشستیں منعقد کرنا چاہئیں جن میں وہ خود حصہ لیں اور ان کے ذوق کی چیزیں انہیں ملیں۔ اپنی مصروفیات کا بہانہ بنا کر دامن چھڑا لینے سے تو یقیناً ہم اپنی زبان کے تناور درخت کی جڑیں اپنے ہاتھ سے کاٹ دیں گے۔"

ارم انصاری مشی گن سے اپنے مختصر سے بیان میں لکھتی ہیں۔ "نئی پروان چڑھنے والی نسل کے اردو سے نابلد ہونے کی وجہ گھر کا ماحول ہے۔ اگر آپ ایک بچے کی مثال لیں تو گھر میں اگر والدین اس سے اردو میں گفتگو کرتے ہیں تو امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کے باوجود وہ اپنی زبان کو سمجھے گا۔ دلچسپی لے گا اس کا تعین گھر کا ماحول کرے گا۔"

اس کتاب کا یہ احسان بھی ہم پر ہوا کہ عبدالرحمٰن صدیقی صاحب کو ہم نے قریب سے دیکھا۔ تصویر کے نیچے دستخط تھے۔ اور شعر تھا

ہم سے کیا پوچھتے ہو کیا گزری
کوئی محفل میں اس کی جائے تو

ان کے مزاج کی داد ہے۔ تصویر اور شعر ایک سے تھے۔ صفحہ اُلٹا تو یہ شعر دیکھ کر آنکھیں روشن ہو گئیں۔

پھول کھلتے ہی آگیا گلچیں
اب سزا پائیگی کلی کھل کے

یہ شعر واللہ کئی روز ہماری زبان پر رہے گا۔ صدیقی صاحب اپنے انٹرویو کے دوران سلطانہ مہر سے کہتے ہیں۔ "امریکہ میں اردو کے مستقبل کے بارے میں کچھ زیادہ پر امید نہیں ہوں، حالانکہ اگر اجتماعی اور شعوری کوشش کی جائے تو اردو کا مستقبل یہاں روشن ہو سکتا ہے۔ والدین اپنی اولاد کو اردو کی تعلیم دینے میں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کر رہے، یہ بہت افسوس کی بات ہے۔ محض مشاعروں وغیرہ سے کام نہیں چلے گا۔"

سخن ور حصہ اوّل ساٹھ شاعروں کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ "سخن ور" دوئم میں اٹھاسی شاعروں اور شاعرات کا ذکر ہے۔ یہ کتاب بک شیلف کی رونق والی کتاب ہے کیونکہ اس میں اجلے اور نئے جذبوں کا اظہار ہے۔ (مطبوعہ "پاکستان اردو لنک" لاس اینجلس مورخہ 7 فروری 1997ء)

گر مفت میں ملے تو 'سخن ور' بُری نہیں

(2جولائی 99ء میں محترمہ سلطانہ مہر کی تالیف کردہ کتاب "سخن ور" کی نیویارک میں تقریب رونمائی کے موقع پر یہ نظم پڑھی گئی)

خالد عرفان (نیویارک، امریکا)

طولِ حیات فیتۂ اردو سے ناپ کر
سلطانہ خوش ہوئی ہے سخن ور کو چھاپ کر

تحقیق ہے، غزل ہے، مقالہ ہے یہ کتاب
اس عہد کے ادب کا حوالہ ہے یہ کتاب

موسم کوئی ہو، شعر و ادب لکھ رہی ہے یہ
جو ہم سے چھوٹ جائے وہ سب لکھ رہی ہے یہ

تالیف کرکے ایک کتاب اپنے عہد کی
تاریخ لکھ رہی ہے کریلے سے شہد کی

اس کی کتب میں سارے سخن ور ہیں ساتھ ساتھ
مامون ایمن اور حنیف اخگر ہیں ساتھ ساتھ

یہ مطمئن ہے یوں کہ کتابیں ہیں اس کا دل
اس کے سوالِ علم و ادب کا جواب نل اے

'ایل اے' ۲- میں اس نے علم کا سامان کردیا
اک چرچ میں نماز کا اعلان کردیا

اس میں بسا ہوا جو صحافت کا شہر ہے
وہ شہر ہی حوالۂ سلطانہ مہر ہے

منزل پہ کوئی راہ بھی سیدھی نہ جائے گی
جب تک کوئی کتاب خریدی نہ جائے گی

اک شخص کہہ رہا تھا 'سخن ور' کے باب میں
قیمت بری لگی ہے مجھے اس کتاب میں

اچھی ہے یہ کتاب جو خانہ پُری نہیں
گر مفت میں ملے تو "سخن ور" بُری نہیں

قلم کا قرض

ڈاکٹر پیرزادہ قاسم

سلطانہ مہر ہمارے عہد کی ایک ایسی فعال قلم کار ہیں جنھوں نے ہر ہر لمحہ تیز رو اور بدلتی ہوئی زندگی اور منقلب ہوتے ہوئے ماحول میں نہایت دیانتداری اور مستعدی کے ساتھ قلم کا قرض چکایا ہے اور اس طرح کہ کسی بھی موقع پر اور کسی بھی حالت میں فکر اور اظہار کی حرمت پر آنچ نہ آنے دی۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مثبت فکر کی حامل ایسی قلم کار ہیں جن میں تمہید کاری اور پیش قدمی (Initiative & Drive) کی بے پناہ صلاحیتیں ہیں اور وہ جم کر کام کرنے کا مزاج اور سلیقہ رکھتی ہیں۔ اس کا ثبوت ان کی تیرہ نثری کتابیں اور ایک شعری مجموعہ ہے، جو سب 'حرفِ معتبر' کے ذیل میں آتے ہیں اس لیے کہ وہ خواہ سلطانہ مہر کی کہانیوں، ناول ہوں، تذکرے ہوں، شعریات ہو یا تحقیقی کام، سب پر سلطانہ مہر نے بے حد محنت اور جاں سوزی کی ہے اور انھیں ان کے سیاق و سباق سے مربوط رکھتے ہوئے حاضر کے مطالبات کی روشنی میں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر سلطانہ مہر کو صحافت اور ابلاغیات کا جو عملی تجربہ ہے اس سے بھی انھوں نے بھرپور فائدہ اُٹھایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں پیش کش (Presentation) کا سلیقہ بھی نمایاں ہے مزید یہ کہ سلطانہ مہر تخلیقی عمل اور اس کی تہہ داریوں سے بھی واقف ہیں اور ان کی تحریروں میں اس کی پاسداری بھی ملتی ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے سلطانہ مہر نے اردو زبان و ادب کی جیسی خدمت کی ہے اس طرح کی مثالیں کم سامنے آتی ہیں ہیں۔

اردو دنیا کے شعراء کے بارے میں انھوں نے ساٹھ کی دہائی میں جو تحریری سلسلہ شروع کیا تھا اس کو بڑھاتے ہوئے انھوں نے اردو زبان کے شعرا کے تذکرے ترتیب دیے۔ یہ منصوبہ بندی انھوں نے نہایت سلیقہ مندی سے کی اور آج کی شاعرات، سخن ور حصہ اوّل، سخن ور حصہ دوم اور سخن ور حصہ سوم اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ یہ ایک تھکا دینے والا اور الجھا دینے والا کام تھا جسے ان کے

حُسنِ تدبیر نے اور بے مثال مستقل مزاجی نے آسان کر دکھایا اور یوں وہ اب تک 333 شاعروں کے تذکرے مرتب کر چکی ہیں جو مذکورہ جلدوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

سلطانہ مہر کے مزاج میں ایک وصف 'مقصدیت' ہے اور وہ اپنی ہر تحریر کے لیے کوئی وقیع حوالہ منتخب کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ شعرا کے ان تذکروں میں بھی انہوں نے ان تخلیق کاروں کے فکری پس منظر کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے اور زبان و ادب کے اہم موضوعات پر ان کے خیالات سے ہی ان کے خدوخال روشن کیے ہیں۔ اسی لیے یہ تذکرے صرف شاعروں کے کوائف پر مشتمل نہیں بلکہ ان میں زمانے اور وقت کا پورا شعور بھی موجود ہے۔ پھر سلطانہ مہر کے ذاتی تاثراتی نوٹس نے اس سلسلے کو نہایت دلچسپ اور اہم بنا دیا ہے۔

سلطانہ مہر کے مزاج میں ایک 'جہدِ مسلسل' کی کیفیت اور خواہش ہمیشہ فروزاں رہتی ہے۔ ایک کام اپنے اختتام کو نہیں پہنچنے پاتا کہ ایک نئے کام کی آرزو سر اُٹھا لیتی ہے۔ سخن ور حصہ سوم اسی برس (1998ء) میں منظرِ عام پر آیا ہے اور یہی برس سلطانہ مہر کی نئی پیش رفت 'گفتنی' کا اعلان بھی ہے جو ہمارے عہد کے نثر نگاروں کا تذکرہ یا تذکروں کی ابتدا ہے۔ (ڈاکٹر پیرزادہ صاحب! الحمدللہ میں نے دو سال کی سعی مسلسل کے بعد نثر نگاروں کا تذکرہ بنام "گفتنی" مکمل کر کے اسی سال یعنی 2000ء میں شائع کر دیا ہے۔ س۔م)

سلطانہ مہر ایک باہمت، مستقل مزاج خاتون ہیں جو اپنی بامقصد اور خوبصورت پر اثر تحریروں کے حوالے سے مصروف ہیں اور انہوں نے ادب و سماجیات کے منظر نامہ پر جو تحسین اور ستائش سمیٹی ہے وہ اس کی ہر طرح حقدار ہیں۔ ان کے کام کی ستائش ہمارے عہد کے اہم اور ارجمند ناقدین نے کی ہے جس میں جناب احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر حنیف فوق، پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، جناب شان الحق حقی، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، محترمہ عصمت چغتائی، جناب مشفق خواجہ، جناب حمایت علی شاعر، جناب ضمیر جعفری اور پروفیسر سحر انصاری نے سلطانہ مہر کی ادبی کاوشوں کو سراہا ہے اور سچ بھی یہی ہے کہ سلطانہ مہر اپنے ہم عصروں میں اپنی ادبی خدمات کے حوالے سے ممتاز ہیں اور ان کی کارکردگی قابلِ رشک قرار دی جا سکتی ہے۔ ان کا کام یقیناً اتنا اور اس قابل ہے کہ ان کی شخصیت اور فن پر بھی کام ہونا چاہیے۔

(یہ مضمون "سخن ور سوم" کی تعارفی تقریب منعقدہ مارچ 1998ء میں آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی میں پڑھا گیا تھا)۔

DR. PIRZADA QASIM
13A STTAF TOWN KARACHI UNIVERSITY
KARACHI- 75270 (PAKISTAN)

نگاہِ دُختِ میمن سے...

محمود شام

آج کل کتابوں کی افتتاحی تقریبات جس باقاعدگی اور تواتر سے ہو رہی ہیں۔ اس کا منطقی نتیجہ تو یہ برآمد ہونا چاہئے کہ ہمارے معاشرے سے وحشت، تشدد اور جہالت رخصت ہو جائیں لیکن ہو اس کے برعکس رہا ہے۔ ایک ہی دن میں پاکستان کی کئی مائیں اپنے جگر گوشوں سے، سہاگنیں اپنے سہاگ سے، بہنیں اپنے ویروں سے محروم ہو گئیں دن بھی کونسا، یوم پاکستان جسے کہتے ہیں قرارداد پاکستان کا دن، جس کے سات سال بعد پاکستان وجود میں آیا۔ پرسوں یوم پاکستان کی شام پاکستان کے افق پر خون کی سرخی چھا گئی تھی۔ کراچی کے بیٹوں کا لہو، بھٹو کے فرزندوں کا لہو، پھر یہ لہو پاکستان کے افق سے ٹیلی ویژن چینلوں کے ذریعے پوری دنیا کے ذہنوں پر چھا گیا۔ پھر دنیا بھر کے لوگ سوچنے لگے پاکستان میں وحشی رہتے ہیں۔ بربر رہتے ہیں۔ اپنے ہی ہم وطنوں کا خون بہانے والے رہتے ہیں۔

اتنی کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ افتتاحی تقریبات ہو رہی ہیں۔ کتابیں تقسیم ہو رہی ہیں فروخت ہو رہی ہیں لیکن یہ محبت نہیں پھیلا رہی ہیں۔ پیار کا سماں نہیں باندھ رہی ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

کیا لکھنے والے خونِ جگر سے نہیں لکھ رہے ہیں؟

کیا کتاب برائے کتاب لکھی جا رہی ہے؟

کیا ادب برائے ادب تخلیق ہو رہا ہے؟

یہ آج کا المیہ ہے۔ آپ کا المیہ ہے، میرا المیہ ہے۔

آج کی کتاب 'سخن ور' میں اس سوال کا جواب حاصل کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ تاہم یہ ایک جزوی کوشش ہے۔ ضرورت ہے کہ یہ سوال ہم سب لکھنے والے اپنے آپ سے کریں۔ اس کا جواب بھی تلاش کریں۔ جواز بھی اور پھر ان اسباب کو دُور کرنے کے لیے کچھ عملی اقدامات بھی کریں۔

پہلے ایک انسان کا قتل ہوتا تھا، آسمان لال بھبوکا ہو جاتا تھا۔ سرخ آندھی چل پڑتی تھی۔ لوگ سہم جاتے تھے۔ قاتل کے خلاف زمانہ سرگرم ہو جاتا تھا۔

اب ایک ایک دن میں کئی کئی جسموں کا جان سے رشتہ ختم کر دیا جاتا ہے۔ ماؤں کے سامنے ان کے بیٹوں کو خون میں نہلا دیا جاتا ہے۔ نہ آسمان سرخ ہوتا ہے نہ کوئی لال آندھی آتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ ہم قاتلوں کو جانتے بھی ہیں، پہچانتے بھی ہیں لیکن نہ جانے کیوں نشاندہی نہیں کر سکتے کیونکہ ہم خود صفِ قاتلاں میں کھڑے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ صف قاتلاں ہی صف مقتلاں میں منتقل ہو رہی ہے۔ پاکستانی ہی قاتل ہے، پاکستانی ہی مقتول ہے۔

سلطانہ مہر اس مقتل سے جسم و جاں بچا کر بہت دُور چلی گئی ہیں۔ شاید بلکہ یقیناً اسی لیے ان میں "سخن وروں" کے بارے میں کچھ جاننے لکھنے اور شائع کرنے کا حوصلہ باقی ہے۔

کتابوں کے لیے بے اثر ہونے میں کتابوں کا کوئی قصور نہیں ہونا چاہئے کیونکہ وہ پڑھی جائیں تو اپنی تاثیر دکھائیں۔ دوائیں بھی اگر میڈیکل اسٹورز پر یا آپ کی الماریوں میں پڑی رہیں تو بیماریاں دُور نہیں کر سکتیں۔ عام قاری تو چھوڑیے۔ کتابوں کی تقریبات میں تقریریں کتابیں بغیر پڑھے ہی کر دی جاتی ہیں۔

میں بھی یہ کتاب پڑھ کر بات کرنا چاہتا تھا لیکن سرورق سے اگلے صفحے میں ہی الجھ کر رہ گیا۔ خواتین کی عمر والا مسئلہ درمیان میں آ گیا۔ سلطانہ مہر خود بتا رہی ہیں کہ ان کا پہلا افسانہ 6 ستمبر 1953ء کو روزنامہ 'انقلاب' بمبئی میں شائع ہوا۔ 1998ء میں وہ یہ بات کر رہی ہیں۔ درمیان میں کتنے سال آ گئے۔ 1953ء میں ظاہر ہے ان کی عمر افسانہ لکھنے والی تو ہوگی ہی۔ افسانہ نگار ہی بتا سکتے ہیں کتنی ہونی چاہئے۔

آگے چلتے ہیں تو روزنامہ 'جنگ' کراچی 1967ء سے 1969ء۔ اس کے بعد یعنی 1969ء سے 1980ء تک کچھ پتہ نہیں کہ سلطانہ مہر کہاں رہیں۔ دیگر معمولات اور مصروفیات کے ذکر میں بھی اس عرصے میں کسی وابستگی کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ کچھ ناول اور تصنیفات اس دوران میں منظر عام پر آئی ہیں۔ بہر حال ایک قاری کی حیثیت سے مجھے اور آپ کو یہ جاننے کا حق حاصل ہے کہ یہ بارہ سال کہاں گزرے۔ بن باس کے لیے بارہ سال ہی کی مدت ہوتی ہے۔ اس بارہ سال کے بن باس کے نتیجے میں 'روپ' نکل کر سامنے آتا ہے۔ نکل کر یا نکھر کر، ایک ہی بات سمجھ لیجئے۔

میں کراچی نیا نیا آیا تھا 'اخبار جہاں' سے وابستگی کے لیے جنگ بلڈنگ میں تیسری منزل پر ہم اخبارِ جہاں والے کھلے ہال میں بیٹھتے تھے۔ جنگ والے بند کروں میں۔ شفیع عقیل تھے۔ سلطانہ مہر تھیں اور کچھ لوگ تھے۔ سلطانہ مہر نے لکھا ہے کہ ان سے سرِ راہے ملاقات ہوتی تھی۔ اس سے ممکن ہے کہ غلط فہمی پیدا ہو کہ ہم سرِ راہ دیدہ و دل فرشِ راہ کیے کھڑے رہتے تھے۔ یہ دراصل ان

کی مجبوری تھی کہ یہ یا شفیع عقیل اپنے بند کمرے سے باہر نکلتے تو سامنے کا نظارہ ہم پر ہی مشتمل ہوتا تھا۔ سر راہے ملاقات ہوتی اور سلام دعا بس۔ اس 'بس' کی توجیہہ انہوں نے ساتھ ہی کر دی ہے۔
محمود شام پیپلز پارٹی سے وابستہ تھے۔ ہماری ان سے ملاقات تو جنگ کی تیسری منزل پر رہی اور ہماری وابستگی بھی 'جنگ' سے ہی تھی۔ یہ دور تھا دائیں اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والوں کی شدت کا۔ ایک طرف وہ تھے جو مارشل لاء کے مخالف تھے۔ طبقاتی بالادستی کے خلاف تھے۔ مذہب کے نام پر اسلام پسندی کے نام پر استحصال کے مخالف تھے۔ دوسری طرف وہ تھے جو یحیٰی خان کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ اسلامی آئین لا رہا ہے۔ جو مساوات کی بات کرنے والوں پر کفر کے فتوے لے آتے تھے۔ ہم پہلی صف سے تعلق رکھتے تھے جو سب انسانوں کو انسانیت کی بنیاد پر حق دلوانا چاہتے تھے جو لوگوں کو نظریاتی وابستگی پر روزگار سے محروم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہی دنوں صحافیوں کی ہڑتال ہوئی مغربی اور مشرقی پاکستان میں پورے 9 روز اخبار نہیں شائع ہوئے پھر ہوا یہ کہ ہماری صف میں سے کچھ لوگ ہڑتال توڑ کر اخبار نکالنے چلے گئے۔ ہم ہڑتال توڑنے والوں میں شامل نہیں تھے۔ اس ساری روداد سے نہ جانے یہ نتیجہ کیسے اخذ کیا جاسکتا ہے کہ محمود شام پیپلز پارٹی سے وابستہ تھے۔ ہمارے نظریات آج بھی وہی ہیں۔ ان نظریات کے لیے جو فرد یا پارٹی کام کرے گی ہم اسے دوسروں کے مقابلے میں بہتر سمجھیں گے لیکن ایک پیشہ ور صحافی کی حیثیت سے کسی بھی پارٹی سے وابستگی کو اپنے پیشے کے مفادات کے خلاف سمجھیں گے۔
بات ہے اپنی مٹی سے عشق کی۔ اپنی مٹی کی محبت اگر لہو کو گرم نہ رکھے تو آدمی کہیں کا نہیں رہتا۔ مٹی ساری دنیا کی ایک جیسی ہوتی ہے لیکن ہر وطن کی مٹی کی خوشبو مختلف ہوتی ہے۔ تاریخ کے اوراق اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ جب ایک تہذیب نے دوسری تہذیب کی طرف سفر کیا ہے تو ایک مٹی کی خوشبو دوسری مٹی کی خوشبو میں ملی ہے اور یہ دو آتشہ ہو گئی ہے۔ تہذیب اور بھی مالا مال ہو گئی ہے۔ خوشبوئیں آپس میں ملتی ہیں کبھی ایک خوشبو کو دوسری خوشبو پر مسلط نہیں کیا جاسکتا ہے۔
مٹی کی یہی خوشبو ہے۔ جو سلطانہ مہر کو لاس اینجلس سے بار بار کراچی لے آتی ہے۔ میں بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی کے انٹرویو کے لیے بھارت جا رہا تھا تو سلطانہ مہر نے کچھ کتابوں کے ساتھ ساتھ بمبئی کی مٹھی بھر مٹی بھی لانے کی فرمائش کی تھی جو میں نے پوری کر دی تھی۔ میرے ذہن میں آیا تو تھا کہ یہ کس لیے؟ لیکن مٹی کے معاملے میں دل کے معاملے میں کوئی منطق یا دلیل نہیں چلتی۔ معلوم نہیں کہ وہ سوغات اب بھی ان کے پاس ہے یا نہیں اور اب جب یہ امریکہ میں رہتی ہیں تو بمبئی کی مٹی کے ساتھ ساتھ کراچی کی مٹی بھی رکھتی ہیں یا نہیں۔
جنگ بلڈنگ کی تیسری منزل پر رہتے ہوئے یہ خیال تنگ کرتا تھا اور ہم ایک دوسرے سے

ذکر بھی کرتے تھے کہ ایک میمن خاتون اردو کی شاعرہ کیسے بن گئی اردو میں صحافت کیسے کرنے لگی اس میں لگن بھی چاہئے محنت بھی۔ سلطانہ مہر کو آج شاعری میں صحافت میں جو مقام ملا ہے۔ وہ ان کی اپنی محنت کا ثمر ہے۔ وہ میمن ہیں۔ زبان گجراتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میمنوں پر تخلیقی اور تخئیل کے دروازے بند نہیں کیے ہیں۔ وہ رو کڑے کے حساب میں لگے رہتے ہیں۔ اس میں بھی کچھ سوچنا تو پڑتا ہے۔ وہ اس پر یقین رکھتے ہیں "پہلے تولو اور پھر بولو" یہ الگ بات ہے کہ زیادہ میمنوں کی عمر تولنے میں ہی گزر جاتی ہے۔ یہاں تولنا گننے کے معنوں میں بھی استعمال ہو رہا ہے۔

کبھی کبھی تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کا 'مرد مومن' دراصل مرد میمن ہی ہے۔ مثلاً آپ یہ مصرع پڑھیں

نگاہِ مرد میمن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں"

کیا کراچی میں ایسا نہیں ہوتا۔ اسی طرح

'میمن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اس پر تحقیق کی ضرورت ہے کہ اقبال کا 'مرد مومن' کیا ہمارے سیاق و سباق میں 'مرد میمن' نہیں ہے۔ معاشرہ ہمارا امرد غالب ہے اس لیے میمنوں کے باب میں بھی صرف 'مرد میمن' کا ذکر ہوتا ہے۔ 'زن' میمن کا نہیں حالانکہ زر، زمین، زن، تینوں سے میمنوں کا بہت قریبی تعلق ہے۔ معلوم نہیں ان مسائل پر ان کے اپنے درمیان یا غیر میمنوں سے جھگڑا ہوتا ہے یا نہیں لیکن میمن برادری ان تینوں چیزوں سے بہت مالا مال ہے۔ سلطانہ مہر جیسی نامور شاعرہ اور صحافی نے میمن برادری کو ادب کی شناخت بھی دے دی ہے۔

میمن برادری میں استقامت اور تسلسل بھی ہے۔ تجارت صنعت امارت اور تمول ان کے ہاں صدیوں سے موجود ہے اسے کسی اور کو منتقل نہیں ہونے دیتے۔ سلطانہ مہر کی تجارت، صنعت، ملکیت، اور امارت تحریروں اور تخلیقات پر مشتمل ہے اس لیے یہ اسی کی پیداوار بڑھاتی رہتی ہیں۔ اس میں انتہائی خلوص اور یکسوئی سے مصروف رہتی ہیں۔ انہوں نے اپنی تعلیم کا سفر بھی اپنی شادی شدہ زندگی کے دوران طے کیا ہے۔ بچوں کی پرورش اور تربیت کے ساتھ اپنی پرورش اور تربیت بھی کی ہے۔ بچوں کو اعلیٰ ٹیکنیکل اور میڈیکل تعلیم بھی مستقل مزاجی سے دلوائی اور اب یہ اطمینان ان کے چہرے پر نظر آتا ہے کہ بچوں کو ان کی منزل تک پہنچانے میں ان کی محنت رنگ لا چکی ہے۔ خود بھی وہ اپنی تکمیل میں بھی ناکام نہیں رہی ہیں۔

تذکرہ شعراء و شاعرات میں تیسرے حصے تک آ پہنچی ہیں۔ (شاعرات کا ایک الگ تذکرہ "آج کی شاعرات" کے نام سے بھی لکھ چکی ہیں) تیرہ تصنیفات اردو ادب کو دے چکی ہیں۔ ایک اپنی طرز کے خوبصورت ماہنامے کی مالک اور مدیرہ رہیں۔ مہر بک فاؤنڈیشن کی بنیاد رکھ چکی ہیں۔

مضامین تازہ کے انبار لگا رہی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اب انہیں مقامی شاعرہ نہیں بلکہ امریکہ سے آئی ہوئی شاعرہ سلطانہ مہر کہا جاتا ہے۔ ان کی وجہ سے ایک مقامی مشاعرہ چشم زدن میں عالمی مشاعرہ ہو جاتا ہے۔

میں انہیں ان ساری کامیابیوں پر مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔

(یہ مضمون "سخن ور سوم" کی تعارفی تقریب منعقدہ 25مارچ 1998ء آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی میں پڑھا گیا)

MR. MAHMOOD SHAM
A- 262 BLOCK3
GULSHAN -E- IQBAL KARACHI (PAKISTAN)

سلطانہ مہر کے نام!!

ظفر عباس

(سلطانہ مہر کی نئی تالیف "سخن ور" سوم کی رونمائی کے موقع پر۔ بمورخہ 11 دسمبر 98ء
بمقام شاہنواز ریسٹورنٹ لیک روڈ کیلی فورنیا)

نیا اجالا نئے آسمان لائی ہے
نئے ورق۔ تو نئی داستان لائی ہے
تمازتوں میں نئے سائبان لائی ہے
رہِ ادب میں نئے کاروان لائی ہے!
جو دیکھئے تو یہی مہر کی کمائی ہے،
خوشا۔ کہ آج "سخن ور" کی رونمائی ہے،
وہ جس نے تلخ حقائق کو بے لباس کیا
علاجِ گردشِ حالاتِ ناسپاس کیا
سخن نواز ہے وہ مہر، جس کے خامے نے
سخن وروں کو زمانے سے رُوشناس کیا
وہ مہربان، وہ مشفق، وہ پرخلوص انساں
وہ اہلِ دل کی بصیرت، وہ اہلِ فن کی زباں
حقیقتاً یہ 'سخن ور' ہے نور کی قندیل!
یہ فصلِ گل کا جزیرہ ہے نکہتوں کی دلیل
کھلائے گلشنِ اردو میں کچھ گلابِ حسیں
دیارِ غیر میں ہے مہرِ مے مژدۂ تسکیں
قبولِ عام ہو یارب! یہ کاوشِ رنگیں
خدا گواہ! کہ ہے مہر لائقِ تحسیں!!

تم نظر آتی رہو گی....!

اسد اللہ حسینی چکر۔ لاس اینجلس

یہ نظم 11 دسمبر 98ء کی شام لاس اینجلس میں "سخن ور سوم" کی تعارفی تقریب کے موقع پر پڑھی گئی۔

کام یہ بھی تم نے سلطانہ مکمل کرلیا
حصۂ سوئم سخن ور کا بھی شائع ہو گیا

مصروفیتِ مہر دیکھی تو کچھ ایسا لگا
بے غرض، بے لوث خدمت کا ہے ان میں حوصلہ

ان کی تنہا کاوشوں نے اک نیا گنجِ ادب
مشرق و مغرب سے منگوا کر اکٹھا کردیا

اک نئی تاریخ دی اردو ادب کے ہاتھ میں
جس میں شعرا اور شاعرات کا ہو تذکرہ

تین حصوں میں "سخن ور" کے تعارف کے لیے
ڈیڑھ سو اہلِ سخن کو کردیا ہو ایک جا

من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو
اب تو ہر بزمِ ادب کا بن گیا یہ تکیہ

ہو گئے رشک و رقابت مانعِ قدرِ ادب
دعویٰ دارانِ ادب ہیں کشمکش میں مبتلا

اردو "لٹریچر" کی اس تالیف پر ملتا "ایوارڈ"
کاسہ لیسوں میں اگر ہو، نام شامل مہر کا

میں کسی تنظیم 'اردو' کا بنوں گر معتمد
تالیفاتِ مہر کامل جائے گا ان کو صلہ

گر برا نہ مانو سلطانہ تو میں تم سے کہوں
گر قبول افتد زہے عز و شرف یہ مشورہ

کھول دو اک انجمن شعر و ادب کے نام سے
اور دے لو اپنی تالیفات کا خود کو صلہ

جانتا ہوں بے نیازِ تحسین و تعریف ہو
ان بکھیڑوں سے کبھی تم کو رہا نہ واسطہ

تم سے واقف ہیں کئی اہلِ ادب، اہلِ قلم
اور شہرت بھی تمہاری ہو رہی ہے جابجا

تم نظر آتی رہو گی مہر ان اوراق میں
یہ "سخن ور" پڑھ کے چکر نے دیا ہے فیصلہ

نوٹ:

برسرِ محفل اسد سے آپ وعدہ کیجیے
حصۂ سوم کو بی بی جلد چھپوا دیجیے

"یہ شعر میں نے سلطانہ کی کتاب "سخن ور حصہ دوم" کے موقع پر پڑھی گئی اپنی نظم سے لیا ہے۔ سلطانہ نے 'سخن ور حصہ سوم' شائع کر کے ہم سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا۔ اسد حسینی

اب سخن ور چہارم
کے ساتھ
گفتنی بھی...

"سخن ور سوم" کی تیاری کے وقت مجھے خیال آیا کہ نثر نگاروں کی تذکرہ بھی مجھے مرتب کرنا چاہیے یا یوں کہیے کہ یہ میری دیرینہ خواہش تھی۔ میں نے "سخن ور سوم" میں "گفتنی" کے عنوان سے اس تذکرے کا اعلان کر دیا تھا۔ اب "سخن ور چہارم" کے ساتھ "گفتنی" کا حصہ اوّل بھی شائع کر کے میں اپنی نظر میں آپ سُرخ رو ہو رہی ہوں۔

ادب کار اور ادب نواز جانتے ہیں کہ جانے کتنے شعرا بڑی خوب صورت نثر لکھنے میں کمال رکھتے ہیں۔ افسانہ، ڈراما اور تنقید و تحقیق میں بھی اُن کا بڑا مقام ہے۔ لیکن میرے سوال نامے کی رُو سے کچھ مختلف موضوعات بھی زیرِ بحث آئے۔ ایک خط میں مجھے محترم شان الحق حقی نے مشورہ دیا کہ "بی بی جواب جلد مطلوب ہو تو سوال نامہ مختصر رکھو۔" ان کے مشورے کی تعمیل کرتے ہوئے میں نے شعرا کی سوانح کے متعلق ایک سوال کے ساتھ صرف سات سوال رکھے۔ اب جواب دینے والوں پر منحصر تھا کہ وہ کس طرح اپنے جواب سمیٹتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ شاعروں اور ادیبوں نے یہ سلسلہ پسند کیا، بڑی خوش دلی اور صراحت سے جواب لکھے۔ یہ جوابات قارئین کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں اور یقیناً فکر پر بھی آمادہ کرتے ہیں۔ اسی قسم کا کام کر کے مجھے پہلے ہی ایک طمانیت ہوئی تھی۔ اس سرخوشی نے مجھے اور کام کرنے کا حوصلہ دیا۔ میں نے کسی کی تقلید نہیں کی۔ خود ہی اپنی راہ منتخب کی اور انٹرویو طرز کا تذکرہ مرتب کرنے کو ترجیح دی۔ میں 'سخن ور اوّل' سے چہارم تک اور "گفتنی" میں بھی اِدھر اُدھر سے ہاتھ مار کر شعرا اور ادیبوں کی سوانح ترتیب نہیں دے رہی ہوں جیسا کہ یہ کام مجھ سے پہلے بہت سے قلم کاروں

نے کیا ہے۔ میں نے اپنے شعرا و شاعرات اور ادیبوں کی فکر کو ان کے قارئین تک پہنچانے کا وقت طلب کام اپنے ذمے یوں لیا ہے کہ اس طرح اپنے طور پر کسی نوع کا تحقیقی کام انجام دے لوں گی۔ اب میں کہاں تک کام یاب ہوئی ہوں، اس کا فیصلہ ظاہر ہے، وقت کی مقدرت میں ہے۔

سوال نامے کے سلسلے میں، میں نے چند ادیبوں سے مشورہ کیا تھا۔ جب آپ مختلف شعرا اور ادیبوں کے جواب پڑھیں گے تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ اکثر بلکہ اسّی فیصد قلم کاروں نے بہت بے باکی اور دیانت داری سے اتنے نکتہ آفریں جواب ارسال کیے ہیں جو کسی ایک سیمینار میں بھی حاصل کرنا ممکن نہ ہوتے۔ میں ان تمام اہلِ دانش کی شکر گزار ہوں، انہوں نے ازراہِ لطف و کرم توجہ کی، منفرد و ممتاز صاحبانِ قلم نے میرے لیے اپنا قیمتی وقت صرف کیا۔ یہ تذکرہ اُن کے علم، اُن کی فکر ان کے تخلیقی کمالات، اُن کے وسیع مشاہدوں اور عمیق تجربوں پر مشتمل ہے۔ آج نہیں، تو کل، کچھ عرصے بعد، اسے ایک دستاویزی حیثیت حاصل ہو گی۔ یہ میرا یقین ہے۔

کچھ لوگوں نے اس تذکرے میں نئے ادیبوں اور شاعروں کی شمولیت پر اعتراض کیا ہے۔ میرے خیال میں نئے شاعروں کی شمولیت پر ہمیں وسیع النظری اور کشادہ دلی کا اظہار کرنا چاہئے۔ کیا معلوم، وقت کسے باقی رکھے، کسے اپنی گرد میں گُم کر دے۔

ڈیلاس، امریکا کے ایک شاعر سے جب اس حوالے سے گفتگو ہوئی تو انہوں نے بڑی حسرت سے کہا تھا "اس تذکرے میں بڑے شعرا کے ساتھ ہماری شمولیت ہمارے لیے فخر اور خوشی کا باعث ہے، ان کے ساتھ ہمیں بھی پڑھ لیا جائے گا۔"

میں سمجھتی ہوں، اپنی حصے کی مسرت کے پھولوں کی تھوڑی سی خوشبو سے دوسروں کو بھی فیض یاب ہونے دیا جائے تو ہمارے حصے کے پھول مرجھا نہیں جائیں گے۔

سلطانہ مہر
6 اپریل 2000ء
کراچی

20873 EAST WALNUT
CANYON ROAD, WALNUT,
CA 91789 U.S.A
PH:(909)444-0065
FAX:(909)444-0077

قطعات

ارشد عثمانی

(نیویارک میں سخن ور دوم اور سوم کی تعارفی تقریب کے موقع پر قطعات مؤلفہ کی نذر کیے گئے)

اردو کی پاس باں ہیں سلطانہ مہر
شاعرِ خوش بیاں ہیں سلطانہ مہر
امریکہ میں اُٹھائے عَلم اردو، مصروفِ عمل
حُسنِ غزل کی جاں ہیں، سلطانہ مہر

سحر کے لب پہ ترنم گلوں کی رعنائی
فضا میں شب کا تبسم دھنک کی انگڑائی
یہ سب حسنِ غزل میں ہے داد کا طالب
سلطانہ آپ کے کلام میں ہے فن کی گہرائی

بزمِ اردو میں غزل کی شاعرہ سلطانہ مہر
زندگی کے دائرے میں طاہرہ سلطانہ مہر
ان کو بخشی ہے خدا نے فکر و فن کی روشنی
'سخن ور' کی خالق ادب کی ساحرہ سلطانہ مہر

2جولائی 1999ء نیویارک

"سوال نامہ"

برائے "سخن ور، چہارم"

1۔ اپنا پورا نام، تخلص، تاریخ و جائے پیدائش، حصولِ تعلیم و ملازمت اور مختصر سوانح لکھیے۔

2۔ شاعری کے علاوہ ادب کی اور کون سی صنف سے وابستگی ہے؟ شاعری کے کس مکتبۂ فکر سے آپ کی شاعری متاثر ہے؟ کن جرائد میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہا ہے؟ اپنے مجموعہ کلام اور دیگر تخلیقات کی تفصیل لکھیے۔

3۔ آپ کن کتب کا مطالعہ دلچسپی سے کرتے / کرتی ہیں؟

4۔ اپنی زندگی کے چند اہم اور دلچسپ واقعات ضرور لکھیے۔

5۔ اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ آپ اس کے مستقبل کے بارے میں کس حد تک پُراُمید ہیں؟

6۔ شاعری میں کس صنف کو اظہارِ خیال کے لیے بہتر سمجھتے ہیں؟ نثری نظم اور نثری غزل کے تجربے ہو رہے ہیں، اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ آج کے دور میں مشاعرے ادب کی تخلیق میں معاون ہیں یا تخلیقی نشستیں بہتر کردار ادا کر سکتی ہیں؟

7۔ الیکٹرونک میڈیم کی وجہ سے کتابوں کا مطالعہ اور اشاعت کم ہو گئی ہے جبکہ الیکٹرونک میڈیم کے مقابلے میں پرنٹ میڈیم کی زیادہ اہمیت ہے۔ چنانچہ کتابوں اور جرائد کی بقا کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

8۔ دورِ حاضر میں اردو ادب میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے جبکہ ادب کی ترقی کے لیے تنقید ضروری ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

بے سائبگی، یہ دھوپ، یہ چھالے، یہ تشنگی!
یہ ہے مرا نصیب، اُسے کٹنے کو سفر ہی رہے!!
آباد جعفری

آباد جعفری

نینی تال ہندوستان

کبھی دیکھا نہیں مگر سنا ہے ہندوستان کے مشرق میں ایک شہر ہے نینی تال جسے ہندوستان کا سوئٹزرلینڈ کہا جاتا ہے۔ جھیلوں سے سجا خوبصورت شہر۔ جانے اب بھی اتنا ہی خوبصورت ہے کہ وقت نے اس کے چہرے پر بدصورتی کے کھرونچے ڈال دیے ہیں۔

نینی تال میں آباد ہونے والے آباد جعفری گزشتہ تیس برس سے نینی تال میں اردو زبان وادب کے لیے سرگرم عمل ہیں مشاعرے کی سالانہ روایت کو زندہ و تابندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ہر سال 29 مئی کو مشاعرہ بھی ہوتا ہے اور سیمینار بھی۔ 99ء کے ادبی سیمینار اور مشاعرہ میں انہوں نے مجھے بھی مدعو کیا اور مجھے اپنی نظم 'پاسپورٹ' یاد آگئی جس میں میں نے کہا ہے۔

چند صفحوں کی یہ پتلی سی کتاب
جس میں تخلیقی ادب کا حرفِ اوّل بھی نہیں
کیمیا کا کوئی نسخہ
فلسفے کا کوئی نکتہ
رہنمائی کا کوئی گر

کوئی دیپک، کوئی مشعل بھی نہیں
اس کی قیمت پھر بھی ہے دیوانِ غالب سے فزوں
کاغذی تصویر ہے اور پاؤں کی زنجیر ہے
ہم۔ کہ ہیں زنجیر شکنی کی روایت کے امیں
کر رہے ہیں جبر کے قانون سازوں سے سوال
کس لیے انسان پہ یہ پابندیاں!
آدمی سے آدمی کا میل کیوں ممنوع ہے؟
کس لیے تہذیب سے تہذیب مل سکتی نہیں!
کاش دے سکتی ہمارے ان سوالوں کا جواب
چند صفحوں کی یہ چھوٹی سی کتاب

یہ پاسپورٹ پہلے بھی بہتری بار میرے قدموں کی زنجیر بنا ہے اور اب کے بھی میں امریکی پاسپورٹ کے حصول کے لیے منتظر تھی۔ بغیر اس کے میں اجازت ملے ہوئے علاقے کی حدود سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی تھی۔ کیا یہ واقعی ظلم نہیں؟

میں نے آباد جعفری کی کتابوں کے بارے میں پڑھا تھا۔ "وحیٔ اوّل" اور "سیرتِ ارشاد"۔ آباد نے بتایا وحیِ اول، قرآن کریم کی پہلی آیات مقدسہ کی تشریح اور وضاحت ہے اور اردو زبان میں اس موضوع پر پہلی جامع اور اپنے موضوع کے اعتبار سے منفرد کتاب ہے۔ آباد کہتے ہیں یہ کتاب مفت تقسیم کی گئی ہے تاکہ قرآنی مشن زندہ رہے۔ اس کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کی تیاری کر رہے ہیں اور اہلِ خیر حضرات سے معاونت کے خواہاں ہیں۔ کتاب میں معاونین کا نام بر فہرست شائع ہوتا ہے۔ آباد نے مجھے لکھا۔ "آپ کا ارسال کردہ سوالنامہ دیکھ کر چکر آگیا۔ بہر حال آپ ایک تعمیری کام میں اس قدر سرگرداں ہیں تو وقت نکالنا ہی پڑے گا۔" چنانچہ آباد نے وقت نکالا اور اپنے بارے میں بتایا کہ ان کا نام شاہ سید محمد آباد حسین جعفری ہے۔ یکم مارچ 1953ء کو بمقام قصبہ شیش گڑھ ضلع یوپی (ہندوستان) میں پیدا ہوئے سوشیالوجی میں ایم اے کے علاوہ ادیب کامل اور ایل ایل بی کی ڈگریاں لیں۔ درس و تدریس کو پیشے کے طور پر اختیار کیا اور صحافت کو مشغلہ کے طور پر اپنایا۔

آباد نے مزید بتایا کہ ان کے والد بزرگوار حضرت سید شاہ محمد ارشاد حسن جعفری اشرفی نظامی سہروردیؒ ماضی قریب کے انتہائی معروف بزرگ، صوفی اور جید عالم تھے۔ اُن کا وصال 23 ستمبر 1961ء کو ہوا۔ ان کے دستِ حق پرست پر ہزارہا بندگانِ خدا نے شرف بیعت حاصل کیا۔ آباد نے 7 برس کی عمر میں اپنے والد سے قرآن کریم بمع ترجمہ و تفسیر مکمل کیا۔ والدہ نے اردو پڑھائی۔ ان کی والدہ نے (جو بفضلہ تعالیٰ حیات ہیں) 1942ء میں ورناکیولر مڈل امتحان میں پورے ضلع میں اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ آباد نے فارسی میں آمدنامہ، حکایات لطیف ختم کر کے گلستان کا دیباچہ

شروع کیا تھا کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ والدہ نے سرکاری اسکول میں داخل کرادیا۔ مالی حالات بہت خراب ہوگئے تھے۔ جاگیر دادا کے زمانے میں ختم ہوچکی تھی اور زمینداری 1958ء میں حکومت نے ضبط کرلی تھی۔ اچانک زمینداری ختم ہونے سے خاندان پر تباہی آئی۔ والد کے مریدین نے خیال رکھا اور تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ انٹر میڈیٹ کرنے کے بعد تدریس کی پیشہ ورانہ تربیت حاصل کر کے انہوں نے نینی تال میں ملازمت کرلی۔ گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کمایوں یونیورسٹی سے کرنے کے بعد ادیب کامل کا امتحان پاس کیا۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے وکالت کی ڈگری حاصل کی مگر پیشہ نہیں بنایا۔ کیونکہ بحمد اللہ اسکول کی ملازمت جاری ہے۔

آباد کہتے ہیں مضمون نگاری اور شاعری انہوں نے ورثے میں پائی۔ شاعری میں اپنے چچا علامہ سید فرہاد حسین جعفری مدیر سوز و ساز، سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ شاعری میں اعتدال پسند ہیں۔ ان کا کلام اور مضامین مندرجہ ذیل رسائل و اخبارات کی زینت بنتا ہے۔

فلمی ستارے، شبستان ہدیٰ، شمع دہلی، کہکشاں اور شیبا (بمبئی)، دوشیزہ ڈائجسٹ (کراچی)، بابلی (پیلی بھیت)، سلگتی لکیریں (لکھنؤ)، تاجدار کائنات (رام پور)، ضیاء وجیہ (رام پور)، اور مختلف اخبارات علاوہ ہیں۔ دو کتابیں 'وحی اول' اور 'سیرت ارشاد' شائع ہوچکی ہیں۔ اردو، انگریزی اور ہندی میں غیر مطبوعہ کتابیں یہ ہیں: (الف) اوراق (مضامین کا مجموعہ)، (ب) آئینۂ طریقت (تصوف کے موضوع پر مدلل و مفصل کتاب)، (ج) سرحد کا سپوت (خان عبد الغفار خان کی حیات و خدمات پر مبنی۔ ہندی)، (د) دیوا استھلی (کماؤں کلچر، تاریخ اور تہذیب پر مبنی ہندی)، (ر) راجیو گاندھی کے سائنسی نظریات۔ ہندی)، (س) خانقاہِ ارشاد (خاندانی حالات و کوائف نیز علمی و ادبی خدمات پر مبنی)، (ش) آور پروفیٹ (رسول صلعم کی سیرت) انگریزی ا، ضخامت 90 صفحات

کہتے ہیں تصوف کے موضوع پر زیادہ دلچسپی ہے چونکہ کتب تصوف میں ادب کا کافی ذخیرہ موجود ہے اور اردو ادب کی بنیاد بھی اہل تصوف ہی کی نگارشات ہیں اس لیے اس موضوع پر جامع طور پر کام کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔

انہوں نے اپنی زندگی کے دو اہم اور یادگار واقعات درج کیے ہیں۔ کہتے ہیں۔

"سردار کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ہر سال پابندی سے دو ماہ کے لیے نینی تال تشریف لاتے تھے مجھے روزانہ ان کے ساتھ کئی گھنٹے گزارنے کا موقع ملتا تھا۔ اکثر اُن سے جنگِ آزادی کے عہد اور ادبی محفلوں کے واقعات اور ان کے تجربات کے موضوع پر گفتگو ہوتی تھی۔ 1978ء میں ایک روز میں نے اُن سے اپنی آپ بیتی لکھنے کی فرمائش کی۔ کئی روز تک یہ اصرار جاری رہا۔ ایک دن انہوں نے مجھے اپنے خصوصی سبز قلم سے تحریر شدہ چار اوراق مرحمت فرمائے اور کہا کہ تمہاری فرمائش پوری کررہا ہوں، مطالعہ کر کے رائے دو اور پھر یہ سلسلہ تکمیل کو پہنچا۔ اُن کی کتاب یادوں کا جشن کافی اہتمام سے شائع ہوئی۔ اس میں میرا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ جب انہوں نے مجھے خود یادوں کا جشن

مرحمت فرمائی تو کہنے لگے 'تم اس کتاب کے متحرک ہو مگر افسوس تمہارا ذکر کرنا بھول گیا، میں سخت نادم و شرمسار ہوں۔ مجھے معاف کر دینا، کنور صاحب بے حد وسیع النظر اور منکسر المزاج تھے، میں نے ان سے عرض کیا کہ میرا ایسا کوئی خیال نہیں ہے بلکہ میں نے جو چاہا تھا پالیا اور وہ یہ کہ آنے والی نسل تاریخ کے مختلف گوشوں سے اس کتاب کے ذریعے استفادہ کرتی رہے گی۔ کہنے لگے کہ آئندہ ایڈیشن میں اس پر تفصیل سے لکھوں گا مگر وہ آنجہانی ہو گئے۔ میرے لیے یہ واقعہ اس لیے اہم ہے کہ اگر میں اصرار نہ کرتا تو یہ تاریخی کتاب ہرگز منظرِ عام پر نہ آتی۔

اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے اور اسے اپنے تخلیقی وجود کو برقرار رکھنے میں سخت مقابلہ درپیش ہے مگر اس کے پرستاروں کی تعداد آج بھی کم نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک و بیرون ملک اردو میں زبردست کام جاری ہے۔ میں اردو کے مستقبل سے اس لیے پرامید ہوں کہ یہ زبان اپنی جائے پیدائش کی سرحدوں سے دور نکل کر اپنے لیے وسیع میدان بنا چکی ہے آپ کے تخلیقی کارنامے خود اس بات کا روشن ثبوت ہیں۔ ورنہ امریکہ میں رہ کر اردو کے لیے کام کرنا۔

'ایں سعادت بزورِ بازو نیست'

آباد شاعری میں نظم اور غزل دونوں کو موثر وسیلہ اظہار سمجھتے ہیں مگر نثری نظم اور نثری غزل سے دور ہیں مگر اس پر متفق ہیں کہ شاعری میں نئے تجربات غزل کی کلاسیکی روایات کو ہرگز متاثر نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ جب تک کائنات میں حسن و عشق کا عمل جاری رہے گا، غزل پورے شباب کے ساتھ زندہ رہے گی۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ مشاعروں کی روایات نے ادب کو زندگی بخشی ہے اور آئندہ بھی یہ روایت اس صنف کو زندہ رکھے گی البتہ تخلیقی نشستوں کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔

کہتے ہیں الیکٹرانک میڈیا سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب یہ ہوگا کہ ہم الیکٹرانک میڈیا سے فائدہ اُٹھائیں اس کے لیے راستے دشوار نہیں ہیں۔ اردو میں شعری مجموعوں کی بہ نسبت نثری ادب کی اشاعت کمزور ہو رہی ہے۔ اس فرق کو اعتدال پر لانا ہوگا۔

آباد کا خیال ہے کہ ترقی پسند تحریک نے نمایاں طور پر تخلیقی کارنامے انجام دیے ہیں۔ قطع نظر ممکن نہیں مگر بدقسمتی سے تنقید، ترقی پسند تحریک کی زلف گرہ گیر کا شکار ہو گئی۔ شعری اور نثری ادب کے غیر متوازن ہونے سے تنقید کا موضوع کمزور ہوا ہے۔

آباد نے افسانے بھی لکھے ہیں۔ افسانے کے فن سے واقف ہیں اور مختصر افسانہ لکھنے میں انہیں کمال حاصل ہے۔

ABAD JAFRI
Charlton Lodge
Nainital -263001 (INDIA)

سوچوں اگر تو فکرِ دو عالم بھی کم مجھے
لکھوں تو حرف حرف مرا کائنات ہے

- ابراہیم اشک
۲۸/۳/۹۹

ابرہیم اشک

بمبئی

آپ نے مجھ سے میرے بارے میں پوچھا ہے۔ میرا پورا نام ابراہیم خان غوری ہے اور تخلص اشکؔ۔ تقریباً 1951ء میں ملتان پورا ضلع مندسور مدھیہ پردیش میں پیدا ہوا لیکن ابتدائی تعلیم اور پرورش بڑنگر ضلع اوجین مدھیہ پردیش میں ہوئی قطعہ تاریخ خود کہا ہے ملاحظہ ہو :

۱۶۱۰	طلوع مہر ہوا لو غزل کی دنیا سے
۳۴۱	
۱۹۵۱ء	یہ راز عام ہوا، اشکؔ کی ولادت پر

میں تین دن کا تھا کہ پڑوس میں رہنے والے ایک عالم جو قرآن حافظ بھی تھے دیکھنے آئے۔ حافظ نے بچے کی ماں حسینہ سے کہا کہ وہ اپنے بچے کی پرورش میں تعلیم کا خیال رکھے کہ علم ہی انسان کی بلندی کا سبب بنتا ہے۔ حسینہ نے وہ بات گرہ میں باندھ لی اور بیٹے کی تعلیم کا پورا خیال رکھا اور یوں اُس غریب نے اپنے بیٹے کو عظیم بنانے کی غرض سے ایم۔اے کی منزل تک پہنچا دیا لیکن اقربا پروری اور رشوت کی عادی اس دنیا میں کوئی معمولی سرکاری ملازمت بھی غریب حسینہ کے بیٹے کو نہ مل پائی اس نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا اور بارہ برس تک اندور، دہلی (ادارۂ شمع اور سریتا) میں مصوری کے ذریعے صحافت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ 1981ء میں بمبئی کی فلمی دنیا میں کچھ کر

دکھانے کی غرض سے آیا اور اب تک گیت غزل کے کوئی چھ سو سے زیادہ ریکارڈ اور کیسٹوں کے لیے نغمے لکھے جو استاد غلام مصطفیٰ، آشا بھونسلے، جگجیت چترا، بھوپندر متالی، ہری ہرن، انورادھا پوڈوال، اوت نرائن، کمار سانو، کویتا کرشنا مورتی، محمد عزیز، طلعت عزیز، طلعت محمود، الکایاگنک، سریش واڈکر، سادھنا سرگم، راج کمار رضوی، جسوندر نرولا، لکی علی اور دیگر کئی نامور گلوکاروں نے گائے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر امریکہ، کناڈا، لندن، موری شس، اور عرب ممالک کی محفلوں میں گونج چکے ہیں اور وہاں کے ریڈیو ٹیلی وژن سے آئے دن نشر بھی ہوتے رہتے ہیں۔ 'جنون' اور دیگر ٹی وی سیریلوں کے لیے بھی گیت مکالمے اور منظر نامے لکھے۔ اسمٰعیل مرچنٹ کی پہلی اردو فلم 'محافظ' کے ڈائیلاگ ڈائریکٹر رہے۔ ان دنوں راکیش روشن کی فلم "کہونا پیار ہے" پارتھوگھوش کی "دل کے آس پاس" اور ننڈیاڈوالا کی "آفیسر" میں نغمے لکھ رہا ہوں۔

شاعری کے علاوہ ابراہیم اشک کی دلچسپی شروع ہی سے تنقید میں بھی رہی ہے۔ 1976ء میں فیض احمد فیض پر لکھے ان کے تنقیدی مضمون نے پہلی بار تمام ادیبوں اور ناقدوں کو چونکا دیا تھا۔ اس مضمون میں انہوں نے صاف طور پر لکھا تھا کہ فیض کی شاعری کا عروج 1955ء تک رہا اس کے بعد وہ اپنے آپ کو دہرانے لگے ہیں۔ عمر کے آخری دور میں جو شاعری فیض نے کی ہے وہ جیل میں کی گئی۔ شاعری سے قطعی بہتر نہیں ہے۔ پھر اقبال صدی کے دوران "ڈاکٹر اقبال کی شاعری میں ڈرامائی عناصر" لکھا جو 'شاعر'، ہماری زبان، اور اردو ادب، میں بیک وقت شائع ہوا۔ "اردو ادب" دہلی میں سات مخصوص مضامین شامل کیے گئے تھے اس میں ایک مضمون ابراہیم اشک کا بھی تھا۔ اس کے بعد "لفظیات اور عظمتِ شعر' (لندن، پاکستان) انسانیت اور شعریت" (علم و ادب) بھی لکھے۔ حال ہی میں مابعد جدیدیت کو رد کر کے معنویت کی اصطلاح کی تجویز شاعر 1998ء اگست میں پیش کی جس کا نئی نسل نے خیر مقدم کیا ہے اور اب یہ بحث ادب میں عام ہو چکی ہے جس کا ابراہیم اشک نے "رنگ و بو" حیدر آباد اور "آوازِ نو" بہار میں تفصیل سے خلاصہ کیا ہے۔ اسی درمیان ان کی تنقیدی کتاب اور غالب کے پچاس مخصوص اشعار کی شرح پر "انداز بیاں اور۔" جلد ہی منظر عام پر آ رہی ہے جس میں حالی، نیاز فتح پوری، حسرت موہانی، بیخود دہلوی، شمس الرحمٰن فاروقی کی لکھی ہوئی شرح کا خلاصہ کیا گیا ہے اور اپنے انداز سے شرح پیش کی گئی ہے۔

ابراہیم اشک کہتے ہیں۔ انہوں نے بیدل، حافظ، ولی، میر، غالب، اقبال اور تمام ترقی پسندوں اور جدید شعرا کو چھان پھٹک کر دیکھا ہے اور اپنا ایک منفرد اسلوب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی شاعری کے بارے میں اشک نے خود کہا ہے۔

جہاں ترقی پسند و جدید ٹھہر گئے
کہ اشک آگہی اپنی وہاں سے آگے ہے

اب تک ان کے تین شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ الہام، 1991ء، آگہی 1996ء،

گربلا 1998ء، ان شعری مجموعوں کے ذریعہ اشک کے تعلق سے کمال احمد صدیقی نے کہا۔

کم از کم زبان کے استعمال کے سلسلے میں انہوں نے کبیر، نانک، اور نظیر کی روایت کا اتباع کیا ہے اشک میں اچھی شاعری کی بڑی صلاحیتیں ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا کہنا ہے "درویشانہ طنطنہ ہے جو بڑا ہی بھلا معلوم دیتا ہے۔ بقول گوپی چند نارنگ آپ کے شعر میں بڑی جان ہے، رچاؤ بھی ہے، تازگی اور تیور بھی مجھے اپنا ایک ادنیٰ مداح جانئیں۔"

اشک نے بتایا "نئی نسل کے زیادہ تر ادیب و شعرا کا حال یہ ہے کہ ان کا مطالعہ گہرا نہیں ہے لیکن میں شروع ہی سے مطالعہ کرنے میں یقین رکھتا ہوں۔ ہندی ادب بھی پڑھتے ہیں اور ہندی ادب کے شعرا تلسی داس، کبیر، میرا، سورداس، رس خان، رحیم کے علاوہ دورِ حاضر کے ہندی ادب پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ افسانہ نگاروں میں ٹالسٹائے، دوستوفسکی، منٹو، بیدی، پریم چند، قرۃ العین حیدر اشک کے پسندیدہ قلم کار ہیں۔ جبکہ ناقدوں میں اختلاف کے باوجود شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ اور وارث علوی کی تنقید دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔

اپنی زندگی کے اہم دلچسپ واقعات سناتے ہوئے انہوں نے کہا:

"میری زندگی رنگارنگ اور فنکارانہ واقعات سے بھری پڑی ہے، کہنے لگے جس زمانے میں میں "رندور سماچار" میں ایڈیٹر تھا۔ میں ترنم سے پڑھتا تھا۔ کچھ کامیاب مشاعرے پڑھنے کے بعد میرے تعلق سے اندور کے شعرا میں یہ بات گشت کرنے لگی کہ مجھے قیصر اندوری شعر کہہ کر دیتے ہیں جو وہاں کے استاد شاعر تھے نور اندوری اور راحت اندوری انہیں کے شاگرد ہیں۔ میں نے ان کی شاگردی قبول نہیں کی لیکن استاد سے دوستی برقرار رکھی اور اسی دن سے مشاعرے میں ترنم سے پڑھنا بند کر دیا اور غزل کے بجائے آزاد نظمیں کہنے لگا کیونکہ قیصر صاحب آزاد نظم نہیں کہتے تھے وہ روایتی شاعر تھے۔ اس دن کے بعد سے اب تک میں تحت ہی میں پڑھتا ہوں لیکن میرا تحت میں پڑھنا ترنم باز شعرا پر بھاری پڑتا ہے۔

غالب اکیڈمی میں فیض احمد فیض سے ملاقات ہوئی فیض کی شاعری پر اس سے پہلے ہی مضمون لکھ چکا تھا۔ اس بار جب انہیں شعر پڑھتے سنا تو اور بھی مایوسی ہوئی۔ انہی دنوں میں نے فیض کی غزل سے متاثر ہو کر ایک غزل کہی جو ممبئی کے انقلاب میں شائع ہوئی اس میں بارہ شعر تھے۔ چند ملاحظہ ہوں:

بس ایک ان کی تمنا کے بعد کچھ بھی نہیں
ذرا سی بات پہ ہم زندگی گزار چلے
ہمیں پہ ختم ہو فسانہ ہائے جان وفا
ہمارے نام ہی سے ذکر یار و دار چلے

میں نے کئی جگہ یہ غزل پڑھی اور خوب داد حاصل کی۔ اسی دوران پاکستان میں بھٹو صاحب کو

پھانسی دے دی گئی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک دن کی ایک نمائش لگی جہاں اس غزل کا مطلع نمایاں طور پر لکھا ہوا تھا اور جناب بھٹو کی کئی تصویریں شعر کے آس پاس لگائی گئی تھیں۔

اردو کے مستقبل کے تعلق سے ابراہیم اشک نے کبھی مایوسی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ نہیں مانتے کہ اردو کبھی سرے سے ختم ہو جائے گی دراصل یہ زبان ایک تہذیب سے جڑی ہوئی ہے اور دنیا کی تہذیبیں مٹتی نہیں پروان چڑھتی ہیں۔ اب تو یہ زبان دیگر زبانوں کو اپنی آغوش میں سمیٹ رہی ہے ہندوستان میں ہندی اردو ہی کا دوسرا نام ہو گیا ہے۔ ہندی اخباروں، ٹی وی سیریلوں اور فلموں میں اردو ہندی پر حاوی ہو گئی ہے اور پچاس فی صد سے بھی زیادہ ہندی میں اردو کی ملاوٹ ہو گئی ہے۔ یہی حال پنجابی اور سندھی کا بھی ہوا ہو گا۔ آج مراٹھی میں غزل لکھی جا رہی ہے، گجراتی میں غزل لکھی جا رہی ہے اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اردو کا دائرہ سمٹنے کے بجائے اور زیادہ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ ایک ذمہ داری ہم اردو والوں کی یہ بنتی ہے کہ بچوں کو بنیادی طور پر ہم اردو سکھائیں اور انہیں اردو کا Reader ضرور ہی بنا دیں۔

شاعری میں ہمارے یہاں جو بھی صنف ہے مثلاً غزل، رباعی، مرثیہ، قصیدہ، مثنوی، آزاد نظم، پابند نظم اگر سنجیدگی سے کسی میں بھی کام کیا جائے تو اعلیٰ ادب کی تخلیق ممکن ہے اشک نے غزل بھی کہی ہے، نظم بھی کہی ہے، مرثیہ، سلام، دوہا، رباعی ہر میدان میں سنجیدگی سے اعتبار کے قابل کام انجام دیا ہے۔ کہتے ہیں۔

مرثیہ ہو کہ غزل، نظم، رباعی، دوہا
کس نے ہر صنف کو اے اشک یہ عظمت دی ہے

غزل نہ ختم ہوئی اشک میر و غالب پر
ہم آئے ہم نے بھی ندرت کی منزلیں دے دیں

کیوں ہو نہ میرے شعر میں معنیِ بر نگِ فکر
اے اشک میر و غالب و بیدل شناس ہوں

اشک کا کہنا ہے نثری نظم، ہائیکو، اور اسی قبیل کی تمام اصناف سخن جو فیشن کی طرح اردو میں رواج پا گئی ہیں جلد ہی ان سے قارئین اور خود لکھنے والے اوب جائیں گے کہ یہ سب وقت برباد کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں جو مزہ ایک شعر، رباعی یا دوہا پڑھ کر آتا ہے وہ ان میں سے کسی ایک صنف کو پڑھ کر بھی نہیں آتا۔ یہ موسمی ہوائیں ہیں جو تیزی سے آ کر گزر جاتی ہیں۔

جہاں تک مشاعروں کے بارے میں سوال ہے تو ابراہیم اشک کی رائے یہ ہے کہ مشاعرے عام نہیں خاص نوعیت کے ہونا چاہیے۔ ان میں مشاعرہ باز میراثی اور بھانڈ شاعروں کو نہ بلایا جائے بلکہ ان کو بلایا جائے جو سنجیدگی سے ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ ہندو پاک میں ایسے بے شمار شعرا موجود ہیں جن کی شاعری میں ایک نئی چمک ہے، فکر ہے، معنی ہے اور وہ سب کچھ ہے جس سے اعلیٰ ادب

کی تخلیق ہو سکتی ہے۔

آخری سوال کے جواب میں انہوں نے کہا: تنقیدی شعور ہر دور میں یکساں نہیں ہوتا ادھر گزشتہ تیس برسوں سے ہمارے بڑے ناقدوں نے نئی نسل کو نہ جانے کس مصلحت کے تحت گمراہ کیے رکھا ساختیات پس ساختیات تشکیل، ردِ تشکیل، مابعد جدیدیت کی بے معنی بحثوں میں نئی نسل کو ایسا الجھائے رکھا کہ اس کا تنقیدی شعور مجروح ہو کر رہ گیا اب ادب میں جبکہ ان تمام بے معنی بحثوں کو رد کرتے ہوئے نئی نسل کے لیے معنویت کی اصطلاح پیش کی گئی ہے تو ہوش مند اور باشعور نئی نسل کے قلم کاروں نے اس اصطلاح کا خیر مقدم کیا ہے ابھی کچھ بحثیں درکار ہیں لیکن اب بادل چھٹنے میں دیر نہیں۔

IBRAHIM ASHK
402, HILL WIEW APT, RASHID COMPOUND
KAUSA. MUMBRA DIST THANE 400612 (M.S.) INDIA

حرف

حرف وہ حرف کہ پتھر پہ اگر میں لکھوں
ایک تاریخ بنے ایک حوالہ بن جائے
نقش ہو جائے زمین پر تو شوالہ بن جائے
حرف وہ حرف کہ جس دل پہ رقم ہو جائے
دل وہی عرش بنے عظمتِ انسان بنے
کوئی انجیل کوئی وید کہ قرآن بنے
حرف وہ حرف کہ تحریر ہو جس کاغذ پر
نسلِ انساں کے لیے نورِ حقیقت بن جائے
ایک ایمان بنے حرف عقیدت بن جائے
حرف وہ حرف کہ جو لب سے ادا ہو جائے
جو سنے اُس کو محبت کا نشہ ہو جائے
زندگی اس کے لیے رسمِ وفا ہو جائے
جستجو ہے کہ میں وہ حرف کہاں سے لاؤں!

نہ جانے جستجو کس کی ہے مجھ کو
سفر اندر سفر ہے اور میں ہوں
محمد علی اثر
۱۸ / جنوری ۱۹۹۹ء

ڈاکٹر محمد علی اثر

حیدر آباد دکن

ڈاکٹر محمد علی اثر کو ایک مصرعہ طرح ملا "کھلی ہوئی ہے غموں کی کتاب آنکھوں میں" ڈاکٹر صاحب نے گرہ لگائی۔

ہر ایک اشک ہے دیباچہ تیری یادوں کا
"کھلی ہوئی ہے غموں کی کتاب آنکھوں میں"

اور محفل میں واہ واہ کے نعرے اور تکرار ارشاد کی گونج نے محفل گرما دی۔ پھر تو ان کی غزل کا ہر شعر حاصل غزل بنتا چلا گیا۔ ملاحظہ ہو۔

کتاب عشق کا عنوان مٹ گیا لیکن
لکھا ہوا ہے ابھی انتساب آنکھوں میں

چہار سمت ہیں ابیاتِ زندگی روشن
بسا ہے جب سے کوئی خوش نصاب آنکھوں میں

کہیں ببول، کہیں پر گلاب کی صورت
ہیں دھوپ چھاؤں کی مانند خواب آنکھوں میں

مصطفیٰ مجاز ان کے بارے میں لکھتے ہیں :

"تخلیق اور تحقیق میدان ادب کی دو ایسی مختلف اور متوازی راہیں ہیں جو کم کم ہی ملتی ہیں یوں تو کہنے کو کچھ محققین نے بھی شعر ضرور کہے ہیں مگر بہر حال اثر صاحب کی بات یقیناً بہت مختلف ہے۔ وہ جتنے اچھے محقق ہیں اتنے ہی اچھے شاعر بھی ہیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ دونوں صلاحیتیں ان کی ذات میں مجتمع ہو کر ایک دوسرے کی ممد و معاون ثابت ہوئی ہیں۔

انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے اردو میں پوسٹ گریجویشن بہ درجہ امتیاز پاس کیا اور دو گولڈ میڈل حاصل کیے۔ دکنیات سے ان کی دلچسپی طالب علمی کے زمانے ہی سے رہی ہے۔ انہوں نے ڈاکٹریٹ بھی "دکنی غزل" ہی پر کیا اور اپنی مادرِ جامعہ ہی سے وابستہ ہو گئے اگرچہ ہڈیوں کے ایک مرض کی وجہ سے انہیں چلنے پھرنے سے معذوری ہو گئی لیکن ان کا قلم بڑی تیز رفتاری سے کام کر رہا ہے۔ جس کا اندازہ ان کی اب تک شائع شدہ 20 کتابوں سے کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنی محققانہ صلاحیتوں کا لوہا بڑے بڑے جغادریان ادب سے منوایا ہے جن میں پروفیسر گیان چند، ڈاکٹر جمیل جالبی اور خواجہ احمد فاروقی جیسے فاضلان ادب شامل ہیں۔ انہیں کئی ایوارڈز مل چکے ہیں جن میں آل انڈیا میر ایوارڈ اور امریکن بیاگرفیکل انسٹی ٹیوٹ کا انٹرنیشنل ایوارڈ بھی شامل ہے۔ مختلف زبانوں کے نامور مصنفین کی ڈائرکٹری اور "ریفرنس ایشیاء" میں بھی ان کا تعارف اور فہرستِ تصانیف شامل کی گئی ہے۔ کم عمری میں ہی ان کا شمار دکنیات کے صفِ اول کے ماہرین اور محققین میں ہونے لگا۔ میدان تحقیق میں ان سے رہنمائی اور استفادہ کرنے والوں میں قومی اور بین قومی سطح کے ریسرچ اسکالرز شامل ہیں جن میں پاکستان، ایران، جاپان، انگلستان اور کینیڈا کے ریسرچ اسکالرز خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ وہ کچھ جامعات کے بورڈ آف اسٹڈیز کے ممبر بھی ہیں اور پی ایچ ڈی کے ممتحن بھی، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود ان کی مادرِ جامعہ نے ان کی صلاحیتوں سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کیا، یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ دکنیات میں ڈاکٹر زور کے بعد ڈاکٹر اثر نے قابل لحاظ کام کیا ہے۔ اتنی ساری تحقیقی مصروفیات کے باوجود انہوں نے اپنے تخلیقی سوتوں کو خشک ہونے نہیں دیا۔ اب تک ان کے دو مجموعے "ملاقات" (1980) اور "حرف نم دیدہ" (1990) شائع ہو چکے ہیں وہ بڑے خوش فکر اور خوش گو شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں قدیم اور جدید کی بڑی خوب صورت Blending نظر آتی ہے۔ اتنے سارے کلاسیکی شاعری کے وسیع مطالعے کے باوجود وہ جدید طرزِ اظہار سے بھی نہ صرف آشنائی رکھتے ہیں بلکہ تازہ کار استعاروں اور علامتوں کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ ابھی ان کے سامنے بہت بڑا میدان پڑا ہے تحقیق اور تخلیق دونوں میں ان سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔"

نام ان کا محمد علی، تخلص اثر ہے۔ 22 دسمبر 1949ء کو حیدر آباد (دکن) میں پیدا ہوئے۔ والد

شیخ محبوب صاحب مرحوم حکیم تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم حیدر آباد ہی کے مدارس "مدرسہ تحتانیہ شاہ گنج" مدرسۂ وسطانیہ وفخر فوقانیہ اردو شریف میں ہوئی۔ انوار العلوم کالج (حیدر آباد) سے پی۔ یو۔ سی اور بی۔ اے، کے امتحانات کامیاب کیے۔ عثمانیہ یونی ورسٹی سے 1974ء میں ایم۔ اے (اردو) کا امتحان درجہ اوّل سے امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا اور یونیورسٹی میں سب سے زیادہ نشانات حاصل کرنے کی وجہ سے دو طلائی تمغوں سے نوازے گئے۔ اسی یونی ورسٹی میں "دکنی غزل کی نشوونما" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ داخل کر کے 1980ء میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1984ء میں مخطوطہ شناسی کا پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما حاصل کیا۔ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو میں 1975ء سے جز وقتی اور 1980ء سے ہمہ وقتی لکچرر کی حیثیت سے کارگزار ہیں۔ 1987ء میں ریڈر کے عہدہ پر انتخاب عمل میں آیا اور تاحال اسی عہدہ پر کارگزار ہیں۔ مختلف موضوعات پر اب تک بیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں۔

1۔ غواصی، شخصیت اور فن 2۔ شمع جلتی رہے 3۔ دبستانِ گولکنڈہ۔ ادب اور کلچر
4۔ تذکرۂ اردو مخطوطات (جلد ششم) 5۔ دکنی اور دکنیات (مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد)
6۔ دکنی غزل کی نشوونما 7۔ دکنی شاعری تحقیق و تنقید 8۔ تحقیقی نقوش 9۔ نوادرات تحقیق
10۔ بنام علیم صبانویدی 11۔ جنوب کا شعر و ادب 12۔ خامہ در خامہ

اوّل الذکر نو کتابوں کو آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کے علاوہ اتر پردیش، بہار اور مغربی بنگال اردو اکیڈمی کے جانب سے ادبی انعام اور سند توصیف عطا کی گئی اور آل انڈیا میر اکیڈمی لکھنو کی جانب سے انہیں امتیاز میر" ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا۔ مزید یہ کہ امریکن بائیوگرافیکل انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے انٹر نیشنل Man of the year ایوارڈ سے انہیں نوازا گیا۔

شاعری کے علاوہ ان کی وابستگی تحقیق و تنقید سے ہے۔ ان کی شاعری میں جدیدیت سے اثر پذیری کا رجحان نمایاں ہے۔ غزلیں اور نظمیں ہندوپاک کے مختلف ادبی رسائل و جرائد میں چھپتی رہتی ہیں۔ چند رسائل کے نام یہ ہیں۔ "سب رس" (حیدر آباد دکن) سب رس (کراچی)، شاعر، قومی آواز، قومی زبان (حیدر آباد)، آندھرا پردیش شعر و حکمت، سہیل، ارتکاز، بادبان، شمس و قمر، ماہ نو، صدف، ترسیل وغیرہ۔

ڈاکٹر اثر کہتے ہیں "شعری مجموعوں کے علاوہ میں تحقیق و تنقید اور خصوصی طور پر دکنی ادب کا مطالعہ دلچسپی سے کرتا ہوں۔"

انہوں نے بتایا۔ "میری زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹریٹ کی تکمیل کے دوران جب کہ میں نے ابھی ملازمت اختیار نہیں کی تھی، اہل خاندان کے اصرار پر مجھے شادی کے لیے حامی بھرنی پڑی تھی اس سلسلے میں خاندان میں لڑکی کی تلاش کی گئی اور اخبار میں بھی اشتہار دیا گیا جس کے نتیجے میں متعدد رشتے آئے لیکن حسنِ اتفاق سے ایک ایسی لڑکی مجھ سے رشتہ ازدواج میں

منسلک ہو گئی جو ایم۔اے کی تعلیم کے دوران ہم جماعت کی حیثیت سے مجھ سے آشنا اور متاثر تھی۔
یقیناً اردو زبان، دنیا کی سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبانوں میں تیسرے نمبر پر ہے۔
میں اس زبان کے مستقبل سے پوری طرح مطمئن ہوں۔
میں شاعری میں 'غزل' کو سب سے بہتر اور سب سے موثر ذریعہ اظہار سمجھتا ہوں اور اسی کو اردو کی سب سے مقبول صنفِ سخن بھی تصور کرتا ہوں۔

کل بھی سرِ تاج تھی شاعری کی یہی
آبروئے سخن آج بھی ہے غزل

شاعری میں ہر طرح کے تجربوں کا قائل ہوں۔ نئے تجربوں کو خوش آمدید کہا جانا چاہئے۔ اس سے نہ صرف شاعری میں ایک نئی توانائی اور تازگی پیدا ہو گی بلکہ اصنافِ شعر کا دائرہ بھی وسیع ہو گا۔ نثری نظم کے بڑے دل کش اور پر اثر نمونے ہمارے سامنے آرہے ہیں لیکن نثری غزل کی شناخت ابھی پیدا نہیں ہو سکی۔

DR. MD. ALI ASAR
20-4- 226/9 CHOWK
HYDERABAD 500002

راستے تاریک اور لمبے سہی
ہیں نمایاں نقشِ پا دھندلے سہی
اور کی خوشیاں کریں کیوں زیبِ تن
خواب اپنے ہی تو ہیں میلے سہی
بات میری بھی مگر جھوٹی نہیں
آپ کے احکام سب سچے سہی
دیکھنے والا کوئی تو ہو یہاں
آپ ہی کے ہر طرف جلوے سہی
منزلیں خود چل کے آئیں گی یہاں
منزلوں سے ہم بہت پیچھے سہی
اپنے ہاتھوں سے فلک کب دور ہے
قد ہمارے اے اثرؔ چھوٹے سہی

اُس دیے کی طرح ہم بھی ہیں کہ جو
دوسروں کو روشنی دے، خود جلے

احسان سہگل

ہالینڈ

عالمی اردو کانفرنس کے بانی و صدر جناب علی صدیقی کا ایک مضمون میں نے پڑھا تھا جس میں لکھا تھا کہ "آج یورپ اور امریکہ کے علاوہ آسٹریلیا تک سے شائع ہونے والے اردو جرائد کی اشاعت جنوبی ایشیا سے مغرب کی جانب بڑی سے بڑی 'ہجرت' کے سبب سے ہے اور یوں لگتا ہے کہ یہ سلسلہ آج کے بر صغیری نژاد بچوں کے سنِ بلوغت تک پہنچنے اور پچاس و ساٹھ کی دہائی کے پہلی نسل کے تارکین وطن کی زندگی تک ہے۔ اس کے بعد وہی ہوگا جو طاقتور تہذیب کا اژدھا کرتا چلا جارہا ہے۔ یعنی بر صغیری نژاد بچوں کے سنِ بلوغت تک پہنچنے اور پچاس و ساٹھ کی دہائی کے پہلی نسل کے تارکینِ وطن کی زندگی تک ہے۔ اس کے بعد وہی ہوگا جو طاقتور تہذیب کا اژدحام کرتا چلا جارہا ہے یعنی بر صغیری برادریوں کی جانب سے تہذیبی تشخص کی جنگ کے اختتام پر مکمل انجذاب کے دور میں داخل ہوتے ہی اردو جرائد اور معاشرے اور سیمینار ختم ہو جائیں گے اور یہ کوئی نئی بات بھی نہیں۔ دنیا بھر کے تارکین وطن کی کہانی ایک سی ہے۔ شروع کی دو تین نسلوں تک اپنے لسانی و تہذیبی تشخص کو بر قرار رکھنے کے لیے بے پناہ جدو جہد جاری رہتی ہے اور پھر بالآخر آہستہ آہستہ میزبان سماجوں میں انجذاب و ادغام کا غیر مرئی منطقی دور آپہنچتا ہے اور تیسری نسل پہلی دو نسلوں کی

پہلی زبان کو مادری زبان کے طور پر اپنا لیتی ہے۔"

ہالینڈ میں رہنے والے احسان سہگل بھی ان خیالات سے متفق ہیں مگر اس خیال میں اضافہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "اس وقت یورپ اور امریکہ کے اہلِ نقد و نظر اردو زبان و ادب کی بقاء کی جس جدوجہد میں مصروف ہیں اس جدوجہد کو موثر بنانے کے لیے ہم سب کو اپنی اپنی جگہ یہ کردار ادا کرنا ہوگا کہ اردو کو یہاں اسکولوں میں ایک اختیاری زبان کے طور پر رائج کرائیں اور ان کا عمل دخل اتنا زیادہ بنادیں کہ یہ روزگار کے حصول یں بھی معاون ثابت ہو۔"

احسان سہگل لاڑکانہ سندھ پاکستان کے رہنے والے ہیں۔ 15 نومبر 1951ء کو لاڑکانہ میں پیدا ہوئے۔ پورا نام خواجہ احسان سہگل ہے۔ اردو میں ایم۔اے کیا اور قانون کی ڈگری لینے کے لیے ایل ایل بی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ ابتدائی طور پر چند پرائیویٹ کمپنیوں میں کام کیا۔ 1970ء سے صحافت سے منسلک ہوئے اور کراچی کے روزنامہ 'آغاز' سے بحیثیت نگراں میگزین اور صفحاتِ طلبہ منسلک رہے۔ پندرہ روزہ تمثیل کراچی سے بھی بحیثیت ایڈیٹر وابستہ رہے۔ اس وقت وہ "مسلم اقوام متحدہ" کے بانی و چیئر پرسن کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔

احسان سہگل کو شاعری کے علاوہ علم عروض اور علم بیان و بدیع سے بھی وابستگی ہے۔ کسی حد تک اقبال اور غالب کے مکتبہ فکر سے بھی ہم آہنگی ہے۔ ہر چند کہ ان کا اپنا الگ اسلوب بھی ہے۔ ایک ناول "خوشی بعدِ غم" اور تین مجموعہ کلام پروازِ تخیل انداز تخیل اور سازِ تخیل شائع ہو چکے ہیں۔ اسی کے ساتھ مضامین اور اقوال میں ایک نثری کتاب "شعور کا شعار" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔

احسان سہگل کو اپنی زندگی کا یہ واقعہ بھلائے نہیں بھولتا۔ کہتے ہیں "یہ 18 جنوری 1993ء کی بات ہے کہ میں حکومت عراق کی دعوت پر اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لیے بغداد کے ہوٹل الرشید میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں اور ایک میرا ساتھی مختلف موضوعات پر بات کررہے تھے کہ کسی بات پر مجھے غصہ آگیا اور میں ساتھی سے ناراض ہوگیا۔ ساتھی میرا رویہ دیکھ کر اوپر ہوٹل کے کمرے میں چلا گیا اور میں ڈائننگ ہال کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جنگ کے الارم بجنے لگے اور ایک زبردست دھماکا ہوا۔ یوں لگا جیسے سارا الرشید ہوٹل منہدم ہوگیا ہے۔ یہ امریکہ کا ایک میزائل راکٹ تھا جو عین اس جگہ گرا جہاں چند منٹ قبل میں اور میرا ساتھی بیٹھے ہوئے ایک دوسرے سے ناراض ہوگئے تھے۔ اگر ہم ناراض نہ ہوتے تو اسی جگہ بیٹھے رہتے لیکن قدرت کو ابھی ہمیں زندہ رکھنا تھا کہ ہم خواہ مخواہ آپس میں ناراض ہوکر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس حادثے میں کئی رہنما زخمی اور استقبالیہ کی دو معصوم لڑکیاں شہید ہوگئیں۔"

احسان سہگل بنیادی طور پر اپنے اظہار خیال کے لیے غزل کو زیادہ پسند کرتے ہیں ہر چند کہ انہوں نے نظمیں قطعات، رباعیات اور آزاد و نثری نظمیں بھی تحریر کی ہیں۔ کسی بھی تجربے کی

مخالفت نہیں کرتے کیونکہ نثری نظمیں یا غزلیں بھی اگر با معنی ہیں تو یہ بھی اردو ادب کی خدمت ہے لیکن ان تجربات کے باوجود علم وفن کے تمام شعبوں سے واقفیت بے حد ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں آج کے دور میں مشاعرے اور تخلیقی نشستیں اپنی اپنی جگہ پر تخلیقی کاموں کے لیے بہتر ثابت ہو سکتی ہیں۔ دونوں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

کہتے ہیں "میں اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا کہ الیکٹرونک میڈیا کی وجہ سے کتابوں کے مطالعہ میں کمی ہوئی ہے یا اس سے کتابوں کی اشاعت کم ہو گئی ہے بلکہ آج کل تو کتابوں کی اشاعت بڑھ گئی ہے۔ کتابوں اور جرائد کی بقا کے لیے جہاں اور بہت سی دوسری باتیں ضروری ہیں وہاں پبلشر کو اس سلسلے میں نہ صرف مخلص ہونا پڑے گا بلکہ ایمان دار بھی۔

تنقید کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ واقعی اردو ادب میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے جبکہ تنقید کے بغیر کسی چیز کی اچھائی اور برائی کا علم نہیں ہو سکتا۔ یہ تنقید ہی ہے جس کے ذریعے ہمیں نہ صرف شعور آگہی حاصل ہوتا ہے بلکہ درست راہوں کا تعین بھی ہوتا ہے۔"

EHSAN SEHGAL
VONDE ISTRAAT 5 2513 EN THE HAGUE HOLLAND

یہ دار ہے مرے لیے، میں دار کے لیے
رکھ دی ہے زندگی ساری ایثار کے لیے
انکار کردیا تونے ہر ایک بات کا
کچھ بھی نہیں رہا ہے اب اظہار کے لیے
میرے دل و دماغ میں روشن ہے جس کا نام
ہے وقف یہ حیات اُسی یار کے لیے
تو آجا چھوڑ کر یہ گلے شکوے میرے دوست
بے تاب ہو گیا ہوں ترے پیار کے لیے
اپنے لیے تو لکھ لے رقیبوں کی گالیاں
پیغام دوستی رہے سنسار کے لیے
انصاف ہونے تک بیٹھ سکتا نہیں خموش
تجھ سے مری تو جنگ ہے حق دار کے لیے
تاریخ نے بتایا ہے سہگل یہی ہمیں
سچائی ہے ضروری قلم کار کے لیے

اپنی وفا کا کوئی دریچہ کھُلا تو دکھ

اِنسان ہوں گھُٹن ہے ہَوا چاہیے مجھے

ارشد اقبال آرش

۱۵.۵.۹۹۹

ارشد اقبال آرش

اٹلی

پندرہ روزہ "ہم سخن" کراچی پاکستان کے فروری 99 کے شمارے میں "سخن ور چہارم اور گفتنی" کی اشاعت کی خبر چھپی تو مجھے اٹلی سے ایک خط ملا۔ ساتھ میں تعارفی خاکہ، ماہیے غزلیں اور دو تصویریں۔

یہ ارشد اقبال آرش تھے۔ ان کی غزل سے یہ اشعار دل کو لگے۔

جانتے ہیں یہاں انصاف کا امکان نہیں
لوگ سادہ ہیں کہ زنجیر ہلا دیتے ہیں
آرش آتا نہیں جب ان سے نہ ملنے کا خیال
ہم رہِ شوق میں دیوار اُٹھا دیتے ہیں

ان کے کہے ماہیے بھی جا بجا ان کی گہری اور خوبصورت فکر کے مظہر ہیں۔

آرش اقبال کو جہاں لکھنے کا فن آتا ہے وہاں بولنے پر بھی ملکہ حاصل ہے۔ بڑی میٹھی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ کہیں پروفیسر ہوتے تو علم کا دریا روانی سے بہتا۔ اپنے بارے میں کہتے ہیں:

میرا پورا نام ملک ارشد اقبال بھٹہ، تخلص آرِش، تاریخ و جائے پیدائش 4 جون، ملتان (پاکستان)

اور تعلیمی قابلیت گریجویشن ہے۔

ملتان کی ایک قدیمی، معتبر اور بڑی "بُھٹہ" برادری سے تعلق ہے جس کے بہت سارے لوگ زندگی کے مختلف شعبوں میں ملک و قوم کی خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔ میرے والد حاجی ملک حسین احمد بُھٹہ اپنی انکساری، خوش اخلاقی اور ہمدرد و سادہ طبیعت کے باعث برادری کے علاوہ علاقے بھر کے لوگوں میں ایک خاص مقام اور عزت رکھتے ہیں۔ ہم دوماؤں سے کل پندرہ بہن بھائی (سات بھائی آٹھ بہنیں) ہیں۔ تمام بھائی تجارت سے وابستہ ہیں جبکہ تمام بہنیں (ایک کے علاوہ جو ایم کام کی طالبہ ہے) شادیوں کے بعد گھریلو زندگیاں گزار رہی ہیں۔ دونوں مائیں ایک ساتھ محبت اور پیار کے ساتھ رہتی ہیں اور تمام بھائی بھی ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ اپنے گھر سے میں ہی واحد آدمی ملک سے باہر ہوں۔ پاکستان میں، میں نے ایک صابن ساز ادارے کے لیے کئی سال تک بطور سیلز مین اور ڈرائیور کام کیا ہے۔ اٹلی آکر میں نے یہاں ایک "کمرشیل ایجنٹ" کا کورس کیا اور چند سال اسی حیثیت سے کام کیا۔ "کمرشیل ایجنٹ" کا کورس کرنے والا اٹلی بھر میں، میں پہلا اور تاحال واحد پاکستانی ہوں۔

فنونِ لطیفہ سے متعلق شاعری اور فنِ اداکاری کے شعبوں میں برادری کی نمائندگی کا اعزاز مجھے حاصل ہے۔ صاحبِ دیوان ہونے کے ساتھ ساتھ پاکستان ٹیلی ویژن لاہور سینٹر کی پیشکش سرائیکی ر پنجابی مشترکہ سیریل "چیتر" میں ایم این اے کا ایک انتہائی اہم کردار کامیابی سے ادا کر کے داد و تحسین پا چکا ہوں۔ اس سیریل کے مصنف اصغر ندیم سید تھے۔

میں اردو، سرائیکی ہر دو زبانوں میں غزل، نظم، گیت، ماہیا کہنے کے علاوہ ناول نگاری و کہانی نویسی بھی کرتا ہوں۔ میرا ایک ناول "رنگین چاک" زیر طباعت ہے اور یہ انشاء اللہ جلد ہی شائع ہو گا۔ شاعری میں میرا بالکل اپنا ایک الگ انداز ہے اور میں کسی مکتبہ فکر سے متاثر نہیں ہوں اور نہ ہی کسی گروہ بندی کا حصہ ہوں کیونکہ میری نظر میں گروہ بندی ادب کے لیے نقصان دہ ہے۔ البتہ میری فکر، معاشرتی ناہمواریوں اور ناانصافیوں کے لیے جدو جہد میں مصروف ہے۔

پاکستان کے تقریباً تمام چھوٹے بڑے اخبارات کے علاوہ کئی دیگر جرائد میں میرا کلام شائع ہوتا ہے۔

میرا ایک مجموعہ کلام "ساحلوں پر محبتیں" اکتوبر 97ء میں شائع ہوا اور میری توقعات سے زیادہ اسے پذیرائی ملی جس کا ثبوت اتنے کم عرصے میں اس کا دوسرا ایڈیشن ہے جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

اردو شاعری کے دوسرے دو مجموعے "جھیل میں ماہتاب" (غزلیں) "کنگن تجھے بلاتے ہیں" (گیت) کے علاوہ ایک سرائیکی مجموعہ "بے فکرے موسم" بھی زیرِ ترتیب ہیں۔

میں ادبی کتابوں کے علاوہ مذہبی اور سیاسی کتابوں کا مطالعہ بغور کرتا ہوں اور کئی ایک اہم کتابیں

میری چھوٹی سی لائبریری کا حصہ ہیں۔

اردو ایک پُر تاثیر اور پُر تکلف زبان ہے اور اس میں بے تکلفی کی بجائے رکھ رکھاؤ بہت زیادہ ہے۔ اردو زبان کا مستقبل یقیناً روشن ہے مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ اسے اپنی زندگی کا حصہ بنایا جائے قومی کے ساتھ ساتھ سرکاری زبان کا درجہ بھی دیا جائے۔

شاعری میں اظہارِ خیال میں شگفتگی اور مطلب خیزی کے لیے میں غزل کو بہترین صنف خیال کرتا ہوں۔ کچھ عرصے سے میں اردو ماہیا نگاری کی طرف مائل ہوا ہوں یہ بھی ایک دلچسپ اور پُر اثر صنفِ سخن ہے اور اس پر بھی کافی کام ہو رہا ہے جرمنی میں مقیم پاکستانی شاعر حیدر قریشی اور انڈیا کے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کافی جدوجہد کر رہے ہیں۔

تحقیق اور نئے تجربات ترقی کی شاہراہ پر منزل کی سمت کامیابی سے دوڑنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں جب نئے تجربات اور تحقیق کے باب بند ہو جائیں، ترقی رُک جاتی ہے اور خیالات میں وسعت و نکھار ناپید ہو جاتا ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ نثری نظم اور نثری غزل کے علاوہ باقی اصنافِ سخن پر بھی سیر حاصل گفتگو اور تجربات ہونے چاہئیں تا کہ نئے امکان پیدا ہوں۔

مشاعروں میں شرکت سے نئے نئے خیالات، نئے نئے انداز اور اشعار کی ادائیگی کا ہنر ملتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ اوزان میں کمی بیشی کا پتہ بھی چلتا ہے اور مشاعرے شاعر کے جلد تعارف، شہرت اور فوری داد و تحسین کا ذریعہ بھی ہیں جبکہ تخلیقی نشستیں فکری مضامین سے تخلیق کاروں کو نئی اور گہری فکروں سے روشناس کراتی ہیں اور عوام کی معلومات میں بھی اضافہ کرتی ہیں۔

کتابوں اور جرائد کی بقاء کے لیے ایک مربوط اور ٹھوس منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ ادبی تنظیموں کو شخصیت پرستی اور جانبدارانہ رویوں کی بجائے اچھی تخلیقات کی پذیرائی کرنا ہوگی خواہ یہ تخلیق نوجوان کی ہو یا مستند تخلیق کار کی اسی طرح تخلیق کاروں کو عوامی موضوعات اپنانے کے ساتھ ساتھ سادہ آسان اور سلیس زبان اپنانا ہوگی۔ قاری کی تعداد میں اضافہ کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔

اگر بین الاقوامی سطح پر یا قومی سطح پر ایک موثر تنظیم سازی کے ذریعے کتابوں کی اشاعت مارکیٹنگ اور پبلسٹی کا اہتمام کیا جائے تو اس سے نہ صرف یہ کہ گھٹیا اور غیر معیاری تخلیقات کا راستہ بند ہو گا بلکہ اچھے اور معیاری تخلیق کار، چور لٹیرے اور نام نہاد پبلشرز کے چنگل سے بھی آزاد ہوں گے، کتابوں کی قیمت کم ہو گی، خریداروں میں اضافہ ہو گا اور تخلیق کاروں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ان کی مالی حالت بھی بہتر ہو گی۔

اردو ادب پر تنقید کا برائے نام رہ جانا بھی شخصیت پرستی ہی کا شاخسانہ ہے جو لوگ الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے یا اعلیٰ حلقوں میں اپنے تعلقات کے ذریعے کامیاب ہو جاتے ہیں خواہ ان کی تخلیقات کسی بھی درجے کی ہوں ان پر کوئی تنقید نگار نکتہ چینی کرنا گناہ سمجھتا ہے۔ بڑے اور نامور

شعراء کی ہلکی تخلیقات پر بھی کوئی تبصرہ نہیں کرتا جبکہ اس کے برعکس کسی نئے نوجوان اور باصلاحیت تخلیق کار کی اچھی کاوش پر بھی بسا اوقات بے جا تنقید کر کے اس کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے اور اس طرح نوجوان تخلیق کاروں کی صلاحیتوں کو ختم کرنے کی سازش کی جاتی ہے اور ایسے لوگ اور نام نہاد تنقید نگار ادب کو نقصان پہنچانے کا باعث بن رہے ہیں۔

میرے خیال میں ایک ایسا ادبی بورڈ بنایا جائے جس میں تعلیم یافتہ اور انتہائی غیر جانبدار تنقید نگار، ادیب شعراء شامل ہوں، جو ہر کتاب کا بغور مطالعہ کریں اور اس پر اپنی حقیقی و سچی رائے کا اظہار کریں۔ اس سے ادب کی اصلاح ہوگی۔ جعلی تخلیق کاروں کا راستہ رُکے گا اور حق داروں کی حوصلہ افزائی ہوگی اور کتابوں پر عوام کے اعتماد میں بھی اضافہ ہوگا۔

ایوارڈ بھی میرٹ پر دیا جانا چاہئے اور کسی ایوارڈ کمیٹی میں کسی ادیب و شاعر یا دوسرے تخلیق کار کے کسی رشتہ دار کو شامل نہ کرنا چاہئے جس طرح کہ گزشتہ سال پاکستان میں دیے جانے والے ادب ایوارڈ میں ہوا۔ جہاں احمد ندیم قاسمی کی سرپرستی میں ایوارڈ کمیٹی نے ان کی بیٹی منصورہ کے لیے بھی ایوارڈ کا اعلان کیا اور اس طرح نہ صرف یہ کہ احمد ندیم قاسمی صاحب کی شہرت داغدار ہوئی بلکہ منصورہ کے لیے بھی مشکلات پیدا ہوگئیں گو کہ یہ اچھی شاعرہ ہیں مگر پھر بھی پہلی ہی کتاب چھپنے کے چند ماہ بعد اس طرح ایوارڈ ملنا میرے خیال میں نامناسب ہے۔ ایک ایوارڈ سینئر کے لیے اور دوسرا جونیئر کے لیے ہونا چاہئے کہ ان سے کچھ لوگوں کو راہ مل جائے تو سمجھوں گا کہ میرے تجربات اور دکھ سکھ ضائع نہیں ہوئے۔

اب چند اہم واقعات کا بیان ہو جائے۔

"دسویں جماعت میں ہمارے کلاس انچارج خواجہ ابراہیم ہوا کرتے تھے یہ بہت بارعب، اصول پسند اور محنتی ٹیچر کے طور پر مشہور تھے اور ہیڈ ماسٹر تک ان سے بات کرنے سے پہلے سوچا کرتے تھے۔ سنا ہے ریٹائرڈ کیپٹن تھے جس دن سخت سردی ہوتی یہ کلاس کے تمام لڑکوں سے دو دو روپے جمع کرتے اور باقی رقم اپنی جیب سے ڈال کر ہمارے لیے گرم انڈے اور چائے منگایا کرتے اس کے بعد ہم سے ہوم ورک کا پوچھتے غلطیوں پر سختی سے اور پیار سے سمجھاتے اور اگر کوئی پھر بھی نہ سمجھے تو خوب پٹائی کرتے۔

ان کا بیٹا ڈویژن میں پہلی پوزیشن لینے میں محض تین چار نمبروں سے رہ گیا تو انہوں نے کلاس روم میں ہم سب کے سامنے اسے مرغا بنا کر خوب پٹائی کی۔ سب لڑکے سہم گئے میں ہمت کر کے اٹھا اور ان کے بیٹے کو ایک طرف کرتے ہوئے کہا سر آپ اچھے آدمی ہیں مگر یہ اچھا نہیں کر رہے اس سے آپ کا بیٹا ہمارے سامنے شرمندہ رہنے لگے گا اور احساسِ کمتری کا شکار ہو جائے گا۔ فوری طور پر تو خواجہ صاحب نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا البتہ تفریح کے دوران مجھے کلاس روم میں رکنے کو کہا۔ تمام لڑکوں کے ساتھ ساتھ میں بھی ڈر گیا کہ آج بڑا پٹوں گا۔ مگر جب سب لڑکے باہر چلے

گئے تو خواجہ صاحب میرے ڈیسک کے قریب آئے اور مجھے کہا مسٹر بھٹہ شکریہ۔ میں تمہارے حوصلے پر خوش ہوں کہ تم نے مجھے غلط کام سے روکا (میں بھٹہ فیملی سے تعلق رکھتا ہوں اس لیے بھٹہ مشہور تھا) ان کی اس اعلیٰ ظرفی کا اثر ہے کہ آج بھی جب کہیں خواجہ صاحب مجھے سر راہ مل جاتے ہیں تو میرا دل ادب اور احترام کے ساتھ ان کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔

ہر بچے کی طرح مجھے بھی بچپن میں کھیلنے سے کافی شغف تھا اور بعض اوقات کھیل میں اتنا محو ہو جاتا کہ کئی گھنٹے گزر جاتے اور اس طرح اپنے قیمتی وقت کے ضائع ہونے کا احساس تک نہ ہوتا (جس کی سزا ابھی تک بھگت رہا ہوں) اس وجہ سے والدین سے مار بھی بہت کھائی۔ آئے روز میری پٹائی ہوتی اور کبھی کبھار تو وحشیانہ طور پر مارا پیٹا جاتا۔ ایک دن والد صاحب کو اتنا غصہ آیا کہ انہوں نے ایک موٹا سا رسہ لیا اور اس سے اتنا مارا کہ بس۔ میری چیخیں اور دھاڑیں سن کر محلے والے اکٹھے ہو گئے اس پر ہی بس نہیں والد صاحب نے میرے سارے کپڑے اتروا لیے اور میں یوں ہو گیا جیسے پیدا ہوا تھا اور کہا چلے جاؤ میرے گھر سے۔ والد صاحب نے جانے تو نہ دیا البتہ اسی رسے کے ساتھ مجھے گلی میں بجلی کے کھمبے کے ساتھ باندھ دیا۔ جب سے میں نے نہ کوئی شرارت کی اور نہ ہی محلے کے لڑکوں کے ساتھ کوئی کھیل کھیلا۔

دوسرا واقعہ یوں ہوا کہ ہمارے گھر کے عقب میں ایک قبرستان ہے۔ گھر چوں کہ چھوٹا تھا اس لیے ہم بھائی پڑھنے کے لیے قبرستان میں موجود باغیچے میں جا بیٹھتے جہاں ٹھنڈک بھی ہوتی اور گھنی چھاؤں کے ساتھ ساتھ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو اور معطر ہوائیں بھی۔ ایک دفعہ مغرب کی اذان سے کچھ پہلے کئی گھنٹے پڑھنے کے بعد جب میں اُٹھ کر گھر واپس آنے لگا تو نجانے میرے ذہن میں کیا آئی کہ قبرستان کے دروازے سے باہر نکلنے کی بجائے دیوار سے باہر کی طرف چھلانگ لگا دی اسی اثناء میں میرے چچا (جنھیں ۱۹۹۷ء میں نامعلوم دہشت گردوں نے ان کے دفتر میں گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ اللہ انہیں جنت میں جگہ دے۔ آمین۔ اسی حادثے میں میرے ایک بہنوئی جو کہ کئی سالوں سے میونسپل کونسلر چلے آ رہے ہیں شدید زخمی ہوئے) دروازے سے قبرستان میں داخل ہو رہے تھے جو کسی کام سے چاچا مالی سے ملنے جا رہے تھے۔ ان کی نظر مجھ پر پڑی تو یہ دروازے ہی سے واپس ہو لیے اور مجھے رکنے کا حکم دیا میرے نزدیک آتے ہی ایک زوردار تھپڑ میرے نرم گالوں پر دے مارا جس سے میرے نہ صرف چودہ طبق روشن ہو گئے بلکہ میری آنکھوں کے سامنے تارے گھوم گئے۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ تمہیں شرم آنی چاہئے خاندان کا نام ڈبو دیا تم نے۔ جوا کھیلتے ہو۔ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ایک اور تھپڑ پڑا جب تیسرا تھپڑ مارنے لگے تو میں نے ان کا ہاتھ روک لیا اور کہا چچا آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں سراسر بہتان تراشی کر رہے ہیں کہنے لگے میں نے خود تمہیں دیکھا ہے۔ اب تو میرے کچھ کہنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہی۔ میں نے بہت صفائیاں پیش کیں مگر سب لاحاصل خدا بھلا کرے چاچا مالی کا۔ جو ادھر آ نکلے اور انہوں نے چچا سے

کہاملک صاحب بچہ سارادن تو پڑھتا رہا ہے ابھی کچھ دیر پہلے میں نے خود اسے کہا بیٹا اب گھر جاؤ شام ہو رہی ہے۔ مگر چچا نہ مانے۔ اس واقعے نے میری زندگی کے سارے رُخ بدل دیے۔ میں نے اس کے بعد آج تک قسم نہیں کھائی بلکہ جو کوئی میرے سامنے اپنی صفائی میں قسم پیش کرتا ہے تو اسے کہتا ہوں میں قسموں پر یقین نہیں کرتا بلکہ قسمیں کھانے والے کو جھوٹا سمجھتا ہوں۔

یہ سبق آموز اور گہرے واقعات ہیں ان والدین کے لیے جو اپنے بچوں پر اعتماد نہیں کرتے انہیں ہر بات پر ٹوکتے ہیں، بے جا شک کرتے ہیں اور دوسروں کے سامنے اپنی اولاد کو مارتے پیٹتے ہیں اور بچوں کو خود اعتمادی جیسی دولت سے محروم کر دیتے ہیں۔ انہی واقعات کی بدولت میں بہت زیادہ حساس ہو گیا ہوں۔ تنہائی پسند ہو گیا ہوں۔ اور چپ چپ رہنے لگا ہوں۔ ہزار خداداد صلاحیت و قابلیت کے باوجود بھی کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی کسی عجیب انجانے کا خوف کا شکار ہو جاتا ہوں خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگتا ہوں اور لاکھ کوشش کے باوجود بھی خود کو احساس کے اس بھنور سے نہیں نکال سکا۔

"ساحلوں پر محبتیں" کی تقریب رونمائی ایک مقامی بڑے ہوٹل میں ہوئی۔ تقریب کی دو خاص باتیں یہ تھیں۔ اس تقریب کی صدارت محترم پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی نے کی جو کہ ماہر تعلیم، ماہر عروض اور استاد و بزرگ شاعر ہیں اور اس تقریب میں ملتان کے چوٹی کے شعرائے کرام بغیر کسی دعوت کے آئے ہوئے تھے یہ کبھی کبھار میری غزل اخبار میں پڑھ لیا کرتے تھے۔ میرے لیے یہ واقعی اعزاز کی بات تھی کہ ایک ہی تقریب میں ان سب سے میری ملاقات ہو گئی۔ (محترم عاصی کرنالی کا تعارف سخن ور سوم میں موجود ہے۔ سلطانہ مہر)

اس تقریب سے خطاب کے لیے جب مجھے بلایا گیا تو اچانک بہت سارے لوگ اپنی اپنی نشستوں سے اُٹھے اور اسٹیج کی طرف دوڑتے نظر آئے جن کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار، گلدستے، نوٹوں سے بنے ہار اور نجانے کیا کیا تحائف تھے۔ ان لوگوں میں میرے گھر کے افراد کے علاوہ میرے رشتہ دار، عزیز، یار دوست اور علاقے کے لوگ بھی شامل تھے یوں یہ میری زندگی کی پہلی ادبی تقریب خوبصورت اور یادگار تقریب بن گئی۔

ہے شرافت جبین پر کندہ
کیا بچھایا ہے مکر نے پھندہ

ARSHAD IQBAL BHUTTA
VIA L. Boccherini, 109
09045 Quartu S.E (CA)
Sardegna - Italy

اشفاق حسین

کینیڈا

اشفاق حسین 1980ء (مارچ) میں کینیڈا آئے۔ بارہ سال بعد 1992ء میں ان کا شعری مجموعہ "ہم اجنبی ہیں" شائع ہوا۔ بارہ سال میں تو کہتے ہیں ایک نسل جوان ہو جاتی ہے۔ رستے زخموں پر کھرنڈ آجاتی ہے مگر وقت کا مرہم اشفاق حسین کی بے گھری کے زخموں کو مندمل نہ کر سکا۔ اپنے وطن جانے کی ہڑک اور اپنی خاک کو ماتھے سے لگانے کی تمنا، مایوسیوں کی راکھ میں بھی جذب نہ ہو سکیں اور اجنبیت کی چنگاری اس کے وجود کو تپاتی رہی۔ مگر اس چنگاری نے اشفاق کو مٹی میں ملانے کی بجائے کندن بنا دیا۔ اس کے قلم کو جلا ملتی چلی گئی اس نے شہ پارے تخلیق کرنا شروع کیے۔ اشفاق کی نظم "بے رنگ تصویریں" اس کی بے اماں زندگی کا ایک شہ پارہ ہی تو ہے۔ اس نے اس اجنبی مٹی میں اپنا پن تلاش کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اشفاق نے سچ ہی تو کہا کہ:

ہم اپنی ذات کے اس خول میں
کب تک رہیں گے بند، آخر کب تلک ان موسموں سے
بے تعلق ہو کے ہم زندہ رہیں گے؟
کب تلک، ان مہرباں صبحوں سے رنجیدہ رہیں گے

کب تلک، یہ شام، جو لوڑھے ہوئے ہے
لطف اور اکرام کی چادر
ہم اس چادر سے، تن پوشی پہ شرمندہ رہیں گے؟
کب تلک، ہم اپنے چاروں سمت پھیلی وسعتوں میں، خود کو بے چہرہ رکھیں گے؟
کون جانے اجنبی ماحول کی تصویر میں، ہم رنگ آخر کب بھریں گے؟
کب یہ سب بے رنگ تصویریں مکمل ہوں گی
ہم تکمیل پائیں گے، نہ جانے کب وہ دن آئے گا
جب ہم خود کو جانیں گے؟

یوں تو بہت سے لوگ تلاشِ روزگار کے لیے گھر سے باہر قدم رکھتے ہیں۔ وہ یا تو "ہوم سک نوسٹیلجیا" کا شکار رہتے ہیں یا سرے سے اپنی تہذیب کا لباس ہی اتار پھینکتے ہیں۔ چند ہی ایسے ہیں جو خاکِ وطن کو آنکھوں کا سرمہ بنا کر اس کو خوشبوئے جاں کی طرح اپنے اندر اتار کر آنے والی زندگی کا خیر مقدم نہ صرف خود کرتے ہیں بلکہ آنے والی نسل کو بھی اس کے لیے تیار کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک خوش آئندہ مستقبل کا خواب اشفاق نے اپنے "بیٹے کے نام" کیا ہے

میں تمہاری آنکھوں سے
وہ زمانے دیکھوں گا، جو ابھی نہیں آئے، میں تمہارے پاؤں سے
تیز تیز بھاگوں گا، ایسی شاہراؤں پر، جو ابھی نگاہوں سے، مثلِ خواب او جھل ہیں
میں تمہارے ہاتھوں سے، وہ پہاڑ چھولوں گا
جس کو سوچ کر بھی اب، سانس پھول جاتی ہے
وہ پہاڑ وہ رستے جن پہ تم کو جانا ہے، وہ نیا زمانہ ہے
اور وہ تمہارا ہے

میرے سارے خوابوں کو، ان جمیل آنکھوں کے، ایک خاص گوشے میں، تم چھپا کے رکھ لینا
اور اگر کبھی یہ خواب، پھول بن کے مہکیں تو
ان کی خوشبوؤں میں تم، میرے نام کے سب حرف، احتیاط سے رکھنا

اشفاق سے اشفاق کے بارے میں گفتگو کریں اس سے پہلے میں آپ کو بتاتی چلوں کہ اشفاق حسین، یکم جنوری 1951ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ جیکب لائین گورنمنٹ ہائی اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر کراچی گورنمنٹ کالج ناظم آباد، نیشنل کالج اور اسلامیہ کالج سے تعلیمی منازل طے کرتے ہوئے جامعہ کراچی سے اردو میں ایم۔اے کیا۔

ملازمت کے سلسلے میں گورنمنٹ کالج کورنگی، کراچی اور آرٹس کونسل کراچی سے وابستہ رہے۔ اب کینیڈا میں ان کی ٹریول ایجنسی ہے۔ اور ایشین ٹیلی ویژن نٹ ورک سے اشفاق اردو

پروگرام "اردو رنگ" ہر ہفتہ پیش کرتے ہیں۔

شاعری کے علاوہ انہوں نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ پہلی کتاب نثر میں شائع ہوئی جس کا عنوان "فیض ایک جائزہ" تھا۔ یہ کتاب ادارۂ یادگارِ غالب کراچی نے 1977ء میں شائع کی۔ تاریخی اعتبار سے فیض احمد فیض کے فکر و فن پر اردو میں لکھی جانے والی یہ پہلی کتاب تھی۔ 1978ء میں دہلی سے اعتقاد پبلشنگ ہاؤس نے اس کا ہندوستانی ایڈیشن شائع کیا۔

نثر میں دوسری کتاب "فیض حبیب عنبر دست" ہے۔ سنگ میل پبلشر لاہور سے 1992ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں اشفاق نے کینیڈا میں فیض صاحب سے اپنی ملاقاتوں کے حوالے سے یادوں کے معلوماتی خزانے بکھیر دیے ہیں۔ جنگ پبلشرز لاہور نے فیض احمد فیض پر بعنوان "فیض کے مغربی حوالے" 1993ء میں شائع کی۔

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے "فیض کے مغربی حوالے" دو جلدوں میں چند اضافوں کے ساتھ "مطالعۂ فیض یورپ میں" اور "مطالعۂ فیض امریکہ و کینیڈا میں" 1994ء میں شائع کیں۔

فیض صاحب پر اشفاق نے جتنا کام کیا اس کا اعتراف عوام نے، میڈیا نے اور شعراء و ادیبوں نے بھی کیا۔ وہ پہلے بھی معروف تھے اور اب فیض کے حوالے سے بھی جانے گئے۔ چنانچہ ان کے لیے "فیض والے اشفاق" کا اعزاز بذاتِ خود کسی ایوارڈ سے کم نہیں مگر اب اس کا عملی اظہار "مجلس فروغ اردو ادب دوحہ قطر" نے کیا ہے۔ اس انجمن کی جانب سے اشفاق حسین کو سلیم جعفری انٹرنیشنل ایوارڈ برائے 1999ء دیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ 55 ہزار روپے اور طلائی تمغے پر مشتمل ہے۔ (اشفاق کو یہ ایوارڈ مبارک ہو۔)

اشفاق کے دو شعری مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ سب سے پہلا مجموعۂ کلام "اعتبار" کے نام سے 1979ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ اس کے بعد کینیڈا سے کچھ نئی اور کچھ پرانی نظموں کا ترجمہ انگریزی میں That day will dawn کے نام سے شائع ہوا۔ پنجابی میں یہ ترجمہ "نیندر نال رشتہ" کے نام سے شائع ہوا۔ لاہور سے سنگِ میل پبلشرز نے 1992 میں دوسرا مجموعۂ کلام "ہم اجنبی ہیں" کے نام سے شائع کیا ہے۔ ان کا زیادہ تر کلام فنون لاہور اور افکار کراچی میں شائع ہوا۔ وقتاً فوقتاً ہندوستان اور پاکستان کے دوسرے ادبی جرائد میں بھی کچھ تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ناول، سوانح اور تاریخ سے متعلق کتابوں کے مطالعہ میں اشفاق زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔

اشفاق اپنے بارے میں مجھے بتا رہے تھے کہ:

"کراچی میں پی آئی بی کالونی سے متصل مہاجروں کی ایک بستی کبھی "لیاقت بستی" کے نام سے ہوتی تھی وہیں میرا بچپن گزرا۔ بعد میں یہ بستی ڈھادی گئی اور ہم لوگ کورنگی منتقل ہوگئے۔ کورنگی ہی کے قیام کے زمانے میں مجھے شعر و ادب سے لگاؤ پیدا ہوا۔ اس زمانے وہاں صہبا اختر، رسا چغتائی، جوہر سعیدی، کیف بنارسی اور بہت سے بزرگ شعرا کے ساتھ ساتھ نئے لوگوں میں اشرف شاد،

نقاش کاظمی، شبر اعظمی، ساجد امجد اور جمال احسانی وغیرہ تھے۔ انھیں سب لوگوں کے ساتھ ساتھ اور زیرِ سایہ مشاعروں میں شریک ہونا شروع کیا اور پھر یونیورسٹی میں اپنے اساتذہ جن میں مجنوں گورکھپوری، ممتاز حسین، شور علیگ، ابواللیث صدیقی، شاہ علی، جمیل اختر خاں (مرحوم) کا انتقال 18 فروری بروز جمعہ ساڑھے گیارہ بجے شب کراچی میں ہوا، اسلم فرخی اور فرمان فتح پوری صاحب کی سرپرستی میں ادب پڑھنے اور اس کو سمجھنے کی تربیت ہوئی۔ یونیورسٹی ہی کے عرصے میں مجھے فیض احمد فیض کی شاعری پر مقالہ لکھنے کا موقع ملا۔ اس طرح میں نے ترقی پسند تحریک اور اس میں شامل لکھنے والوں کا تفصیلی مطالعہ کیا اور میری اپنی تحریروں میں ان کے اثرات بھی آئے۔

کورنگی کالج میں پروفیسر منظر ایوبی صاحب کے ساتھ پڑھانے کا موقع ملا اور ادب کو ایک دوسرے زاویے یعنی استاد کی نظر سے بھی دیکھنے اور پرکھنے کا تھوڑا بہت سامان میسر آگیا۔ کالج سے جب آرٹس کونسل کراچی میں پہنچا تو شعر و ادب کے علاوہ دیگر فنون اور ان کے عالموں سے علمِ مجلسی حاصل ہوا۔

مارچ 1980ء میں کینیڈا ہجرت کی اور یہاں سے شعر و ادب کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ رائٹرز فورم آف پاکستانی کینیڈین کی بنیاد ڈالی اور اس کا پہلا صدر منتخب ہوا۔ اسی دوران ''اردو انٹر نیشنل'' کا اجرا کیا۔ یہ رسالہ 1982ء سے 1987ء تک باقاعدگی سے جاری رہا۔ اس کی اشاعت میں فیض احمد فیض کا تعاون اور مشورے حاصل رہے۔ اس پرچے کو شاید زیادہ اہمیت حاصل ہوئی اور پاک و ہند کے قلم کاروں نے اسے بے حد سراہا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے ڈاکٹر سید معراج نیر نے کالج کی طرف سے گرانٹ ملنے پر اس کا انتخاب اور اشاریہ مرتب کیا اور کالج ہی کی طرف سے اسے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ میرے لیے تو خیر یہ بات خوشی کی ہے ہی لیکن شمالی امریکہ سے کسی علمی اور ادبی کام پر پاکستان کے ایک انتہائی معتبر تعلیمی ادارے کی جانب سے یہ اعزاز پوری شمالی امریکہ کی اردو دنیا کے لیے بھی ایک اچھا شگون ہے۔ اپنی کاروباری مصروفیات کی وجہ سے میں اس سلسلے کو جاری نہ رکھ سکا لیکن میرے بہت سے بہی خواہوں کا یہ مسلسل اصرار ہے کہ اس سلسلے کو دوبارہ جاری کیا جائے۔''

اشفاق کہہ رہے تھے:

''میں شاعری ہی میں نہیں بلکہ ادب اور زندگی دونوں میں ترقی پسند فکر سے قریب تر رہنے کی شعوری کوشش کرتا ہوں۔ چونکہ مجھے مواد کے اعتبار سے جدید تر اور ہیئت کے اعتبار سے روایت پسند ہونا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ لہٰذا نثری نظم اور نثری غزل کے تجربے کرنے والوں کو میں شاباشی تو دے سکتا ہوں لیکن ان کے ناکام تجربوں کو اپنی شاعری کا حصہ نہیں بنا سکتا۔

آج کے دور میں یا کسی بھی دور میں مشاعرے وغیرہ ادب کی تخلیق میں براہِ راست معاون نہیں تھے۔ مشاعرے یا نشستیں زبان کی ترویج کے لیے اچھا وسیلہ ضرور ہیں لیکن ادب کی تخلیق کے لیے نہیں (تخلیقی عمل کا تعلق فرد سے ہے اور ادبی تقریبات میں، جن میں مشاعرے بھی شامل

ہیں ان کا تعلق افراد اور ان کے جتھوں سے ہے)۔ چنانچہ دونوں اپنی اپنی جگہ قابلِ قدر ہیں جس کا جو ظرف ہوگا وہ اسی طرح اپنی پیاس بجھائے گا۔

الیکٹرونک میڈیا سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس میڈیا سے بھی ادب اور زبان کی بے انتہا ترویج واشاعت ہو سکتی ہے۔

تخلیقی ادب کی بقا کے لیے تنقید بے شک بہت اہم کردار ادا کرتی ہے لیکن آج کل اردو زبان میں جو تنقید لکھی جا رہی ہے وہ واقعی معیاری نہیں ہے۔ نظری تنقید میں تو پھر بھی دیانت داری محنت اور لگن نظر آتی ہے لیکن جب بات عملی تنقید کی طرف آتی ہے تو معاملہ اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ چنانچہ آج کے نقاد جب کسی ادبی شہ پارے کے بارے میں رائے دیتے ہیں تو اسے اعتبار کی سند حاصل نہیں ہوتی۔ لوگ پہلے یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ تخلیق کار سے نقاد کے کون کون سے مفاد وابستہ ہو سکتے ہیں؟ ایسا عصر حاضر کے تخلیق کاروں کے بارے میں ہوتا ہے لیکن جب آج کا نقاد کلاسیکی ادب کا محاکمہ کرتا ہے تو اس کی رائے پر توجہ دی جاتی ہے۔"

"اردو" پر گفتگو کا سلسلہ چلا تو اشفاق نے بتایا کہ "اردو زبان دنیا کی تیسری نہیں بلکہ دوسری بڑی زبان اسی صورت میں ہے کہ جب اس میں بول چال کی ہندی کو بھی شامل کیا جائے یعنی بول چال کی زبان میں ہندی اور اردو کو ملا کر جب گنا جاتا ہے تو اقوامِ متحدہ کے اعداد و شمار کے مطابق یہ زبان چینی زبان کے بعد دنیا کی دوسری بڑی زبان ہے اور اس کے بعد تیسری بڑی زبان انگریزی ہے۔ لیکن علم و فن اور سائنسی علوم اور جدید دور کے تکنیکی اظہار میں یہ زبان ابھی طفلِ مکتب ہے یعنی دنیا کی اور بہت سی دوسری زبانوں کی طرح یہ زبان انگریزی کے پاسنگ بھی نہیں آتی۔ اب ظاہر ہے کہ جب حال کی صورت حال یہ ہو تو مستقبل میں کیا ہوگا؟ اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل نہیں۔ مایوسی کی بھی کوئی بات نہیں اس لیے کہ تمام تر محرومیوں کے باوجود اس کا سفر دنیا کی اور دوسری جاندار زبانوں کی طرح جاری وساری ہے۔ زبانوں کی اس دوڑ میں انگریزی کے ساتھ ساتھ فرانسیسی، عربی، چینی، جاپانی، اردو اور دوسری بہت سی زبانیں دوڑ رہی ہیں۔ لہٰذا جھنڈی کسی ایک کے ہی ہاتھ آسکتی ہے اور فی زمانہ یہ جھنڈی انگریزی زبان کے ہاتھ ہے۔ چنانچہ جب اتنی اور بہت سی زبانوں کی سانس پھولی جا رہی ہے تو اردو کی حالتِ زار پر ہزار افسوس کرنے اور ناامید ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

اردو میں انگریزی زبان کے لفظوں کی شمولیت کے بارے میں کبھی معاندانہ رویہ نہیں اپنایا گیا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس زبان میں ہر زبان کے لفظ کی شمولیت کو قابلِ قبول بنایا گیا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب زبان کو بگاڑ کر زبردستی اس میں الفاظ داخل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو ایک مضحکہ خیز صورت بن جاتی ہے۔ اردو میں انگریزی زبان کے الفاظ اور بعض اوقات تو جملے تک اس طرح ٹھونسے جاتے ہیں کہ کانوں پر گراں گزرتا ہے۔ مثلاً اگر میں آپ کے سوالنامے کے جواب میں یہ کہوں کہ "سلطانہ مہر صاحبہ! 'یو سی' میں نے اب تک، چار 'بکس' لکھی ہیں جن میں سے

دو 'پوئٹری' کی ہیں اور دو 'کریٹیسزم' کی ہیں پوئٹری تو ٹھیک ہے لیکن میں اپنی کریٹسزم والی بکس سے 'اپیچو ئلی' 'بہت زیادہ سیٹسفائڈ' نہیں ہوں" وغیرہ وغیرہ۔ تو مجھے تو اس زبان کی کوئی ترقی نظر نہیں آتی۔ اگر اردو میں کتاب، شاعری اور تنقید کے الفاظ موجود ہیں تو پھر ان کی جگہ انگریزی الفاظ کا استعمال مناسب نہیں ہے۔ ہاں اگر آپ میزائل، کمپیوٹر، انٹرنیٹ وغیرہ جیسے الفاظ جن کے متبادل اردو میں موجود نہیں ہیں تو ایسے الفاظ کو اردو املا میں لکھیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ یہی ہماری زبان کی روایت بھی رہی ہے۔ آخر بس، بس اسٹاپ، تھرما میٹر اور سینکڑوں ایسے ایسے الفاظ ہیں جنہیں ہم نے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے اور انہیں روزمرہ کے استعمال میں لاتے ہیں تو یہ سلسلہ آج بھی جاری رہنا چاہئے۔ اس سے زبان میں نیا خون آتا رہے گا لیکن اردو کے خوب صورت متبادل الفاظ ہوتے ہوئے بلا ضرورت انگریزی الفاظ کا استعمال زبان کے فروغ اور ترقی کے بجائے اس کا حلیہ بگاڑنے کا عمل ہے۔ زبان کو اس کے فطری ڈھب پر چلتے رہنا چاہئے اسی میں اس کی بھلائی ہے۔"

ASFAQ HUSSAIN
440, WELDRICK ROAD. EAST RICHMOND HIN L4B 2M3 CANADA

سب سمجھ کر کچھ وہ سمجھا بھی نہیں
ہے مگر انجان اتنا بھی نہیں

لوٹ کر شاید وہ آجائے ادھر
وہ جو اس رستے سے گزرا بھی نہیں

یاد وہ آیا بچھڑ کر جس قدر
اتنا میں نے اُس کو چاہا بھی نہیں

کان میں رس گھولتی ہیں آہٹیں
کوئی دروازے پہ آیا بھی نہیں

آخرِ شب کی سیاہی بڑھ گئی
چاند اُس نگری میں ڈوبا بھی نہیں

رنگ ہیں اشفاقؔ اس میں سب مگر
تتلیوں کے پنکھ جیسا بھی نہیں

ہم اس مٹی کو اپنے خون سے زرخیز کریں گے
ہمارے اس زمیں کے ساتھ کچھ رشتے انوکھے ہیں
ف س اعجاز

ف۔ س۔ اعجاز

کلکتہ ہندوستان

ہوش مند کبھی ایسے مشغلے نہیں اپناتے جو جی کا زیاں بنیں مگر جو ہوش مند نہ ہوں ان کا کیا کیجئے! خود اپنے آپ سے جب پوچھتے ہیں کہ صحافت کیوں اپنائی اور قلم کا شوق کیوں پالا تو ایک ہی جواب ملتا ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے اس کے جراثیم اپنے خمیر میں ڈال دیے تھے۔"

سو یہی کچھ ف۔ س اعجاز کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ انہوں نے 1965ء میں کلکتہ سے جاری ہونے والے "فانوس ڈائجسٹ" سے بحیثیت مینجنگ ایڈیٹر وابستگی اختیار کی تھی۔ یہ ہندوستان کا اولین اردو ڈائجسٹ اور مشرقی ہند کا اولین فوٹو آفسٹ رسالہ تھا جو 13 اشاعتوں کے بعد بند ہو گیا۔ سترہ سالہ نوجوان اعجاز کو صحافت کا چسکا لگ چکا تھا چنانچہ انہوں نے صحافت کی ہی ایک شاخ فلمی صحافت سے دلچسپی لی اور 66ء سے 68ء تک فلمی ہفت روزہ "عکاس" سے وابستگی اختیار کی۔ کچھ عرصہ بعد جناب اقبال اکرامی کے ہفتہ وار "مابدولت" سے جڑے رہے۔ وہ اخبار ادبی چاشنی کی وجہ سے مقبول تو ہوا مگر پائدار ثابت نہ ہوا۔

جس طرح ہم نے روزنامہ "جنگ" کراچی سے علیحدگی کے بعد چاہا کہ اب کوئی اور کام

ڈھونڈیں مگر صحافی کو صحافت سے کتنا ہی بازر کھا جائے وہ ہیر اپھیری کے بغیر نہیں رہ پاتا۔ ہم بھی اپناماہنامہ "روپ" دس سال تک کامیابی سے شائع کرتے رہے اور بچوں کی جدائی سے بولا کر امریکانہ آجاتے تو اسی ہیر اپھیری میں لگے رہتے۔ اسی طرف ف۔ س اعجاز نے بھی 1986ء میں اپناذاتی ماہنامہ "انشاء" جاری کیا۔ یہ کلکتہ کا واحد رسالہ ہے جس نے اپنی ماہوار اشاعتوں کی سنچری بنائی اور اب بھی کلکتہ جیسے شہر سے اردو میں شائع ہو رہا ہے۔

'انشاء" نے کئی موضوعاتی اور شخصی گوشے بڑے اہتمام سے شائع کیے ہیں اور اس کے دس خصوصی نمبروں نے تو ادبی صحافت کو بلاشبہ نیا وقار بخشا ہے۔ ان کے نام درج ذیل ہیں :

1۔ احمد سعید ملیح آبادی 2۔ ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ 3۔ قمر رئیس 4۔ انشا عالمی اردو افسانے 5۔ صدی شمارہ 6۔ بابری مسجد نمبر 7۔ اسکنڈ نیویائی ادب نمبر۔ 8۔ نیاز فتح پوری نمبر 9۔ دلیپ سنگھ نمبر 10۔ بخش لائل پوری نمبر۔

ف۔ س اعجاز 2 مئی 1948ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دہلی کے لال کنواں اسکول اور فتح پوری مسلم ہائی اسکول سے حاصل کی۔ کلکتہ کے پریسڈینسی مسلم ہائی اسکول سے 1964ء میں میٹرک کیا۔ 1969ء میں سینٹ زیوریس کالج کلکتہ سے بی۔ اے کی تعلیم دوہرے امتیاز کے ساتھ مکمل کی۔ کلکتہ یونیورسٹی میں وکالت کے لیے داخلہ لیا لیکن تیسرے آخری سال میں کورس نامکمل چھوڑ دیا۔ صحافت سے وابستگی کی بنا پر طباعت اور انجینئر کو حصولِ روزگار کا ذریعہ ٹھہرلیا۔ ماسکو، لندن، ناروے، ڈنمارک، پیرس اور دبئی کی سیر کے دوران خاصے تجربے حاصل کیے۔

ان کی تصانیف "تنہائیاں" مالکِ یوم الدین و موسم بدل رہا ہے، لاشریک، یوروپ کا سفر نامہ اور خوابوں کے اسرار کو مختلف اکاڈمی نے انعامات سے نوازا ہے۔

"انشاء عالمی اردو افسانے" کو ڈنمارک میں بسے ایشیائی تارکین وطن کی ادبی انجمن نے ایک قابل قدر انعام سے نوازا۔ میر اکادمی لکھنؤ سے میر ایوارڈ، برائے 1996 بھی انھیں دیا گیا ہے۔

جن کتابوں پر انعامات ملے ہیں ان کے علاوہ اسلامی تصوف اور صوفی (تصوف پر ایک مضمون اور مولانا روم کی منتخب حکایات) اور نیتاجی سبھاش چندر بوس کی سوانح عمری (انگریزی سے ترجمہ) بھی کر چکے ہیں۔ زیر اشاعت کتابیں یہ ہیں۔

1۔ اونچے مکانوں کے قریب (غزلیات کا مجموعہ) 2۔ تاثراتی تنقیدی (ادبی مضامین کا مجموعہ)

3۔ ذہانت ننگے پاؤں چل رہی ہے (انشاء کے اداریوں کا مجموعہ)

ف۔ س اعجاز کو شاعری پر جتنی دسترس حاصل ہے اتنی ہی نثر پر بھی ہے۔ انگریزی اور اردو زبان پر عبور حاصل ہونے کے باعث نثر اور نظم دونوں اصناف میں دلنشیں ترجمے کرتے ہیں۔ شاعری کے کسی خاص مکتبۂ فکر سے ان کا تعلق نہیں اسی لیے گروہ بندیوں سے دور رہتے ہیں۔ انشاء کے علاوہ ان کا کلام ہندوپاک، یوروپ اور برطانیہ کے مختلف جرائد میں شائع ہوتا ہے۔ مطالعہ میں

انہیں شاعری، افسانے، ناول کبھی کبھی ڈرامے، نفسیاتی مضامین، سیاسی مضامین اور سفرناموں کا مطالعہ پسند ہے۔ انہوں نے تحیراتی ناول بھی خاصے پڑھے ہیں۔ فلمی لٹریچر سے بھی وابستگی رہی ہے۔ ادبی تنقید کا مطالعہ ضروری سمجھتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے اردو کے مستقبل کے بارے میں رائے دینا اور پیش گوئی کرنا دشوار کام ہے۔ یہ ایک طویل بحث ہے اور جس کی جتنی معلومات ہیں جتنا اور جیسا لگاؤ ہے، وہ اس کے بارے میں ویسے ہی خیالات بیان کرے گا۔ ہندوستان میں اردو کا مستقبل (جس زاویے سے اعجاز دیکھ رہے ہیں) انہیں زیادہ حوصلہ افزا نظر نہیں آتا۔

اعجاز نے شاعری کی کئی اصناف میں لکھا ہے۔ ان کی ایک نظم "انشاء" کے جولائی اگست 98ء کے شمارے میں نے پڑھی۔ چاہتی ہوں آپ بھی پڑھیں۔

مہاتما بدھ کی مسکراہٹ

(11 مئی 98ء کو پوکھران میں ہندوستان کے 3 نیوکلیر دھماکوں کے بعد)

مہاتما بدھ!
یہ روٹیوں کا جو پیڑ ہے نا، کہ جس کے نیچے، ہم اپنے اپنے دھیان میں ہیں
اور ایک نروان پا رہے ہیں،
اٹھا کے جب ہاتھ اپنے بھارت کا کوئی بچہ، کہے کہ روٹی کا ایک ٹکڑہ
ادھر بھی پھینکو، تو ہم نے اپنی نجات کی راہ یہ نکالی ہے، اس سے کہہ دیں
وہ روٹیوں کی کسی بھی خواہش کو ترک کر دے، اور ایک گولی جو ہم اسے دیں
وہ منہ میں رکھ لے، زمیں کے پہلو میں لیٹ جائے
مہاتما بدھ!
تم ایک پتھر بنے ہوئے ہو تمہارے ہونٹوں کا یہ تبسم، گھنیرے برگد کی ٹہنیوں کو
پورنیما کی روشنی میں، گدگداتا ہے، خامشی سے
کئی یگوں سے تم آتماؤں پہ "پنچ شیلو" کا جل چھڑکتے ہی آ رہے ہو
مہاتما بدھ!
جو امن کی جڑ کو ڈھونڈنا ہو، بتاؤ کتنی زمین کھودیں، تم ایک اونچائی پر سمادھی لگا کے بیٹھے
بشر کی پستی پہ مسکراتے رہے ہو صدیوں
تم اپنے آسن کو آج توڑو، اور ایک پل کے لیے نگاہیں اٹھا کے دیکھو کہ،
پورنیما میں ساری دھرتی دمک اٹھی ہے تمہاری پاکیزہ مسکراہٹ کے چاند کو ہم نے توڑ ڈالا

تو کیا تشدد اسے کہو گے ؟
نئی صداقت کو چھو کے دیکھو، نظر ادھر بھی ہو عارفانہ
ہمارا بت ہے شجر کے نیچے، اٹل کھڑا مسکرا رہا ہے
تمہیں بھی نروان مل گیا تھا، اسے بھی نروان مل رہا ہے
صدی کے دو سال بچ گئے ہیں

امن کے حامی اس شاعر نے بڑی جرات مندانہ شاعری کی ہے۔ اعجاز کہتے ہیں شاعری میں ہر صنف کو اظہارِ خیال کے لیے مفید اور ضروری قرار دیا جانا چاہئے لیکن فارم (Form) کی شاعری یعنی نثری نظم یا نثری غزل ذاتی طور پر مجھے پسند نہیں۔ آج نثری شاعری کے تجربے ہو رہے ہیں لیکن نثری شاعری کرنے والوں کا ادب اور عوام میں کیا مقام ہے، ان کا ادب کتنے دن تک شاعری مانا جائے گا؟

میرے خیال میں آج کے دور میں مشاعرے تخلیقی ادب کی تحریک نہیں پیدا کرتے۔ عموماً علاقائی مشاعرے شعراء کی رسمی خود ستائی اور جذبۂ تشہیر کی تسکین کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ دیکھا جائے تو تضیع اوقات بھی ہوتی ہے۔ البتہ تخلیقی نشستیں اچھے ادب کی نشو و نما میں بڑا کردار ادا کر سکتی ہیں سامعین کی فہم بلند اور ہمہ گیر ہونی چاہئے تاکہ وہ ہر طرح کی شاعری میں دلچسپی لیں۔

کتابوں اور جرائد کی بقا کے لیے کئی ٹھوس اقدامات ضروری ہیں لیکن الیکٹرونک میڈیا ہی کے ذریعے کتابوں اور جریدوں کی اشاعت کو فروغ بھی دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ مقصد الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے ناظرین میں کتابوں اور جریدوں کا عشق پیدا کرنا ہو اور یہ ممکن ہے۔

ادب کی ترقی اور بلوغت کے لیے تنقید از حد ضروری ہے۔ لیکن اردو تنقید ابھی تخلیقی مقام تک نہیں پہنچی ہے اور نہ تخلیقی ذمہ داری کا پورا شعور ابھی تک اسے آیا ہے۔"

F.S.EJAZ, EDITOR "INSHA"
25, B ZAKRIA STREET
CALCATTA 700073
INDIA.

انتخابِ کلام

ف۔ س اعجاز

وہ محفل ہے کہ جس میں سب کے سب چہرے انوکھے ہیں
میری انکھوں سے یہ اٹھتے ہوئے پردے انوکھے ہیں

سدا گردش میں پیمانے کسی کا دم نہیں بھرتے
ہمیشہ ساتھ دیتے ہیں تو یہ شیشے انوکھے ہیں

کسی کے دستِ شفقت کی طرف مڑ کر نہیں تکتے
جو گر کر آپ اٹھ جاتے ہیں وہ بچے انوکھے ہیں

اچانک کس طرح وہ دور کر دیتا ہے ہر مشکل
خدا ہی جانتا ہے اس کے جو رستے انوکھے ہیں

کبھی اک دائرے میں ایک نقطہ کام کرتا تھا
مگر اس دائرے میں سب کے سب نقطے انوکھے ہیں

بتا کب تک سنے گی ہم سے تو نایاب افسانے
ہمارے پاس اے دنیا کئی قصے انوکھے ہیں

ہم اس مٹی کو اپنے خون سے زرخیز کر دیں گے
ہمارے اس زمین کے ساتھ کچھ رشتے انوکھے ہیں

ہمارا دین و مذہب آج تک کچھ بھی نہیں سمجھے
ہمارے ہم وطن ہیں، پھر بھی وہ کتنے انوکھے ہیں

نظر میں روشنی کی اک کرن بھی رکھ نہیں پاتے
جو سورج پی کے اندھے ہیں تو وہ ذرے انوکھے ہیں

اس میں کوئی شکوہ نہ شکایت نہ گلہ ہے
یہ بھی کوئی خط ہے کہ محبت سے بھرا ہے
چہرے میں ہے آئینہ کہ آئینے میں چہرہ
معلوم نہیں کون کسے دیکھ رہا ہے

افتخار امام

بمبئی ۲۲ دسمبر ۱۹۹۹ء

افتخار امام صدیقی

ممبئی

دسمبر 1999ء میں، میں ممبئی میں تھی۔ جو میرے بچپن کا ساتھی شہر ہے۔ میرے کچے پکے شعور لاشعور کے شگوفے جہاں پروان چڑھنے کو تھے کہ وہ شہر مجھ سے چھوٹ گیا۔ سعید رضا سعید صاحب کا گھرانہ کراچی میں تھا۔ میں بھی ان کے ساتھ یہاں آگئی۔ پھر سالوں بیت گئے ممبئی کی خوشبو مجھ سے جدا نہیں ہوئی۔ آج بھی مجھ سے لپٹی ہوئی ہے۔

افتخار امام صدیقی بھی ممبئی میں رہتے ہیں اور ایک ماہنامہ بنام "شاعر" شائع کرتے ہیں جس کے پہلے صفحے پر اب بھی فکر امروز، کی سرخی کے نیچے ان کے جدِ امجد محترم سیماب اکبر آبادی کی تصویر شائع ہوتی ہے۔ دسمبر 1999ء میں "شاعر" کی اشاعت کو ستر (70) سال ہو چکے ہیں۔ افتخار امام کہتے ہیں کہ "اردو زبان و ادب کے لیے ہمارے اسلاف کا یہ زبردست کارنامہ ہے۔ ہم اس پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ 70 سالہ شاعر ایک چہرہ، ایک شخصیت ایک اکاڈمی نہیں بلکہ ایک عالمی ادارے کا نام ہے۔ تحقیق ایک مستقل موضوع ہے۔ بیسویں صدی کے ادب کا ایک بڑا تاریخی رسالہ 'شاعر' میں محفوظ ہے۔"

افتخار امام صدیقی 16 نومبر 1947ء کو آگرہ (یوپی۔ ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ حضرت

علامہ سیماب اکبر آبادی ان کے دادا اور محترم اعجاز صدیقی ان کے والد صاحب تھے۔ بمبئی یونیورسٹی سے بی اے کر رہے تھے کہ تعلیم ادھوری چھوڑنا پڑی۔ پھر انہوں نے مختلف کورسز میں اسناد لیں۔ شاعری کی ابتداء 1960ء سے کی اور صحافیانہ زندگی کا آغاز 1970ء سے ہوا۔ ممبئی کے روزنامہ انقلاب اردو ٹائمز، ہندوستان، قیادت وغیرہ میں کام کیا۔ مختلف کالم اور فیچرز بھی لکھے۔ ان کی ادارت میں ماہنامہ "شاعر" کے کئی یادگار ضخیم نمبر شائع ہوئے۔ انہوں نے "شاعر" کے تاریخ ساز مشہور کالم 'جرعات' کے تحت 1978ء سے تاحال مختلف موضوعات پر سو سے زائد مضامین تحریر کیے ہیں۔ ان کا کلام کئی مشہور گلوکاروں نے گایا ہے۔ خود ترنم سے پڑھتے ہیں اور ہندو پاک کے علاوہ بین الاقوامی مشاعروں میں بطورِ خاص مدعو کیے جاتے ہیں۔

افتخار امام صدیقی نے خود کو ماہنامہ "شاعر" کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ 1978ء سے تاحال شاعر کی ادارت سنبھالے ہوئے ہیں۔ دونوں بھائی نعمان صدیقی اور اقبال حامد صدیقی ان کی معاونت کرتے ہیں۔ اقبال حامد صدیقی بڑے اچھے مصور بھی ہیں اور ہر ماہ شاعر کا سرورق سجاتے ہیں۔ جب دسمبر 99 میں میری افتخار امام صدیقی سے ملاقات ہوئی تھی اس موقع پر انہوں نے کہا تھا "میں بس اتنی زندگی چاہتا ہوں کہ ستر سالہ 'شاعر' اپنی ایک صدی مکمل کر لے۔ جنوری 2030ء (اجراء 1930ء) ہماری منزل ہے۔ شاعر اپنی دوسری صدی بھی جیے۔ یہ بھی دعا ہے۔"

انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ "ہمارے پاس وسائل کی کمی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اردو والے اپنی اس تاریخ ساز روایت کے لیے کیا کرتے ہیں۔ اسے کس طرح اپنا فخر بناتے ہیں۔ ستر سالہ شاعر کو کس طرح اپنا تعاون دیتے ہیں!" پھر یہ سطریں انہوں نے "شاعر" جنوری 2000ء کے شمارے میں صفحہ 4 پر شائع بھی کی ہیں۔ اگر میں کسی جامعہ کی سربراہ ہوتی۔ اگر میں کسی ملک کی، کسی صوبے کی وزیر تعلیم یا ثقافت ہوتی یا میں کسی ادبی ادارے کی سربراہ ہوتی تو اپنے وسائل استعمال کر کے افتخار امام صدیقی کو "پی ایچ ڈی" کی اعزازی سند ضرور دیتی اور ساتھ میں "شاعر" کے لیے مالی وسائل کی فراہمی کا انتظام کرتی۔ کیونکہ میں نے خود دس سال تک اپنا ذاتی ماہنامہ 'روپ' شائع کیا ہے اور جانتی ہوں کہ کیسے اپنے شب و روز کا آرام حرام کیا تھا۔ صرف 'روپ' کو زندہ رکھنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے بچوں کو ان کی تعلیمی منزلوں تک پہنچانے اور کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے بھی اور افتخار امام نے تو اپنا گھر بھی اسی لیے نہیں بسایا کہ ان پر شاعر کو آباد کرنے کی دھن سوار تھی اور ہے۔ ان کی یہ نظم بھی ان کی اسی سوچ، جذبے اور کیفیت کی ترجمان ہے

مجھے بوڑھا نہیں ہونا ہے ابھی
بعض لمحوں اور جذبوں کے لیے، وہ جو کھوئے نہیں گئے اب تک
کبھی بھلائے نہیں گئے مجھ سے، وہ جو وقت کی تہوں میں کہیں
گم نہیں ہوئے، تحلیل نہیں ہوئے

افتخار امام ان جذبوں کو لے کر جینا چاہتے ہیں۔ اپنے شعری جذبوں کی پرورش بھی چاہتے ہیں۔ شعر کہتے ہیں مشاعروں میں چھا جاتے ہیں۔ گو میں نے انہیں ابھی تک کسی مشاعرے میں نہیں سنا لیکن لوگوں نے بتایا کہ ان کا ترنم خوب ہے۔ اسی حوالے سے ان سے میرا پہلا سوال تھا جو سوالنامے سے ہٹ کر تھا کہ "آپ مشاعروں میں ترنم سے پڑھتے ہیں۔ کیا اچھے کلام کو ترنم کی ضرورت ہوتی ہے؟ اور جب جبکہ ترنم کا رواج بھی ختم ہوتا جا رہا ہے اور ہندوستان سے جو شاعرات بلائی جاتی ہیں ان کے لیے کہا جاتا ہے کہ ان کی شاعری بے جان ہے صرف گلے بازی رہ گئی ہے۔"

افتخار امام صدیقی کا جواب تھا کہ "اعتراض وہ کرتے ہیں جو ترنم یا لحن میں پڑھ نہیں سکتے یا وہ لوگ جو مشاعروں میں کامیاب نہیں ہوتے۔ ورنہ آپ ہی بتائیے کہ ترنم سے اگر کلام کے عیوب چھپائے جاتے تو آسمانی صحائف قرأت میں کیوں پڑھے جاتے ہیں؟ قرأت کے عالمی مقابلے کیوں ہوتے ہیں؟ باقاعدہ اس کی تربیت کیوں دی جاتی ہے۔ میری رائے میں تو اچھا کلام ترنم سے پڑھا جائے تو آواز اور کلام روح کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔ شاعری کے آہنگ کو ترنم کے ذریعے ابھارا جاتا ہے۔ ترنم اور گائیکی میں فرق ہے۔ میں پاکستان میں پنجاب کے مشاعروں میں گیا تو مجھ سے بطورِ خاص ترنم میں پڑھنے کی فرمائش کی گئی، جس سرزمین کے خمیر میں ترنم ہو جہاں سے بزرگانِ دین ابھرے ہوں جن کا خیاں گائی جاتی ہوں۔ اب اگر کلام کو فلمی گانوں کی طرز میں پیش کیا جائے گا تو بلاشبہ وہ مشاعروں کے ماحول کو متاثر کرنے کا سبب بنے گا اور ابھی جن شاعرات کی گلے بازی کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ شاعرات نہیں متشاعرات ہیں۔ آپ شاعرات کو بلوائیے پھر کسی کو یہ شکایت نہیں ہوگی۔ اب جہاں تک میرے ترنم سے پڑھنے کا سوال ہے میں نے اپنے مداح سامعین خود پیدا کیے ہیں جو کہتے ہیں کہ افتخار امام کو بلائیے تو اچھے ترنم کے ساتھ اچھی شاعری اور اچھا کلام سننے کو ملے گا۔ میں جب شعر سناتا ہوں تو بالکل نہیں چاہتا کہ مجھے ہر شعر پر داد دی جائے۔ میں کہتا ہوں کہ بس توجہ سے سنیئے۔ آپ کی توجہ ہی میری داد ہوگی۔ میں داد کے لیے وہ حربے استعمال نہیں کرتا جو دیگر شعراء کرتے ہیں۔"

میں نے افتخار امام صدیقی سے کچھ سوالات "گفتنی" سے بھی کیے۔ انہوں نے کہا "بیسویں صدی میں اردو ادب میں زندہ رہ جانے والے ناموں میں نثر نگاری میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت، منٹو، غلام عباس، رشید جہاں، ممتاز مفتی، جمیلہ ہاشمی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، بانو قدسیہ اور قرۃ العین حیدر (جو فکشن میں بیسویں صدی کا بہت بڑا نام ہے)۔ شاعری میں اقبال، جوش سیماب، یگانہ فراق، میراجی، مجید امجد، فیض احمد فیض وغیرہ کے نام اہم اور بڑے نام ہیں۔ اس حوالے سے میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ پچھلے بیس پچیس برسوں میں خواتین ادیب اور شاعرات بہت تیزی سے ابھری ہیں جیسے پروین شاکر، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید اور ادا جعفری (ادا کا نام بنیادی نام ہے۔)

تذکرہ نگاری کے حوالے سے آپ کا نام لیا جائے گا۔ ادبی تاریخ میں آپ کے نام سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ خواتین اگلے چند سالوں میں بہت تیزی سے چھا جائیں گی۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ 'شاعر' کے ذریعے ان کے ادبی کارنامے سامنے آئیں۔ کیونکہ میرے والد اور دادا علامہ سیماب اکبر آبادی نے آزادیٔ نسواں کے لیے بڑا کام کیا ہے۔ نظمیں غزلیں کہیں۔ کتابیں لکھیں شاعر کا خواتین افسانہ نمبر شائع کیا۔ مجھ پر الزام ہے کہ افتخار لڑکیوں کی تحریریں چھاپتا ہے لیکن میں لڑکیوں کی نہیں ٹیلنٹ کی تحریریں چھاپتا ہوں۔"

میرا اگلا سوال محترم علی سردار جعفری کے حوالے سے تھا۔ ان دنوں ان کے ایک انٹرویو میں، میں نے پڑھا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ 'ترقی پسند ادب ایک مقصد کے تحت تخلیق کیا گیا جبکہ جدیدیت میں یہ بات نہیں پائی جاتی' آپ کی رائے کیا ہے؟

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "یہ ان کی اپنی آئیڈیالوجی ہو سکتی ہے۔ اس ادب میں نعرے بازی بھی ہے اور مقصدیت بھی ویسے ترقی پسندی اور جدیدیت کی بحث بہت طویل ہے۔ میرے نزدیک دونوں نے بڑی طاقتوں کے زیرِ اثر کام کیا ہے۔ وہ دور تھا ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کا۔ ہندوستان میں ترقی پسندی کا زمانہ 37-36ء کا ہے۔ اس لحاظ سے سیاسی نظام کیا ہونا چاہئے لوگ اس کے لیے ذہن بنا رہے تھے۔ مثلاً روس کا انقلاب بڑا انقلاب تھا۔ مارکسزم کا زور تھا اور نظریہ تھا کہ مارکسزم انسانیت کا نجات دہندہ یا رہبر ہے۔ دراصل کوئی بھی تحریک نظریہ یا رجحان زیادہ عرصہ نہیں ٹھہرتا۔ وقت کے ساتھ تبدیلیاں آتی ہیں۔ جدیدیت اور ترقی پسندی نے اپنا اپنا کام کر لیا اور نفع یا نقصان جو اٹھانا تھا اٹھا لیا۔ اب جدیدیت سے آگے مابعدِ جدیدیت پر کام ہو رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نظریے کی وابستگی روح سے ہونی چاہئے۔ لایعنی بات اپنی موت آپ مر جاتی ہیں۔"

ترقی پسندی اور جدیدیت سے ہوتے ہوئے گفتگو کا رُخ اس سوال تک پہنچا کہ "اب جو ادب تخلیق ہو رہا ہے اُسے کس خانہ میں رکھا جائے گا؟"

انہوں نے کہا۔ "میں ادب میں خانے رکھنے کا قائل نہیں ہوں۔ میں ادب کو نام دینے کا بھی قائل نہیں۔ آپ کا جو عہد ہے آپ اپنی تحریروں میں اسی سے پہچانے جائیں گے۔ مابعد جدیدیت کا مطلب ترقی پسندی اور جدیدیت سے آگے ہے لیکن مابعدِ جدیدیت کو میں ان لسانی معنوں اور اصطلاحوں میں نہیں لیتا جن معنوں میں اسے گھیر کر رکھا گیا ہے۔ نئی نسل آج اپنے عہد میں جی رہی ہے اور جو لفظیات اس کے پاس ہیں انہی میں اپنا ادب تخلیق کر رہی ہے اور یہ تو ارتقائی عمل ہے۔ اسے آپ کوئی نام دے لیں۔ ترقی پسندی یا جدیدیت یا مابعد جدیدیت لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ آٹھ دس سال بعد کوئی اور رجحان سامنے آ جائے۔"

نثری نظم اور غزل کے حوالے سے گفتگو ہوئی تو انہوں نے کہا کہ "اب تو ایک مصرعہ کی

نظمیں آنے لگی ہیں۔ تجربے تو ہر دور میں ہوتے رہے ہیں اور ہونے بھی چاہئیں۔ اس سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں جو تحریر اور تجربہ جاندار ہو گا وہ باقی رہ جائے گا۔ آپ دیکھیے جو غزل کے خلاف صف آرا ہیں وہ مخالفت کر رہے ہیں حالانکہ غزل ایک حقیقی اور جینوئین صنف ہے اور بڑی توانا صنف ہے۔ وہ گائی جانے والی مترنم صنف ہے جبکہ قصیدہ، مرثیہ، واسوخت اور شہر آشوب کا چلن عام نہیں رہا۔ اب فی زمانہ ہائیکو ماہیے، ترائیلے سب کہے جا رہے ہیں۔ نثری نظم کا تو اب مسئلہ ہی نہیں رہا کہ وہ اپنا جواز پیدا کر چکی ہے۔ رسائل میں چھپتی ہیں اور بعض شعراء جیسے ندا فاضلی، شہریار بلراج کومل ہندوستان میں اور پاکستان میں بھی کئی شعراء کہہ رہے ہیں۔"

گفتگو خاصی طویل ہو چلی تھی اس لیے ایک آخری سوال اردو کے مستقبل کے حوالے سے کیا گیا۔ اردو رسائل پر گفتگو ہوئی۔ ماہنامہ "افکار" کراچی کا ذکر ہوا کہ اس میں ایک ماہ کا تعطل پیدا ہوا جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ افتخار امام خود اس صورتِ حال پر دکھی ہو رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ "اب الیکٹرانک میڈیم حاوی ہو گیا ہے۔ لوگوں کے پاس وقت بھی نہیں۔ تھکے ہارے ذہن شام کو ٹی وی سے تفریح لے لیتے ہیں۔ جو کتابوں کے شوقین ہیں وہی کتابیں پڑھتے ہیں۔ اب یہ کام والدین کا ہے کہ وہ بچوں کو لائبریریوں سے کتابیں لے کر پڑھنے کا عادی بنائیں۔ محلّہ وار لائبریریاں قائم ہوں جیسا پہلے والدین بچوں میں مطالعہ کا شوق پیدا کرتے تھے۔ اسی طرح رسائل میں چھپنے والے مواد میں بھی دلچسپی کا عنصر شامل کرنا چاہئے جو کہ ہماری بھی کوشش ہے کیونکہ "شاعر" زندہ ہے تو ہم سمجھتے ہیں ہمارے والدین محترم زندہ ہیں ہمارے اسلاف زندہ ہیں۔ ہماری اردو زبان زندہ ہے۔ میں زندہ ہوں۔ میری تہذیب زندہ ہے۔ حکومتوں کو بھی اس ضمن میں مدد فراہم کرنی چاہئے مثلاً سستا کاغذ، حکومت کے اشتہارات یہ سب مالی امداد کی ضمن میں آتے ہیں اور اس کی فراہمی حکومتِ وقت کا فرض ہے۔"

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ مغرب کی اذان ہوئی۔ رمضان کے دن تھے۔ ہم سب روزہ سے تھے لہٰذا کام بند کر کے اللہ کے حضور پہنچ گئے کہ وہ تو پہلا فریضہ تھا۔

MR. IFTITKHAR IMAM SIDDIQUI
EDITOR "SHAIR" MONTHLY
202- 228 DEENA NATH BUILDING,
P.B. MARG.BOMBAY 400004 INDIA

انتخابِ کلام

افتخار امام صدیقی

نیا خیال ستارہ

میرے لہو میں جرثوموں کی اک دنیا ہے
جیسے میں اپنی دنیا کا اک جرثومہ ہوں
مرا لہو میرے جسم کے اندر قیدی ہے
میں اپنی دنیا کے جسم کا قیدی ہوں
جرثوموں اور انسانوں میں کچھ فرق نہیں ہے

☆

اپنی گم ہوتی ہوئی عمر
اور ماہ و سال سے ٹوٹتے ہوئے جسم
کے باوجود
اپنے لافانی احساس کے کینوس پر
میں تیرے نام کا عکس تخلیق کر رہا ہوں
اس یقین کے ساتھ
کہ
میرا احساس
اور تیرا نام زبانوں، زمانوں
سفر کریں گے۔

☆

سنو!
تمام سچ جی لینے سے
بہت سارے عذاب
خیال بھر رہ جاتے ہیں

☆

دنیا
میرے مزاج
میرے معیار
اور میری سطح کی بالکل نہیں
دنیا بے چاری

☆

میرے اعمال
میری سانسوں کے کاندھوں پر
سفر کر رہے ہیں
میرے اعمال کا بستہ
مگر بہت ہلکا پھلکا ہے
کسی پھول کے وزن سے بھی کم
کیوں کہ
اس میں سوائے عشق کے
اور کچھ بھی نہیں ہے

☆

نظمیں نہیں ہیں یہ
تم سے مکالمہ ہے صرف
مکالمہ
جو حرف بھی ہے
لفظ بھی
دنیا اور کائنات بھی
اگر تم چاہو تو

پھر سے آغاز کریں
آؤ خوشیوں کو
اپنا ہمراز کریں۔

سہیل اقبال
4-3-99

سہیل اقبال

کینیڈا

یہ بھی ہمارے خاموش خضر حسن چشتی صاحب کا کمال تعاون ہے کہ ہفت روزہ 'راوی' بریڈ فورڈ برطانیہ میں (ایڈیٹر مقصود الٰہی شیخ) سخن ور چہارم اور گفتنی کی اشاعت کی خبر دی تب مجھے جرمن سے سہیل اقبال کا خط ملا۔ ملاحظہ ہو۔

محترمہ 13 فروری کے "راوی" میں آپ کی طرف سے دی گئی خبر پڑھی۔ جو کہ سخن ور چہارم کی اشاعت کے سلسلے میں ہے۔ اس سلسلے میں عرض ہے شعر وادب کی دنیا میں میرا داخلہ ابھی بہت ہی نیا ہے۔ اچھا شعر تو سننے کا شوق شروع ہی سے ہے۔ خاکسار عرصہ آٹھ سال سے جرمنی میں مقیم تھا اور اب کینیڈا میں ہوں۔ پہلے چند سال تو روزگار کی تلاش اور پھر دوسرے مسائل میں ہی گزر گئے۔ میرے محترم استاد مکرم حیدر قریشی صاحب جب سے پاکستان سے جرمنی تشریف لائے۔ اُن سے ملاقات کے بعد میں نے آزاد نظم لکھنے کی طرف توجہ کی۔ محترم قریشی صاحب نے میری بھرپور راہنمائی کی اور اصلاح بھی فرمائی۔ آزاد نظم سے پھر غزل کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی اور اب قریشی صاحب مجھے کھینچ کر ماہیے کے میدان میں لے آئے ہیں۔ محترم قریشی صاحب میرے خیال میں اردو ادب کے پہلے ماہیے نگار ہیں جنھوں نے وزن میں ماہیے کہنے شروع کیے ہیں۔

تعارف کے سلسلے میں عرض ہے کہ خاکسار کا نام سہیل اقبال ہے اور 1972ء پیدائش کا سال ہے۔ مقام ربوہ فیصل آباد پاکستان سے بی ایس سی کیا۔ پھر میں جرمنی چلا گیا۔ جرمنی میں زبان سیکھنے کے علاوہ فیکٹری میں کام کرتا رہا۔ جہاں پر کاغذ ہی کی کٹائی کا کام ہوتا تھا۔ میرا تعلق شعبہ اشتہارات سے تھا۔ 90 سے 99ء کے عرصے میں ہی جرمن میں مختلف کورسز میں داخلہ لیا۔ جن میں سر فہرست فوٹوگرافی اور کمپیوٹر تھے۔ فوٹوگرافی نہ صرف میرا پسندیدہ مشغلہ ہے بلکہ بعد میں ذریعہ آمدنی بھی بنا۔ جرمنی میں میرا تعلق فوٹو کلب سے بھی تھا۔ جہاں پر میری تصویروں کی ایک نمائش بھی ہو چکی ہے اور میں ٹیچر کے طور پر جرمن میں جرمنوں کو فوٹوگرافی سکھاتا رہا ہوں اور اب مارچ 99ء سے کینیڈا میں مقیم ہوں اور تماشائے اہلِ کرم دیکھ رہا ہوں۔

میرا شاعری کے علاوہ ادب کی کسی اور صنف سے ابھی تک تو کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہاں پڑھنے کا جنون ضرور ہے، ہر اچھی ادبی کتاب جہاں بھی ملے پڑھ کر ہی دم لیتا ہوں۔

شاعری کے کسی خاص مکتبہ فکر سے میری شاعری متاثر نہیں ہے۔ ہر اچھی بات ہر اچھا شعر مجھے اپیل کرتا ہے۔ شعراء میں میرے استاد محترم حیدر قریشی صاحب کی شاعری اور افسانہ نگاری سے متاثر ضرور ہوں۔ اس طرح محترمہ پروین شاکر صاحبہ (مرحومہ) سے بھی متاثر ہوں۔

میرا کلام انگلینڈ سے شائع ہونے والے ہفت روزہ اخبار "راوی" اور دیگر رسائل میں شائع ہوا ہے۔

اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں۔ جہاں تک مستقبل کا سوال ہے تو عرض ہے کہ زبان کبھی بھی جامد نہیں ہوتی۔ یہ طوفانی ندی کی طرح کہیں نہ کہیں رستہ بنا لیتی ہے۔ اب پاکستان اور ہندوستان میں بولی جانے والی زبان تقریباً ایک ہے لیکن لکھنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اردو میں زیادہ فارسی کی آمیزش ہے اردو خود مختلف زبانوں کا مجموعہ ہے اب پاکستان اور ہندوستان آکر باہر کے ممالک میں بسنے والے لوگ تو اردو سمجھتے اور بولتے ہیں اور ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ اُن کے بچے بھی اردو سیکھیں۔ اردو بولنے کی حد تک تو یہ نسخہ کامیاب رہتا ہے لیکن لکھنے اور پڑھنے پر یہ نسخہ کارگر نہیں ہوتا اور ہمارے بچوں کی اکثریت کو اردو لکھنا اور پڑھنا نہیں آتی۔ جرمنی، فرانس، بیلجیم، سوئٹزرلینڈ اور انگلینڈ جانے کا مجھے اتفاق ہوا ہے، وہاں پر جن جن پاکستانیوں سے یا اردو بولنے والوں سے ملاقات ہوئی۔ وہ سب اُس ملک کی زبان میں اردو ملا کر بولتے ملیں گے۔ میں جرمنی میں 9 سال رہا ہوں۔ ایک دفعہ میرے والدین پاکستان سے جرمنی مجھے ملنے کے لیے آئے۔ میں اب اپنی طرف سے اردو بول رہا تھا اور میرے والدین میری شکل دیکھ رہے تھے کہ بیٹا کیا کہہ رہا ہے پھر مجھے خیال آیا کہ میں اردو میں اتنی زیادہ جرمن ملا کر بول رہا تھا کہ مجھے خود احساس نہیں ہوا اور چونکہ کسی بھی ملک میں رہتے ہوئے یہ وہاں کا روٹین بن جاتا ہے کہ آپ اس ملک کی زبان اور اپنی مادری زبان دونوں ملا کر یوں بولتے ہیں کہ آپ کو خود احساس نہیں رہتا۔ کینیڈا اور امریکہ میں تو میرا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑا ہے جو آدمی اردو اور آدھی انگلش بولتے ہیں اور انہیں بالکل بھی

محسوس نہیں ہوتا کہ وہ ایک مکس زبان بول رہے ہیں۔ ایک امریکی رائٹر نے حال میں "ثقافتوں کی جنگ" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس پر کافی شور مچا حالانکہ میرے خیال میں تو دوسری جنگِ عظیم کے بعد ہی سے یہ ثقافتوں کی جنگ شروع ہو چکی ہے کیونکہ اُسی وقت سے نقل مکانی ہو رہی ہے، اتنی لمبی چوڑی تمہید باندھنے کا میرا مقصد صرف یہ کہنا ہے، مستقبل میں اردو اپنی اصل اور خالص حالت میں نہیں رہ سکتی۔ اردو میں اتنی زیادہ لچک ہے کہ یہ ہر زبان کو اپنے اندر سمو سکتی ہے۔

شاعری میں اظہارِ خیال کا بہتر ذریعہ وہ صنف ہے جس سے دوسرے آپ کی بات آسانی سے سمجھ جائیں اور اس پر غور کر سکیں۔ اب وہ چاہے نثری نظم ہو یا غزل۔ نثری نظم اور نثری غزل کے تجربے ہو رہے ہیں اور تجربے ضرور ہونے چاہئیں بلکہ اسے اور آگے بڑھنا چاہئے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ آپ کا پیغام دوسروں تک پہنچ جائے۔

مشاعرے اور تخلیقی نشستیں دونوں ہی ادب کی تخلیق میں معاون کردار ادا کرتی ہیں اگر باقاعدگی سے ہوتی رہیں تو لوگوں میں بھی اپنی نشستوں میں جانے کا شوق بڑھتا ہے۔ یہاں کینیڈا کا تو ابھی پتہ نہیں لیکن جرمنی میں تو ہر تیسرے چوتھے مہینے ایک مشاعرہ یا ادبی نشست ہوتی تھی محترم عرفان خان صاحب کے توسط سے وہاں میں جاتا رہتا تھا اور یہی دیکھنے میں آیا ہے لوگ کافی شوق سے آتے ہیں اور اگر ان نشستوں میں باقاعدگی رہے تو تعداد غیر معمولی طور پر بڑھتی جاتی ہے لیکن ہمارا مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہم میں بہت جلد دھڑے بازی اور گروپ بن جاتے ہیں اور بعض اوقات تو یہ گروپ ایک دوسرے کے خلاف ایسی ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ آدمی سُن کر حیران رہ جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ جب لکھنے والا ایسی بات کہہ سکتا ہے تو پڑھنے والا کیا کہتا ہو گا اس پر بلاشبہ ہمیں غور کرنا چاہئے۔

میرا خیال میں جب آپ مشاعروں کا انعقاد کریں گے لوگوں کو اس طرف لائیں گے تب ہی کتابوں کی بقا ممکن ہو گی اور پڑھنے کا شوق کا پیدا ہو گا۔ اب الیکٹرونک میڈیا کی وجہ سے کتابوں کا مطالعہ اور اشاعت کم ہو گئی ہے تو کیوں نہ الیکٹرونک میڈیا پر ہی ہم کتابوں کی اشاعت کے اشتہار دیں۔ یہ مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن تو نہیں ہے جس طرح آپ نے ایک اچھی کاوش کی اور 'سخن ور' کے نام سے چوتھی جلد شائع کر رہی ہیں۔ اب ان کتب میں چھپنے والے شاعر اور ادیب حضرات وغیرہ کے نام اور پتے تو آپ کے پاس ہوں گے چنانچہ ان سب حضرات کی رائے سے اگر ایک تنظیم بنالی جائے۔ جس کا بے شک سالانہ (چندہ) زرِ رفاقت ہو اس طرح تنظیم میں شامل حضرات میں سے اگر کسی کی کوئی کتاب وغیرہ چھپتی ہے تو دوسرے اپنے اپنے علاقے یا ملک میں جہاں وہ رہ رہے ہیں اُس کی وہاں کے مقامی اخبارات یا ٹی وی وغیرہ میں تشہیر کریں تو میرے خیال میں کوئی وجہ نہیں ہے کہ اگر ایک کتاب پاکستان میں چھپتی ہے تو وہ دوسرے ممالک کے رہنے والے نہ پڑھ سکیں۔ یہاں کینیڈا، امریکہ، جرمنی، انگلینڈ وغیرہ میں ایشین لوکل ٹی وی چینل ہیں جن پر

اشتہار دینا میرے خیال میں مشکل نہیں یہ مہنگا بھی نہیں ہوگا۔اس طرح ٹی وی چینل پر اگر کتب کا نہ ہو سکے تو کم از کم مشاعروں یا ادبی نشستوں کا اشتہار ہی دیا جائے جب لوگ ان مشاعروں میں آئیں تو انہیں مختلف کتب سے متعارف کروایا جاسکتا ہے۔ میں نے جو اپنا خیال لکھا ہے۔ یہ مشکل ضرور ہو سکتا ہے ناممکن نہیں۔

آخری سوال میں آپ نے لکھا ہے کہ ادب کی ترقی کے لیے تنقید ضروری ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ اس تنقید کا معیار کیا ہوگا اور اس کی حد کیا ہوگی؟ میرے خیال میں ادب برائے زندگی ہونا چاہئے۔ تنقید کرنے والے کو چاہئے کہ وہ تنقید کرنے سے پہلے اُس سے اچھا لکھ کر یا بن کر دکھائے۔ پھر وہ تنقید کا حق بھی رکھتا ہے۔

MR. SOHAIL IQBAL
12 Ave. S.W. 825 APT 505
Calgary A.L.B T2 ROJ2 (CANADA)

ماہیے

گلشن میں جو تو آئے
خوشبو پھولوں کی
پہلے سے بھی بڑھ جائے

پھر سے آغاز کریں
آؤ خوشیوں کو
اپنا ہم راز کریں

آنا گھبراتے ہوئے
پھول مجھے دینا
لیکن شرماتے ہوئے

جیون کو ستاتے
پیار بھی کرتے ہیں
اور لڑتے بھی جاتے ہیں

رات آئی ہے بچوں کو پڑھانے میں لگا ہوں
خود جو نہ بنا ان کو بنانے میں لگا ہوں

اکبر حمیدی
اسلام آباد ۔ 25 دسمبر ۱۹۹۸ء

اکبر حمیدی

اسلام آباد

اکبر حمیدی نثر نگار بھی ہیں اور شاعر بھی۔ فیصلہ کرنا مشکل تھا کیونکہ انہوں نے گفتنی اور سخن ور دونوں کے لیے سوالوں کے جواب عنایت کیے تھے اور بہت ناپ تول کر گفتگو کی اور سلجھے نکھرے انداز میں کہ بات دل کو لگتی ہے۔ پھر یوں ہوا کہ ان کی شاعری کے لہجے نے اکسایا کہ "ہم سے رابطہ کرو۔" ان کی شاعری میں نئے عہد کا دکھ بھی ہے اور ان کی غزل میں میر کی روایت کی پاسداری بھی۔ جدید عہد میں انسان جن مصائب میں مبتلا ہے اس کا عکس بھی ان کی غزل میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو

ترس گئی ہیں فضائیں نئی اڑانوں کو
پرندے لپٹے ہوئے گھونسلوں سے بیٹھے ہیں

ہم اہلِ فکر کے شایاں نہیں ہے کوزہ گری
تو ہم الگ بھی کوزہ گروں سے بیٹھے ہیں

سہل ممتنع کی ایک بہتر مثال ان کی اسی غزل کا مقطع ہے جس میں غزل کا بھرپور رنگ اور جدید و قدیم لہجے کا ملا جلا آہنگ بھی ہے۔

ہر اک طرف سے ہے منظر بہشت کا اکبر
وہ انجمن میں کئی زاویوں سے بیٹھے ہیں

محترم اکبر حمیدی دل میں کھب جانے والی شاعری کرتے ہیں اور ذہن کو متاثر کرنے والی گفتگو۔ ان سے کچھ ان کے اپنے بارے میں سنتے ہیں۔ یہ کہہ رہے ہیں میرا نام چودھری محمد اکبر بُگر ہے اور قلمی نام اکبر حمیدی ہے۔ تخلص اکبر کرتا ہوں۔ یکم اپریل 1936ء کے دن قصبہ فیروز والہ ضلع گوجرانوالہ پنجاب پاکستان میں پیدا ہوا۔ تعلیم۔ ایم۔ اے تک اردو اور پنجابی میں حاصل کی۔ کالج میں درس و تدریس کا پیشہ اپنایا۔ 1978ء تک گوجرانوالہ میں رہا۔ 1979ء کو اسلام آباد بسلسلہ ملازمت آیا اور تب سے یہاں ہوں۔ اب یہاں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی ہے۔ کالج میں شعبہ اردو میں تھا اور صدر شعبہ اردو کی حیثیت ریٹائر ہوا ہوں۔ یہ کالج اسلام آباد ڈگری کالج ہے۔

انشائیے کے میرے تین مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ 1- جزیرے کا سفر 1985، "تتلی کے تعاقب میں" 1991ء میں اور "جھاڑیاں اور جگنو" 1998ء میں۔ یہ میری پسندیدہ صنف ہے۔ میرے لکھے ہوئے خاکوں کا مجموعہ "قد آدم" بھی شائع ہوا اور ان دونوں اصناف سے بھی مجھے بہت گہری دلچسپی ہے۔ شاعری میں میرا مکتبہ فکر ہیومن ازم ہے۔ یعنی انسان سے محبت۔ میں پورے انسان سے متعلق شاعری کا قائل ہوں۔ محض دائیں، محض بائیں، محض داخلی یا محض خارجی شاعری نامکمل شاعروں کی شاعری ہے۔

میرے نزدیک اردو میں صرف غالبؔ مکمل شاعر تھے اور کس قدر میر تقی میرؔ۔ میں جذبے اور فکر دونوں کو شاعری کا محور سمجھتا ہوں۔ ہمارے ہاں شاعری اب زیادہ تر مکینکل عمل بن کر رہ گئی ہے یا محض سطحی جذبات سرائی۔ یا پھر معاملہ بندی اور نئے دور کے حسن و عشق کی کہانی۔ ہمارے دور میں جن لوگوں کو شہرت ملی ہے وہ انھی باتوں کی وجہ سے یا ان کی سماجی حیثیت کے باعث، اور بھرپور پراپیگنڈہ بھی اس میں شامل ہے یا پھر ادبی رسائل و اخبارات کے مدیران اور دوسرے ذرائع ابلاغ سے وابستہ لوگوں کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے۔ ہمارا معاشرہ منافق، بددیانت اور خوشامدی، ابن الوقت معاشرہ ہے اس لیے جہاں دوسرے سبھی شعبوں میں بددیانت لوگ آگے آئے ہیں وہیں شعر و شاعری میں خصوصیت سے ایسے ہی جعلی لوگ سامنے آ گئے ہیں۔

میری بیشتر شاعری اوراق، فنون، نقوش ادبیات، افکار، پاکستان کے ہر اچھے ادبی رسالے میں شائع ہوئی ہے۔ میں ہر طرح کی کتب پڑھتا ہوں۔ شاعری، انشائیہ، سوانح، فلسفہ، افسانہ، ناول، خاکہ کالم وغیرہ۔ میری زندگی کا ہر اہم کام جیسے اتفاق سے ہو گیا۔ میں خداوند کریم کو اپنا محسن عظیم سمجھتا ہوں۔ انسانوں سے محبت کرتا ہوں۔ واقعات کہاں تک لکھوں گا۔ ابھی مارچ 1990ء میں میری خود نوشت "جست بھر زندگی" شائع ہو رہی ہے۔ ارسال خدمت کروں گا۔

میرے نزدیک اردو کا مستقبل پاکستان میں روشن ہے۔

میری رائے میں شاعری میں غزل سب سے موثر صنف ہے مگر بعض حالتوں میں نظم اس سے بھی ضروری ہے اور بہتر لگتی ہے۔ ہائیکو بہت اچھی صنف ہے۔ نثری نظم میں سلیم آغا قزلباش اور کشور ناہید نے اچھی نظمیں کہی ہیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ نثری نظم اظہار کی ایک ضرورت ہے جب پابند میڈیم کام نہ دے رہے ہوں تو شاعر کیا کرے۔ تب نثری نظم میں وہ بات کہی جا سکتی ہے۔ اسے موثر شاعرانہ صنف کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ دیکھئے کوئی بھی صنف محض ایک فارم ہے۔ میڈیم ہے۔ فارمیٹ ہے۔ سارا انحصار اس کے استعمال پر ہے اس لیے نثری نظم کامیابی کی طرف گامزن ہے۔ جیسے نثر میں انشائیہ کی مخالفت کی گئی اور بدزبانی کی حد تک اسے برا بھلا کہا گیا مگر اب ہر رسالہ انشائیہ شائع کر رہا ہے حتیٰ کہ "فنون" بھی انشائیہ شائع کر رہا ہے اگرچہ مشکور حسین یاد صاحب کے افسانے بھی انشائیے تک محدود ہیں۔ سو کوئی بھی صنف اچھی یا بری نہیں۔ اچھے لکھنے والے ملیں گے تو صنف طاقتور ہوگی ورنہ کمزور پڑ جائے گی۔

نثری غزل اس لیے کامیاب نہیں ہو رہی ہے کہ روایتی غزل ابھی تک اس قدر جاندار ہے کہ کسی اور صنف کو راستہ نہیں دے رہی ہے حتیٰ کہ آزاد نظم بھی دوسرے درجے پر ہے۔ ویسے بھی آزاد نظم اظہار کی دھند سے نکل نہیں پا رہی ہے۔ نئی آزاد نظم مجید امجد کی سب اچھی ہیں۔ راشد ذہنوں سے ماورا ہیں۔ میراجی بھی اظہار کی دھند کا شکار ہیں۔ میرے خیال میں صرف ڈاکٹر وزیر آغا کو نئی نظم کا نمائندہ شاعر کہا جاسکتا ہے اس وقت وزیر آغا نے جیسی آزاد نظم کہی ہے کسی اور نے نہیں کہی۔ ان کی طویل نظمیں "آدھی صدی کے بعد" اور خصوصاً "اک کتھا انوکھی" اردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ یہ نظمیں بیک وقت عوام و خواص کے ذہنوں اور وجدانوں کو محظوظ کرتی ہیں۔ ان حالات میں نثری غزل کے لیے ابھی تک کوئی جگہ خالی نظر نہیں آتی۔ نثری غزل میں جو چیزیں لکھی گئیں وہ بے مزا اور بے آہنگ لگتی ہیں اور ان کی حیثیت "ایجادِ بندہ" سے زیادہ نہیں ہے۔

تخلیق ادب کے لیے مشاعرے بھی اچھے ہیں مگر مشاعروں کی شاعری عام طور پر سطحی سمجھی جاتی ہے۔ تخلیقی نشستیں بھی اس کی ایک قسم ہیں۔ تخلیق کے لیے ذاتی طور پر پڑھنا لکھنا مگر گھر بیٹھ کر زیادہ اہم ہے۔ رسالہ اور کتاب جو تحریک دیتے ہیں ان کا کوئی بدل نہیں ہے۔ مشاعرے اور نشستیں تفریحِ طبع کے لیے ضروری ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے شاعروں نے جو آزاد نظم لکھی ہے وہ ان کی غزل سے مختلف نہیں ہے۔ اس کا ذائقہ اور مزاج ان کی غزل ہی سا ہے۔

کتابوں اور رسالوں کی بقا کے لیے نظامِ تعلیم اور معیارِ تعلیم بہتر بنانا چاہیے۔ اگر ہم تعلیم کا سارا نظام ملازم کے حوالے کر دیں گے تو ادب کا یہی حال ہوگا۔ تعلیم کے ذریعے سے ہمیں نئی نسل کو روشن خیال انسان دوست، عقلیت پسند انسان بنائیں گے تو ادب پڑھا جائے گا اور کتاب اور رسالے کی طلب بڑھے گی۔ ہمارے ہاں سیاست ہمیشہ ہر شعبے پر غالب رہی ہے۔ تعلیم بھی اس کے زیرِ اثر

ہے۔ آپ کو پتہ ہے یہاں اسلامی ادب کا شوشہ بھی چھوڑا گیا تھا۔ ایسے میں ہمیں غیر جانبدار ہو کر نئی نسل کو تیار کرنا ہے جو علمی تقاضوں اور معیاروں پر پوری اتر سکے اور کنویں کی مینڈک نہ بنے۔

پہلے تو تنقید کی زبان اس قدر بقراطی ہے اور پیوست زدہ ہے کہ اسے پڑھنا ہی بیحد مشکل ہے۔ تنقید، لکھاری اور قاری کے درمیان ایک پل تھا جو اب ٹوٹ گیا۔ دوسرے یہ کہ نقاد بھی انہی لوگوں کو توجہ دیتا ہے اور انہی کے لیے کلمۂ خیر کہتا ہے جو مفید ہیں اور سماجی مرتبہ رکھتے ہیں اور ان کے کام آسکتے ہیں یا دوست نوازی ہے یا تقریباتی تنقید ہے۔ یہ شعبہ بہت ابتر ہے۔ سو ہم سب کو صبر واستقامت کے ساتھ اپنا اپنا کام کرتے رہنا چاہئے اور اچھے وقتوں کا انتظار کرنا چاہئے

اکبر حمیدی کی تقریباً سولہ عدد تصانیف ہیں:

1۔ لہو کی آگ (شاعری۔ 1970ء)، 2۔ آشوبِ صدا (شاعری 1977ء)، 3۔ جزیرے کا سطر (انشائیے 1985ء)، 4۔ تلوار اس کے ہاتھ (شاعری 1986ء)، 5۔ ریڈیو کالم (کالم۔1987ء)، 6۔ دے ڈے شیل ڈان (اردو غزلوں کے انگریزی تراجم۔ 1988ء) 7۔ تتلی کے تعاقب میں (انشائیے۔ 1990ء)، 8۔ شہر بدر (شاعری۔ 1991ء)، 9۔ مضامینِ غیب (تنقید 1993ء)، 10۔ قدِ آدم (خاکے 1993ء)، 11۔ وزیر آغا کے خطوط (خطوط 1995ء)، 12۔ اس کتاب میں (تنقید) 1995ء، 13۔ دشتِ بام و در (شاعری 1996ء)، 14۔ بکی غزل پنجاب (پنجابی شاعری 1997ء)، 15۔ جھاڑیاں اور جگنو (انشائیے 1998ء)، 16۔ جست بھر زندگی (خودنوشت مارچ 1999ء)

اب رخصت ہونے سے قبل اکبر حمید کی ایک خوبصورت نظم بھی پڑھ لیں۔

AKBER HAMIDI
HOUSE NO.2029 I
10/2 ISLAMABAD, PAKISTAN

انتخابِ کلام

اکبر حمیدی

کوئی ایسا دلاور بچہ ہو

میں سوچتا ہوں، میں سوچتا ہوں
مرے بچوں میں کوئی ایسا ہو
جو آئے مری تکمیل کرے
مجھے میری طرح تشکیل کرے
جو سپنے میں نے دیکھے ہیں
ان سپنوں کی تعبیر کرے
وہ محل جو میں نے سوچے ہیں
اُن محلوں کی تعمیر کرے
وہ لفظ جو میرے دل میں ہیں
ان لفظوں کی تشہیر کرے
جو میری طرح تکبیر پڑھے
جو میرے لیے تدبیر کرے
اور میرے پاؤں میں ڈالنے کو
جو سورج کو تسخیر کرے
جو میری ذات میں بیعت ہو
اور خود اپنی تکفیر کرے
میں سوچتا ہوں میں سوچتا ہوں
مرے بچوں میں کوئی ایسا ہو
کوئی ایسا بہادر بچہ ہو
کوئی ایسا دلاور بچہ ہو

دل ہے بے چین ادھر شام سے آنکھیں بھی ہیں نم
پھر مرے سامنے رکھ دو مرے قرطاس و قلم

سید جعفر امیر
۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء

سید جعفر امیر

ٹیکساس امریکا

علامہ اقبالؒ کی نظم "مسجد قرطبہ" ایک غیر فانی نظم ہے۔ ڈاکٹر شوکت زرین نے 17 دسمبر 1997ء کے نوائے وقت کے ادبی صفحے پر اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ "علامہ نے اس نظم کے متعلق کہا ہے کہ انہوں نے یہ نظم ہسپانیہ کے دوران قیام اس اجڑے دیار کی جامع مسجد کی زیارت کے بعد کہی تھی۔ ڈاکٹر زرین لکھتی ہیں کہ اس قسم کی اعلیٰ اور غیر معمولی تخلیق کے بعد اقبالؒ کا شمار دنیا کے صفِ اول کے شعراء میں ہوا۔"

سید جعفر امیر نے بھی جب قرطبہ کا دورہ کیا اور مسجد کو قریب سے دیکھا تو علامہ اقبال کی نظم کئی تصویروں میں ڈھل کر ان کے نہاں خانوں میں اجاگر ہو گئی اور انہوں نے یہ نظم تخلیق کی جس کا عنوان ہے۔ "قرطبہ کی مسجد میں۔" یہ نظم آپ ان کے تعارف کے ساتھ کلام کے صفحے پر ملاحظہ کریں گے۔ اس کا ایک شعر دیکھیے۔

ذکر جو اس کا سنا تھا تو چلا آیا ہوں
دردِ دل ساتھ لیے شوقِ نظر لایا ہوں

سید جعفر امیر بلاشبہ ایک درد مند دل پہلو میں رکھتے ہیں۔ انہیں اپنی زبان اردو اور اردو کی

شیریں بیانی پر ناز ہے۔ان کی ایک غزل کا مقطع ہے۔

مرے اشعار میں پوشیدہ ہیں صد رنگ عرفانی
امیر اب غور سے تم بھی سنو شیریں زباں اپنی

سید جعفر امیر کی خاص توجہ اس بات پر ہے کہ اپنی شاعری میں ان مضامین کا انتخاب کریں جن میں اردو زبان میں کم لکھا گیا ہے۔ وہ اپنے کلام میں زبان کے معیار کا خصوصی خیال رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں زبان جہاں انسان کا وسیلۂ اظہار ہے وہیں زندگی کے تمدن کی بھی مظہر ہے۔ اردو زبان میں بڑی وسعت ہے اور اگر تھوڑی توجہ دی جائے تو ہم اسے قانون سے لے کر ادب تک ہر قسم کے نازک مطالب کے اظہار کے لیے بڑے فخر سے استعمال کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اردو زبان میں اظہار کے لیے وہ خوبصورت الفاظ ہیں جو دوسری زبانوں کو میسر نہیں۔ کہتے ہیں

نقشِ احساس جو مشکل سے عیاں ہوتے ہیں
اپنے اشعار میں پھولوں کی زباں ہوتے ہیں

وہ خیالات جو شرمندۂ اظہار نہیں
نئی ترکیب سے لفظوں میں بیاں ہوتے ہیں

سید جعفر امیر اپنا زیادہ وقت مطالعہ میں صرف کرتے ہیں۔ انھوں نے عالمی ادب کا خاصا مطالعہ کیا ہے اور اس سے استفادہ بھی کیا ہے جس کا اثر ان کی نظموں میں خصوصی طور پر جھلکتا ہے۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ ان کے دوست ڈاکٹر انیس قدوائی (سابق پروفیسر اور نائب صدر برائے اکیڈمک افیرس امیریٹس اسپوکین واشنگٹن سخن شناس تو ہیں ہی مردم شناس بھی ہیں۔ وہ سید جعفر امیر کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"میانہ قد، چھریرا بدن، دلکش خط و خال، دیدہ زیب سراپا، کلین شیو، چہرے پر متانت و سنجیدگی اور تیکھے نقوش، نگاہوں میں محبت، شگفتہ دہانے پر ہلکا سا تبسم، لہجے میں نرمی، خوش اطوار، خوش اخلاق، خوش وضع اور خوش پوشاک۔ یہ ہیں شعر و ادب کے صحت مند ذوق رکھنے والے علمی و ادبی ماحول کے پروردہ، خوش فکر شاعر و ادیب سید جعفر امیر رضوی۔"

سید جعفر امیر رضوی حیدر آباد دکن کے ایک معزز متمول خاندان کے فرد سید منظور حسین رضوی کے گھر پیدا ہوئے۔ ویسے ان کا آبائی وطن لکھنؤ ہے۔ ابتدائی تعلیم گھریلو طور پر حاصل کرنے کے بعد انگریزی اسکول میں داخل ہوئے۔ وہاں ان کو قابل اساتذہ میسر آئے جنھوں نے ان کی ذہانت، شوق اور خداداد قابلیت دیکھ کر ہونہار لڑکے میں دلچسپی لی اور ان کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ابھی پانچویں جماعت ہی میں تھے کہ ایک دن اپنے والد کے پاس پہنچے اور اُن سے شاعری کرنے کے اصول اور نکات دریافت کیے۔ والد صاحب جو دفتر سے آنے کے بعد اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ حیران ہو کر اُٹھ بیٹھے اور اپنے لڑکے کو غور سے دیکھنے کے بعد فرمایا

کہ بیٹے شاعری تو خدا داد چیز ہے۔ تم ابھی تعلیم کی طرف توجہ دو لیکن امیر نے اس وقت تک بندی شروع کردی۔ کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے اپنی پہلی انگریزی کی نظم بہ عنوان (Traveller) (مسافر) لکھی اور اپنے والد صاحب کو بھی سنائی۔ گھر والوں نے یہ تاثر لیا کہ "لڑکا کام سے گیا" اس وقت ہندوستان کے حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے اور مسلمان نوجوانوں کے لیے تو مستقبل بالکل ہی تاریک نظر آرہا تھا۔ ویسے بھی شاعری سے کس نے پیٹ پالا ہے؟ چنانچہ سعادت مند بیٹے نے باپ کی بات گرہ میں باندھ لی اور اس کو کبھی نہ بھولے۔ بہر حال انگریزی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی۔ حیدر آباد میں داخلہ لیا۔ یہاں اردو کے علاوہ دو مزید زبانیں بھی پڑھنا لازمی تھیں۔ امیر نے انگریزی اور فارسی زبانیں منتخب کر کے عبدالطیف اور ڈاکٹر عبداللہ دستگیر جیسے قابل انگریزی اور فارسی کے ماہر زبان دانوں سے استفادہ کیا۔ اپنے طالب علمی کے دور میں امیر نے درسی کتابوں کے علاوہ کلاسیکل اور ماڈرن انگریزی اور اردو کی نثر و نظم دونوں کا مطالعہ کیا اور دونوں زبانوں کے لٹریچر سے شناسائی حاصل کی۔ آخر کار 1960ء میں بی۔ ایس سی کی ڈگری امتیازی نمبروں سے حاصل کر کے مزید تعلیم حاصل کرنے امریکہ آئے اور ٹیکساس اے۔ اینڈ۔ ایم (Taxsas&M) اور پنسلوانیا یونیورسٹیوں سے نیوکلیر انجینئرنگ میں خصوصی ڈگریاں حاصل کر کے اسی پیشہ کو روزگار بنالیا۔ جعفر امیر گزشتہ بارہ سال سے امریکی حکومت کے نیوکلیر ادارے سے منسلک ہیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ نیوکلیر سائنس داں کے اس پیشہ ور کو امریکہ میں نہایت ہی غیر شاعرانہ ماحول میں کام کرنے کے باوجود اس کی شعر و شاعری اور ادب سے دلچسپی برقرار رہی۔

امیر کو جذبہ شاعری نہ صرف فطری طور پر ودیعت ہوا تھا بلکہ ورثہ میں بھی ملا۔ ماں، باپ دونوں اچھے شاعر تھے۔ ان کے زمانہ میں حیدر آباد میں بڑے باکمال شعراء موجود تھے اور شعر و شاعری کا بڑا چرچا تھا فضا تجمی اور محی الدین وغیرہ کے نغموں سے گونج رہی تھی۔ ہر طرف شعر و سخن کے چرچے، علم و ادب کی باتیں تھیں۔ جگہ جگہ شعری محفلیں منعقد ہوتی تھیں جن سے شائقین کے ذوق کی تسکین بھی ہوتی تھی اور طالبان فن کی تربیت بھی۔ اس ماحول نے امیر پر جلاء کی چونکہ شعر و ادب کا فطری ذوق لے کر آئے تھے۔ شعور شق سے جلد ہی دنیائے ادب میں مقبولیت حاصل کرلی۔

امریکہ کی تیز گام زندگی، گھریلو مصروفیات اور ملازمت سے جو وقت ملتا ہے اسے جعفر امیر اپنی تسکین ذوق کے لیے علم و ادب اور فن شاعری کی آبیاری میں گزارتے ہیں۔ امریکہ کے مختلف شہروں میں منعقد ہونے والے مقامی اور بین الاقوامی مشاعروں میں مدعو کیے جاتے ہیں اور کوشش کر کے شرکت کرتے ہیں۔ جعفر خود اپنے دولت کدہ پر بھی گاہے گاہے مشاعروں کی نشستیں منعقد کرتے رہتے ہیں۔ وہ اور ان کی بیگم رقیہ امیر اور ان کے بچے طالب، ہما اور صنوبر، شعراء اور دیگر مہمانوں کی خاطر و مدارات کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔ جعفر امیر مشاعروں میں خاص طور سے شیروانی اور پائجامہ زیب تن کرتے ہیں۔ مشاعروں میں ترنم سے بھی پڑھتے ہیں اور تحت اللفظ بھی۔

یہ ان کے موڈ پر منحصر ہے۔ ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ "عود کے بادل" 1987ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا جسے ادبی حلقوں میں سراہا گیا اور داد تحسین کا مستحق ٹھہرا۔ ان کی انگریزی نظموں کا مجموعہ The Obtant song بھی شائع ہو چکا ہے اور امریکہ کی ادبی اور شعری انجمنوں میں نہ صرف پسند کیا گیا بلکہ کئی انعامات بھی حاصل کر چکا ہے۔ یہ بات قابلِ غور رہے کہ ان کے اجتہادِ فکر اور انداز بیان پر انگریزی ادب کا اثر پایا جاتا ہے اور اس کی جھلکیاں ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہیں۔

جعفر امیر نے شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا لیکن انہوں نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلام میں پختگی اثر آفرینی، سلاست اور صفائی کی خوبیاں پائی جاتی ہیں جو غزل کی روایات کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی تمام شاعری اور احساسات، خیالات، الفاظ و محاورات کا حسین گلدستہ ہے جس میں روایتی قدروں سے محبت، جدید رجحانات و فکر کی آمیزش اور تغزل کی شان پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان کے یہاں جذبات کی پاکیزگی معنی آفرینی، نزاکت تخیل، روانی و برجستگی، زبان و بیان کی دلکشی اور تشبیہات و استعارات کے حسنِ استعمال کی خوبیاں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار ان خوبیوں کی وضاحت کرتے ہیں۔

سیکھا چمن میں برگ سے شبنم سے پھول سے
درس حیات ان سے لیے جا رہے ہیں ہم

سیکھا ہے گل نے مجھ سے سلیقہ نکھار کا
میری نظر سے دیکھ تماشا بہار کا

شب حیات کی محرومیوں پہ کیا روتا
وہ چارہ گر میرا ہوتا اگر خدا ہوتا

اور حواسِ خمسہ پر اثر کرتی ہے مثال کے طور پر ان کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

سرسراہٹ جب ہوا کی شب کی خاموشی میں ہو
اس کے لہراتے ہوئے آنچل کا آتا ہے خیال

ہمارے سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ انہیں شاعری کے علاوہ سوانح حیات، مضامین، خطوط، سفرناموں اور ڈراموں سے دلچسپی ہے۔ ناول، کہانیاں، اور افسانوں کے مطالعہ کی طرف کم ہی توجہ کی۔ کہتے ہیں میں نے پریم چند، عصمت چغتائی اور قرۃالعین حیدر کو کالج کے زمانے میں گرمیوں کی چھٹیوں میں گاؤں کے مکان میں، چبوترے پر قندیل کی روشنی میں خوب پڑھا اور لطف اندوز ہوا۔

30 جلدیں لکھنے کے بعد ایرانی محقق البیرونی نے کہا تجر علم کے لیے دراصل ایک زندگی بہت ناکافی ہے۔ جب "سمجھ" اظہار کا راستہ نکالتی ہے تو موت سر پر آ کھڑی ہوتی ہے۔ میری نظم

"عطف" پڑھے گا تو میرے جذبات کا اظہار ہو گا (کیٹز (Keats) کی بھی ایک نظم ہے۔

When I have fears, Ill ceare to b
Before my pen has glamed my preamimy brak??
Before high pibed books is charactory
Hold like a rich garmer, the sirpened grain

دراصل سائنس اور انگریزی ادب میں اس قدر مشغول رہا کہ اردو ادب پوری طرح پڑھ نہ سکا۔ شاعری بھی بہت کم پڑھی اور اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ سخن گستری میں کسی اور شاعر کا رنگ نہ اپنانا چاہتا تھا اردو زبان میں غزل کی مقبولیت کی وجہ عشقیہ شاعری کا بہت ذخیرہ ہے۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ فطرتی رجحان کی وجہ میں نے نظم کے پیرہن میں حسنِ قدرت کا ارتسام کیا۔ آدھے سے زیادہ میرا کلام منظری حسن اور اس سے ابھرنے والی کیفیات کی عکاسی پر مستمل ہے۔ موسم گرما، سرما، برسات، خزاں، بہار، برگ و چمن و لالہ زار، دشت و جبل و میدان، آسمان، مادہ وانجم،، بحر و بر ندیاں، تالاب،، صبح کی دلکشی، شام کی اداسی، دوپہر کی سونداہٹ، یہ ہی سب میری روح میں بسے رہتے ہیں اور نغمے بن کر نکلتے ہیں۔

اردو زبان کے مستقبل کے سلسلے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے انہوں نے بتایا اردو زبان کو حکومتی سرپرستی حاصل نہیں۔ پاکستان کی قومی زبان ضرور ہے مگر اس کی ترقی یا تنزلی کا کوئی محتسب نہیں۔ ہندوستان نے تو آزادی ملنے کے بعد ہی سے اس کو عاق کر دیا تھا۔ امریکہ میں مغربی ماحول میں گھرے، نوکریوں میں بندھے ہمارے پاس وقت نہیں کہ اپنے بچوں سے اردو میں بات کریں۔ ان کو اپنی تہذیب سے واقف کرائیں۔ اپنے شعراء اور ادیبوں کی عظمت کا ذکر کریں۔ مشاعروں میں ان کو لے جائیں۔ خود سے تو یہ قوم کچھ نہیں کرے گی۔ نہ سوچے گی متنبہ کرنا مگر لوکیا (ذہین لوگوں) کا فرض ہے۔ میں اپنے گھر پر جو مشاعرے کرتا تو شروع میں آدھا گھنٹا اس عقدہ لاینحل پر سامعین کی سمع خراشی کرتا کم از کم گھر کا ماحول اردو بولنے والا رکھیں تو بچے بہت کچھ سیکھ جائیں گے۔ گھر کے ماحول کا ایک بچے کے شعور پر کتنا اثر ہوتا ہے اس کا احساس مجھے کھوست سامی ہوا یعنی اب جا کر ہوا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ تہذیب، جس کو میں نے انگریزی اسکول جانے کی وجہ سے سرسری انداز میں دیکھا تھا وہ میرے کردار کی بنیاد ہو گی۔ جو آوازیں عہد طفلی میں کانوں مین پڑی تھیں وہ میرا لہجہ اور زبان بن جائیں گی۔ جو طریقہ عمل اپنے قدما کا دیکھا تھا وہ میرے آداب ہو جائیں گے۔ میرے بزرگوں کی صدیوں پرانی سوچ جس کو فرسودہ خاطر سمجھتا وہ خود میری اپنی فکر بن جائے گی۔ ایک تجویز اور بھی ہے کہ ایک اردو کانفرنس کر سکتے ہیں جس کا عنوان ہو "اردو کی بقا" شاید اس سے اردو زبان کو کچھ فائدہ ہو۔

سید امیر کی دو تصنیفات آئندہ سال شائع ہونے والی ہیں۔ ایک تصنیف ان کی شاعری کا مجموعہ ہے اور دوسری ایک جاپانی کتاب کا ترجمہ ہے یہ ایک وناب زادی کا روزنامچہ ہے جو نویں صدی عیسوی میں لکھا گیا۔ یہ کتاب تاریخی اہمیت رکھتی ہے اس میں شاعری کا بھی کافی دخل ہے۔

SYED JAFER AMIR
P.O.BOX 33402 AMRILO, TEX 79120 U.S.A

انتخابِ کلام

قرطبہ کی مسجد میں علامہ اقبال سے خطاب

جعفر امیر

قرطبہ میں ہوں، ادھر سامنے مسجد کا مزار
ایک بستی ہے پرانی سی، فصیلیں دیوار
پیچ کھاتی ہوئی گلیوں میں مکانوں کی قطار
گنبدیں پہلوئے دریا پہ، پرانے بازار

ذکر جو اس کا سنا تھا تو چلا آیا ہوں
دردِ دل ساتھ لیے شوقِ نظر لایا ہوں

فرش پتھر کے وہی، راہ پہ ماضی کے نشان
جالیاں لوہے کی روزن پہ، یہ بوسیدہ مکان
تختیاں نام کی دہلیز پہ محرابی کمان
در و دیوار پہ سوئے ہوئے نصِ قرآن

بیٹھا کب سے ہوں اِدھر دیکھتا یہ وقت و مقام
ایک بھولی ہوئی تہذیب کی کھوئی شام

تو بھی آیا تھا اِدھر دیکھنے یہ نقشِ جمال
اسی مسجد میں تقدس کی مہارت کا کمال
بود و نابود کی، تقلیبِ مانہ کی مثال
عصرِ حاضر میں جھلکتے ہوئے ماضی کے خیال

قلبِ تاریخ کو ہے حرکتِ دوراں، دیکھوں
صبح کا وقت ہے میں شامِ غریباں دیکھوں

جانے کیوں دیکھ کے اس آنکھ سے بہتا ہے لہو
نہ پڑھیں میں نے نمازیں نہ کیا میں نے وضو
نیت نیک نہیں، منہ سے کریں اللہ ہو!
مدتوں سے ہے ترے قوم کی بگڑی ہوئی خو

ہے موذن نہ کوئی حمد خدا ساز نہیں
ہاں ترپندِ "خودی" کی بھی تو آواز نہیں

'سخنور' کا چوتھا شمارہ ایک
اچھے، ایماندار، صحت مند خاندان
کا نیا فرد بنے۔ اور اس کو
پذیرائی ہونا ضروری ہے

ستیہ پال آنند

۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء
واشنگٹن ڈی سی

ڈاکٹر ستیہ پال آنند

واشنگٹن ڈی۔ سی

1995ء میں جب میں 'سخن ور دوم' پر کام کر رہی تھی، میرے سوالنامے کے جواب میں بحرین کے شاعر محترم شاہد علی خان نجیب آبادی نے اپنے تعارف کے ساتھ محترم ستیہ پال آنند کا مضمون "اردو کی نئی بستیاں" بھیجا تھا جس کا حوالہ میں نے کسی انٹرویو میں دیا ہے لیکن صرف اس ایک مضمون سے تو ستیہ پال آنند سے مکمل طور پر متعارف نہیں ہوا جاسکتا تھا۔ بہر حال ان کے نام میں ایک کشش تھی جو مجھے بھی محسوس ہوئی۔ 'سچا دوست' میں نے اس نام کا ترجمہ کر رکھا تھا۔ کوئی "سچ" تو اس نام کے خالق اور مالک میں ہوگا ہی۔

پھر مجھے اس سچ کا پتہ 99ء میں چلا۔ لیوٹن برطانیہ کے شاعر اور صحافی محترم ساحر شیوی نے اپنا جریدہ "سفیرِ اردو" اپریل تا جون 99ء مجھے ارسال کیا۔ اس کے صفحے 9 پر ستیہ پال آنند کی ایک نعت میں نے پڑھی۔ اس نعت کے بول میرے اندر اترتے چلے گئے۔ کہیں کوئی قدرِ مشترک یقیناً تھی۔ میرے حضورِ صلعم کی جس نے تعظیم کی وہ انسان میرے لیے بلاشبہ لائق تعظیم ہے۔ آپ بھی نعت ملاحظہ کریں:

حاضری، حضور اکرمؐ، فقیر اک پائے لنگ لے کر
سعادت حاضری کی خاطر، ہزاروں کوسوں سے، آپ کے در پہ آ گیا ہے
نبی بر حق
یہ حاضری گرچہ نامکمل ہے، پھر بھی اس کو قبول کیجیے
حضور آقائے محترم، یہ فقیر اتنا تو جانتا ہے
کہ قبلہ دید صرف اک فاصلے سے، اس کو روا ہے
اس کے نصیب میں، مصطفیٰ کے در کی تجلیاں دور سے لکھی ہیں
نبی اکرمؐ، وہ سایہ رحمت، جو صف بہ صف سب نمازیوں کے سروں پہ ہے، اس کا ایک پر تو
ذرا سی بخشش، ذرا سا فیضان غفور حمت، اسے بھی مل جائے، جو شہ مرسلین
دستِ دعا اٹھائے کھڑا ہے اک فاصلے پہ لیکن
نمازیوں کی صفوں میں شامل نہیں ہے آقاؐ

یہ نظم ستیہ پال نے 14 دسمبر کو سعودی عرب کی رشک جناں سرزمین پر پاؤں رکھنے کے بعد ہوائی اڈے کی لاؤنج میں کہی اور صرف پانچ منٹ میں مکمل کی۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند کا تعارف لکھنے سے پہلے میں ماہنامہ "شاعر" بمبئی کے مئی 91ء کا شمارہ دیکھ رہی ہوں جس میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند کے لیے گوشہ ترتیب دیا گیا ہے۔ اس شمارے میں اس انٹرویو کا ترجمہ بھی موجود ہے جو جولائی 1990ء میں ڈاکٹر تھامس گرے نے واشنگٹن ڈی سی میں 'ورلڈ پوئٹری" کے پراجیکٹ کے ذیلی پروگرام کے تحت جنوبی ایشیا کی شاعری (بنگالی ہندی اردو) کے باب (Chapter) کے اختتام پر منعقد کی گئی۔ تقریب کے موقع پر کہا تھا۔ اس موقع پر حاضرین میں ممتاز ہستیاں بھی موجود تھیں۔

ستیہ پال آنند نے اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی اور پنجابی میں بھی بہت لکھا ہے۔ ان کی صرف اردو تصانیف مطبوعہ اور غیر مطبوعہ 19 کے قریب ہیں جن میں ان کے افسانوی مجموعہ، شعری مجموعے اور ناول شامل ہیں۔ انگریزی میں Studies in Urdu Poetry بھی زیرِ طبع ہے۔ اب تک ان کے فن پر 29 مقالات جیدّ ادیبوں نے لکھے ہیں۔

1997ء میں "اوراق" نے بھی گوشۂ ستیہ پال آنند کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ انہیں بین الاقوامی طور پر بھی اعزازات ملے ہیں۔

1۔ کینیڈین پوئٹری ایوارڈ 1982ء ان کے انگریزی شعری مجموعہ Figurs of Fantasy پر ملا ہے۔

2۔ فیڈرل پوئٹری ایوارڈ 1997ء انگریزی شعری مجموعہ "A Promise Kept" پر ملا۔

فروری 99ء میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے 52 سال بعد اپنی "جنم بھومی" پاکستان میں قدم رکھا۔ تو

لاہور پہنچتے ہی پاک سرزمین کو چوم لیا۔ وہاں ان کی پذیرائی بہت ہوئی۔ دی نیوز، سنڈے پاکستان، نوائے وقت اور جنگ میں ان کے تفصیلی انٹرویوز شائع ہوئے۔ لاہور پریس کلب میں صحافیوں نے انھیں مدعو کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر سہیل احمد خان نے ان پر مقالے پڑھے اور ان کی ادبی خدمات کو سراہا۔

چلیئے پھر ہم بھی چلتے ہیں ڈاکٹر آنند سے مکالمہ کرنے اور ستیہ پال سے ان کی زبانی سنتے ہیں:

"لو جی ستیہ پال جی ہم آئے ہیں۔ کچھ فرمائیں گے اپنے بارے میں؟"

"جی میرا نام ستیہ پال آنند ہے، تخلص کا گنہگار نہیں ہوا۔ آنند "کھوکر" قبیلے کی ہندو کھتری شاخ ہے اور پاکستان کے شمال مشرقی اضلاع اور صوبہ سرحد و بلوچستان میں آباد ہے۔"

انہوں میٹھے سروں میں کہنا شروع کیا:

"میری تاریخ و جائے پیدائش 24 اپریل 1931ء، موضوع کوٹ سارنگ، تحصیل تلہ گنگ، ضلع چکوال، پاکستان ہے۔ (یہ امر میرے لیے دلچسپی کا موجب بنا کہ شیکسپیئر کی تاریخ پیدائش، اس کے سوانح نگاروں کے مطابق 23 اور 24 اپریل کی درمیانی رات ہے جو برصغیر کے وقت اور ہندو علم کے زائچہ نویسی کی رو سے 24 اپریل سمجھی جائے گی۔ یہ امر بھی باعث صد افتخار رہا کہ گوتم بدھ کے پہلے چیلے اور جانشین بھکشو آنند (میرے ہم نام) کی تاریخ پیدائش فصلی کیلنڈر کے مطابق 24 اپریل کے برابر بنتی ہے)

ابتدائی مدرسہ، کوٹ سارنگ کا ڈسٹرکٹ بورڈ مڈل اسکول اور اس سے بھی قبل اردو ابجد کی شد بد گھر میں ماں اور بہنوں کے توسط سے ہوئی۔ تقسیم وطن سے پہلے نوشہرہ ضلع پشاور کے ہائی اسکول اور پھر راولپنڈی میں امریکن مشن ہائی اسکول میں کچھ برس گزارے۔ انڈیا میں ہجرت کے بعد گورنمنٹ کالج، لدھیانہ سے بی اے (آنرز ان فلاسفی) اور پھر پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ سے ایم اے اور بعد میں پی ایچ ڈی (انگریزی ادبیات) کیا۔ دیار مغرب میں بسنے کے بعد دوسری ڈاکٹریٹ فلسفے میں کی۔

30 برسوں تک اپنی Alma mate پنجاب یونیورسٹی میں لیکچرر ان انگلش سے شروع ہو کر، ریڈر اور پروفیسر اور چیئرمین اور ڈائریکٹر آف ایجوکیشن کے مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے، امریکا آنے کے لیے وقت سے قبل ریٹائرمنٹ کی درخواست کی جو منظور ہو گئی۔ ان 30 برسوں میں پانچ بار یورپ، امریکا اور کینیڈا کی مختلف یونیورسٹیوں میں وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر پانچ برسوں کا وقفہ گزارا۔ اسی طرح مختلف بین الاقوامی سیمیناروں میں حصہ لینے کے لیے آٹھ بار مختصر وقت کے لیے یورپ اور امریکا کا سفر اختیار کیا۔ 1986ء میں ہجرت کے بعد ساؤتھ ایسٹرن یونیورسٹی، واشنگٹن ڈی سی، سے الحاق رہا۔ 1992 سے 1994ء تک دو برسوں کے لیے سعودی عرب حکومت نے E.S.L کے کورس ترتیب دینے اور اپنے عرب ملازمین کی انگریزی میں تربیت کے

لیے جن پانچ انگریز اور امریکی اساتذہ کا انتخاب کیا، ان میں سر فہرست رہا۔ 1994ء میں واپس امریکا آنے کے بعد واشنگٹن ڈی سی کی مرکزی سرکاری یونیورسٹی، یوڈی سی (یونیورسٹی آف ڈسٹرکٹ آف کولمبیا) سے الحاق ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جزوقتی طور پر سائتھ ایسٹرن یونیورسٹی میں فلسفہ Art Appreciation کے کورس بھی پڑھاتا ہوں۔

انڈیا پہنچنے پر یعنی 1947ء میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، اور گھر کی ساری ذمہ داری سترہ برس کے نوجوان کے ناتواں کندھوں پر آپڑی۔ دوبارہ آبادکاری، چھوٹے بھائی اور بہن اور بیوہ ماں کی پرورش اور ان کے ساتھ ساتھ سلسلۂ تعلیم کو جاری رکھنا، جزوقتی ملازمتیں اور ٹیوشن کرنا۔ یہ سب نو دس برسوں تک میری زندگی پر حاوی رہے۔ 1957ء میں اپنی شریک حیات یعنی پرو ملا سے شادی ہوئی، اس شادی کا ثمر تین بچے ہیں، دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ سبھی بفضل خدا امریکن یونیورسٹیوں سے پوسٹ گریجویٹ ہیں اور اونچی ملازمتوں پر ہیں۔ سب سے بڑا بیٹا کینیڈا میں آباد ہے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی امریکا میں ہیں۔ میرے لیے صرف یہ امر ہی بے حد باعث تشویش ہے کہ میں انھیں اردو کی تعلیم نہیں دے سکا اور میری وفات کے بعد میری اردو کی ڈیڑھ درجن کتابیں شیلفوں میں رکھی رہ جائیں گی اور میری تیسری نسل انھیں نہیں پڑھ سکے گی۔ لیکن جو میرا المیہ ہے، وہ صرف میرا نہیں ہے، امریکا میں بسے ہوئے تقریباً سبھی اردو اہل علم کا ہے۔

میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شعر گوئی سے کیا۔ گیارہ بارہ برس کی عمر میں پہلی غزل کہی۔ سترہ برس کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی یعنی میٹرک کے طالب علمی کے زمانے سے ہی شعر گوئی کا آغاز ہو جاتا تھا اس وقت کے رسالوں "لطف شباب"، "مست قلندر"، "مستانہ جوگی"، "مصور"، "چترا" ویکلی وغیرہ میں غزلیں اور مختصر افسانے شامل اشاعت ہونے شروع ہو گئے تھے۔ 1946ء میں اپنی کچھ غزلیں اصلاح کے لیے منشی تلوک چند محروم، جو گورڈن کالج، راولپنڈی میں اردو کے پروفیسر تھے لے گیا۔ انھوں نے نہایت شفقت سے مجھ پوچھا، "کیا کوئی نظم بھی لکھی ہے؟ غزل کہنا تو پیشہ ور شاعروں کو زیب دیتا ہے۔" میں نے دو تین پابند نظمیں سنائیں۔ بہت خوش ہوئے تھپکی دی اور کہا "اب آئندہ سے نظم ہی لکھا کرو۔ تمھارے مزاج کے عین موافق ہے۔" اصلاح وغیرہ کی بات تو دھری کی دھری ہی رہ گئی۔ لیکن اسی ہفتے ڈی اے وی کالج راولپنڈی کے مشاعرے میں، جس کی صدارت محروم صاحب کر رہے تھے، جب مبتدی شعرا کے ساتھ مجھے بھی پڑھوایا گیا تو محروم صاحب نے وہی نظم سننے کی فرمائش کی جو میں انھیں سنا چکا تھا۔ نظم حب الوطنی سے متعلق تھی اور نوجوانوں کے لیے آزادی کی جنگ میں شامل ہونے کی پکار تھی۔ اب پوری نظم تو یاد نہیں ہے، کچھ مصرعے یاد رہ گئے ہیں۔

آندھیاں بن کے اٹھو، سیل کی مانند بڑھو
کس میں ہمت ہے کہ طوفانوں کا رستہ روکے

یہ جو اٹھتی ہوئی، تنی ہوئی دیواریں ہیں
وقت کی بات ہے، سب وقت کی رفتاریں ہیں

1947ء میں انڈیا پہنچنے کے بعد، والد کی وفات سے روزی روٹی کا مسئلہ درپیش آیا تو کئی ملازمتیں کیں۔ اس کے ساتھ ساتھ افسانہ لکھنے کا سلسلہ جاری کیا۔ 'شمع' دہلی سے 1950ء سے 1958ء تک آٹھ برسوں میں مجھے 150 روپے (ایک سو پچاس روپے) فی افسانہ معاوضہ ملتا رہا جو ان دنوں ایک کلرک کی ایک ماہ کی تنخواہ کے برابر تھا۔ بیسویں صدی کے مدیر خوشتر گرامی دوسرے کرم فرما تھے جو پچاس روپے فی افسانہ معاوضہ دیتے رہے۔ ان کے علاوہ پنجاب کی حکومت کے دو رسالوں جالندھر اور دہلی کے مختلف اخباروں، ریڈیو کے جالندھر اسٹیشن کے لیے مختصر مزاحیہ ڈرامے Skits لکھنے اور دیگر pen-pushcing (قلم گھسائی) کے توسط سے میں نے نہ صرف گھر کے اخراجات چلانے کے لیے روپے فراہم کیے، بلکہ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ایک بار ماں کی بیماری کے لیے روپوں کی اشد ضرورت پڑی تو دہلی میں اپنے ایک دوست خوشباش، شہزادہ تبسم بی اے کے ادارے ماہنامہ "نقاب پوش" کے لیے ایک ماہ میں چار جاسوسی ناول لکھے، جس کے لیے انہوں نے چار سو روپے کا معاوضہ دیا۔ (یہ ناول ان کے نام سے چھپے)۔ اس دوران میں اردو کے ساتھ ساتھ اپنی کہانیوں کو ہندی میں ترجمہ کر کے مختلف ہندی جریدوں میں چھپوانے سے خاطر خواہ آمدنی ہو جاتی تھی۔ اس آٹھ دس برس کے وقفے میں میرے افسانوں کے تین مجموعے اور تین ناول شائع ہوئے۔ ان ناولوں "آہٹ" اور "اپنے مرکز کی طرف" کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ اب بھی جب کبھی کسی دوست سے یہ ذکر کرتا ہوں کہ ان دنوں اپنے قلم کے جوش روانی سے میں پانچ چھ سو روپے ماہانہ کما لیتا تھا، تو وہ حیران ہوتے ہیں کہ یہ کیونکر ممکن تھا لیکن اس بات کا صرف مجھے ہی علم ہے کہ اس کے لیے مجھے بارہ سے چودہ گھنٹے روزانہ کام کرنا پڑتا تھا۔ افسانہ نویسی کے اس دور میں یعنی 1952ء سے لگ بھگ 1967ء تک شعر کہنے کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ پاکستان کے رسائل "نقوش" اور "ادب لطیف" میں باقاعدگی سے لکھا۔ "سویرا" (جب اے احمد راہی ایڈٹ کرتے تھے) میں دو تین افسانے شائع ہوئے۔ کراچی سے چھپنے والے کئی جرائد میں باقاعدگی سے لکھتا رہا۔ میرٹھ سے 'معیار' بھوپال اور دہلی سے "شاہراہ"، "راہی"، "شعلہ و شبنم"، "شعاعیں" اور کئی دیگر رسائل میں لکھا۔ زود نویسی کی تہمت لگی، تو سر ماتھے پر قبول کی۔ ایک سو سے کچھ زائد افسانے لکھے۔ اب بہت سے گم ہو چکے ہیں لیکن میرے افسانوں کے چار مجموعوں میں جو شامل ہیں ان کی تعداد پچاس کے لگ بھگ ہے۔

شاعری کے نئے دور کی شروعات 1982ء کے لگ بھگ ہوئی جب میں یکبارگی ہندی اور انگریزی سے منہ موڑ کر اردو کی طرف لوٹ آیا۔ اردو کی طرف تو لوٹنا شاید میری قسمت کا نوشتہ ہی

تھا کیونکہ جس انڈو پرشین تہذیب کی گود میں میری پرورش ہوئی تھی، ہندی اور انگریزی اس سے میل نہیں کھاتی تھیں۔ میں جس گھر میں پیدا ہوا تھا، وہاں بہنیں اور بھائی اردو اور پنجابی میں بیت بازی کرتے تھے اور فارسی کی گردان، مصدر اور مضارع کے باہمی تعلق پر بحث مباحثے میں حصہ لیتے تھے۔ "تپیدن مصدر، تپد مضارع" یعنی چار "فعلن" کے وزن میں "تپد" کو قافیہ اور "مضارع" کو ردیف بنا کر فی البدیہہ شعر کہتے تو کہاں ممکن تھا کہ میں ہندی سے چپکا رہتا لیکن شاعری کی طرف ایک بار پھر توجہ دینے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اس دوران مجھے بین الاقوامی تناظر میں اردو کی غزلیہ شاعری کو دیکھ لینے کے مواقع میسر آچکے تھے۔ ستر کی دہائی کی انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی اور سپانوی شاعری پر مبنی تقابلی ادب کے کورس پڑھاتے ہوئے جب میں اردو کی غزلیہ شاعری اور اس کی بیچ اور پوچ روایتی طرز فکر، مضامین کے انتخاب، پیش پا افتادہ تمثالوں، استعاروں اور تشبیہوں پر غور کرتا تو بہت برا لگتا۔ نیز یونیورسٹی پروفیسروں کو یہ باور کروانا مشکل ہو جاتا کہ

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

شاعری ہے، Keening نہیں ہے۔ طے کیا کہ مجھے اردو میں نظم، بطور خاص نظم معرا کے فروغ کے لیے کوشش کرنا چاہیے۔ تبھی ایسٹرن اسٹڈیز سینٹر (یو ایس اے) کے ایک پراجیکٹ میں جو ورلڈ پوئٹری پر تھا۔ مجھے اپنی یونیورسٹی کی وساطت سے برصغیر کی شاعری (اردو ہندی، بنگالی) کے چیپٹر (Chapter) کا چارج مل گیا۔ گرانٹ تو بہت زیادہ نہیں تھی لیکن مجھے تین اسکالرز کو وظیفہ دے کر کام کروانے کا اختیار تھا۔ چار برس اس پروجیکٹ پر کام کرتے ہوئے میں نے ایک سو نظمیں ایک ہی بحر یعنی بحر خفیف (فاعلاتن مفاعلن فعلن) میں لکھیں، جو بعد میں "دستِ برگ" کے عنوان سے ایک شعری مجموعہ کی شکل میں شائع ہوئیں۔ اس کا دیباچہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے تحریر کیا۔ میرے پراجیکٹ کی رپورٹ کے کچھ حصص جو ہند و پاک کے ادبی جرائد میں شائع ہوئے، ایک تازیانہ ثابت ہوئے۔ غزل پر از سر نو غور کرنے پر اردو کے اہلِ قلم مجبور ہوئے۔ "شاعر" بمبئی میں گوشہ ستیہ پال آنند چھپنے سے تو جیسے غزل گو شعرا کے لیے میں نشانۂ مشق بن گیا۔ پورے دو برسوں تک شاعر کے کالموں میں میرے افکار و خیالات کے حوالے سے بحث و مباحثہ چلتا رہا۔ یہی بحث و مباحثہ ڈاکٹر تاراچرن رستوگی (مرحوم) کے میرے بارے میں تحریر کردہ بے حد اشتعال انگیز مضامین کی وجہ سے 'طلوعِ افکار' (کراچی) اور 'انشاء' (کلکتہ) میں ایک دو برسوں تک زیر بحث رہا اور اس میں ہند و پاک کے مقتدر شعرا اور نقاد حضرات بشمول ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر محمد حسن، زاہدہ زیدی، اختر الایمان، ظہیر غازیپوری وغیرہ نے حصہ لیا۔

مختصراً یہ کہ اب میں صرف اردو نظم کی طرف متوجہ ہوں۔ غزل بالکل نہیں کہتا۔ غزل کو اردو شاعری کے مستقبل کے لیے سم قاتل سمجھتا ہوں۔ کلیم الدین احمد (مرحوم) کے مشہور قول "غزل نیم وحشی صنف سخن ہے" کو ایک بے حد ضروری تبدیلی کے ساتھ ایک نئے قول میں

تبدیل کیا ہے۔ "غزل نیم تہذیب یافتہ صنف سخن ہے۔"

گزشتہ چھ برسوں میں "دست برگ" کے بعد میرے چار شعری مجموعے منظر عام پر آئے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

"وقت لاوقت" (نئی دہلی) 1993ء، "آنے والی سحر بند کھڑکی ہے" (لاہور) 1994ء "لہو بولتا ہے" (نئی دہلی) 1997ء، "مستقبل، آمجھ سے مل" (نئی دہلی) اب چھپ کر تیار ہے۔

ان پانچ مجموعوں میں میری 350 سے کچھ اوپر نظمیں شامل ہیں لیکن (زود نویسی کی تہمت کو سر ماتھے پر قبول کرتے ہوئے) میں نے اب تک پانچ سو کے لگ بھگ نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں وہ ڈھائی سو کے قریب غزلیں شامل نہیں ہیں جو میں نے 1965ء سے پیشتر لکھیں اور جنہیں اپنا کہتے ہوئے مجھے آج شرمساری کا احساس ہوتا ہے۔ ان میں کچھ جدیدیت کے زیر اثر لکھی ہوئی غزلیں بھی ہیں جو نسبتاً تازہ کاری کا پتہ دیتی ہیں۔ نموتاً ایک غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

میکدہ، محبوب کا گھر، باغ میں پیڑوں کے سائے
گھر سے دفتر تک ہزاروں منزلوں کے فاصلے ہیں

کیا انا جومیٹری کی اک عمودی شکل ہے؟
شہر کے سب لوگ نوے ڈگریوں کے زاویے ہیں

بکھرا بکھرا اس لیے ہے میری شخصیت کا عکس
میرے گھر میں ٹوٹے پھوٹے، ٹیڑھے میڑھے آئینے ہیں
(1967ء)

جن رسائل وجرائد میں میری تخلیقات شائع ہوتی ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

پاکستان سے: "صریر"، "افکار"، "طلوع افکار"، "منشور"، "بادبان"، "آئندہ"، "ارتکاز"، "تشکیل"، "سخنور"

"اوراق"، "فنون"، "تسطیر"، "جریدہ" اور "ابلاغ"

انڈیا: "شاعر" "بمبئی" کتاب نما (دہلی) نیا سفر اور شب خون (الہ آباد)

کس مکتبۂ خیال سے میں منسلک ہوں؟ یہ کہنا مشکل ہے۔ ترقی پسند تحریک کے عروج کے وقت اگر جگر مراد آبادی کو بھی یہ کہنا پڑا "شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل" تو میری گنتی کس قطار میں ہے؟ میں بھی اس امر میں کچھ دیر تک رہا لیکن ذہن و دل کشادہ رکھنے والا انسان کبھی اپنے شعور وادراک کی کھڑکیاں بند کر کے نہیں سوتا۔ اس لیے میں بہت جلد تحریک اور انجمن ترقی پسند مصنفین سے الگ ہو گیا ترقی پسند اہل قلم انقلاب کو بھی رومان کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ نظریاتی سطحوں پر ان میں سے کوئی بھی یہ اہلیت نہیں رکھتا تھا کہ ماضی، حال، اور مستقبل کے بارے میں

وثوق سے کچھ کہہ سکے۔ میں اپنا الگ، آزادانہ مسلک رکھتا تھا اس لیے جب جدیدیت کا دور آیا، تو بھی میں ان شاعروں کی فہرست میں اپنا نام لکھوانے سے گریز کرتا رہا جو اس قسم کے شعروں کو بھی ابلاغ سے بھرپور بڑی شاعری مانتے ہیں۔ ؎ "بکری میں میں کرتی ہے بکرا ممنا تا ہے" (ظفر اقبال) اس لیے اگر میں یہی کہہ کر اس سوال کا جواب دے دوں کہ میں آنکھیں کھول کر چلنے والا انسان ہوں اور مجھے شعروادب اس لیے عزیز ہیں کہ یہ زندگی کی بہترین قدروں کے غماض ہیں تو یہ غلط نہیں ہوگا۔

ادب عالیہ کی کتابیں میرے زیرِ مطالعہ رہتی ہیں۔ دنیا کی سب سے پرانی کتاب رگ وید سے لے کر تھر گراس کی کتابیں (جنھیں اس برس نوبل پرائز ملا ہے) مجھے مسحور کیے رکھتی ہیں۔ درس و تدریس کے حصار کے اندر رہ کر مجھے انگریزی اور فلسفہ کی درسی کتابیں بھی پڑھنی پڑتی ہیں۔

میری زندگی کے اہم واقعات میں سے ایک واقعہ : منشی تلوک چند محروم سے اپنی پہلی ملاقات کا ہے جو آج سے 54 برس پہلے ہوئی تھی، میں اس کا ذکر کر چکا ہوں۔ اردو ادب کے حوالے سے کچھ واقعات اور ایسے ہیں جو میرے دل و دماغ پر اپنے دیرپا نقوش چھوڑ گئے ہیں۔ ایک تو فیض احمد فیض سے میری آخری ملاقات کے بارے میں ہے۔ اس ملاقات کا ذکر ڈاکٹر تھامس گرے کے ساتھ اپنے انٹرویو میں (جو "شاعر" کے 1999ء کے شمارہ 5 میں چھپا) بھی ہے اور کچھ دیگر مضامین میں بھی میں نے اس کا حوالہ دیا ہے۔ یہ ملاقات فیض کی وفات سے چند ماہ پیشتر کی ہے۔ میں ملٹن کینز میں جو لندن سے کچھ دور، نیوٹن کے قریب ہے۔ برٹش اوپن یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر تھا۔ ایک شام کو انگریزی کے معروف بزرگ ناول نگار ڈاکٹر ملک راج آنند کا فون آیا (میں انھیں چچا ملک کہہ کر پکارتا ہوں) کہ فیض آئے ہوئے ہیں، زہرہ نگاہ کے پاس تھے، لیکن اب آرلنگٹن کریسنٹ میں عزیز لودھی کے ہاں میں تمھیں یاد کر رہے تھے جا کر مل آؤ۔ "میں پہنچا تو ایلس اور منیزہ اوپر بیڈ روم میں تھیں اور فیض صوفے پر دراز تھے۔ معلوم ہوا کہ بیمار ہیں۔ ہنگری، رومانیہ اور چیکوسلواکیہ کے دورے سے لوٹے تھے۔ مجھے دیکھ کر خوش ہوئے۔ "کومی یک" پی رہے تھے۔ بے حد اداس تھے۔ عالمی اشتراکیت کا خواب دیکھتے دیکھتے جس شخص کی آنکھوں کے سامنے روس اور اس کے حواری ممالک میں بھی اشتراکیت کا نظام درہم برہم ہو رہا ہو۔ اس کی کیا حالت ہو سکتی ہے۔ پوچھنے لگے "آپ کا کیا خیال ہے؟ روس بچا رہے گا؟" میں نے کہا "ملک کے طور پر تو یقیناً لیکن اشتراکیت کا زمانہ لد چکا ہے۔" زیرِ لب کہا، "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے!" میں نے اس شخص کو جو طاقت کا ستون سمجھا جاتا تھا، پہلی بار خود ترحمی کی حالت میں دیکھا، کہنے لگے "میری بدقسمتی رہی ہے کہ میں ایک نادار ملک کا، ایک نادار زبان کا شاعر ہوں!" مجھے فیض سے مل کر بے حد قلق ہوا۔ وہ ٹوٹ رہے تھے اور اس شکستِ ذات کی آواز ان کی باتوں سے نمایاں تھی۔

کچھ باتیں مصرعوں کی طرح ان کی زباں سے ادا ہوئیں۔ گھر لوٹ کر میں نے اپنی ملاقات کی

روداد اپنی ایک نظم میں لکھی جو "ایک نادار ملک کا شاعر" کے عنوان سے مختلف جرائد میں چھپی اور میرے شعری مجموعہ "دستِ برگ" میں بھی شامل ہے۔ میں یہ من و عن یہاں نقل کر رہا ہوں کیونکہ یہ ایک تاریخی ریکارڈ ہے۔ اردو کے بارے میں اور اپنے وطن عزیز کے بارے میں یہ جذبات شاید کچھ احباب کو ناقابل قبول ہوں، لیکن جس ذہنی کیفیت سے فیض اس وقت گزر رہے تھے، اس میں شاید کوئی پتھر دل رکھنے والا شخص بھی شاید اسی طرح سوچتا اور فیض تو ایک بے حد حساس، بے حد جذباتی شاعر تھے۔

ایک نادار ملک کا شاعر

کیسا سقراط؟ کون سا منصور؟
میں تو ادنیٰ سا ایک شاعر ہوں
(ایک نادار ملک کا ہی سہی!)
میں نہیں چاہتا، شہادت کا جام پینا، یادار کی ونجھنک ٹہنی پہ مارا جانا، نہیں!!
ہیرو بننا؟ کمال کرتے ہیں!
ہیرو بننے کی غرض و غایت سے، زندگی سے ہی ہاتھ دھو لینا؟
آج کے دور میں؟ نہیں صاحب!
میرے خوابوں کے دن تمام ہوئے، اب مجھے روشنی کے شہروں کو،
زندگی کو سلاخوں کے پیچھے، سے نہیں دیکھنا، مجھے آرام،
شیمپئین، کوئی اک، مصاحب دوست، سوپ او پیرے اچھے لگتے ہیں
ستیہ پال، آپ جائیں، شکریہ، مجھ کو اپنی دوا بھی پینی ہے!

یہ ان یک صد نظموں میں سے ایک ہے، جو رن آن لائینز Run-on Lines کے اسلوب میں بحر خفیف میں لکھی گئی ہیں۔ مرحوم رام لال نے فیض سیمینار کے سلسلے میں کراچی میں جب یہ نظم اپنے پیپر میں استعمال کی تو کچھ لوگ تو بہت سیخ پا ہوئے اور کچھ صرف افسردہ ہو گئے۔

سوال نمبر 5 کے جواب میں، معافی چاہتا ہوں، پہلے تو آپ کو مجھے قائل کرنا پڑے گا کہ اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ اس تنازعے میں پڑے بغیر مجھے آپ کے سوال کے آخری فقرے کا جواب صرف یہ کہہ کر دینا ہے کہ اگر میرے اور آپ کے اور ہم جیسے سینکڑوں دوسرے اہل اردو کے بچے امریکہ میں رہ کر اردو صرف بول ہی سکتے ہیں تو اردو کے مستقبل کی بات کرنا مجھے پانی بلونے کے استعارے کی یاد دلاتا ہے۔

میں شاعری میں نظم معرا کو بہترین صنف سمجھتا ہوں۔ نثری نظم ابھی تو اپنے بچپن میں ہے۔ آگے چل کر شاید اپنی جگہ بنا لے۔ میں مشاعروں کو کلچرل تشنگی کو تشفی میں بدلنے کے لیے ایک

شام یارات کی 'عیاشی' " سمجھتا ہوں اور مجرے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ میرے لیے شاعری Spoken word نہیں ہے۔

یہ آپ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ الیکٹرانک میڈیا سے کتابوں کی اشاعت اور مطالعہ میں کمی ہو گئی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے اعداد و شمار تو اس کے بر خلاف شہادت دیتے ہیں۔ اچھے ناول اب بھی انگریزی میں لاکھوں کی تعداد میں چھپتے ہیں۔ نان فکشن کی کتابیں بھی پچاس ہزار سے کم کے ایڈیشن میں نہیں چھپتی۔ ایک پروفیسر ہونے کے ناطے سے میں ان اعداد و شمار سے واقف ہوں۔ 1950ء سے 2000ء تک کتابوں کی اشاعت میں صرف امریکہ میں ہی اڑھائی سو فیصد (250%) کی ترقی ہوئی ہے یعنی پہلے اگر ایک سو کتابیں چھپتی تھیں تو اب اڑھائی سو چھپتی ہیں۔ پہلے اگر ایک لاکھ کی تعداد میں چھپتی تھیں تو اب اڑھائی لاکھ کی تعداد میں چھپتی ہیں۔ ہاں، اردو کی حالت ناگفتہ بہ ہے اور یہ حالت اردو میں الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے نہیں ہے۔ لوگوں میں قوت خرید کی کمی اور کتابوں کو غیر ضروری Luxuary سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ (ڈاکٹر صاحب ہم نے 'اردو' کے حوالے سے ہی سوال کیا تھا)

جی ہاں، یہ درست ہے لیکن اردو ادب میں کب تنقید کے دھارے بہتے تھے؟ ترقی پسند تحریک نے اپنے نقاد (ممتاز حسین وغیرہ) خود پیدا کیے۔ جدیدیت کی خوش قسمتی تھی کہ اسے ایک بیدار مغز 'نقاد' یعنی شمس الرحمٰن فاروقی مل گیا۔ پاکستان میں درسی، نصابی اور متنی تنقید میں فرمان فتح پوری سمیت کئی نام ہیں۔ نفسیاتی تنقید میں ڈاکٹر سلیم اختر کا نام سر فہرست ہے۔ صرف وزیر آغا ایسے ہیں جو کسی مدرسۂ فکر سے منسلک ہوئے بغیر تخلیقی سطح پر تنقید لکھتے ہیں۔ انڈیا میں ساختیات، پس ساختیات اور مابعد جدیدیت کے بارے میں گوپی چند نارنگ ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انڈیا میں ہی اب پروفیسر حامدی کشمیری نے اکتسابی تنقید کی شروعات کی ہے۔ میں نے خود شاعری میں امیجری کے حوالے سے درجن بھر مضامین لکھے ہیں۔ میری اردو ادب کی تاریخ (انگریزی میں) ان دنوں زیر اشاعت ہے۔ مجموعی طور پر اردو میں تنقید کی حالت اتنی بری نہیں جتنی کہ سمجھی جاتی ہے۔ شکایت تو اس امر کی ہونی چاہئے، کہ اردو نقاد ذاتی تعلقات کی وجہ سے عموماً توصیفی تنقید لکھتے ہیں۔ البتہ خوشی کی بات یہ ہے کہ میں نے اپنے پاکستان کے حالیہ دورے میں چھ سات ایسے نوجوانوں کو دیکھا، جو ایماندارانہ تنقید لکھتے ہیں۔

DR. SATYA PAL ANAND
PROF. OF ENGLISH
UNIVERSITY OF THE DISTRIC OF COLOMBIA W.D.C U.S.A

انتخاب کلام

واپسی

(باون برسوں کے بعد پاکستان یں اپنے آبائی گاؤں میں لوٹنے کی روداد۔ گاؤں کی زبانی)

تنگ پتھریلی گلی نے چونک کر آواز دی

شاید وہی ہے!

دھوپ جو آہستگی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے

بے دم سی، شاید تھک گئی تھی، ایک لحظہ رک گئی

کیا واقعی وہ آ رہا ہے؟ ضعف کی ماری ہوئی بوڑھی ہوا نے پلپلے منہ سے کہا

میں اس کی خوشبو سونگھ سکتی ہوں، وہی نٹ کھٹ ہے، واپس آ رہا ہے!

بوڑھے دروازوں کی آنکھیں بند تھیں، کچھ بھی نظر آتا نہیں، شاید وہی ہو!

اس کے بچپن کا کھلنڈرا دوست، اک کنچا، جو پچھلے ساٹھ برسوں سے

گلی کے ایک کونے میں منوں مٹی کے نیچے سو رہا تھا

کلبلا کر چیخ اٹھا۔ المدد! کوئی مجھے باہر نکالو!

ہاں، وہی ہے، دھوپ بولی، پر وہ بچہ، جس کو میں پہچانتی تھی

آنے والے مرد کے دل میں کہیں گم ہو گیا ہے

بوڑھے دروازوں نے آنکھیں کھول دیں

پہچانتے ہیں ہم اسے! لڑکا وہی ہے، باپ کی مانند لمبا ہو گیا ہے!

تنگ پتھریلی گلی بولی۔ میں کتنی پیڑھیوں سے

ننھے قدموں کے بڑے ہوتے ہوئے سب نقش

اپنے جسم پر سنبھال کر رکھتی رہی ہوں!

کلبلاتا، چیختا کنچا منوں مٹی کے نیچے رو دیا، میں کیسے نکلوں!

اور پھر بوڑھی ہوا، جو دم بخود سی رک گئی تھی،

لڑکیوں سی کھلکھلا کر ہنس پڑی

آؤ ذرا دیکھوں! تمہارے گال، آنکھیں، بال، چہرہ تو وہی ہے

اتنی مدت تک کہاں گم ہو گئے تھے؟

اب کہو آیا کرو گے؟

سید انور کمال

۶ ستمبر 1999ء

سید انور کمال رضوی

کینیڈا

جور و جفا کا ظلم کا وحشت کا دور تھا
اخلاق کے بگاڑ کی عظمت کا دور تھا
انسانیت کہاں تھی جہالت کا دور تھا
کعبہ بھی بتکدہ تھا وہ ظلمت کا دور تھا
غارِ حرا پہ چھائے تھے انوارِ کبریا
مستور چشمِ عام سے تھا نورِ مصطفیٰ

1970ء میں کہی ہوئی سید انور کمال رضوی کی نظم کا یہ بند ان کے ذہنی رجحان کا غماز ہے انور غزل بھی کہتے ہیں مگر نظم پر ان کی گرفت زیادہ مضبوط ہے۔ انور دن بھر تو حصولِ روزگار کی جدوجہد میں لگے رہتے ہیں پھر بھی اردو سے ان کا لگاؤ انہیں شعر کہنے پر اکساتا رہتا ہے۔ لکھتے ہیں اور جمع کرتے ہیں اور منتظر ہیں اس موقع کے جب ان کا کلام کتابی صورت اختیار کرے۔

انور کی جدوجہد کی کہانی ان کی زبانی سنیئے۔ انہوں نے بتایا:

"میرا پورا نام سید انور کمال رضوی ہے اور تخلص انور۔ میری تاریخ پیدائش 26 دسمبر 1942

اور جائے پیدائش حیدر آباد دکن۔ میں نے عثمانیہ یونیورسٹی (حیدر آباد) سے 1964ء میں بی ای (b.E) الیکٹریکل انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ 1964 سے 1965ء تک محکمہ برقی آندھرا پردیش میں کام کیا۔ 1965ء سے 1970ء میں نے ناگرجونا ساگرا انجینئرنگ کالج میں بطور لیکچرر کام کیا۔ وہاں میں الیکٹریکل انجینئرنگ سے متعلق مضامین پڑھاتا تھا اور عملی جماعتوں کی نگرانی بھی کرتا تھا۔ 1970ء سے 1974ء تک میں البوکر کی نیو میکسیکو (Albuquerque New Mec-sico) میں تھا۔ وہاں یونیورسٹی آف نیو میکسیکو سے میں نے ایم ایس الیکٹرانکس (ماسٹر آف سائنس) کی ڈگری حاصل کی اس کے علاوہ میں نے وہاں معاشیات اکاؤنٹ کے کورس بھی مکمل کیے۔ 1974ء سے میں رینو۔ نواڈا، امریکا (Reno, Nevada) میں تھا۔ وہاں یونیورسٹی آف رینو نیواڈا سے میں نے ایم بی اے (M.B.A) کے کچھ کورسس مکمل کیے۔۔ فی الحال میں نیٹ ورک انجینئرنگ لمیٹڈ میں کام کر رہا ہوں شاعری کے علاوہ میں نے کچھ مضامین بھی لکھے ہیں۔ میرا ایک مضمون ستی سائنس کالج میگزین میں شائع ہوا تھا۔ میں نے انگریزی میں ایک مضمون "On Play-ing work Time" لکھا تھا جو ناگرجونا ساگر کالج کے میگزین میں شائع ہوا تھا۔ شاعری میں اقبال اور غالب کو اردو کے دو بڑے شاعر مانتا ہوں۔ فیض احمد فیض، احمد فراز، شکیل بدایونی، جگر مراد آبادی، قمر جلالوی، شکیب، عبدالحمید عدم، بیکل اتساہی کا کلام بھی پسند ہے۔

میں نے 1960ء سے شعر کہنے کی ابتدا کی۔ ہمارے حیدر آباد کے گھر کے ایک حصہ میں اسماعیل ذبیح نامی حکیم صاحب رہتے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے شروع میں، میں نے اُن سے اصلاح لی۔ حیدر آباد میں میرا کلام "رہنمائے دکن" اور "سیاست" کے علاوہ بنگلور سے شائع ہونے والے "نشیمن" میں شائع ہوا۔ ٹورانٹو میں عابد جعفری ایک اردو اخبار "امروز" کے نام سے شائع کرتے تھے اس میں میری کئی نظمیں اور غزلیں شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ ٹورنٹو کے صداقت "لیڈر" اور دیگر کئی وجرائد میرا کلام شائع ہوا ہے۔ مجموعہ میرا کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔ حالانکہ اتنا کلام جمع ہو چکا ہے کہ میں دو تین مجموعے طبع کرا سکتا ہوں۔ میں نے کئی نعتیں اور قصیدے لکھے ہیں۔ کئی نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں مزاحیہ نظمیں اور غزلیں بھی لکھی ہیں۔

میری زندگی کے دلچسپ اور اہم واقعات میں سے ایک واقعہ میری شاعری کی ابتدا تھی میری شادی، بچوں کی پیدائش، ان کی شادیاں اور 90 سے 92 تک خود اپنا کاروبار کرنا کیا یہ دلچسپ واقعات نہیں؟ میں کیبل کمپنی سے کام لے کر ان کو ڈیزائن اور ڈرافٹ کر کے دیتا تھا۔ یہ میری زندگی کا سنہری دور تھا اور ہمیشہ مجھے یاد رہے گا۔ مجھے اردو سے بے حد پیار ہے۔ یہ میری زندگی ہے میرا سب کچھ ہے۔ میں مانتا ہوں کہ اردو دنیا کی بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس کا قریبی رابطہ عربی اور فارسی سے ہے۔ فصاحت کے لحاظ سے عربی کا مقابلہ کرنا مشکل ہے۔ عربی کی کچھ فصاحت اور بلاغت اردو زبان میں ہے۔ شاعری میں اردو کئی زبانوں سے آگے ہے لیکن ڈرامے کے میدان میں

اردو کو کافی ترقی کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اردو میں کمپیوٹر اور سائنس کے مضامین میں کتابوں کی ضرورت ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے ذریعہ طبعیات (Physics)، کیمیا (Chemistry)، طب، انجینئرنگ اور دوسرے علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ہندستان نے 1949ء میں جب ریاست حیدرآباد پر قبضہ کیا اس کے بعد سے عثمانیہ میں اردو ذریعہ تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ دورِ حاضر میں اس قسم کے تجربوں کی شدید ضرورت ہے۔ امریکہ کینیڈا اور یوروپ میں ہماری نئی نسل اردو سے نابلد ہوتی جارہی ہے۔ نئی نسل کے ذہنوں پر انگریزی کا اتنا رعب ہے کہ وہ اردو کو کچھ اہمیت نہیں دیتے۔ اس سلسلہ میں ہم کو مل کر کوشش کرنا چاہیے تاکہ ہماری نئی نسل اردو سے نابلد نہ رہ جائے۔ ہندوستان میں اردو کو مٹانے کی منظم کوشش کی جارہی ہے۔ ویسے ہندوستان میں فلمی صنعت نے اردو کی خدمت کی ہے۔ یوں تو گانوں کو ہندی کا نام دیا جاتا ہے لیکن ہندوستان کے اکثر فلمی گانے اردو میں ہوتے ہیں۔ ہم سب اردو بولنے والوں کو چاہیے کہ اردو کی ترویج اور بقا کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کریں اگر نئی نسل کو اردو کی اہمیت سمجھائی جائے اور وہ اس کو سمجھ کر اردو کے لیے کوشش کریں تو پھر اردو کا مستقبل روشن تر ہوتا چلا جائے گا۔ ایک زمانہ تھا کہ غزل صرف عشق و عاشقی، گل و بلبل تک محدود تھی لیکن آج کل غزل میں سیاست، معاشیات، طنز و مزاح، سب پر اظہارِ خیال ہو رہا ہے۔ غزل کی ایک خوبصورتی یہ ہے کہ اس کے مختلف اشعار میں مختلف موضوعات پر اظہارِ خیال کیا جا سکتا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ انسانی جذبات کے اظہار کے لیے غزل زیادہ موزوں ہے جبکہ تاریخ، سیاست وغیرہ پر اظہارِ خیال کے لیے نظم زیادہ مناسب ہے کیونکہ نظم کے اشعار میں مسلسل ایک رابطہ ہوتا ہے۔ نثری نظم اور نثری غزل یہ آزاد شاعری کی ایک شکل ہے۔ اظہارِ خیال کی یہ بھی ایک شکل ہے۔ شاید شاعری کی قدیم روایات سے بغاوت کا جذبہ نثری نظم اور نثری غزل جیسی چیزوں کا محرک ہوا۔

میری رائے میں نثری نظم اور نثری غزل ایک عارضی چیز ہے۔ ردیف اور قافیہ کے ساتھ جو خوبصورتی غزل اور نظم میں ہوتی ہے وہ نثری غزل یا نثری نظم میں نہیں آسکتی ہے اور باردیف اور باقافیہ غزل اور نظم آسانی سے یاد ہو جاتی ہے۔ نثری نظم اور نثری غزل میں یہ خوبی نہیں ہے ایک اور سوال یہ بھی اُٹھتا ہے کہ نثر میں اور نثری نظم یا نثری غزل میں حدِ فاصل کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں ہے۔

میرے خیال سے مشاعرے اور تخلیقی نشستیں ادب کی تخلیق میں مساوی کردار ادا کرسکتے ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جب کوئی شاعر کسی مشاعرے میں جاتا ہے تو وہاں اشعار سن کر اُس کے ذہن میں نئے خیالات آتے ہیں اور ان خیالات سے متاثر ہو کر وہ کوئی غزل یا نظم اکثر لکھ دیتا ہے۔ تخلیقی نشستوں میں شاعر مل کر بیٹھتے ہیں اور کسی ایک مضمون پر یا کسی ایک طرحی مصرعہ پر تخلیقی زور آزمائی کرتے ہیں۔ اس سے بھی بہتر ادب کی تخلیق میں مدد ملتی ہے۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا

ہے کہ شاعر جب کسی خوبصورت منظر سے یا موسیقی سے یا کسی حادثہ یا واقعہ سے متاثر ہوتا ہے تو اس کے قلم سے ایک اچھی غزل یا نظم کاغذ پر منتقل ہو جاتی ہے۔

الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹڈ میڈیا کا یہ مقابلہ اور زور آزمائی پرانی چیز ہے۔ جب تک صرف ریڈیو تھا تو ہوتا یہ تھا کہ انسان ایک ہی وقت میں کتاب یا رسالہ پڑھ سکتا تھا اور ساتھ ہی ریڈیو سے لطف اندوز ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد ٹی وی آیا تو یہ سلسلہ کم ہو گیا۔ اگر کوئی ٹی وی سے لطف اندوز ہونا چاہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی آنکھوں اور کانوں کے ذریعے اپنی توجہ ٹی وی کی طرف لگائے رکھے۔

الیکٹرونک میڈیا میں یہ ہے کہ آپ کی خبریں وغیرہ جو بھی ٹی وی پر یا انٹرنیٹ پر سنتے یا دیکھتے ہیں وہ تھوڑی دیر کے بعد آپ کی نظروں سے او جھل ہو جاتی ہیں جبکہ پرنٹڈ میڈیا میں خبریں یا مضامین آپ اپنی فرصت کے لحاظ سے پڑھ سکتے ہیں اور ان سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ پرنٹڈ میڈیا کا بہت بڑا فائدہ ہے (الیکٹرونک میڈیا کے مقابلہ میں) ان چیزوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہمیں کتابوں اور جرائد میں ایسی تحریریں شائع کرنا چاہئے جن کے اثرات دیرپا ہوں۔ ایسے مضامین شائع کرنا چاہئیں جن سے عام لوگ دلچسپی رکھتے ہوں اور جو ٹی وی اور الیکٹرانک میڈیا سے مختلف اور معیار کے لحاظ سے بہتر ہوں۔

بات یہ ہے کہ سچی بات کڑوی ہوتی ہے اور تنقید بھی ایک طرح کا سچ ہے۔ اکثر شاعروں اور افسانہ نگاروں کو یہ بات پسند نہیں آتی کہ کوئی اُن کے کلام پر تنقید کرے لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ اگر کوئی شاعر یا افسانہ نگار یہ چاہتا ہے کہ اُس کے کلام میں یا ادبی تخلیق میں بہتری پیدا ہو تو اُس کے لیے لازم ہے کہ تنقید کو برداشت کرے۔ اگر کلام کو سونے سے تشبیہ دی جائے تو تنقید وہ بھٹی ہے جس میں پڑ کر سونا صاف ہو کر نکلتا ہے اور اس میں سے کثافت دُور ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی نقاد کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اُس کی تنقید صرف برائے تنقید نہ ہو بلکہ تنقید برائے اصلاح ہو۔

S.A..K. RAZVI
10 Eddystone Ave
Unit 122 Do wnsview ONT-M3N 2TZ. CANADA

انتخابِ کلام

سید انور کمالی

نعت اور تاریخ اسلام

ایثارِ جان دولتِ اہل یقیں ہوئی
حائل خدا کی راہ میں کثرت نہیں ہوئی
وابستہ جب نیاز سے دل کی جبیں ہوئی
اک روز رب نے کہہ دیا تکمیلِ دیں ہوئی

وہ روز روزِ عید تھا خوشیوں کی عید تھی
حق میں وہ اہلِ کفر کے غم کی نوید تھی

عثمانؓ خوش تھے دین کی معراج دیکھ کر
شاداں بہت علیؓ تھے تو مسرور تھے عمرؓ
لیکن تھے ایک سوچ میں ڈوبے ابو بکرؓ
پوچھا کسی نے کھل گیا کیا راز آپ پر

اسلام کے چمن میں تو آئی ہے اب بہار
مسرور سب ہیں آپ کی آنکھیں ہیں اشک بار

کہنے لگے کہ آنکھ میں آنسو خوشی کے ہیں
ہم سب خدا کے عبد صحابہ نبیؐ کے ہیں
آثار اس جہاں میں نئی روشنی کے ہیں
لیکن ابھی نشان کئی تیرگی کے ہیں

تکمیل دیں ہی کام اگر مصطفیؐ کا ہے
پردہ کریں وہ ہم سے ارادہ خدا کا ہے

یہ زیست دوامی نہیں، یک آنی ہے
جو شے بھی ہے دنیا میں، وہ سب فانی ہے
کونین کو جب غور سے دیکھا، تو کھلا
اللہ کی ہستی ہے جو لافانی ہے

مامون ایمن، نیویارک

۱۹ جولائی ۱۹۹۹ء

مامون ایمن

اور لینڈو

یہ جون 99ء کے آخری دنوں کی بات ہے میں نیویارک میں سخن ور دوم اور سوم کی تقریب کے حوالے سے مدعو کی گئی تھی۔ مامون ایمن صاحب کسی وجہ سے تقریب میں تشریف نہ لا سکے دوسرے دن میزبان مسرور جاوید صاحب سے فون پر ان کی گفتگو ہوئی تو میں نے بھی ان سے گفتگو کی اور سخن ور چہارم کے لیے سوال نامہ دینے کے لیے ان کا پتہ چاہا جس پر انہوں نے کہا کہ اب تو بہت تاخیر ہو چکی۔ میں نے انہیں سخن ور دوئم کے وقت کیوں یاد نہ رکھا۔

اعتراض ان کا بالکل بجا تھا مگر وہ میری مجبوریاں کیا جانیں۔ میں نے انہیں پڑھا تھا۔ ان کی زبان دانی کی قائل ہوں۔ انہیں سوالنامہ بھی کسی کی معرفت بھجوایا تھا۔ جواب نہ ملا۔ کچھ لوگوں سے مختلف شعراء کے پتے بھی پوچھے تھے مگر مجھے اس وقت قطعی اندازہ نہ تھا کہ نیویارک میں اتنی حلقہ بندی ہے کہ کوئی اپنے مخالف کا پتہ بھی دینے کو تیار نہیں ہوتا میں چونکہ اس طرح کی حرکت کبھی کر ہی نہیں سکتی لہٰذا سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ اس زمانے میں (1995ء میں) میں فون اور فیکس کی سہولت سے محروم تھی۔ ذہنی یکسوئی قطعی میسر نہ تھی میرا جو بیٹا ڈاکٹری کی ڈگری کے حصول کے مراحل طے کر رہا تھا اُسے سب کے تعاون کی ضرورت تھی اور میں ماں ہونے کے ناطے سب کے

درمیان "پُل" بنی ہوئی تھی۔ مجھے کتاب کی اشاعت کے لیے رقم کی ضرورت بھی تھی۔ میں نے کسی سے ایک ڈالر بھی کتاب کے لیے ایڈوانس نہیں لیا تھا۔ اپنے بل بوتے پر کام کر رہی تھی۔ پھر جب جی بہت گھبرا لیا تو میں نکل بھاگی اور کراچی جا کر دم لیا۔

یہ 96ء کی بات ہے کہ کراچی میں میرا قیام بھی زیادہ نہ تھا۔ امیگریشن کی شرائط کی وجہ سے مجھے چھ ماہ سے پہلے امریکا واپس لوٹنا تھا۔ یہ اور اس طرح کے کئی مسائل تھے جن سے میں گزری۔ میں انہیں یہ ساری کتھا کیا سناتی۔ معذرت کرتی رہی اور مناتی رہی۔ میری بات میں سچائی تھی جس نے غالباً انہیں متاثر کیا اور روٹھے مامون ایمن دوسرے دن خود مجھے فون کر کے ملنے آ گئے۔ مجھے ان کا یہ خلوص بہت بھایا۔ ملاقات کے بعد سارے گلے شکوے بھی جاتے رہے۔ میں نے انہیں سوالنامہ دے دیا۔ انہوں نے مجھے چھوٹی بہن بنا لیا اور اس لیے بھی کہ چھوٹوں پر حکم چلانے میں آسانی ہوتی ہے۔ مجھے ان کی یہ ادا بھی پسند آئی۔

مامون ایمن سے میری جتنی دیر گفتگو رہی مجھے لطف آیا۔ ان کی علمی قابلیت نے متاثر کیا۔ حالانکہ میں نے ان کی خودسری، غصے اور ترش روئی کے کئی قصے سن رکھے تھے۔ مگر وہ تو قصے تھے اور سچ بھی ہوتے تو مجھے علم کے سمندر سے تھوڑا بہت کھاری پانی بھی پینا گوارا تھا۔ میں نے ہمیشہ سوچا ہے اور کہا ہے "میں علم کے لعل و گہر جہاں بھی پاؤں گی انہیں اپنی پلکوں سے چنوں گی۔"

مامون ایمن زبان داں ہیں۔ زبان کی چھوٹی سی غلطی بھی انہیں بہت کھلتی ہے۔ ذرا سی بھی بدسلیقگی انہیں نہیں بھاتی۔ میں ان سے بہت واقف نہیں۔ جتنا جانتی ہوں اس سے اندازہ ہے کہ یہ "خوبیوں" کا مجموعہ ہیں مگر مامون ایمن میں مجھے ایک ہی خرابی نظر آئی وہ یہ کہ وہ زبان کی غلطی قطعی پسند نہیں کرتے ہیں۔ برداشت بھی نہیں کرتے۔ مامون ایمن کو شکایت ہے کہ لوگ درست اردو کیوں نہیں لکھتے مثلاً "سوال نامے" کو "سوالنامہ" لکھنا غلط ہے۔ اسے یوں ہونا چاہیے "سوال نامہ" میں یہ غلطی کرتی ہوں کیونکہ صحافت کے میدان میں برسوں کام کر کے اور تیز تیز لکھنے کی عادت کے تحت اب ایسی "غلطیاں" میرے لیے روزمرہ ہو گئی ہیں۔ کوشش کرتی ہوں کہ ان سے دامن بچا رہے مگر ہر دم غلطیوں کو درست کرنے والا کوئی مامون ایمن جیسا بھائی ساتھ ہو تو ۔۔۔ یقین ہے کہ اپنا قبلہ جلد درست ہو جائے گا۔

مامون ایمن کو مجھ سے یہ شکایت بھی ہے کہ میں نے ابتدائی جلدوں میں (صرف سخن ور دوم میں اور ممکن ہے اب چہارم میں بھی ہو) شمالی امریکہ کے حوالے سے کئی غیر معروف اور بعض بے وزن شعراء و شاعرات کے تذکرے شامل کیے ہیں اور ایمن جی کے بارے میں طویل خاموشی اختیار کی۔ (ملاحظہ ہو سوال نمبر 2 کا جواب) میں وہ خطوط سنبھالے ہوئے تھی جن کے لکھنے والے اور والیوں نے تعارف بھیج کر پیار سے دلار سے درخواست کی تھی کہ میں ان کا کلام درست کر دوں اور ان کا تعارف ضرور شامل کر لوں۔ میں اندر سے بہت کمزور ہوں۔ میں انہیں رد نہ کر سکی۔ اب بھی نہیں

کر سکتی۔ میں نے وہ کلام کراچی میں ایک صاحب کے سپرد کیا کہ درست کردیں۔ میرے پاس نظرِ ثانی کا وقت نہ تھا۔ رات کے تین تین بجے تک میں نے کاپی پیسٹنگ کراتی ہے۔ چائے پی کر جاگی ہوں اور دوسروں کی نیندیں بھی خراب کیں کہ مجھے اتنی مدت میں یہ کام ختم کرنا ہے اور واپس جانا ہے۔ بس میں ایسے ہی کام کرتی ہوں۔ اللہ مجھے معاف کرے اور بھائی مامون آپ بھی میری یہ کوتاہی یہ کمزوری معاف کردیں۔

اپنا قصہ بہت ہوا۔ چلئے اب ہم براہ راست مامون ایمن سے گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن گفتگو سے پہلے دن سے محبت کرنے والے چند لوگوں کی آرا آپ کی خدمت میں کیا تھا۔ پیش کردوں اور یہ بھی بتادوں کہ ستمبر، اکتوبر 98ء میں راولپنڈی کے جریدے "چہار سو" نے ان کے لیے ایک خصوصی خبر کی اشاعت کا اہتمام یہ نیویارک کے پروفیسر سرور علی کوثر مرزا نے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ہے: "مامون ایمن ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شاعر ہے۔ وہ تدریس انگریزی سے رزق حلال فراہم کرتا ہے اور جز وقتی طور پر ریڈیو وائس آف امریکا اور مقامی پاکستانی ٹی وی پروگراموں میں اپنی تقریر کے جوہر دکھاتا ہے۔ یہ من موہنی شخص نیویارک ہی کیا پورے شمالی امریکا کا سب سے پرانا شاعر ہے کہ اس نے یہاں مشاعرے کی روایت قائم کی ہے اور اس روایت کو آگے بڑھانے کے لیے برسوں تنہا اہم کردار ادا کیا ہے۔"

صفوت علی لکھتے ہیں۔ "انھیں نہ صرف اردو اور انگریزی پر عبور ہے بلکہ نفسیات کے علم کو بھی باقاعدہ سیکھا اور فلسفہ بھی۔ ادیب ہونے کے ناطے وہ نثر نگاری اور شعری اوزان، صرف و نحو پر عبور اور خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ جب نیویارک کی ادبی تاریخ اردو کے سلسلے سے لکھی جائے گی تو ان کا نام ان چند لوگوں میں شامل ہوگا جو اردو کو فروغ دینے والے بانیوں میں شامل ہوں گے۔"

ڈاکٹر گیان چند جین نے مامون ایمن کی رباعیوں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا "امریکا میں شیشہ بند ایئر کنڈیشنڈ مکان ہوتے ہیں۔ باہر کی ہوا کا جھونکا مکان کے اندر آتا ہی نہیں۔ میں نے یہ بھی مشاہدہ کیا ہے کہ امریکا میں گھریلو پرندے مثلاً چڑیا، کوا نہ ہونے کے برابر ہیں (آج کل چڑیاں بے شمار نظر آتی ہیں) ایمن نے ان سب کی کمی محسوس کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

دیوار پہ پنچھی ہے، نہ جھونکا در میں
اس ملک میں آنگن نہیں ہوتا گھر میں
پھر بھی یہی کہتے ہیں کہ ہجرت اچھی
سودا ہے عجب طرح کا سب کے سر میں

نیویارک کی منفرد لہجے کی شاعرہ حمیرا ؟؟ کی رائے میں "اس کڑی دھوپ میں مامون ایمن کی شخصیت غنیمت ہے جو سایہ دار بھی ہے اور ثمر بار بھی۔ شمالی امریکا میں اردو ادب اور فن سخن کی محافل کے انعقاد کا جب بھی تزکرہ ہوگا یقیناً مامون ایمن کے نام سے پہلے کوئی اور نام نہ لکھا جائے

گا۔" اب آیئے مامون جی سے کچھ گفتگو بھی ہو جائے۔

نام ہے ان کا محمد مامون الرشید ایمن۔ ادبی دنیا میں مامون ایمن کے نام سے معروف ہیں۔ 14 مئی ایمن 1941ء کے دن الہ آباد یوپی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ ایڈ، آنرز گورنمنٹ ٹریننگ کالج، بہاول پور سے کیا۔ اردو زبان وادب میں ایم۔اے، پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے کرنے کے بعد ایم ایجوکیشن میں ایم لو فل برائٹ سکالر، ٹیچرز کالج، کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک سے کیا۔ ایم۔اے، صحافت۔ نیو سکول فور سوشل ریسرچ بھی نیویارک سے اور انگریزی میں ایم۔اے، ہنٹر کالج، سٹی یونیورسٹی آف نیویارک، نیویارک سے کیا۔

اپنی زندگی کے ابتدائی حالات بیان کرتے ہوئے انہوں نے کہا "میری زندگی کے ابتدائی چھ برس، والدین کے ہم راہ دہلی میں گذرے۔ دہلی سے ہجرت کے بعد، لاہور میں قیام رہا۔ میں نے وہاں تعلیم حاصل کی بعد، میں لاہور سے نیویارک آیا اور ٹیچرز کالج، کولمبیا یونیورسٹی میں فل برائٹ سکالر کی حیثیت سے ایک برس گزارا۔ یہ سکالرشپ، تعلیم وتدریس کے ضمن میں امریکا کا سب سے زیادہ محترم وظیفہ ہے۔ اس اسکالرشپ کے لیے کئی شرائط ہیں۔ ان میں یک شرط یہ بھی ہے کہ امیدوار کی عمر کم سے کم اٹھائیس برس ہو۔ میں نے یہ سکالرشپ بئیس برس کی عمر میں حاصل کر کے ایک عالمی ریکارڈ قائم کیا ہے۔

میں نیویارک سے لاہور واپس گیا تو وہاں کوئی تدریس ملازمت حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ لہٰذا میں لاہور سے لندن چلا گیا اور وہاں اکیس ماہ قیام کیا۔ اس قیام کے دوران، میں نے ملکہ کے سرکاری دفتر میں بحیثیت ٹیکس آفیسر کام کیا اور جز وقتی طور پر بی بی سی ریڈیو کی اردو سروس سے وابستہ رہا۔ دوسری بار میں نیویارک 24 مارچ 1968ء کو آیا۔ یہاں بورڈ آف ایجوکیشن میں ساڑھے ستائیس برس انگریزی زبان پڑھانے کے بعد، اگست 1995ء میں خود اختیاری طور پر ریٹائر ہوا۔ اس وقت میں اکیڈیمک ڈین کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔

نیویارک میں قیام کے دوران، میں نے جز وقتی طور پر مقامی کالجوں میں بحیثیت پروفیسر کام کیا اور انگریزی افسانہ اور انگریزی طرزِ نگارش کے مضامین پڑھائے۔

میری پہلی شادی 29 دسمبر 1961ء کو محترمہ انوری بیگم عثمانی سے لاہور میں ہوئی تھی۔ رب العزت نے ہمیں خوب صورت بچوں سے نوازا۔

نیویارک آنے سے پہلے انوری بی۔اے (آگرہ یونیورسٹی) اور بی۔ایڈ پنجاب یونیورسٹی، لاہور) کی ڈگریاں حاصل کر چکی تھیں اور لاہور کے دو مقتدر، انگلش میڈیم سکولوں، سر سید کیمبرج سکول اور ڈویژنل پبلک اسکول میں بحیثیت معلّمہ وابستہ رہ چکی تھیں۔ انہوں نے یہاں نیویارک یونیورسٹی سے ایم۔اے، ایجوکیشن کی ڈگری حاصل کی تھی۔ وہ 1998ء میں، ایک مقامی ڈے کیئر سنٹر سے، خرابی صحت کے باعث ایجوکیشنل ڈائریکٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئی تھیں۔

انوری نے اردو زبان وادب کی تعلیم حضرت نشور واحدی (مرحوم) سے لی تھی۔ وہ شعر کا بہت اچھا ذوق رکھتی ہیں۔ انہی کے ایماء اور اصرار پر میں نے پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے، پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے 1963ء میں، ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔۔۔ یاد رہے کہ اس سے پہلے میں نے اردو زبان صرف آٹھویں جماعت تک پڑھی تھی۔

انوری سے میری شادی، ان کی خواہش کے مطابق 25 نومبر 1987ء کو ختم ہوئی تھی۔

میں نے 19 دسمبر 1987ء کو لاہور میں شائستہ سیف سید نامی ایک خاتون سے، دوسری شادی کی تھی۔ شائستہ نے 1 جنوری 1988ء کو میرے ساتھ، ایک امی گرنٹ کی حیثیت سے، نیویارک کا سفر کیا تھا۔ رب العزت نے مجھے مزید تین بیٹوں سے نوازا۔ طٰہٰ، زین اور سمیع۔ ان کی عمریں دس برس، نو برس اور چھ برس ہیں۔

نیویارک آنے سے پہلے، شائستہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے صحافت میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد رسالوں میں بحیثیت معاون مدیرہ کام کر چکی تھیں۔ یہاں آنے کے بعد، انہوں نے اپنے تخلیقی جوہر کو بروئے کار لاتے ہوئے، افسانہ نگاری شروع کی۔ ان کے افسانوں میں پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش کے تارکین، وطن اور امریکی بودوبش کے حوالے نمایاں ہوتے ہیں۔ شائستہ کے افسانے، شائستہ سید ایمن کے نام سے پاک وہند، انگلستان، کینیڈا اور امریکا کے کئی رسالوں اور اخبارات میں باقاعدگی سے چھپتے ہیں۔

ہمارے غریب خانے پر ادب اور موسیقی کی محافل باقاعدگی سے منعقد ہوتی ہیں۔

میں نے صحافت، ادب اور موسیقی کے حوالے سے، ریڈیو وائس آف امریکا اردو سروس کے لیے بیس برس بحیثیت جزوقتی نامہ نگار صحافتی خدمات سرانجام دی ہیں۔ میں ریڈیو پاکستان یو۔ این/ یو۔ ایس نامہ نگار کی حیثیت سے بھی نیویارک میں اردو اور انگریزی میں، دو برس تک نشریات کا اعزاز حاصل کر چکا ہوں۔ نیز میں نے مقامی پاکستانی ٹی وی پروگراموں کے لیے بھی اردو، انگریزی اور پنجابی میں، دس برس تک باقاعدگی سے صحافتی ذمہ داریاں نباہی ہیں۔

بقول احباب، میں پنجابی بولتا ہوں، انگریزی پڑھتا ہوں اور اردو میں نظم ونثر لکھتا ہوں۔

میں خوب صورت لباس اور تیز ہری مرچوں کا شوق ہوں اور سگریٹ، شراب، غیبت اور سازش سے دُور بھاگتا ہوں۔

یہ میری "سوانح عمری" نہیں کہ میں زندگی کو ایک نعمت جانتا ہوں۔ میں زندگی کو سانحہ نہیں کہتا۔ لہٰذا زندگی کے نشیب وفراز کو "سوانح عمری" کا نام دینا ایک غلط بات ہے۔ ہمیں "سوانحِ عمری" کے بجائے زندگی کے "حالات وواقعات" سے فرد کا خاکہ مرتب کرنا چاہیے۔ ہر زندگی میں خوشیاں بھی تو ہوتی ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم ان خوشیوں کو بھی سانحوں سے تعبیر کریں؟ حالاتِ زندگی کے لیے، سوانح عمری کی روایتی، اضافتی ترکیب غلط ہے۔ لہٰذا اسے ترک کرنا چاہیے۔

سوال نمبر 2 کا جواب دیتے ہوئے مامون بھائی نے بتایا۔ "اردو، پنجابی ور انگریزی میں با قاعدہ شعر گوئی کے ساتھ ساتھ، میں اردو اور انگریزی میں نقد و نظر کے حوالے سے مضامین لکھتا ہوں۔ ادب کے علاوہ، میں پورٹ ریٹ فوٹو گرافی اور مناظر کی عکاسی سے اپنے ذوق استحسان کی تشفی کرتا ہوں۔ موسیقی، خاص طور پر غزلوں اور نیم کلاسیکی گائیکی سننے کا شوق رکھتا ہوں۔ یہی وجہ ہی کہ میرا کلام غنائیت سے "منور" ہے۔

میرا کلام بھی اور مضامین بھی عالمی طور پر متقدر اردو اخبارات اور رسالوں میں باقاعدگی سے شائع ہوتے ہیں۔

میرا کوئی مجموعہ کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ غزلوں کے تین مجموعے تیار ہیں، چار سو رباعیات کا بھی ایک مجموعہ تیار ہے نیز مذہبی کلم اور مقفہ و غیر مقفہ نظموں کے مجموعے بھی زیرِ ترتیب ہیں۔ نثر میں 21 تنقیدی مضامین کا مسودہ بھی موجود ہے۔ اشاعت کے ضمن میں یہ تاخیر دانستہ ہے۔ میں یہ تمام کام خود فرصت سے کرنا چاہتا ہوں تاکہ تخلیق، تخلیق ہی نظر آئے اغلاط اور عیوب کا مرکب نہ کہلائے۔

3۔ میں قدیم (کلاسیکی) ادب بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ اساتذہ کی سخن گوئی میں، مجھ سے ایسے مبتدیوں کے لیے رہنمائی اور ادراک کے مواقع وافر ہیں۔ اساتذہ کے دواوین کے علاوہ، میں فنِ عروض پر مختلف کتابوں کا مطالعہ کرتا ہوں۔ میرے پس اردو، عربی اور فارسی کے بہت سے لغات ہیں۔ میں ان کی ورق گردانی بھی بہت انہماک سے کرتا ہوں۔ انگریزی میں، زبان دانی، سماجیات اور نفسیات کی کتب بھی باقاعدگی سے میرے زیرِ مطلعہ آتی ہیں۔ تخلیق کے ضمن میں، بیان خالصتاً ودیعت ہے لیکن زبان کے عوامل اور علوم کا براہراست واسطہ اکتساب سے ہے۔ میں اپنی طرف سے یہی کوشش کرتا ہوں کہ اس اکتساب کو بہتر بناؤں، بہتر بناتا رہوں۔ تحریر کے لیے بھی اور تقریر کے لیے بھی چونکہ میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا صحافی ہوں، میرے لیے یہ ضروری ہے کہ میں الفاظ کے انتخاب اور اصوات کی ادائیگی کے ضمن میں بہت محتاط رہوں۔ اس احتیاط کا براہِ راست واسطہ زبان و ادب کے مطالعے سے ہے۔ میں اس مطالعے سے سرشار ہوتا رہتا ہوں۔

میرے نزدیک، ہر زندگی میں اہم اور دل چسپ واقعات ہوتے ہیں۔ ایک انگریزی دان ملک میں مجھ "پنجابی دان" کا انگریزی پڑھانا ایک اہم بات ہے۔ میں دورانِ تدریس شلوار کرتے میں ملبوس، انگریزی صرف و نحو کی گتھیاں سلجھاتا ہوں تو جی ہی جی میں بہت خوش ہوتا ہوں۔

نئے احباب، مامون ایمن میں ایک سفید ریش، معمر بزرگ نہ پا کر بہت مایوس ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے ایک قہقہے لگانے والا، ذرا شوخ سے کپڑے پہنے "نوجوان" ہوتا ہے۔۔ مجھے ایسے مناظر دل چسپ معلوم ہوتے ہیں۔ میں چار برس کی عمر میں گم ہو گیا تھا۔ ایک میاں بیوی نے مجھے اپنے گھر میں تین دن رکھا تھا۔ یہ تین دن بہت مزے کے دن تھے کہ متعلقہ خاتون نے میری

خاطر داری میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ میرے والدین اگر مجھے تلاش کرنے میں ناکام رہتے تو میری زندگی ہندوستان ہی میں گذر رہی ہوتی۔ یوں شمالی امریکا میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے مامون ایمن کا نام فہرست میں شامل نہ ہوتا۔

یہ بھی ایک دل چسپ بات ہے کہ سلطانہ مہر نے سخن ور جلد چہارم کی ترتیب کے وقت مجھ سے رابطہ قائم کیا ہے۔ انھوں نے ابتدائی جلدوں میں شمالی امریکا کے حوالے سے کئی غیر معروف اور بعض بے وزن شعراو شاعرات کے تذکرے شامل کیے ہیں۔ میرے بارے میں اس طویل خاموشی کا وہ جو بھی سبب پیش کریں، دل چسپ ہوگا۔ بہت ممکن ہے کہ وہ اپنے اس "اقدام" کی تلافی کرتے ہوئے، اپنی ادب نوازی اور صحافت کی سند کی لاج رکھتے ہوئے، نئی جلد کی تدوین میں دیانت اور سوجھ بوجھ کا ثبوت دیں۔ کیسے؟ اس کا جواب صرف وہ دے سکتی ہیں۔

اس سوال نامے کی پذیرائی میں سلطانہ مہر کی عند الملاقات معافی تلافی بھی ہے۔ شاید انہیں اپنی غلطی کا احساس بھی ہے اور اعتراف بھی۔ میں نے انہیں بظاہر ایک وضع دار خاتون پایا ہے۔ ان کی یہ غلطی دانستہ تھی یا نادانستہ؟ ان کی توضیح بھی ایک دل چسپ بات ہوگی۔

میری زندگی کی سب سے دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ ایک کھلی کتاب ہے۔ میری زندگی کا کوئی امر، کوئی فیصلہ کسی مصلحت کا مرہونِ منت نہیں ہوتا۔ میں ایک صاف گو بندہ ہوں اور صاف گوئی کی قدر کرتا ہوں۔

یہ ایک بحث طلب بات ہے کہ اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے یا نہیں۔ عزت اور وقار کے اعتبار سے دنیا کی ہر زبان برابری کا درجہ رکھتی ہے۔ ہم دوسری زبانوں کا احترام کریں گے تو ہماری زبان کا احترام بھی کیا جائے گا۔

آج کا دور کمپیوٹر کا دور ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ نئی نسل کمپیوٹر کو بھی اردو زبان سیکھنے کا ایک موثر آلہ بنائے۔ یہ بھی ناگزیر ہے کہ زبان و ادب اور لغت بھی کمپیوٹر کا حصہ بنیں۔ فنِ عروض پر کمپیوٹر پروگرامز تیار کیے جائیں تاکہ مبتدی احباب بھی بے وزن نہ ہو سکیں۔ کمپیوٹر، ہر مصرع کے بے وزن اور باوزن ہونے کا اعلان کرے اور باوزن ہونے کی صورت میں، متعلقہ تقطیع اور بحر کی نشان دہی کرے۔ اردو کتابت کے ضمن میں، بہت سے کمپیوٹر پروگرامز آچکے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ایک نیا پروگرام اعراب کے ساتھ آیا ہے۔ اس پروگرام کے مروّج ہونے سے تلفظ اور شعری اوزان کی مشکلات حل ہوں گی۔ ذاتی طور پر، وبوجوہ میں اردو زبان و ادب کے مستقبل کے بارے میں پراُمید ہوں۔ یہ خوب صورت زبان زندہ بھی رہے گی اور ترقی بھی کرے گی۔

اظہارِ خیال کے لیے کسی ایک صنف کا انتخاب موزوں نہیں کہ ہر صنف کا مزاج جدا ہوتا ہے۔ جو مزاج غزل کا ہے، وہ مزاج نظم کا نہیں۔ جو مزاج رباعی کا ہے، وہ مزاج قطعے کا نہیں جو مزاج مرثیہ کا ہے، وہ مزاج مناقب کا نہیں۔ اسی طرح، مثنوی، حمد اور نعت بھی مزاجاً ایک دوسرے سے

مختلف ہیں۔ ہر خیال، ہر صنف میں نہیں باندھا جاسکتا۔ لہٰذا، اظہارِ خیال کے لیے، ہر صنف کا مزاج پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

نثری نظم اور نثری غزل کے تجربات، وقت اور جوہر کا ضیاع ہیں جو صنف نثر ہے وہ بیک وقت نظم یا غزل کیسے ہو سکتی ہے؟ نثر، نثر ہے اور نظم، نظم۔

مشاعرہ، ادب پسندوں کو جمع کرنے کا ایک عمدہ اور موثر ذریعہ ہے۔ اس ضمن میں بد قسمتی یہ ہے کہ بعض ادب پسند، مشاعرے کو "تفریحِ طبع" فراہم کرنے کا ایک "شغل" سمجھتے ہیں۔ یہ ایک غلط، افسوس ناک بات ہے۔ شعر کا واسطہ عرفان سے ہے، تفریح سے نہیں۔ شعر گوئی اور شعر فہمی کے لیے، ذاتی نشستیں بہتر کردار ادا کر سکتی ہیں کہ ان میں تفریح کم اور تفہیم زیادہ ہوتی ہے۔

الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیم کا موازنہ یا مقابلہ ایک غیر منطقی امر ہے۔ آج کا دور، ادب کا دور نہیں، مالی دوڑ کا دور ہے۔ آج ادب کا درجہ کم ہے، ڈالرز کا درجہ زیادہ۔ جو فرد ادب کا رسیا ہو گا وہ الیکٹرانک میڈیا (ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلم اور ویڈیو وغیر ہم) کے ساتھ ساتھ پرنٹ میڈیم کو بھی عزیز رکھے گا۔ خلوت میں جو حظ کوئی کتاب فراہم کر سکتی ہے وہ کوئی اور میڈیم نہیں دے سکتا۔

پہلے، ادیبوں اور شاعروں کے نام جریدے اور اخبارات اعزازی طور پر جاری ہوتے تھے۔ موجودہ صورتِ حال کا تقاضا یہ ہے کہ تمام لکھنے والے لکھیں بھی اور زرِ سالانہ بھی ادا کریں۔ ہمیں جس گل شن سے لطف اندوز ہونا ہے، اس کی حفاظت اور نگہداشت کی ذمہ داریاں بھی ہمیں کو قبول کرنا ہیں۔

8۔ بحیثیت مجموعی، اردو زبان کا شاعر یا نثر نگار جائز تنقید بھی پسند نہیں کرتا۔ اُس کے نزدیک، تنقید، تنقیص ہے، ذاتی حملہ ہے۔ ہم لوگ صرف اپنی تعریف سننا چاہتے ہیں۔ کوئی ہماری غلطی کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ہم اسے برداشت نہیں کرتے اور سیخ پا ہو جاتے ہیں۔ ہم حقیقت سے فرار ہو کر، تصنع اور خوش فہمی کے سائے میں پناہ تلاش کرتے ہیں۔ اس فضا، اس ماحول میں تنقید کا برائے نام رہ جانا بھی ایک معجزہ ہے۔

شمالی امریکا میں، بزرگوارم ڈاکٹر محمد عبدالقوی ضیاء صاحب، اشفاق حسین صاحب اور ڈاکٹر خالد سہیل صاحب نے اردو ادب کو خوبصورت تنقیدی تحریریں دی ہیں۔ ان تحریروں میں تعارف زیادہ ہے اور عیوب کی نشان دہی نہ ہونے کے برابر ہے کہ "خیالِ خاطرِ احباب" درکار ہوتا ہے۔ میری اپنی تحریروں میں بھی یہی روش ہوتی ہے کہ یہاں فی الحال اعتراف اور ہمت افزائی زیادہ ضروری عوامل ہیں۔ (بھائی جن سوجھ بوجھ اور دیانت کی تلقین آپ نے مجھے کی ہے۔ اپنے لیے اسے "خیالِ خاطرِ احباب" کے کھاتے میں نہ ڈالیں)۔

نیویارک میں، پروفیسر منظور احمد صاحب (سابق وائس چانسلر، کراچی یونیورسٹی) اور نسیم اختر سید سید صاحب نے اپنی بے باک اور بے لاگ تحریروں سے احبابِ ادب کو چونکایا ہے۔ یہ ایک

اچھا، صحت مند آغاز ہے۔ میں حضرت رشید حسن خان اور مربی ڈاکٹر گیان چند جین صاحب کے نقشِ قدم پر چل کر، شمالی امریکا کے چنیدہ شعراء و شاعرات کے اسالیب کا تجزیہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں تاکہ یہاں دیانت دارانہ طور پر "نقد و نظر" کا سلسلہ آگے بڑھے۔ یہ ایک غیر مقبول، جرأت مندانہ قدم ہوگا۔ میں رب العزت سے اس عطائے خاص کا طالب ہوں۔

آج، نیویارک ایک اہم ادبی مرکز ہے۔ یہاں جدید غزل میں حمیرا رحمان، شہلا نقوی اور فرحت زاہد کے نام نمایاں ہیں، کلاسیکی، مترنم غزل کے حوالے سے صبیحہ صبا کا نام گونجتا ہے، مثنوی وقت لکھ کر صفوت علی نے دنیا کو چونکایا ہے، شہاب کاظمی مرثیہ گوئی کا سلسلہ آگے بڑھا رہے ہیں، عبدالرحمٰن عبد نے نعت گوئی کا فن آگے بڑھایا ہے (ناچیز کا کام غیر مقفہ نظموں اور رباعیات سے متعلق زیادہ ہے)۔ یہاں نئے احباب میں، رئیس وارثی صاحب شعری برجستگی اور انجمن آرائی کا ستون ہیں۔ الطاف ترمذی، مشیر طالب اور نوید گیلانی غزل کے میدان میں شہرت کا درجہ پا رہے ہیں۔ بزرگ، پختہ گو شاعر عزیز الحسن سید صاحب کا کام عمدہ ہے۔ حنیف اخگر صاحب کا دم غنیمت ہے کہ وہ آج بھی اربابِ کہنہ کی طرز غزل گوئی کے تتبع میں غزل کہتے ہیں اور اُسے روایتی گائیکی سے سجاتے ہیں۔ نیز حضرت سوز مراد آبادی اپنے شوخ اشعار اور جوان ترنم سے غزل کا روپ سنوارتے ہیں۔ یوں کہئے کہ نیویارک میں فنِ شعر گوئی کامیابی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ آئندہ فنِ تنقید بھی اس اعزاز سے ہم کنار ہو۔

MAMUN R. AIMAN
20 BISCAYNE DRIVE
HUNTINGTON, NY 11743 U.S.A.

انتخابِ کلام

مامون ایمن

پسِ چہرہ کوئی چہرہ نہ پایا
صنم خانے میں بھی شیشہ نہ پایا

ہمارے ہی تصرف میں تھی صدیاں
ہمیں نے ایک بھی لمحہ نہ پایا

جو کہتے اس کو ہم سے دشمنی ہے
عدو میں ہم نے وہ لہجہ نہ پایا

سجی تھی خواب کی محفل ہمیں سے
سنانے کو کوئی قصہ نہ پایا

وفا کو آس نے پایا نہ آساں
جفا کو دل نے پیچیدہ نہ پایا

چمن کا راز رکھنا تھا کلی نے
کسی بھنورے کو آوارہ نہ پایا

سمندر کو جو کر دیتا سمندر
سمندر نے وہی قطرہ نہ پایا

اُجڑ جائے گی منزل بھی یقیناً
مسافر نے اگر رستہ نہ پایا

کبھی تنہائی نے کیں بند آنکھیں
کبھی محفل نے آئینہ نہ پایا

کسی بھی غیر سے ہم نے تو ایمنؔ!
کسی حملے کا اندیشہ نہ پایا

باقر نقوی

لندن

1997ء کی بات ہے۔ باقر نقوی نے اپنے کلام کے دو مجموعے مجھے بھجوائے تھے۔ ان کی شاعری جی کو لگی مگر سخن ور سوم کے لیے ان سے رابطہ نہ ہو سکا۔ اب سخن ور چہارم کے وقت وہ دستیاب ہوئے تو اُن سے گفتگو ہوئی اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ شاعرانہ مزاج رکھنے والے اس شخص کو سائنس سے اور سائنس سے متعلق شخصیات سے بھی دلچسپی ہے۔ چنانچہ مشہور سائنسدان انفریڈ نوبل کے بارے میں ان کی لکھی ہوئی کتاب بے حد دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ انفریڈ نوبل نے کہا ہے کہ "ہر سال اگر میرے ذہن میں ہزاروں خیالات آئیں اور ان میں سے صرف ایک بھی کار آمد نکل آئے تو میں مطمئن ہو جاتا ہوں۔"

انفریڈ نوبل وہی شخص ہے جس کے نام پر ایک گراں قدر انعام ہر سال دنیا کے کسی بھی حصے میں رہنے والے اس شخص کو دیا جاتا ہے جس نے کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہو۔ یہ مخیر کام ہر کسی کے بس کا بھی نہیں اور ایسے مخص کے بارے میں جتنی بھی معلومات فراہم کی جائیں کم ہیں۔

باقر نقوی کی شخصیت کا دوسرا پہلو شاعری ہے۔ امجد اسلام امجد ان کے بارے میں کہتے ہیں :

"باقر نقوی ایک دھیمے، خوش رُو، خوش خو، دلاویز، مخلص اور پر کشش انسان ہیں

بعض اوقات اُن کی شاعری پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایسے مرنجاں مرنج نظر آنے والے انسان کے احساسات، فکر اور لہجے میں ایسی شدت، کاٹ اور چیزوں کے باطن میں اُتر کر انھیں سمجھنے کی ایسی زبردست بصیرت کہاں سے در آئی ہے! اُن کے اندر کا شاعر باقر نقوی ایک ایسا دلیر، پُر جوش اور روایات کا باغی انسان ہے جو معاشرتی ناہمواریوں، دولت اور مراتب کی غیر منصفانہ تقسیم اور انسان کے انسان پر ظلم اور استحصال کے خلاف صرف سوچتا ہی نہیں بلکہ اپنی اس سوچ کو زمانے بھر میں پھیلانا اور پھر اس کا مثبت نتیجہ بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ اپنے معاشرے سے اسی گہری کمٹ منٹ کا نتیجہ ہے کہ اتنے برس وطن سے دُور رہنے کے باوجود بھی باقر نقوی کی شاعری میں کہیں بھی کسی بھی قسم کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا وہ بلاشبہ شاعروں کی اس نمائندہ اقلیت سے تعلق رکھتے ہیں جس کے حوالے سے کسی دور کو پہچانا اور پرکھا جاتا ہے۔"

سید محمد باقر نقوی، تخلص باقر کرتے ہیں۔ 4 فروری 1936ء کو الہ آباد (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم کراچی میں ہوئی اور پھر برطانیہ میں چارٹرڈ انشورنس کی تعلیم حاصل کی۔ زیورچ میں ایس آئی ٹی سی مکمل کیا۔ ملازمت بھی کی اور ساتھ سیاحت بھی۔ ان دنوں ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی کراچی میں جنرل منیجر کے عہدے پر فائز ہیں۔

باقر نقوی کو شاعری کا شوق تھا اور طبیعت بچپن سے موزوں تھی مگر ان کی 18 سال کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا تو بہن بھائی اور والدہ کی معاشی کفالت کے لیے انھیں ستم ہائے روزگار کا شکار ہونا پڑا۔ چنانچہ سوئٹزرلینڈ سے جب چارٹرڈ انشورنس کی تعلیم مکمل کر کے پاکستان لوٹے اس زمانے میں غالب کی صد سالہ برسی منائی جارہی تھی۔

یہ فروری 69 کا زمانہ تھا۔ اب باقر کی شاعری کا اصل دور شروع ہوا۔ انہوں نے سنجیدگی سے شاعری شروع کی۔ چنانچہ اس سنجیدگی کے نتیجے میں ان کے تین مجموعے شائع ہو گئے۔ ان کے نام ہیں "تازہ ہوا"، "مٹھی بھر تارے" اور "موتی موتی رنگ" چوتھا زیرِ طبع ہے۔ مجموعے کا نام ابھی نہیں رکھا ہے۔ نثر میں بھی انہوں نے کچھ کام کیا ہے ایک تو الفریڈ نوبل پر کتاب لکھی ہے یہ الفریڈ نوبل کے بارے میں پہلی مفصل کتاب ہے۔ نثر کی دوسری کتاب جینٹک انجینئرنگ پر ہے اور طباعت کے مراحل میں ہے۔ نام ہے "دنیا خلیے کی" تیسری کتاب جو الفریڈ نوبل انعامات پانے والی شخصیات کے بارے میں ہے۔ 1901ء سے 1999 تک جن لوگوں نے اپنے منفرد کام کی وجہ سے انعام حاصل کیے ان کے متعلق ہے۔ شاعری سے ہٹ کر سائنسی موضوعات پر لکھنے کا خیال کیسے آیا؟ میں نے پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ "اسکول کے زمانے میں اکثر اوقات یہ خبر سننے میں آتی تھی کہ نوبل پرائز ملا۔ ہمیں کچھ خبر نہ تھی کہ نوبل پرائز ہے کیا! بلکہ ہم "نوبل" کے معنی بھی نہیں جانتے تھے۔ ڈکشنری اٹھا کر دیکھی تو NOBLE کے معنی "شریف" ملے۔ میں سمجھا کوئی بہت شریف

شاعر ہوگا اس کو پرائز ملتا ہوگا لیکن جب میں State Life کا منیجر ہو کر برطانیہ گیا وہاں جانے کے بعد مجھے کچھ وقت ملا تب میں نے سوچا کہ یہ وقفہ اچھا ہے کہ الفریڈ نوبل کو پڑھا جائے اس نے ڈائنامائیٹ ایجاد کیا تھا۔ یہی اس کی شہرت کی وجہ بھی تھی۔ جب میں نے اس کا مطالعہ کیا تو ایک بحرِ ذخار پایا۔ اتنی کتابیں اتنا میٹریل! تب خواہش ہوئی کہ الفریڈ نوبل کے بارے میں ایک مفصل سوانح اردو میں لکھی جائے اور اس میں جتنے لوگوں کو انعامات ملے ان کی تفصیل بھی دی جائے۔ دو سال کے قریب میں نے اس پر کام کیا اور ہوتا یوں تھا کہ دن میں دفتر اور رات میں یہ سب کام۔ جب اسٹیٹ لائف کا آفس کراچی میں کھلا اور میں یہاں آگیا تو وہ سارا کام اُدھورا رہ گیا۔ پھر یہاں 1997ء میں مجھے ذرا فرصت ملی تو میں نے سارے پرزے جمع کر کے تعمیراتی کام کیا اور یوں یہ کتاب مکمل ہوئی۔ اس کتاب کو اردو سائنس بورڈ نے جو حکومت کا ادارہ ہے شائع کیا۔

میں نے پوچھا۔ "آپ نے مزاحمتی یا علامتی ادب لکھا ہے کبھی؟

انہوں نے کہا۔ "مزاحمتی اور علامتی تو میں نے نہیں لکھا ہے کیونکہ میرے نزدیک مزاحمتی کی عمر بس اس وقت تک ہوتی ہے جب تک وجہ مزاحمت بھی موجود ہو لیکن مزاحمت اور علامت میری شاعری میں آپ کو جگہ جگہ ملے گی۔ ویسے میں نے جتنا مزاحمتی ادب پڑھا ہے کہ وہ جس مقصد کے لیے لکھا گیا ہے وہ مقصد بھی پورا نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ ایسے ہے کہ جیسے سر پانی گزر کر نالی میں بہہ جائے تو اس کا فائدہ کیا؟

میں نے سوال نامے سے ہٹ کر ان سے پوچھا کہ پاکستان میں خواندگی بڑھانے کے لیے ادیبوں نے کیا کردار ادا کیا؟

وہ بولے "بڑا اچھا سوال کیا ہے آپ نے مگر میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ اس لیے کہ شاعری کرنے کا جو مقصد ہوتا ہے مجھے تو وہ نظر نہیں آتا اور آپ کا یہ فرمانا بھی درست کہ کہ قلم اور حرف ایک نشتر ہوتے ہیں کہ لوگوں کی تاریخیں اور تقدیریں بدل دیتے ہیں تو ہم اس کو کس طرح صحیح مانیں اور کس طرح ایسا ہو کہ لکھنے والے اثر انداز بھی ہوں تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ لکھا تو بہت کچھ جاتا ہے مگر اس کی تشہیر نہیں ہوتی۔ کتابیں ایک ہزار چھپتی ہیں اور بکتی نہیں ہیں دس پانچ سال تک کوئی کتاب خرید کے پڑھتا نہیں تو آپ اگر لکھتے ہیں اور اگر وہ پہنچے نہیں عوام تک تو اس کا فائدہ کیا ہے؟ اور یہ ہمارے ملک کی اور ہماری بدقسمتی ہے۔ ہمارے لیڈروں نے تو صرف عوم کو لوٹا ہے دیا کچھ نہیں۔ ترقی پذیر ممالک میں لیڈر شپ دیانت دار ہے تو ان کی شرح خواندگی بھی زیادہ ہے۔ لوگ کتابیں خریدتے ہیں پھر کتابوں کی قدر اسی وقت ہوگی جب آدمی پیسے خرچ کر کے کتابیں پڑھے گا وہاں لوگ خرید کر پڑھتے ہیں اور حکومت کی لائبریریوں سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ آپ کے سامنے امریکہ کے صدر کی مثال ہے کہ ایک اسکینڈل پر ان کی جواب دہی ہوئی تھی۔ ہمارے ملک میں کچھ لکھئے تو پریس ضبط ہو جاتا ہے کیا ہے اس کا علاج؟"

میں نے پوچھا "مشاعرے کیا ادب کی تخلیق اور ترقی میں معاون ثابت ہوتے ہیں؟"

ان کا جواب تھا "بہت سے لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ مشاعرے ہماری تہذیب کا حصہ ہیں۔ مشاعرے شاعری کو فروغ دیتے ہیں اب سوال یہ ہے کہ معیار شاعری کا جو ہے تو کتنے مشاعروں میں ناصر کاظمی جاتے تھے کتنے مشاعروں میں مصطفیٰ زیدی جاتے تھے۔ مصطفیٰ زیدی D.C تھے تو ان کے اعزاز میں جو مشاعرے ہوتے تھے ان میں جانا پڑتا تھا۔ ویسے اگر نشست ہو تو شعر سمجھنے والے ہوں تو پڑھنا بھی اچھا لگتا ہے۔ ایک بار مجھے لندن سے ایلیٹ کالج کے مشاعرے میں بلایا گیا تھا تو رات دس بجے سے صبح چھ بجے میرا نمبر آیا۔ اور وہاں کوئی سینڈوچ کھا رہا تھا کوئی چائے پی رہا تھا تو ایسے میں کوئی مشاعرہ کیا پڑھے۔"

انہوں نے بتایا کو صنفِ سخن میں غزل میں بہت زیادہ موضوعات کی گنجائش نہیں ہے مگر غزل کی پابندیاں اچھی لگتی ہیں انہیں ملحوظ رکھنا چاہئے میں آزاد نظم بھی کہہ لیتا ہوں۔

باقر نقوی نے اپنی زندگی کا ایک یادگار واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

"ایک دفعہ 1990ء یا 91ء میں لاہور گیا تھا تو حسن رضوی صاحب نے مجھے دعوت دی F.C کالج کے پوسٹ گریجویٹ لڑکوں سے بات کرنے کے لیے خصوصاً برطانیہ میں اردو کی صورت حال پر بات کرنے کے لیے مدعو کیا۔ وہاں طلباء میں سے کچھ لوگوں نے پوچھا کہ آپ کی جو نئی نسل ہے وہ پاکستان میں پڑھنے والی نئی نسل کے مقابلے میں کیسی ہے؟ میں نے کہا کہ دیکھئے یہ سوال جو آپ نے مجھ سے پوچھا ہے اس کا جواب آپ مجھ سے نہ مانگیں تو اچھا ہے کیونکہ جواب میں دوں گا وہ آپ کو پسند نہیں آئے گا۔ ان کے اصرار پر میں نے کہا مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہاں کی نئی نسل یہاں کی نئی نسل کے مقابلے میں زیادہ دیانتدار ہے اور میں نے ایک مثال دی کہ میرے ایک دوست ایک بار انڈیکسڈ قران کی VCD لائے اور کہا کہ اسے اپنے لیے کاپی کرلو میں نے اپنے بیٹے سے کاپی کرنے کو کہا تو وہ کہنے لگا کہ یہ پائیریٹ یعنی جعلی کاپی ہے۔ میں نے کہا ہاں، تو اس نے کہا آپ چاہتے ہیں کہ میں قرآن چوری کروں یہ تو میں نہیں کر سکتا۔ آپ بتایئے آپ کے ہاں ایسے کتنے بچے ہیں جو اس انداز سے سوچتے ہیں۔"

S.M. BAQAR NAQVI
EFU LIFE ASSURANCE LTD.
37-K, BLOCK-6, P.E.C.H.S. KARACHI- 75400
PH:4535071- FAX:4535079- DIRECT:4537517
E-mail: efulife@khi.compol.com

انتخابِ کلام

باقر نقوی

شبنم کے قطرے میں ڈھونڈا، برف کے پارے میں
ٹھنڈک شاید چھپی ہوئی ہے اک انگارے میں

دل کے ریگستاں میں پھوٹے کبھی کوئی چشمہ
منّت کا سکہ ڈالا ہے اک فوارے میں

اپنی پیاری دھرتی کو ہم دھواں دھواں کر کے
پانی ڈھونڈنے نکلے ہیں بنجر سیارے میں

نخلِ جوانی کر آیا ہے کسی کے دیس کو دان
کھیل کھلونے بہا دیے گنگا کے دھارے میں

برج تھا اچھا لیکن اپنی بگڑ گئی تھی چال
اب مستقبل ڈھونڈھ رہے ہیں نئے ستارے میں

ٹیمز کنارے کھڑا ہوا، ہوں کیے سنہرے بال
لہروں کو اب کیا بتلاؤں اپنے بارے میں

یہی تو ہم کو لے جائے گا اڑا کے اُس کے پاس
ہم نے اپنی جان بھری ہے اس غبارے میں

تازہ ہوا، مٹھی بھر تارے، موتی موتی رنگ
عیب سہی پر ہنر بھی ہیں کچھ باقرؔ پیارے میں

بخش لائل پوری

برطانیہ

آج میں پنچ ملک کے گائے گیت سن رہی تھی۔ اس کی آواز میں بنگال کا جادو ہے اور لہجے میں بنگال کا حسن۔ جانے کیوں مجھے سہگل سے زیادہ پنچ کی آواز میں مٹھاس محسوس ہوتی ہے۔

فن رنگوں کا ہو یا آواز اور الفاظ کا۔ اپنے ہر روپ میں یہ قدرت کا عطیہ ہے۔ یہ کبھی کبھی اور کسی کسی پر نازل ہوتا ہے۔ فنکار تو اس کے اظہار یا معیار کا ذریعہ ہوتا ہے۔ ورنہ ہر کوئی میر، غالب، اقبال یا جوش بن جاتا۔

جوش پر یاد آیا۔ مجھے برمنگھم برطانیہ سے محمود ہاشمی صاحب نے جناب بخش لائل پوری پر لکھا اپنا مضمون بھجوایا تھا اور میں پنچ ملک کو سنتے ہوئے بخش صاحب کو پڑھ رہی تھی۔ بڑا مزا آ رہا تھا۔ شیر و شکر جیسے ہم آہنگ ہو کر قطرہ قطرہ میرے خشک حلق کو تر کر رہے تھے۔ افسوس بھی ہو رہا تھا کہ میں بخش صاحب تک دیر میں کیوں پہنچی۔ بڑی لمبی کہانی ہے۔ مختصر یہ کہ ہزار مسائل کے باوجود کوتاہی میری ہی رہی ہو گی۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ دیر آید درست آید اور اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے سو اس میں رتی بھر بھی شک نہیں۔ ورنہ آج کلکتہ ہندوستان سے نکلنے والا ادبی جریدہ انشاء کا بخش لائل پوری نمبر نہ اس وقت پڑھنے کو ملتا نہ میں بخش محترم کو اتنے قریب سے جان پاتی۔ یہ نمبر

کیا ہے۔ ایک شاندار کارنامہ ہے جو محترم ایڈیٹر ف۔ س اعجاز نے انجام دیا ہے۔ میں اسی لیے صحافی اور ادیب ف۔ س اعجاز کی خدمت میں مبارکبادوں کے ڈھیروں پھول نذر کرنا چاہتی ہوں۔ انہوں نے بخش لائل پوری کی زندگی کے ہر زاویے اور ہر پہلو کی قلمی تصویریں انشاء میں جمع کردی ہیں۔ وہ یہ ضخیم پر وقار اور معلومات کا خزانہ نمبر ہمیں فراہم نہ کرتے تو انشاء کی تاریخ ادھوری رہتی۔ انہوں نے اپنا صحافیانہ اور ادیبانہ حق ادا کردیا۔

اردو کی اس نفسانفسی کے دور میں چند ادیب و صحافی ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں کہ ان کے کارنامے امر ہو چلے ہیں۔ (قارئین ف۔ س اعجاز کے مزید کارناموں کے مطالعہ کے لیے زیر مطالعہ سخن ور چہارم۔ ف۔ س۔ اعجاز کا تعارف بھی پڑھ لیں)

عرض یہ کررہی تھی کہ محمود ہاشمی محترم نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ "بخش لائل پوری اپنے مزاج کے لحاظ سے بعض اوقات جوش ملیح آبادی کے قریب نظر آتے ہیں لیکن یہ قربت آنی جانی ہے۔ بخش لائل پوری کا تعلق شاعری کے کسی قبیلہ سے جوڑنا ضروری ہے تو وہ اس کارواں کے رہرو ہیں جس کے سالار ظفر علی خان تھے اور جس کے نمائندہ شورش کاشمیری تھے۔ بخش لائل پوری کے جذبے میں جو تیزی و تندی ہے، حرکت و حرارت ہے اور اظہار میں جو قوت، شدت اور بے باکی ہے وہ ان سے قبل صرف ظفر علی خان اور ان کے پیروکاروں ہی میں نظر آتی ہے۔ ظفر علی خان کا طریقِ قلندری یہ تھا کہ لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ بخش لائل پوری بھی آزادی حاصل ہو جانے کے بعد نئے سیاست دانوں کی سیاست گری، جاگیرداروں کی فرعونیت، برخود غلط علما اور خود ساختہ پیروں کے ہاتھوں علم کی بے حرمتی اور خستہ سامانی سے خفا ہیں۔"

ظفر علی خان کا ایک مشہور شعر ہے

تہذیب نو کے منہ پہ وہ تھپڑ رسید کر
جو اس حرامزادی کا حلیہ بگاڑ دے

بات کہنے کا یہ انداز بخش لائل پوری کے ہاں بھی عام ہے۔ پھر انہوں نے بخش صاحب کے یہ اشعار کوڈ کیے ہیں

فرزندانِ اہلِ شہوت   فاسق زانی نچ بہادر
عین حرامی غنڈے لوفر   آوارہ خنزیر کے نطفے
حقِ نیابت کے مشٹنڈے   جاگیروں کے راج دلارے

محمود ہاشمی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "پاکستان سے برطانیہ میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ آئے ہوئے ہیں۔ ان سب کا وطن کی مٹی سے رشتہ اب بھی مضبوط ہے۔ ان میں شاعر بھی ہیں جو کسی نہ کسی طور پر اپنے کلام میں وطن کو یاد کرلیتے ہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں جس نے بخش

لائل پوری کی طرح اپنی پوری شاعری وطن کے لیے وقف کردی ہو۔"
پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید نے بخش صاحب کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی شاعری میں ترقی پسند روایت کا بڑا عمل دخل ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

ملک مرا آزاد ہے لیکن قوم مری آزاد نہیں ہے
ہر اک ہاتھ میں ہتھکڑیاں ہیں ہر پاؤں میں زنجیریں ہیں
آج کا انسان زندانی ہے، زندانوں کی ہر بات کرو
کتابوں میں جس کا ملا تذکرہ
نصابوں میں اس کا نشاں بھی نہیں

اس شاعر باکمال سے گفتگو آسان نہ تھی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بے مثال یعنی ننگا سچ بولتا ہے۔ لیکن مجھے ان سے گفتگو کرنا ہی تھی۔ پھر میں سوال پوچھتی گئی وہ بتاتے گئے۔ فضا کو خوشگوار بنانے کے لیے میں نے پوچھا، چلیے ابتدا آپ کی زندگی کے اہم واقعات سے کرتے ہیں۔ مسکرا کر بولے "یہ رہے میرے سات انٹرویوز۔ پڑھ لیں۔"
میں نے انٹرویوز پڑھ کر کہا۔ "سچ کو تھوڑا سا شہد میں لپیٹ کر بولتے۔" جواب ملا، سچ شہد میں لپٹا ہو پھر بھی کڑوا ہوتا ہے۔ میں نے کہا ادب کے نام پر آج بھی ساری دنیا میں گھپلا ہو رہا ہے۔ اور بے ڈھنگا کاروبار۔ آپ نے جن جن لوگوں کے نام آشکار کیے ہیں۔ ان سے تعلقات بھی خراب ہوئے اور۔۔۔ انہوں نے میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے فرمایا۔
"اور یہ کہ دیگر لوگوں کو بھی سچ بولنے کا حوصلہ ملے گا اور تعلقات خراب ہوں تو ہوں مجھے کیا لینا دینا ان سے۔ لیکن برائیوں کا قلع قمع ہو۔ ان برائیوں کی جڑیں تو کٹتی رہیں گی تا کہ آئندہ یہ بار آور ہو کر سایہ دینے کی بجائے کانٹوں کی کاشت کرنے کے قابل نہ رہیں۔
بات سچ تھی۔ کھری تھی، اب ہم نے پوچھا:
"اپنے بارے میں بتایئے۔" بخش صاحب نے پہلو بدلا ہم نے کافی کا گھونٹ لیا اور ہمہ تن گوش ہو گئے وہ کہہ رہے تھے:
"میرا نام کریم بخش، ادبی نام بخش لائل پوری، جائے پیدائش تحصیل کپور تھلہ، مشرقی پنجاب اور تاریخ پیدائش قیاساً 1932ء مگر ریکارڈ پر 1934ء ہے، تعلیم ایم اے (اکنامکس) میں کرنا چاہا مگر مکمل نہ کر سکا۔
میری شعر و ادب کی ہر قسم سے وابستگی ہے۔ ترقی پسند نظریات اور انسانی اقدار کے مبلغین کی تحریروں سے متاثر رہا ہوں۔ عرصہ پینتیس سال سے انڈوپاک اور یورپ کے مختلف جرائد میں میرا کلام شائع ہوتا رہا ہے جن کی فہرست بتانا ممکن نہیں ہے۔ شائع شدہ مجموعوں کی تفصیل یوں ہے:
1۔ لہو کا خراج 2۔ زندانِ شہر 3۔ بادِ شمال 4۔ ابھی موسم نہیں بدلا 5۔ ایک سمندر میرے اندر 6۔

سوچ سمندر (اردو ماہیے) ماہ نامہ انشاء کلکتہ نے میری شاعری کے حوالے سے حال ہی میں 120 صفحات کی ایک دستاویز شائع کی ہے۔ انہوں نے اپنے بارے میں مزید معلومات فراہم کرتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے پہلی ملازمت ریڈر ہیڈ کوارٹر ماڑی پور میں سات سال تک کی۔ دوسری ملازمت نیشنل بینک آف پاکستان میں تین سال تک۔ چوتھی ملازمت برٹش ریئرویز لندن ایئرپورٹ پر انیس سال تک کی۔ 1982ء میں خود اختیاری گولڈن ہینڈ شیک کے بعد پانچ سال کاروبار کیا۔ پانچویں ملازمت گروپ فور انٹر نیشنل سیکوریٹی میں آٹھ سال تک کی۔ نومبر 1995 میں ہارٹ اٹیک ہوا جس کے بعد سے میں مکمل طور پر ملازمت سے سبکدوش ہیں۔ اردو زبان کے مستقبل پر بات ہوئی تو کہنے لگے اردو زبان کا دنیا کی تیسری بڑی زبان ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس زبان کے فروغ کو روکا نہیں جاسکتا۔ 1948ء سے بھارت میں یہ زبان زیرِ عتاب ہے اس پر ہندی زبان کا لیبل لگادیا گیا اور اس کا رسم الخط تبدیل کرنے کی بہت اسکیمیں تیار کی گئیں لیکن اردو زبان آج بھی انڈوپاکستان کے تمام صوبوں میں لکھی پڑھی اور بولی جاتی ہے۔ ہندوستان کی پوری فلم انڈسٹری اور ہندوپاک کی غزل گائیکی کا سہرا اردو زبان کے سر بندھتا ہے۔ 1948ء سے لے کر آج تک اہلِ بھارت ہندوستانی فلموں میں ہندی زبان کے صرف ایک درجن کے قریب الفاظ متعارف کرواسکے ہیں اور میرے خیال میں اس سے زیادہ کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ اردو زبان نے پاکستانی پنجاب میں پنجابی شاعری کو گہنا کر رکھ دیا ہے۔"

انہوں نے کہا میں شعر و ادب کی ہر صنفِ سخن میں اظہارِ خیال کا دلدادہ ہوں۔ نظم، غزل، قطعات اور رباعیات وغیرہ میرے اظہارِ خیال کے پیمانے میں مجھے کسی صنف میں بھی اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے میں کبھی وقت محسوس نہیں ہوتی۔ نثری نظم اور نثری غزل کے تجربات کو عوامی مقبولیت کی سند نہیں مل سکی۔ شعری تخلیق عروضی ارکان کے بغیر بدمزہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ میں نثری نظمیں نہ لکھتا ہوں نہ ہی ان کا مطالعہ کرتا ہوں۔ نظم میں قافیہ اور ردیف کی پابندی ضروری نہیں سمجھتا۔ لیکن نظم کو نثر کا لباس پہنا کر کسی کی انا کو تسکین ملتی ہے تو اسے ایسا ہی کرنا چاہئے۔ ادب میں تجربات ضرور ہونے چاہئیں لیکن ایسے تجربات کا کوئی ادبی جواز بھی ہونا چاہئے۔ موجودہ دور کے مشاعرے کوئی ادبی معیار پیش نہیں کرتے البتہ عوام کی تفننِ طبع کا سامان ضرور مہیا کرتے ہیں۔ پچھلے دور میں جب تک کسی استادِ کامل کی پشت پناہی نہ ہو کوئی شاعر اسٹیج پر جاکر شعر سنانے کی جرات نہیں کیا کرتا تھا لیکن آج کا شاعر بذاتِ خود اچھل کود کرتا ہوا مشاعرے کے اسٹیج پر پہنچ جاتا ہے اور مشاعرہ گاہ پہلوانوں کا اکھاڑا بن جاتی ہے۔ البتہ تخلیقی یا تنقیدی نشستیں فروغِ ادب کے لیے بہتر کردار ادا کرتی ہیں۔ ہم نے انہی محافل میں بیٹھ کر ادبی سوجھ بوجھ حاصل کی ہے۔

سوال نمبر 8 سن کر انہوں نے کہا:

آپ نے فرمایا ہے کہ الیکٹرونک میڈیا کی وجہ سے کتابوں کا مطالعہ اور اشاعت کم ہوگئی ہے۔

آپ کا یہ موقف درست نہیں ہے۔ یہ بات آپ کے مشاہدہ میں ہونی چاہئے کہ تخلیق ادب کو پڑھنے والے دنیا میں ہمیشہ اقلیت میں ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ دنیا میں پڑھے لکھے لوگوں کے بالمقابل جہلا اور سطحی ذوقِ مطالعہ رکھنے والوں کی اکثریت ہے لہٰذا دنیا کے ہر ادب کے ساتھ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے ہاں اعلیٰ تعلیم کا فقدان اور لائبریریوں کے نظام کی خستہ حالی بھی ہے۔ سترہ گریڈ کا لکچرار تین چار سو روپے کی کتاب نہیں خرید سکتا جبکہ سستے فلمی رسائل اور چربہ اور سطحی ڈائجسٹ بکثرت پڑھے جاتے ہیں۔ ملکی تقسیم کے وقت اردو کے صرف چند ایک جرائد تھے اور ادبی کتابوں کی اشاعت بھی معمولی تھی لیکن آج رسائل کی تعداد ہزاروں تک ہو گی اور اسی طرح ادب کے حوالے سے کتابوں کی اشاعت بھی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اگرچہ آبادی بھی بڑھ چکی ہے لیکن اعداد و شمار آپ کے خیال کی تردید کر رہے ہیں۔ الیکٹرونک میڈیا، ای میل اور کمپیوٹر وغیرہ کی آمد ایک انقلابی تبدیلی ہے ادیبوں اور شاعروں کو اسے بھی ہضم کرنا ہے۔ ان انقلابی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ہماری سوچ بھی بدلنی چاہئے۔ میرے خیال میں پرنٹ میڈیا کی افادیت اور اہمیت آنے والے وقتوں میں کم نہیں ہو گی۔ اصل سوال تعلیم اور قوتِ خرید کا ہے جو ہمارے معاشرے میں روز بروز انحطاط پذیر ہوتی جا رہی ہے۔

تنقید کے سلسلے میں میرے سوالوں کے جواب میں کہنے لگے۔" یہ بات اٹل ہے کہ مثبت تنقید مثبت تخلیق اور منفی تنقید منفی ادب کو فروغ دیتی ہے۔ تنقید کے بغیر نہ ہی اعلیٰ ادب پیدا ہوتا ہے اور نہ پروان چڑھتا ہے۔ ہم یہ دیکھ کر مایوس ہو جاتے ہیں کہ ہمارے معاشرتی نظام کا ہر شعبہ، یعنی نظام تعلیم، نظام عدل، حکومتیں وزارتیں، سفارتیں، وکالتیں صحافتیں اور کالم نویسی سب کے سب کرپشن کی دلدل میں پڑے ہوئے ہیں۔ تنقید نگار بھی اس معاشرے کا ایک فرد ہے وہ ان اثرات سے بچ نہیں سکتا۔ جو جتنا زیادہ کرپٹ ہے وہ اتنا ہی شہرت یافتہ ہے اگرچہ اس میں کچھ مستثنیات بھی ہیں لیکن عام کلیہ یہی ہے۔ ادیبوں کی کرپشن کے حوالے سے ایک واقعہ سن لیجئے۔ یہ واقعہ میں آپ کے چوتھے سوال کے حوالے سے بھی عرض کر رہا ہوں۔ 1986ء کا ذکر ہے کہ میں لکھنؤ میں ایک کانفرنس اور مشاعرہ کے لیے مدعو تھا۔ گومتی ہوٹل میں اردو کے ایک پروفیسر سے ملاقات ہوئی جو کہ ایک یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر تھے اور جن سے لندن میں ایک ملاقات ہو چکی تھی۔ دورانِ گفتگو انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ آپ ادب کے کسی موضوع پر پی ایچ ڈی کیوں نہیں کر لیتے۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ اس کا مجھے کیا فائدہ ہے۔ مجھے تو صرف شاعری کرنی ہے اور شاعری کے لیے پی ایچ ڈی کرنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ کوئی پی ایچ ڈی شاعر کامیاب شاعر نہیں بن سکا سوائے علامہ اقبال کے۔ کہنے لگے کہ اس ڈگری سے انسان کا وقار بڑھ جاتا ہے اور پھر آپ نے کچھ بھی نہیں کرنا۔ ہم آپ کو آدمی دیں گے وہ THESIS لکھے گا آپ کو صرف دستخط کرنے ہیں اور اس شخص کی تھوڑی سی کفالت کرنی ہے۔ باقی سب کچھ ہم کریں گے۔ آپ صاحب

حیثیت ہیں لہٰذا آپ کے لیے یہ کام کوئی مشکل نہیں۔ لیکن میں نے پروفیسر صاحب کی بات ایک کان سے سنی اور دوسرے سے باہر نکال دی۔ یہی صورتِ حال ایک مرتبہ لاہور میں پیش آئی۔ لاہور والے پروفیسر دوست کا پرپوزل بھارت والے پروفیسر سے ملتا جلتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بیوروکریسی اور حکمرانوں کی طرح ہمارے پڑھے لکھے لوگ بھی کرپشن کے تالاب میں ننگے ہیں۔ ہر قسم کی ڈگری سیل پر لگی ہوئی ہے (شیم شیم شیم)۔ اس صورتِ حال سے اچھے ذہن کے تنقید نگار سخت پریشان ہیں بلکہ پاکستان میں سرکار مدار سے تعلق رکھنے والے شعرا کرام کے اپنی شان میں توصیفی مقالہ نگاری سے انکار پر مار دھاڑ اور گولیاں چلانے کے اکے دُکے واقعات ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس روش میں بھی اضافہ ہوگا۔ ادارۂ ادبیات پاکستان کے سابق صدر پر کروڑوں روپوں کی کرپشن کے الزامات لگ چکے ہیں جن کی تردید میں فی الحال ایک بیان بھی شائع نہیں ہوا۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ادیبوں اور شاعروں کو تمغات وغیرہ عنایت کیا کرتے تھے۔

1936ء کی تحریک سے پہلے شعری تنقید صرف اشعار کی عروضی خامیوں تک محدود تھی۔ ترقی پسندوں نے تنقید ادب کا رشتہ انسانی اقدار سے جوڑ دیا اور اس کی بنیاد حالی کے تنقیدی افکار پر رکھی تھی جس کی نمائندگی کرنے والے آج بھی موجود ہیں جو بغیر کسی تعصب یا دوستانہ پاسداری کے ادب پاروں پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں۔ اس فہرست میں پروفیسر ریاض صدیقی، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر عقیل رضوی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر علیم اللہ، حالی، قیصر تمکین، پروفیسر سجاد حارث اور پروفیسر جمیل ملک کے اسمائے گرامی شامل کیے جاسکتے ہیں۔"

ROM:
BAKHSH LYALL PURI
337 Staines road
hounshow - Middx
London-uk- tw45ap

انتخابِ کلام

بخش لائل پوری

مرا رشتہ

مرا اُس شب سے رشتہ ہے
کہ جس شب کی سیاہی میری
نسلوں کا مقدر ہے
مرا اس شب سے رشتہ ہے
کہ جس شب کی بلندی
عرشِ اعظم سے بھی ارفع ہے
جو اربابِ تعیش کے ستم خانوں
سے نکلی ہے
یہ شب ہے یا جہنم ہے
قیامت ہے کہ فتنہ ہے
مرا اُس شب سے رشتہ ہے
کہ جس شب کی طنابیں
میری آنکھوں کے دریچوں میں
گڑی ہیں روزِ اوّل سے
یہ وہ شب ہے جسے میری
معیشت کے خداوندانِ ظلمت نے
تظلم کے پہاڑوں سے
محبت کی زمینوں پر
ریاکارانہ حربوں سے
ہوس گیری کے تیشوں سے
تراشا ہے بنایا ہے
زمانے بھر کے مظلوموں
کی آنکھوں کی فریموں میں
سجایا ہے
یہ وہ شب ہے کہ جس کے آہنی
پنجوں میں دنیا بلبلاتی ہے
مرا اُس شب سے رشتہ ہے
کہ جس شب کے تصور ہی سے
انسانوں کی روحیں کانپ جاتی ہیں
وہ شب جس کے در و دیوار پر
بے چہرہ لوگوں کے ہزاروں نقش کندہ ہیں
مرا اُس شب سے رشتہ ہے

کہ جس شب کی صلیبوں پر
سحر کی لاش جلتی ہے
کہ جس کے تیرہ خانے میں
کئی سورج امیدوں کے
کئی کرنیں مقدر کی
کئی جگنوں نگاہوں کے
مسخر ہیں، مقید ہیں
مرا اُس شب سے رشتہ ہے
کہ جس کی کالی چوکھٹ پر
جھکی ہیں سجدہ ریزی میں
جبینیں بے ضمیروں کی
جہاں کوئی نہیں سنتا ہے فریادیں
اسیروں کی
مرا اُس شب سے رشتہ ہے
کہ جس شب کے سمندر میں
اذانیں نو اُمیدی کی
موذن صبح خیزی کے
گلے میں پھانسیاں ڈالے
سسک کر ڈوب جاتے ہیں
مرا اُس شب سے رشتہ
کہ جس شب کی طوالت کی
گراں باری کئی صدیوں پہ بھاری ہے
فسوں جس کے توہم کا
کئی نسلوں پہ طاری ہے
مرا اُس شب سے رشتہ ہے کہ
جس کی کوکھ میں ورہ زنوں کی فوج پلتی ہے
یہ وہ شب ہے کہ استقبال کو جس کے
کمر بستہ کھڑا ہے ایک لشکر
شہریاروں کا
مرا اُس شب سے رشتہ ہے
کہ جس شب کی سیاہی
میری نسلوں کا مقدر ہے

مٹی کے جسم سے بچھڑا تھا مٹی ہی کھا گئی
بہتے سمندروں میں تو پانی نہ چھوڑتا

جاوید اختر بیدی
7/3/99

جاوید اختر بیدی

لندن

یہ مانا خلق محروم زباں ہے
مگر چپ بھی عجب آتش فشاں ہے

لندن میں رہنے والے جاوید اختر بیدی کی ایک غزل کا یہ مطلع جب پڑھا تو بے اختیار محترم رفعت سروش کی نظم "حرف حرف زندگی" کی یہ لائنیں یاد آگئیں

لفظ آواز کی ڈوری سے بندھے
دل کی گہرائی سے ہونٹوں تک آجاتے ہیں
اور ہونٹوں سے پھسل جاتے ہیں معنی بن کر
مگر کبھی کبھی یہ ایک کراہ، ایک چیخ بن کر بھی دلوں میں اتر جاتے ہیں۔

اپنے وطن سے دور جاوید اختر بیدی دیارِ غیر میں بڑے جتن سے اردو زبان و ادب کے دیے جلائے جا رہے ہیں۔ 1987ء سے لے کر 1998ء تک یعنی گیارہ سال کی مدت میں بیدی کے چھ مجموعہ کلام بالترتیب نئے آدم کی اولاد، 1987ء جہاں کے مقابل جہاں 1989ء، روشن صدی کے خواب 1991ء، صورتیں سب خاک کی 1993ء، اک دریا طوفانی سا 1955ء، اور

سرخ پھول ہیں میرے، 1998ء میں شائع ہو چکے ہیں۔
بیدی کے کلام میں وطن سے دوری کی تڑپ ہی نہیں وطن کے حالات پر بے بسی کا کرب بھی شامل ہے ملاحظہ ہو۔

ظلم ہی ظلم ہر اک سمت نظر آیا تھا
لیکن اس بات نے خوں کو مرے گرمایا تھا

گھپ اندھیرا تھا جہاں ایک زمانے کا غرور
میں وہاں صبح کی امید پہ اترایا تھا

شہر میں اترا تھا صدیوں کے غموں کا شارح
اور سدا کے لیے دل میں مرے در آیا تھا

جس کو دنیا میں مری آنکھ نے تخلیق کیا
ایسا موتی نہ کسی ابر نے برسایا تھا

ماں تھی موجود نہ ابا تھے نہ بھائی نہ بہن
مدتوں بعد کوئی لوٹ کے گھر آیا تھا

وہی آنگن تھا مگر پیڑ بھی غائب تھے
اور یہ بھی کہ کوئی اور ہی ہمسایہ تھا

منزلیں کفر کی سر ہونے لگی تھیں مجھ سے
مجھ کو بیدی مرے ایمان نے بہکایا تھا

جاوید جنوری 1951ء میں ہڈالہ ضلع جہلم میں پیدا ہوئے۔ 1974ء میں انگلستان آئے۔ شاعری کے علاوہ انہیں تاریخ ادب سے بھی دلچسپی ہے۔ شاعری کے تمام مکتبہ ہائے فکر سے استفادہ کرتے ہیں مگر ترقی پسندانہ شاعری سے خصوصی لگاؤ ہے۔
جاوید اختر بیدی بہت کم گو ہیں شاید۔ جو پوچھا اس کا مختصر جواب دیا۔ ان کے خیال میں اردو دنیا کی تیسری زبان محض آبادی کے اعتبار سے ہے بلکہ ان اعداد و شمار سے انہیں اتفاق بھی نہیں۔ اردو زبان کا مستقبل ان کی نظر میں پاک و ہند میں روشن ہے مگر بین الاقوامی طور پر زبان نہ ہونے کے برابر ہے۔
شاعری میں بیدی ہر قسم کے تجربات کو دلچسپی کی نگاہ سے دیکھنے کے قائل ہیں۔ مشاعرے کی افادیت کو مانتے ہیں مگر اسے محدود قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ لوگ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے

کتابوں میں دلچسپی کم لیتے ہیں لیکن یہ ایسی کوئی خطرناک بات نہیں۔
بیدی کہتے ہیں اردو تنقید اگر برائے نام رہ گئی ہے تو یہ بھی اچھا ہے۔ ادب کی ترقی کے لیے شاعری اور نثر کا اچھا ہونا شرط ہے۔ تنقید ہر گز اس سے مشروط نہیں ہے۔

JAVED A. BAEDI
39 AMBERLEY ST BRADFORD ENGLAND BD3 8QZ

ہر اک شخص سے وہ بڑا شخص ہے
مری دوستداری کو کیا شخص ہے

ریاکاریوں کے نگر میں سہی
مگر کس قدر بے ریا شخص ہے

خدائی ہے اور اُس کی مصروفیت
زمانے کا مشکل کشا شخص ہے

جہاں بھر میں اُس جیسا کوئی نہیں
بڑا آدمی ہے خدا شخص ہے

وہ بے چہرگی کا مرقع نہیں
وہی ہے جو اک رونما شخص ہے

فقط راستی اُس کا ہے راستہ
کہ وہ ایک آخر بھلا شخص ہے

جہاں ہے کسی سے محبت اُسے
وہاں میرا انسان "لا شخص" ہے

تشخص کی بیدیؔ کبھی فکر کر
مری اور تری انتہا شخص ہے

تاجدار عادل

کراچی

خود سے اکثر پوچھتا ہوں اور خود سے اکثر پوچھا ہے
آدمی آخر کیسا تھا وہ، جس نے اس کو جیتا ہے
یہ ہار عجب سی ہوتی ہے ایسے جیسے ذات میں ٹوٹے کچھ
جیسے دل میں منظر تھا اور سارا منظر جلتا ہے

کسی کو معلوم نہ بھی ہو تو اس کی شاعری بولتی ہے کہ اس کا سارے کا سارا وجود "ہار" کے نوکیلے خاروں سے زخمی زخمی ہوا ہے مگر اس نے اپنے اندر کے آدمی کو اس طرح ٹوٹنے پھوٹنے نہیں دیا کہ اس کی شخصیت کا آئینہ بھی کرچی کرچی ہو جاتا اور پھر کوئی بھی عکس اپنی اصل میں نظر نہ آتا۔

یہ بھی نتیجہ تھا ایک ایسے شخص کی تربیت کا کہ تاجدار عادل نے "مات ہونے تک" کے عنوان سے وہ ساری کیفیات رقم کردیں اور پھر اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو گیا۔ ایک نئی منزل کی تلاش کا سودا سر میں لیے۔ وہ شخص جس نے تاجدار کی ذہنی تربیت کی وہ صبا اکبر آبادی تھے۔ صبا صاحب کی شخصیت کے ہر پہلو کی چھاپ تاجدار کی شخصیت پر موجود ہی نہیں بلکہ اس کے اندر اتری ہوئی ہے۔ کہنے کی بات نہیں کہ تاجدار کو ان سے بے حد محبت تھی۔ بے حد محبت ہے اور رہے گی۔

اپنے مجموعہ کلام "مات ہونے تک" میں "عکس کی آواز" کے عنوان سے تاجدار نے صبا صاحب کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے اس کی سطر سطر کیا اس کا حرف حرف "بیٹے کی باپ سے شدید محبت" کی پکار ہے فریاد ہے، پرسوز لے ہے جو پڑھنے والے کو اسی سوگوار کیفیت سے آشنا کرتی ہے جس کیفیت کو تاجدار نے اپنے ذہن کا لمس اور اپنے جذبوں کی خوشبو بنا لیا ہے اور اپنے لہو میں اُسے رچا بسا لیا ہے۔

وہ صبا صاحب کے لیے لکھتا ہے:

"میرے لیے تو ان کا ذکر ایک حکایتِ لذیذ ہے۔ زندگی بھر بیان کرتا رہوں گا اور سیراب نہ ہوں گا لیکن کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ کاش آپ بھی میری اس کیفیت میں شامل ہو کر زندگی کی اقدار سے صبا اکبر آبادی کی محبت میں شریک ہوتے اور انسانیت اور زندگی کے حوالے سے روشن روایتوں اور زندہ کیفیتوں کا مشاہدہ کرتے جو صبا صاحب کے لمحے لمحے میں جگمگاتا ہوا نظر آتا ہے۔"

ہاں! تاجدار کا یہ جی چاہا پورا ہو سکتا ہے کیونکہ تاجدار کی تحریر میں، ایک بیٹے کے جذبے میں باپ کی محبت کا سمندر موجزن ہے۔ چنانچہ تاجدار کے لیے میرا مشورہ ہے کہ وہ جو چاہتا ہے کہ 'ہم سب' اس کی کیفیت میں شریک ہو کر صبا صاحب کی زندگی کے روشن حوالوں سے اپنی حیات کی شاہراؤں پر چراغ در چراغ روشن کریں تو اس کے لیے پہلا دیا، پہلا چراغ تاجدار کو روشن کرنا ہو گا۔ اُسے صبا صاحب کی زندگی کے اوراق رقم کر کے ہم سب تک پہنچانا ہو گا اور مجھے یقین ہے کہ صبا صاحب سے تاجدار کی بے پناہ چاہت اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچاوے گی اور پھر تاجدار تنہا کب ہے۔ سلطان جمیل نسیم ہیں اور دیگر بھائی بہن بھی اس کا ہاتھ بٹانے کو، اس کی معاونت کو موجود ہیں۔

تاجدار کی شاعری کا اگر ذکر کیا جائے تو تاجدار کے اس اعتبار کا ذکر کیا جانا بھی ضروری ہے جو اُسے صبا اکبر آبادی کا بیٹا ہونے کے ناطے حاصل ہے۔ یہاں بھی وہ اپنی ذات کے ذکر کے ساتھ صبا صاحب کے ذکر کو اولیت دیتا ہے تو بھی اعتماد کے ساتھ کہتا ہے:

"جب یہ مجموعہ (مات ہونے تک) مرتب ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک گوشہ نشین شاعر اپنے بہت سارے دلائل کے ساتھ خاموش بیٹھا مجھے بھاگتا دوڑتا دیکھ رہا ہے۔ میں ایک لمحے کے لیے رکا اور میں نے اس کے قدموں کی خاک چاٹ کر کہا کہ میں بھی تمہاری ہی ایک دلیل ہوں لیکن میں نے دیکھا کہ بارہ سو رباعیات عمر خیام کا اردو رُباعی میں ترجمہ:

مکمل دیوانِ غالب کی مکمل تظمین

پچاس سے زیادہ مرثیے اور بیس ہزار سے زیادہ غزل کے اشعار نے جیسے مجھ سے کہا کہ "ہم تم سے زیادہ معتبر دلیل ہیں تو اس وقت میں ایک بہت بڑے شاعر کی سب سے کم معتبر دلیل ہوں لیکن ہے کوئی جو میرا مقابلہ کرے؟"

پھر وہ کہتا ہے:

یہ آنکھ بھی، یہ خواب بھی یہ رات اسی کی
ہر بات پہ یاد آتی ہے ہر بات اسی کی
جگنو سے چمکتے ہیں اسی یاد کے ہردم
آنکھوں میں لیے پھرتے ہیں سوغات اسی کی
ہر شعلے کے پیچھے ہے اسی آگ کی صورت
ہر بات کے پردے میں حکایات اسی کی
پھر وحشت دل ڈھونڈتی پھرتی ہے ہمیشہ
دیوانگیٔ غم پہ مدارات اسی کی

اس شاعرے، تاجدار عادل سے مجھے ملاقات بھی بہت بھلی معلوم ہوئی کہ اس کی شخصیت میں مجھے ایسے ہی ایک اور بیٹے کی شبیہ نظر آئی جس سے بشرطِ زندگی آپ کو کبھی ملاؤں گی۔ اس وقت ہم تاجدار عادل سے ملتے ہیں۔ اس شاعر نے 11 ستمبر 1955ء کو حیدر آباد سندھ کی سرزمین پر جنم لیا۔ ابتدائی تعلیم حیدر آباد سندھ سے حاصل کی لیکن ثانوی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم یعنی بی اے آنرز اور معاشیات میں ایم اے جامعہ کراچی سے کیا۔ پھر پاکستان ٹیلی ویژن سے بحیثیت پروگرام پروڈیوسر وابستہ ہوئے۔

آپ اور ہم سب جانتے ہیں کہ تاجدار عادل کا تعلق ایک ادبی گھرانے سے ہے ان کے والد صبا اکبر آبادی اردو ادب کے ان شاعروں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے مرثیہ، غزل، رباعی اور تضمین جیسی اصناف میں وہ امتیاز حاصل کیا جو بہت کم شاعروں کے حصے میں آیا۔ ان کے بھائی سلطان جمل نسیم، تاجدار کی پیدائش سے قبل 1950ء سے اردو افسانے کی دنیا سے وابستہ ہیں اور ایک مستند مقام رکھتے ہیں اور غالباً یہی سبب ہے کہ تاجدار نے جب بولنا سیکھا تو کانوں میں پڑنے والی آوازیں اردو ادب کے بہت سی مشاہیر کی آوازیں تھیں چنانچہ شاعری کے علاوہ تاجدار نے افسانے بھی لکھے جو ملک کے مختلف جرائد میں شائع ہوتے رہے لیکن بعد میں بقول اسلم فرخی کہ یہ افسانہ نگاری تاجدار کی شاعری میں شامل ہوگئی۔ ملک کے مختلف جرائد خصوصاً سیپ، افکار اور الفاظ میں تاجدار کا کلام چھپتا رہا، اب تک شاعری کے حوالے سے 1981ء میں شائع ہونے والا پہلا مجموعہ "مات ہونے تک" ہے۔ جس کا یہ شعر آج بھی بھلایا نہیں جاسکا۔

وہ اس کمال سے کھیلا تھا عشق کی بازی
میں اپنی فتح سمجھتا تھا مات ہونے تک

تاجدار کی دوسری کتاب کا نام "اثبات" ہے جس میں تاجدار، صبا اکبر آبادی اور سلطان جمیل نسیم کی تخلیقات شامل ہیں۔ تاجدار کا مطالعہ ادب تک اس لیے محدود نہیں کہ انہوں نے معاشیات میں ہی ایم۔ اے نہیں کیا تھا بلکہ پہلے ایم۔ اے کے سولہ سال بعد دوسرا ایم۔ اے ابلاغ عامہ میں

کر لیا تھا۔ تاجدار کے دوستوں میں چونکہ میڈیکل کے اور فلاسفی کے بہت سارے ماہرین شامل ہیں لہٰذا ان شعبوں میں بھی ان کا مطالعہ کافی مناسب ہے۔

اردو زبان کے متعلق تاجدار کا خیال بھی صبا صاحب کے خیال کے مطابق یہی ہے کہ "یہ زبان اس وقت تک ترقی کرتی رہے گی جب تک اس کے بولنے والے کشادہ دل اور کشادہ ذہن رہیں گے لیکن قلمی سطح پر فارسی جانے بغیر اردو جاننے کا دعویٰ کرنا ایسا ہی ہے جیسا دیکھے بغیر کسی شخص کی تصویر بنانے کی کوشش کی جائے۔"

مشاعروں کے متعلق تاجدار کہتے ہیں کہ "دس بیس ہزار کی تعداد میں سامعین کی شمولیت والے مشاعرے دراصل ادبی میلے ہوتے ہیں جس سے شاعر کو تو پہچانا جا سکتا ہے شعر کی پرکھ نہیں ہو سکتی اور شعر کی پرکھ کے لیے مخصوص نشستیں ہی وہ واحد ذریعہ ہیں جہاں سب ایک دوسرے سے ایک کی تخلیق کے متعلق کھل کر اظہارِ خیال کر سکتے ہیں۔"

نثری نظم کے بارے میں تاجدار کا کہنا ہے کہ "اگر کوئی بھی تحریر پوری تخلیقی قوت سے لکھی جائے تو اس صنف میں ہمیشہ ترقی کے امکانات رہتے ہیں۔ اور اگر نثری نظم بھی اس انداز سے لکھی جائے تو اس شاید آئندہ اس میں غزل سے زیادہ ترقی ہو۔"

الیکٹرونک میڈیا سے وابستگی کے سبب سے تاجدار کتابوں کے مستقبل سے بہت زیادہ خوف زدہ ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اگر ابھی سے تہذیب اور تربیت کے حوالے سے ہر گھر میں کتاب کے پڑھنے اور پڑھانے کی جانب توجہ نہیں دی گئی تو آئندہ پچاس سال میں لوگوں کے گھروں میں کیسٹ ہوا کریں گے کتابیں نہیں۔ چنانچہ گھر کی تربیت کے ساتھ ساتھ کتابوں کی قیمتیں انتہائی کم ہوں اور طباعت کے معیار میں انقلابی تبدیلیاں کی جائیں ورنہ جس طرح اب ادب صرف شرفا کا کام ہو کر رہ گیا ہے کتابیں بھی پاکستان میں شرفا کے گھروں تک محدود ہو کر رہ جائیں گی۔

تاجدار کا کہنا ہے کہ "اردو تنقید ہمارے ادب کے زوال کی سب سے بڑی وجہ ہے جعلی نقادوں اور اردو پڑھانے کے لیے اسکولوں کالجوں میں مقرر کیے گئے استادوں نے جب سے نقاد کا درجہ اختیار کیا ہے ادب کو سمجھنا اور اس کی روح اور اس کے مزاج کو آگے بڑھانا تقریباً ختم ہو چکا ہے چنانچہ اب ادب بھی ایک جیسا ہے اور تنقید بھی ایک جیسی۔ ضروری ہے کہ ادب کے اعلیٰ حوالوں کے لیے کچھ پیمانے مرتب کیے جائیں جو صرف انگریزی کے نقادوں کے اردو ترجموں تک محدود نہ ہوں اور اپنی تاریخ، تہذیب اور روایات کی روشنی سے پوری طرح جڑے ہوئے ہوں ورنہ یہی ہوگا جو اب ہو رہا ہے کہ سائبیریا کی برفانی ہواؤں سے بچنے کے لیے جو کپڑے تیار کیے جاتے ہیں ان کو معیار بنا کر ہم ململ کے کرتے کی قدر و قیمت کا تعین کریں گے۔"

Tajdar Adil
B-80, Gulshan-e-Iqbal, Karachi (Pakistan)

انتخابِ کلام

تاجدار عادل

ہر اک کی راہ میں جلتا نہیں ہے
چراغِ عشق ہے، شعلہ نہیں ہے

مری تنہائی نے مجھ سے کہا تھا
جو اپنے ساتھ ہے تنہا نہیں ہے

ستارے کی طرح چمکا تھا لیکن
وہ آنسو آنکھ میں پھیلا نہیں ہے

میں اب تک اس کو بھولا بھی نہیں ہوں
مگر وہ یاد بھی آتا نہیں ہے

دریچے میں ہے جس کے دل کی خوشبو
وہ اب تک پاس سے گزرا نہیں ہے

بغیرِ زندگی ہیں لوگ زندہ
وہ اب تک بات یہ سمجھا نہیں ہے

بہت سی ٹھوکریں کھائی ہیں لیکن
کوئی پتھر ابھی ٹوٹا نہیں ہے

اُسے ظاہر ہوا ہے ساتھ چل کر
کہاں تک دھوپ ہے سایہ نہیں ہے

صبح کا افسانہ کہہ کر شام سے
کھینچتا ہوں گردشِ ایام سے
تجمل علی خاں
۱۹ اپریل ۱۹۹۶ء

صاحبزادہ تجمل علی خان

کراچی

"اردو شاعری کا تیسرا اسکول" صاحبزادہ تجمل علی خان کا ایم۔ اے کا مقالہ ہے۔ اس میں مصنف نے اپنے آبائی مولد رام پور کو اردو شاعری کا تیسرا اسکول قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"اس مقالہ کو لکھتے وقت یہ خیال بھی نہ تھا کہ اس قدر دشواریاں راہ میں حائل ہوں گی۔" اس مقالے میں انہوں نے اردو شاعری کے حوالے سے لکھا ہے کہ رام پور کے متعلق مجمل اور یک رُخی حالات کئی تذکروں میں پیش کیے گئے ہیں دہلی اور لکھنؤ تباہ ہونے کے بعد اردو کا تیسرا سب سے بڑا اسکول ہندوستان میں رام پور ہی تھا جس نے اہلِ علم وادب کی پزیرائی کی اور حقِ میزبانی ادا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

صاحبزادہ تجمل علی خان آج ہمارے درمیان اس دور کی یادگار ہیں جو اب خواب وخیال ہو گیا ہے۔ نہ وہ باتیں نہ وہ تہذیب نہ وہ لوگ لیکن ان کا ذکر جب بھی اور جہاں بھی ہو سننے اور پڑھنے میں وہی چاشنی اور لطافت ہے جس کی تلاش میں اس تہذیب کے مداح اور شیدائی اب بھی سرگرداں

ہیں۔ علی گڑھ کے ان کے ساتھی سید ولی حیدر بھی تھے جنہوں نے اپنے تعارف میں صاحبزادہ تجمل علی خان کا ذکر کیا ہے۔

صاحبزادہ تجمل علی خان 10 جولائی 1920ء رام پور اسٹیٹ یوپی ہندوستان میں پیدا ہوئے، تعلیم میٹرک اور انٹر رام پور سے کیا۔ 1944ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے کیا اور 1946ء میں اردو میں ایم۔اے اور پھر 1974ء میں علی گڑھ ہی سے ایل ایل بی فرسٹ کلاس پاس کیا۔ بحیثیت وکیل درجہ اوّل 1948ء میں ریاست رام پور میں وکالت کی۔ جولائی 1949ء میں کراچی تشریف لائے۔ یہاں بھی وکالت کا پیشہ اپنایا اور اوتھ کمشنر کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دیے۔

صاحبزادہ تجمل علی خان نے منہ کا مزہ بدلنے کو کبھی کبھی شاعری سے بھی شوق فرمایا ہے:

ایک قطعہ ملاحظہ ہو۔

حسرتِ گال پہ رشک بھر لائی
ہر کلی مسکرا کے پچھتائی
زندگی کو ازل سے کچھ نہ ملا
اک غمِ صبح و شام لے آئی

ان کی تالیفات درج ذیل ہیں 1۔ عتیق پریکٹیکل انگلش ٹیچر 1954ء، 2۔ اردو شاعری کا تیسرا اسکول 1976ء، 3۔ تلخیص قواعد نوٹری پبلک (اردو) 1978ء، 4۔ لیگل پروویژن آف نوٹریز (انگریزی) 1984ء، 5۔ "مجاہد اعظم" (اردو) 1985ء، 6۔ ترجمہ "تاریخ روہیلہ افغان" (اردو) 1987ء، 7۔ مقالات صدی کانفرنس، میر مولانا محمد علی جوہر (اردو) 1988ء، مدیر اعزازی ماہنامہ نوائے کراچی، اجراء جنوری 1955ء

تجمل علی خان صاحب اب بھی باقاعدگی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا میرے زیرِ مطالعہ زیادہ تر مذہبی اور تحقیقی کتب رہتی ہیں میری کتاب ہٰذا کے شذرات صفحہ نمبر دو سے میرے نظریۂ حیات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ میری زندگی غم انگیز واقعات سے مملو ہے اس لیے دلچسپ واقعات کہاں سے لاؤں۔ البتہ اہم واقعات بھی قنوطی ہیں۔ حالانکہ میری ظاہری زندگی ہمیشہ رجائی رہی ؎

چھپا رہا ہوں تبسم میں راز ناکامی
گزر رہی ہے جو دل پر کسی کو کیا معلوم

اس کے علاوہ ایم اے تک میری زندگی غیر سنجیدہ رہی۔ علی گڑھ میں ایم اے امتحان بھی بغیر کتابوں کے پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب مرحوم و مغفور کے نوٹس پر پاس کیا۔ قانون کا امتحان میں تھرڈ ڈیویژن نہیں ہوتی تھی اس لیے پہلے امتحان میں فیل ہوگیا۔ پھر محنت کر کے پڑھا تو فرسٹ کلاس فرسٹ پاس آیا۔ میرا تعلق لکھنؤ اور بھوپال سے بھی تھا۔ اس لیے پہلے لکھنؤ یونیورسٹی

میں بی اے میں داخلہ لیا تھا لیکن دل نہیں لگا۔ میں فطرتاً جذباتی واقع ہوا ہوں۔ لہٰذا لکھنؤ سے علی گڑھ کا ٹکٹ لے کر پہنچ گیا اور داخلہ لے لیا اور۔

1969 میں کراچی آکر بھی 8 سال تک یہی دور رہا۔ اس دوران میں ماہنامہ "نوائے کراچی" کا اجرا اور بندش بھی ہوئی اور ساقی فاروقی سے ملاقات بھی ہوئی۔ اردو کا مستقبل نہایت درخشاں ہے۔ یہ زبان ادب کی ہر صنف کو سمو لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ دینی و مذہبی کتب اور تفاسیر کے علاوہ سائنسی معلومات کا اضافہ بھی کر سکتی ہے اور شاعری میں تو غالب اور اقبال نے اس کو مالا مال کر دیا۔ عربی اور فارسی الفاظ کی تراکیب کے استعمال نے اس میں چار چاند لگا دیے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

مگر اس طرح نہیں کہ۔

قمر جمیل نے ایجاد کرکے نثری نظم
چچا کی روح سے بدلہ لیا ہے کیا کہیے

مشاعرے بھی ادب کی تخلیق میں بہتر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ کتابوں اور جرائد کی بقا کے سلسلے میں آپ جو کام کر رہی ہیں وہ قابلِ تحسین ہے۔

دورِ حاضر میں اردو ادب میں تنقید لازمی ہے۔ غالب سے پہلے اردو شاعری گل و بلبل تک محدود تھی غالب پہلے شاعر تھے جس نے شاعری میں فکر کے عنصر کا اضافہ کیا اور جہاں انسانی نفسیات کی کار فرمائی اور بذلہ سنجی بھی تھی۔ ان کا Vision اپنے دور کے شعراء کے مقابلے میں زیادہ تھا وہ کلکتے بھی گئے اور فورٹ ولیم کالج بھی دیکھا۔ مشرقی تہذیب کا ماتم ہی نہیں کیا بلکہ مغربی تہذیب کا استقبال بھی کیا۔ اس بارے میں ایک واقعہ بیان کرتا لیکن۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

انہوں نے کہا ہے۔

خیالِ خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

چنانچہ چچا کی خاطر اور آپ کے اس سوال کا تفصیل سے جواب لکھ رہا ہوں

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

غالب نے کائنات کا آنکھیں کھول کر مشاہدہ کیا ہے اور یہی ان کی وہ خوبی ہے جسے "تحصیل حقائق" کہتے ہیں۔ اسی کی بدولت انہوں نے اپنے دور کے فرنگی نظام کی خوبیوں کا موازنہ قدیم مغل

نظام کی خرابیوں سے کر کے اسے ٹھنڈے دل سے قبول کر لیا۔ ہنگامہ 57ء سے پہلے ہی وہ اس کے قائل ہو چکے تھے کہ نیا نظام ہر اعتبار سے قدیم نظام پر فوقیت رکھتا ہے۔ سر سیّد احمد خان نے ابوالفضل کی تصنیف "آئین اکبری" کی تصحیح و تدوین کر کے شائع کرنا چاہا اور اپنی اس کاوش پر غالب سے تقریظ کی فرمائش کی تو اگرچہ وہ انکار نہ کر سکے تاہم اپنی تقریظی نظم میں یہ کہے بغیر نہ رہے کہ سیّد کو اس فرسودہ نظام حکومت کے دفتر کو شائع کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی جبکہ یہ شے ارفع اور قوی نظام "صاحبان انگلستان" کے آئین میں پایا جاتا ہے۔ انہیں چاہئے تھا کہ اس پر خامہ فرسائی کرتے۔

ان کی اس تقریظ پر سر سیّد خاصے دل گرفتہ ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ برسوں اُن کے دل میں اس کا غبار رہا مگر غالب کی اس صاف گوئی پر کوئی حرف نہ رکھ سکے اور بعد میں جب انہوں نے تحریک اصلاح چلائی تو یقین ہے کہ انہوں نے غالب کی اس حقیقت پسندی کو تسلیم کر ہی لیا ہو گا ورنہ وہ کیوں برطانیہ کا سفر اختیار کرتے اور وہیں کے نمونے پر "تہذیب الاخلاق" جاری کرتے اور دارالعلوم قائم کرتے جو اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہے۔

ڈاکٹر اقبال نے اسلامی نشاۃ ثانیہ کا خواب دیکھا جس کی نصف تعبیر پاکستان کی صورت میں جلوہ گر ہوئی اور عالم اسلام کی حالیہ بیداری بھی اسی تعبیر کا ایک حصہ ہے۔ علامہ اقبال کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مذہب کے فلسفے کو رنگیں انداز اور شعری رنگ میں پیش کیا اور اس کے لیے اردو فارسی اور انگریزی زبانوں سے کام لیا۔ دراصل علامہ ایک اسلامی تحقیقی ادارہ قائم کرنے کے آرزومند تھے تاکہ آئندہ چل کر وہ اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لیے کی جانے والی کوششوں میں معاون ہو سکے۔ چنانچہ پٹھان کوٹ کے قریب جمال پوری میں ایک دینی ادارہ بنام "دارالاسلام" قائم کر دیا تھا اور مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کا نام اس ادارے کی سربراہی کے تجویز کیا تھا اور استاد مودودی نے حیدر آباد دکن سے آکر اس پر کام کا آغاز کر دیا تھا اور لاہور کا عزم کر رہے تھے کہ علامہ کی عمر نے وفا نہ کی۔ مولانا مودودی بھی اردو نثر کے انشاپرداز مانے جاتے ہیں جس طرح اردو کی ترقی میں اولیائے ہندوستان کو اہمیت حاصل تھی۔ اسی طرح اردو کی ترقی میں اولیائے سندھ کا بھی ہاتھ ہے۔

ویسے تو ادب کی ترقی کے لیے تنقید ضروری ہے لیکن اس میں تعمیری پہلو ہونا چاہئے۔ شاعری میں متعدد شعرا سے توارد ہو رہے۔ تنقید کی چند مثالیں: 24 دسمبر 1993ء، راحیلہ سلطان، کالم نگار، ادبی صفحہ۔ عنوان "آتے ہیں غیب سے یہ مضامین" نے تحریر کیا ہے کہ غالب نے سید علی غمگین کے چند اشعار سامنے رکھ کر لکھے ہیں۔ اس کا جواب راقم الحروف نے تحریر کر کے روزنامہ جنگ کو ارسال کیا لیکن وہ شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ مسودہ یہاں بھی میرے پاس موجود ہے۔ 6 ستمبر 1991ء مضمون نگار ایس ایم معین قریشی۔ عنوان "پروین شاکر کا۔۔۔ انکار۔۔۔ یا۔۔۔ اقرار" موضوع وہی توارد۔ 11 اکتوبر 1991ء۔ مضمون نگار: راقم راحت: عنوان "شاعری میں تنقیدی اور تعمیری پہلو۔ پروین شاکر تنہا نہیں ماضی میں متعدد شعرا سے توارد ہوا ہے۔" معین قریشی

روایتی مردانہ تعصب کے شکار ہو گئے" وغیرہ وغیرہ۔ میرے خیال میں آج کل ادیب اور شاعر مشفق خواجہ کی تنقید کے میدان اچھی کار کردگی ہے۔ وہ ایک عرصہ تک ہفت روزہ "تکبیر" میں بعنوان "سخن در سخن" خامہ بگوش کے قلم سے۔ تنقیدی کالم لکھتے رہے ہیں جو پہلی مرتبہ ہندوستان سے بھی کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔

116۔ علی دولت اسکوائر ایس۔ ڈی 22
بلاک "جی" نارتھ ناظم آباد، حیدری کراچی

انتخابِ کلام

کس قدر دلچسپ ہے میری پریشانی کا دور
دیکھیں اب کیا رنگ لائے فکر انسانی کا دور

سبزہ بیگانہ، فضا افسردہ، غنچے مضمحل
واہ کیا حیرت فضا ہے خانہ ویرانی کا دور

وہ تبسم ہائے رنگیں کی نوازش اب کہاں
اک افسانہ بن گیا تھا اُن کی گل افشانی کا دور

رفتہ رفتہ سارے پردے درمیاں سے اُٹھ گئے
راس آیا حسن کو جلووں کی عریانی کا دور

تجمل اُف! وہ آغازِ جنون کی سادگی
یاد آجاتا ہے اکثر اپنی نادانی کا دور

آنکھ چھین سکتی ہے پر خواب نہیں چھین سکتے
ابھی تو بغیرِ تمنا میں کھنک باقی ہے

تسنیم عابدی

تسنیم عابدی

ابو ظہبی

ہندوستان کے مشہور نقاد محمد حسن نے ایک جگہ بغیر نام لیے ان دو خواتین کے بارے میں لکھا ہے جو مشہور شاعرہ اور افسانہ نگار تھیں مگر شادی کے بعد جن کی تحریروں کی اشاعت پر پابندی لگ گئی اور یوں اردو ادب کا خزانہ ان دو عہد آفریں ادبی شخصیات کی تحریروں سے ہمیشہ کے لیے محروم رہ گیا۔

جناب محمد حسن اسے فکر و فن کے قتل کی واردات قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ان واقعات کا موازنہ ہٹلر کے زمانے کی نازی جرمنی میں فکر و فن پر خونی قدغن سے کیا جاسکتا ہے۔ نہ جانے ایسی کتنی خواتین ہوں گی جنھوں نے خاموشی سے اپنے اندر کے فن کو شہادت کی صلیب پر پیش کیا۔ صرف اس لیے کہ استحصال کا یہ سماج عورت کو تخلیقی فن کے مرتبے پر فائز دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس کے ذمہ دار محض مرد نہیں بلکہ وہ استحصالی نظام ہے جس کی بنیاد وراثت، منافع، ذاتی جائیداد اور نجی ملکیت پر قائم ہے۔ اس نظام میں عورت بھی محض ایک ملکیت ہے۔ مرد کی ملکیت، اس کے خاندان کی ملکیت اور ملکیت کو صرف وہی جوہر قائم رکھنے کی اجازت مل سکتی ہے جو اس کے مالک کو پسند ہوں۔"

ایسی ہی سوچ کا اظہار پروفیسر علی حیدر ملک نے تسنیم عابدی کے مجموعہ کلام صحرا، آنکھیں، تنہائی' میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "زن اور زمین تخلیق کا سر چشمہ ہیں۔ عورت ماں ہے اس لیے دھرتی کو بھی ماں کہاں جاتا ہے۔ افزائشِ نسل سے فصل اگانے اور فصل اگانے سے تہذیبی اقدار کی نمو اور فنونِ لطیفہ کی ترویج و ترقی تک عورت نے ہر شعبے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ غالباً مردوں سے بھی زیادہ، لیکن مادری نظام کے پدری نظام میں تبدیل ہو جانے کے باعث عورت کے کردار کو اس طرح تسلیم نہیں کیا گیا جس طرح کہ اسے تسلیم کیا جانا چاہئے تھا۔ جسمانی طاقت و وسائل پر تصرف اور اقتدار پر قبضے کی بناء پر مرد نے ہر چیز اپنے نام کر لی۔"

یہ جبر ماضی میں تو تھا۔ حال میں بھی ہے مگر کم کم۔ وہ وقت بھی آنے کو ہے جب آج کا یہ جبر بھی نہیں رہے گا۔ یہاں مجھے ایک تاریخی واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ذکر کرتی ہی چلوں۔

دنیا کے سب سے بڑے فاتح اور حکمران سکندرِ اعظم اپنی فتوحات کے نشے میں چور ایک دانش ور سے پوچھ رہا ہے "مانگ کیا مانگتا ہے۔"

دانشور نے اُسے سر سے پیر تک دیکھا اور صرف اتنا کہا۔ "ہو سکے تو دھوپ چھوڑ دیجئے۔" یہ دانشور دیو جانس کلبی تھا جس نے "ہو سکے" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ وہ بھی کوئی دانشور ہی ہو گی جس نے "ہو سکے" کو حرفِ غلط کی طرح مٹا کر کہا ہو گا "دھوپ چھوڑ دیجئے اور......"

روشنی پھیلتی چلی گئی۔

انہی روشن راہوں پر چلتی ہوئی تسنیم عابدی آج ہم تک پہنچی ہیں۔ بساطِ ادب پاکستان کراچی، نے ان کے کلام کا پہلا مجموعہ "صحرا آنکھیں تنہائی" کے نام سے جنوری 1999ء میں شائع کیا۔

تسنیم 5 فروری 1961ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ جامعہ کراچی سے اردو میں ایم۔ اے کیا۔ رثائی ادب میں خواتین کا حصہ کے عنوان سے تحقیقی کام کا آغاز کرنے کو ہیں۔ ان کا کلام افکار، سیپ، تخلیق، اوراق، تجدید نو اور شاعر میں شائع ہوتا ہے۔ ان دنوں پاکستان کالج ابو ظہبی میں اردو کی معلمہ ہیں۔ سولہ برس کی عمر میں شادی ہو گئی اس وقت بی۔ اے کی طالبہ تھیں۔ شادی کے بعد ایم۔ اے کیا دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔

تسنیم نے لکھنے کی ابتدا افسانہ نگاری سے کی مگر پھر رجحان شاعری کا پا کر اس صنف میں طبع آزمائی کرنے لگیں۔ اب بھی کبھی کبھی تنقیدی مضامین لکھ لیتی ہیں۔ نثر و نظم دونوں کا مطالعہ کرتی ہیں۔ ترجمے پڑھنے کا شوق اب پیدا ہوا ہے۔ انہیں اپنے ملک کی صوبائی زبانوں کے ترجمے اچھے لگتے ہیں۔ خصوصاً صوفیانہ شاعری جس میں شاہ عبد اللطیف بھٹائی، بابا رحمٰن، خوشحال خان خٹک اور وارث شاہ شامل ہیں۔ فارسی کے شعراء کا کلام انہیں خصوصیت سے پسند ہے۔

تسنیم کہتی ہیں "فلسفہ کی کتابیں بھی روح کو تازگی بخشتی ہیں اس سلسلے میں کراچی کے اساتذہ بہت مددگار ثابت ہوئے ہیں (سحر انصاری صاحب اور فلسفہ کے شعبہ کے جاوید امیری صاحب

وغیرہ) یہاں امارات میں رہنے کی وجہ سے وقت تو بہت ہے مگر اچھے لوگوں کی صحبت سے دور ہیں اس لیے رہنمائی کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔"

تسنیم نے بتایا "زندگی کے دلچسپ واقعات کی جانب جب دیکھتی ہوں تو بچپن ہی سب سے دلچسپ گزرا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اُس دور میں ہوائیں بھی آج کی ہواؤں سے منفرد اور معطر تھیں۔ خزاں بھی بہار سے بہتر تھی۔ بچپن کے ہنر تھے اور ماں باپ کی شفقت۔ اب ہوائیں، موسم اور ہنر بدل چکے ہیں۔ زندگی کا دوسرا دلچسپ واقعہ اچانک شادی تھی اور تیسرا اہم واقعہ بیٹی کا میڈیکل کالج میں داخلہ۔ مجموعی طور پر زندگی دلچسپ ہے میں خود غیر دلچسپ ہو گئی ہوں۔"

ان کی رائے میں اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان تو ہے مگر افسوس کہ یہ اہل زبان کی سرپرستی سے محروم ہوتی چلی جا رہی ہے ان کا کہنا ہے زبان میں تبدیلیاں اتنی بری بات نہیں مگر یہ تبدیلی حسن پیدا کرنے اس کی صورت مسخ نہ کرے۔ اہلِ زبان طبقہ کی بے اعتنائی کی وجہ سے مایوسی ہوتی ہے۔ نئی نسل تعلیم یافتہ ہے لیکن اس کے پیشِ نظر صرف پیشہ کا حصول ہے علم جاننے یا معلومات میں اضافہ کے لیے نہیں حاصل کیا جا رہا بلکہ اس لیے کہ اچھا پیشہ میسر ہو اسی وجہ سے اردو سے دوری اور انگریزی سے نزدیکی ہو رہی ہے۔ تعلیمی ادارے پیشہ ور ماہر پیدا کر رہے ہیں۔ زبان پر غیر زبانوں کے پیوند لگ رہے ہیں اردو زبان اس صورت حال کا شکار ہے مگر پھر بھی اس کا مستقبل روشن ہے کیونکہ ادیب اور شاعر اس سے وفادار ہیں۔ خدا کرے کہ قارئین بھی سنجیدگی اختیار کریں۔ دراصل الیکٹرانک میڈیا نے قاری کو کتاب سے دور کر دیا ہے مگر کتاب کی عظمت اور مقام بہت مستحکم ہے کیونکہ ٹی وی فلم کمپیوٹر اور انٹرنیٹ دماغ کو اتنا حرکت میں نہیں لاتے جتنا قلم اور دوات سے ذہن کو تحریک حاصل ہوتی ہے۔

تسنیم کہتی ہیں "شاعری میں غزل کی بہت زیادہ معترف ہوں۔ مختصر الفاظ میں مفصل عنوان کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ ہر نئی چیز اچھی نہیں ہوتی۔ تبدیلی، حسن میں اضافہ کے لیے ہونا چاہیے صورت مسخ کرنے کے لیے نہیں۔ اس لیے نثری غزل تو پڑھتی بھی نہیں ہوں۔ مشاعرے معاشرے اور سخن فہم افراد کے جمود کو متحرک کرتے ہیں وہ معاشرہ جہاں ڈانس ڈنر اور پارٹیاں ہو رہی ہوں وہاں کم از کم مشاعرہ ضرور کر دیا جائے تاکہ اتنے بڑے مجمع میں سے کوئی ایک ہی ادب پر ایمان لے آئے اور اس میں کشش محسوس کرے تو مقصد محفل حاصل ہو جائے۔ پھر یہ کہ ادبی محافل میں تو نشست و برخاست تک سکھائی جاتی ہے۔ شعراء ان محافل م[illegible] گوں کے لیے ایک ماڈل یا نمونہ ہوتے ہیں انہیں اپنے مرتبہ کا خیال رکھنا چاہیے۔ یہ ضر[illegible]ہے کہ مشاعرہ شاعر کے مقام متعین کرنے کا ذریعہ نہیں ہوتے صرف تبلیغ ترویج اور تشہیر کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ مشاعرے میں کامیابی سے مقام ادب کا تعین غلط فکر ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اچھا لکھا اور اچھا پڑھا دونوں فوراً پسند کیے جاتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے اردو کی بقا کے لیے موجودہ دور کے پیشِ نظر ٹی وی پر ادبی پروگرام زیادہ نشر ہونا چاہئیں تاکہ نئی نسل سے متعارف ہونے میں دقت نہ ہو۔ کتابوں اور جرائد کا اجرا بھی جاری رہنا چاہئے۔ موجودہ دور کے تقاضوں کے پیشِ نظر کتاب اور جریدہ کو پرکشش بنانا چاہئے یہ سب کچھ سطحی باتیں نئی نسل کے لیے ہیں مگر فن کا معیار اس کی گہرائی میں مضمر ہے۔

تنقید کے سلسلے میں ان کی رائے ہے کہ صرف سنجیدہ تنقید سے ہی ادب کا معیار بلند کیا جاسکتا ہے۔ تنقید اور تخلیق کو ایک دوسرے سے دست و گریباں نہیں ہونا چاہئے ان کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ آج کے معاشرے میں تخلیق کار نقاد سے اس لیے خوف زدہ ہوتا ہے کہ اُسے خطرہ ہوتا ہے کہ ناقد اس کی تحریر میں جتنے کیڑے نکالے گا اتنا ہی وہ کامیاب اور مستند سمجھا جائے گا حالانکہ میرے نزدیک ناقد تو اس استاد اور مصلح کی مانند ہوتا ہے جو بڑی خوبصورتی سے ہیرے کو تراش کر اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتا ہے وہ دراصل جوہری ہوتا ہے۔ اپنے اردگرد تخلیق کاروں کا مجمع نہیں لگاتا بلکہ دشمنوں کی محفل میں بھی دوست ہوتا ہے۔ ادب کی ترقی کے لیے مثبت تنقید کی ضرورت ہے فنکار پر توجہ کم صرف کی جائے اور فن پر زیادہ۔ ادب ضرور پروان چڑھے گا۔

تنقیدی نشستیں بھی ضرور ہونا چاہئیں جن میں بالغ نظر افراد موجود ہوں لیکن ان سب باتوں کا مقصد ادب کی ترقی اور معیار میں بہتری ہونا چاہئے۔ تعریف و تحسین کا حق بھی ادا ہو اور کوتاہی کی بھی نشاندہی ہو مگر انداز بھونڈا نہ ہو۔ تنقید کا مقصد صرف تنقیص نہ ہو بلکہ نئے راستے اور نئی منزلوں کی جانب اشارہ ہو۔"

MRS. TASNEEM ABIDI
P.O.BOX 2035
ABU DHABI U.A.E
PHONE:02 33081
FAX: 02 783443

انتخابِ کلام

تسنیم عابدی

رازکا بزم میں چرچا کبھی ہونے نہ دیا
ہم نے اپنے کو تماشا کبھی ہونے نہ دیا

ہم کو اس گردشِ دوراں نے کہیں کا نہ رکھا
پھر بھی لہجہ کو شکست کبھی ہونے نہ دیا

میکدے میں بڑے کم ظرف تھے پینے والے
آنکھ کو ساغر و مینا کبھی ہونے نہ دیا

دل میں اک درد کا طوفان چھپائے رکھا
آنکھ سے راز کو افشا کبھی ہونے نہ دیا

کتنا آسان تھا اپنے سے جدا ہو جانا
عشق میں ذہن کا سودا کبھی ہونے نہ دیا

روز جلنا ہے اسے روز جلانا ہے اسے
آتشِ شوق کو ٹھنڈا کبھی ہونے نہ دیا

عمر رشتوں کے تقاضے ہی نبھاتے گزری
زندگی نے مجھے اپنا کبھی ہونے نہ دیا

سب سے محفوظ مقامِ غمِ تنہائی ہے
فکرِ دنیا نے اکیلا کبھی ہونے نہ دیا

ہمارے نام سے زندہ ہے وقت کی تاریخ
زمانہ حسن کو پڑھے وہ کتاب ہیں ہم لوگ

توفیق انصاری احمد 15/6/99

توفیق انصاری احمد

اٹلانٹا، امریکا

عثمانیہ یونیورسٹی (حیدر آباد دکن) میں شعبہ قانون کے پروفیسر محترم ڈاکٹر احمد اللہ خان کی خوش بیانی میں کلام نہیں چنانچہ ہم نے ڈاکٹر احمد اللہ خان کو زحمت دی کہ وہ اپنی شگفتہ بیانی جاری رکھتے ہوئے جناب توفیق انصاری احمد کے تعارف کا فریضہ انجام دیں۔ انھوں نے کچھ سوچتے ہوئے کچھ بکھری یادیں جمع کرتے ہوئے کہا: مجھے یاد ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں توفیق صاحب اپنے ہم عمر طلبا کے لیے ایک آئیڈیل سمجھے جاتے تھے۔ ہائی اسکول سے لے کر گریجویشن کی تکمیل تک اور پھر اس کے بعد پوسٹ گریجویشن کے حصول تک بھی جناب والا کی پیٹھ کرسی کا ہی ایک حصہ محسوس ہوتی تھی۔ کوئی بھی وقت یا کیسا ہی موسم، چاہے تنہائی کا سکوت ہو یا محفلوں کا شور شرابہ، توفیق صاحب ہر وقت پڑھنے اور صرف پڑھنے میں مصروف نظر آتے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کا ہر کوئی دوست نہیں ہو سکتا لیکن یہ ہمارا ہی دل گردہ تھا کہ ہم ان کی بے اعتنائی و تغافل کے باوجود ان کے ساتھ ساتھ رہے۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ شخص صرف پڑھنے کے لیے پیدا ہوا ہے اور اسی طرح پڑھتے پڑھتے بوڑھا ہو جائے گا اور زندگی کی کئی ایک رنگینیوں سے محروم رہے گا لیکن ہمارا اندازہ غلط ثابت ہوا کیونکہ گریجویشن کی تکمیل کرتے کرتے موصوف نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیے

اور شاعری کی طرف تیزی سے مائل ہوئے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کسی بھی انسان میں شاعری کا شوق وجذبہ اس لیے پیدا ہو سکتا ہے کہ کسی کے عشق میں مبتلا ہو جائیں۔ محبوب کے ستم نے ہاتھ میں قلم تھما دیا اور مجروح جذبات وروح کے زخم، غزل میں مرہم تلاش کرنے لگے لیکن توفیق صاحب کے معاملہ میں ہم خدا کو حاضر و ناظر جان کر حلفیہ کہہ سکتے ہیں کہ مبتلائے عشق ہونے کے لیے جس ہنر کی ضرورت ہوتی ہے وہ جناب والا میں مفقود ہے اور انہوں نے کبھی کوئی عشق نہیں کیا۔ اس کے باوجود آپ حضرات ان کی شاعری میں جو رنگِ تغزل پائیں گے ہماری دین ہے اور یہ ہمارا احسان ہے کیونکہ اس معاملہ میں توفیق صاحب نے ہماری عشقیہ داستان سن سن کر پورا پورا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ بھلا سوچئے تو، توفیق صاحب جن کی وٹرنری تعلیم، جانوروں کے درمیان گذری ہو، جنھوں نے گدھے اور گھوڑے میں فرق کا مطالعہ کرتے کرتے گھوڑے کی ہیئت ترکیبی خصوصیت کے ساتھ نہ صرف اپنی شعری دلچسپیوں کو برقرار رکھا بلکہ امریکہ کے دوران قیام اس کو ترقی کی منزل بھی عطا کی۔ توفیق صاحب نے نہ صرف منظوم نثری شاعری بلکہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ حمد ہو یا تعریف، نعت ہو یا منقبت، غزل ہو یا نظم، قطعہ ہو یا رباعی، ہجو ہو یا قصیدہ، ہر صنف میں آپ کا کلام موجود ہے نہ صرف یہ بلکہ جناب والا نے قرآن شریف کی بعض سورتوں کا بھی منظوم ترجمہ کیا ہے۔

مختصر یہ کہ اگر توفیق صاحب کے موجودہ مقام کے صحیح تعین کے لیے میں اُن کو ان ہی کی غزل کے ایک شعر کی کسوٹی پر پرکھوں تو یہ چوبیس قیراط سونے کی طرح کھرے نکلیں گے کیونکہ آپ نے کئی نغمے و گیت بھی لکھے ہیں اور 1980ء میں آپ کے گیتوں کا لانگ پلے ریکارڈ "پیاسے گیت" کے نام سے جاری ہو کر مقبول عام ہو چکا ہے۔ پاکستان کے ممتاز میوزک ڈائریکٹر کبیر سلطان کی موسیقی اور گلوکارہ یاسمین قیصر کی آواز نے آپ کے گیتوں کو سرور بخشا۔ خود توفیق صاحب نے بھی موسیقی کی تعلیم حضرت لنِ آذر اور جناب ایم۔ اے رؤف سے لی ہے۔ انہوں نے خطاطی بھی سیکھی۔ کمرشیل آرٹ میں بھی درک حاصل کیا۔ فن مصوری کی تعلیم اپنے والد ماجد عنایت احمد انصاری کے علاوہ حضرت ماسٹر متین اور حضرت سعید نقش سے حاصل کی۔ 1986ء سے اب تک ایک پراڈکٹ انالسٹ یو ایس ڈی اے ایف ایس آئی ایس سول سروس حکومت امریکہ میں ہیں۔

توفیق احمد انصاری کے سنِ شعور سے تحریری و تقریری تربیت کا آغاز ہو چکا تھا۔ طبع زاد شاعری و مضامین کی ابتدا 1975ء سے ہو چکی تھی۔ 'المومنی' سٹی کالج میگزین کے فرائض بھی دو سال تک انجام دیے۔

توفیق احمد 12 مارچ 1944ء حیدرآباد دکن ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ تخلص توفیق کے علاوہ احمد اور دکنی بھی کرتے ہیں۔ دکن کے قدیم روایاتی ماحول میں گھر پر اساتذہ کی زیرِ نگرانی مذہبی و اخلاقی تعلیم حاصل کی۔ اسکول کی تعلیم کے بعد کالج آف وٹرنری سائنس اینڈ اینیمل ہسبنڈری عثمانیہ

یونیورسٹی سے 65ء میں بی ایس سی کیا۔ 72ء میں انیمل سائنس میں ایم ایس، آندھرا پردیش اگری کلچرل یونیورسٹی سے کیا۔ 76 میں اوریگن یونیورسٹی امریکہ سے پولٹری سائنس میں ایم ایس اور 74 سے 76 تک ڈاکٹریٹ اسی یونیورسٹی سے کیا۔

اردو کے علاوہ عربی، فارسی، ہندی، تلگی انگریزی اور جرمنی زبان کی تعلیم بھی 66 تا 70 کے عرصہ میں حاصل کی۔ سلسلۂ ملازمت ویٹرنری سرجن ریسرچ اسسٹنٹ اور انالسٹ کی حیثیت سے رہا۔ ڈاکٹر توفیق نے زمانۂ طالب علمی سے موجودہ دور تک، ہندوستان وامریکہ کے ممتاز شہروں میں کئی ایک مقامی وعالمی مشاعرے پڑھے اور ہر مشاعرہ میں اپنے مخصوص تحت وترنم سے اک خاص کیفیت شعری پیدا کر کے مشاعرہ کے ماحول کو گرمایا ہے اور عوام وخواص سے دل کھول کر دادِ سخن حاصل کی ہے۔ انہیں اجلاس محافل اور مشاعروں کی مشاورت، نظامت وانتظامات کا طویل تجربہ ہے۔ انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ "دی عثمانینس یوایس اے" کی بنیادی رکنیت ومنفرد مشاورت کا سلسلہ تاحال قائم ہے۔ اس کے علاوہ عثمانینس یوایس اے سے متعلق پلاننگ پروجیکٹس اور مشنس کو امریکہ وبیرون امریکہ عام کرنے کی ذمہ داری کا خصوصی شرف بھی انہیں حاصل ہے۔

السیرۃ سوسائٹی آف نارتھ امریکہ (ASNA) کی بنیادی رکنیت ومنتخبہ نائب صدارت کا اعزاز انہیں ملا اس کے علاوہ ان کی سماجی وادبی خدمات پر کئی اعزازات حاصل کر چکے ہیں۔ سماجی بہبودی و بھلائی کے پروجیکٹس میں خصوصی دلچسپی لیتے ہیں اور تارکان وطن کی سماجی رہبری ورہنمائی میں کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔ موجودہ اردو نسل میں اردو دلچسپی وسرپرستی کو برقرار رکھنے اور اردو تجسس وتحقیق کو فروغ دینے اور اردو ادب کو امریکہ کے طول وعرض میں پھیلانے کے سلسلہ میں "سلطان العلوم میموریل لائبریری اردو الی نائے" کے قیام میں ان کا اہم حصہ ہے۔

ڈاکٹر توفیق نے بتایا کہ وہ مذہب، ادب تاریخ، سیاست، سماج، سائنس کے موضوعات پر مبنی کتابوں کا مطالعہ ذوق وشوق سے کرتے ہیں۔

شاعری کے علاوہ نثر نگاری ان کی محبوب صنف ادب ہے۔ "موضوعاتی مضامین" اور "خاکہ نگاری" سے طبیعی دلچسپی ہے جس کا سلسلہ پچھلے تیس سال سے جاری ہے (گاہے گاہے۔ حسبِ ضرورت) شاعری کے ابتدائی زمانہ میں غالب سے جگر تک متاثر ہے۔ مگر آگے چل کر ترقی پسند اور مسائل مکتبہ فکر نے انہیں متاثر کیا اور بعد میں اپنی الگ راہ نکالی۔ طبیعت میں انفرادیت کی وجہ اب کسی کی بھی تقلید پسند نہیں کی۔ طبیعت کی خاکساری اور نام نمود سے دور رہنے کی وجہ نشرواشاعت پر زیادہ توجہ نہ ہو سکی۔ ادب پرست دوست احباب کے مسلسل اصرار پر ابتدائی کلام کا ایک انتخاب "دشت تمنا" کی صورت میں انشاء اللہ عنقریب منظر عام پر آئے گا۔ دیگر شعری انتخابات دردِ مشترک، بیاض شب، اور رقص روایات، زیر ترتیب ہیں۔ حمد ونعت کی کتاب "نذرِ عقیدت" اور "نثری انتخاب انشاء اللہ "اپنا نگر" کے نام سے شائع ہوگا۔

انھوں نے کہا اردو ایک عظیم زبان ہے جس کی مٹھاس ذہن و دل میں رس گھولتی ہے۔ اردو کا مستقبل اردو لکھنے پڑھنے والوں سے ہے جس کی سرپرستی عوام و حکومت دونوں کے لیے لازم و ملزوم ہے۔ اردو اسی وقت زندہ رہ سکتی ہے جب اردو کی ترقی و ترویج کے لیے بنیادی سطح پر کام کیا جائے۔ "نئی نسل کو اردو سکھانا بہت ضروری ہے۔ اردو کا مذاق پیدا کرنے کے لیے زمانے کے لحاظ سے کام کرنا ہوگا۔ ملاحظہ فرمائیں راقم کا مضمون "امریکہ میں اردو کی تعلیم و تربیت" نسل نو کو اردو کس طرح سکھائی جائے۔ (مطبوعہ اردو لنک)

ڈاکٹر توفیق نے شاعری کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا کہنا ہے اظہار خیال کے لیے کسی بھی صنف کو منتخب کیا جاسکتا ہے۔ عام اظہارات کے لیے غزل نظم، قطعہ، رباعی کا میدان مناسب ہے۔ مضمون کو مناسب انداز پر کسی بھی خامہ میں سمویا جاسکتا ہے اور یہ کہنے والے کے کمال پر منحصر ہے کہ وہ کس میدان میں کس طرح کمال دکھاتا ہے۔ نثری نظم و نثری غزل کے تجربے نئے ہیں۔ تجربات ضروری ہیں اور تجربات سے نئی نئی راہیں نکلتی ہیں۔ ذہن کے دروازے کھلتے ہیں اور اظہار کو وسعت ملتی ہے۔ آج کے دور میں اردو کی شعری ترقی کے لیے مشاعرے اور تخلیقی نشستیں دونوں بہتر ہیں تاکہ اردو کا میدان عمل محدود نہ رہے۔

ان کی رائے میں کتابوں اور جرائد کی اشاعت بہت اہم ہے اور اس سے انکار نہیں لیکن مختصر مفید معلوماتی ادب کی تخلیق اور اشاعت کی طرف توجہ دینا ہوگا۔ طوالت آج کل پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھی جاتی اہل ادب کے پاس وقت کم اور کام زیادہ ہے۔ اس کی اچھی مثال خود آپ کی دونوں کتابیں یعنی 'سخنور' اور 'دگفتنی' ہیں۔ میں ذاتی طور پر شروع سے ایسی کتابوں کا قائل ہوں کہ ایک نشست میں کئی ایک فنکاروں کا رنگ مختصر مفید انداز پر نظر آسکتا ہے۔ ایسی کتابیں دلچسپ اور مقبول ہوسکتی ہیں جس سے مارکیٹ میں بھی جگہ نکل سکتی ہے۔

تنقید صحت مند ہو تو اس سے سب کا فائدہ ہوتا ہے۔ تنقید نگاری ایک فن ہے مگر آج کل کیچڑ اُچھال کر لوگ خود کو تنقید نگاروں کی صف میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ تنقید بہت ضروری ہے مگر تنقید کے لیے قابلیت و منصب کی ضرورت ہے۔

TAUFIQ ANSARI AHMED
805 STOWELL AVE STREAMWOOD, JL 60107 . U.S.A

انتخابِ کلام

توفیق انصاری

اردو

دعا یہی ہے کہ اونچا ہو نام اردو کا
خدا کرے کہ بڑھے اور کام اردو کا

اندھیرا ہو کہ اجالا، جلے چراغ کوئی
کوئی چراغ جلے، صبح و شام اردو کا

نکل کے پھیل گئی، دور دور تک اردو
ہوا وطن میں جو جینا حرام اردو کا

کچھ اس طرح سے چپی جارہی ہے اب مالا
چھری بغل میں ہے منہ میں ہے، رام اردو کا

نہ بن سکے گا کبھی نفرتوں سے کام کوئی
بنے گا صرف محبت سے کام اردو کا

اُٹھے گا خاک سے اک روز اپنا خون جگر
ملے گا اردو کو اک دن مقام اردو کا

وہ جس پہ چل کے نئی نسل سیکھ لے اردو
بنایئے وہ مکمل نظام اردو کا

جھکا دیا ہے عقیدت سے ہم نے سر اپنا
پہنچنے والوں کو پہنچے سلام اردو کا

بلا رہا ہے تقاضائے وقت پھر توفیق
چلو کہ مل کے کریں کوئی کام اردو کا

داغ دل کے تمام روشن تھے
اس اجالے میں زندگی گذری

توفیق محمد خان
۶ جون ۱۹۹۹ء

توفیق محمد خان توفیق

جارجیا امریکا

قد سے بڑے ہیں سائے سبھی اہلِ شہر کے
اب روشنی یہاں سے چلی آفتاب کی

یہ قادر الکلام شاعر توفیق محمد خان توفیق ہیں جن کا پہلا شعری مجموعہ "اجالے دل کے داغوں کے" اگست 1997ء میں ایوانِ ادب ناظم آباد سے شائع ہوا ہے۔ اس میں پاکستان کے نامور شاعر جناب محسن بھوپالی اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "توفیق کی مشقِ سخن کی مدت کم و بیش آدھی صدی پر محیط ہے۔ اس درمیان انہوں نے کبھی بھی مشاعروں میں شرکت کرنے اور رسائل میں کلام شائع کروانے پر توجہ نہیں دی۔ توفیق ویسے بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں کلاسیکی رنگِ تغزل میں غزل کے معروف مضامین کے ساتھ ساتھ موجودہ عہد کے معاشی اور طبقاتی نظام کے پیدا کردہ مسائل پر مبنی اشعار بھی جابجا نظر آتے ہیں جو ان کی علمی فراست اور شاعرانہ دسترس پر دلالت کرتے ہیں۔ ان کے اشعار ہمیں وجد آفریں ماحول میں ہی نہیں لے جاتے بلکہ غور و فکر پر آمادہ بھی کرتے ہیں۔"

توفیق محمد خان کی جائے پیدائش بھوپال اور تاریخ پیدائش 10 جولائی 1921ء ہے۔ انہوں نے بتایا۔

"آج سے ستر پچھتر سال پہلے بھوپال برصغیر پاک و ہند میں علم و ادب کا ایک معروف اور ممتاز مرکز تھا۔ اردو ریاست کی دفتری زبان تھی اور یہاں متعدد صاحبِ تصنیف علماء اور شعراء زبان کی ترقی اور ترویج میں سرگرم عمل تھے۔ اسی تہذیبی اور تعلیمی ماحول میں، میں نے آنکھ کھولی، اس تہذیب کے نقوش اب تک ذہن پر مرتسم ہیں۔ شہر میں شعر گوئی کا چرچا عام تھا، بان اور بیان کی لطافت پر پورا زور دیا جاتا، تقریباً ہر محلے میں ماہانہ مشاعرے ہوتے جس میں مقامی شعراء اپنا کلام سناتے اور نئے شاعروں کی ہمت افزائی کرتے۔ سال میں ایک یا دو بڑے پیمانے پر مشاعرے منعقد ہوتے جن میں ہندوستان کے چند بڑے شعرا بھی مدعو ہوتے۔ میں نے ان مشاعروں میں حضرت جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، فانی بدایونی اور مقامی شعراء میں جناب سہا باسط اور اصغر شعری وغیرہم کو شرکت کرتے دیکھا اور سنا۔

میرے زمانۂ طالب علمی میں ہماری درسگاہ الگزینڈرا جہانگیریہ ہائی اسکول کا الحاق جامعہ عثمانیہ سے ہو گیا تھا جس کے باعث انگریزی کے علاوہ تمام دیگر مضامین کا ذریعۂ تعلیم اردو قرار پایا۔ شہر کی علمی فضا، اساتذہ کی شفقت آمیز رہنمائی اور ذریعۂ تعلیم اردو ہونے کے باعث طالب علموں میں اردو ادب سے شغف اور گہری وابستگی پیدا ہوئی۔ ادبی سرگرمیوں کی ہمت افزائی کی جاتی، تقریری مقابلے اور مشاعرے منعقد ہوتے، انجمن طلباء کے زیرِ اہتمام مختلف مضامین پر طالب علم اپنی نگارشات پیش کرتے۔ اسکول کے مجلّہ "گہوارۂ ادب" میں طالب علموں کے مضامین اور غزلیں شائع ہوتی تھیں جن میں میرے کچھ مضامین اور غزلیں بھی شامل تھیں۔ اسی زمانے میں میرے کچھ مضامین ہفت روزہ 'تیج' دہلی اور 'الہند' کلکتہ میں بھی شائع ہوئے۔

میٹرک میں کامیابی کے بعد میں نے عثمانیہ کالج اورنگ آباد میں داخلہ حاصل کیا۔ اورنگ آباد میں میرے دو سالہ قیام کی یادیں اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ 1937ء میں ہندوستان کے بعض صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قائم ہوئیں اور انہوں نے مسلم اقلیت کی حق تلفیوں کی انتہا کر دی۔ وردھا تعلیمی اسکیم بنائی گئی۔ اردو ہندی کا قصہ شروع کیا گیا۔ نستعلیق رسم الخط اور اردو کو دیس نکالا دے کر دیوناگری اور سنسکرت کی ترویج کی گئی۔ ہمارے کالج کے سابق پرنسپل بابائے اردو مولوی عبدالحق نے شدید احتجاج کیا۔ گاندھی جی سے کئی بار ملاقاتیں بھی کیں جو لا حاصل رہیں۔ اسی زمانے میں ہندو مہاسبھا اور دوسری متعصب ہندو جماعتوں نے حیدرآباد میں منتخب حکومت کے قیام کے لیے ستیہ گرہ کی تحریک شروع کر دی لیکن ریاست کشمیر میں منتخب حکومت کے قیام پر خاموشی اختیار کی۔ حالانکہ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ہمارے کالج میں آئے دن ہندو طلباء ہڑتال کرتے اور بندے ماترم گانے کی کوشش کرتے جس سے ہندو مسلم فسادات کے

خطرات پیدا ہونے لگے۔

ان واقعات کا مسلم طلباء پر ایک مثبت ردِ عمل یہ ہوا کہ ان میں مذہب سے گہرا لگاؤ پیدا ہوا۔ ہمارے کالج ہوسٹل کے مودب مولوی مظہر الدین صدیقی صاحب تھے جو اسلامی جماعت کے رکن تھے وہ ہوسٹل میں جمعہ کی نماز کی امامت کرتے اور حالاتِ حاضرہ پر اردو میں خطبہ دیتے تھے۔ ہماری ذہنی تربیت میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ 1939ء میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں امتیازی کامیابی کی وجہ سے مجھے وظیفہ ملا اور میں جامعہ عثمانیہ میں داخل ہو گیا۔ جہاں سے میں نے امتیاز کے ساتھ بی۔اے اور ایم۔اے کی اسناد حاصل کیں۔

جامعہ عثمانیہ ہندوستان کی وہ منفرد درسگاہ تھی جہاں جدید علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ اردو زبان تھی اور انگریزی ادب کی تعلیم بی۔اے تک لازمی تھی۔ جامعہ میں میرے طالب علمی کے زمانہ میں چند بڑے واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ 1939ء میں دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔ صوبائی کانگریس حکومتوں کے مستعفی ہونے پر مسلمانوں نے یوم نجات منایا۔ مسلمانوں اور خصوصاً طلباء میں مسلم لیگ کی بے پناہ مقبولیت اور قرار دادِ پاکستان کی منظوری نے ملتِ مسلمہ کے سامنے ایک منزل کا تصور پیش کیا۔ میرے بچپن میں ہمارے محلے میں ایک صاحب ترنم کے ساتھ مثنوی مولانا روم پڑھ کر اردو میں اس کی تشریح کرتے تھے اور سب لوگ بہت شوق سے یہ تشریح سنا کرتے تھے۔ اب ہم کلام اقبال اسی ذوق و شوق سے سنتے اور اس کے مطالب اور گہرائی پر تبادلۂ خیال کرتے۔ حیدر آباد کے آتش نوا خطیب نواب بہادر یار جنگ نے جلسوں میں اپنی خطابت کا جادو جگا کر ہم نوجوانوں میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ حیدر آباد ہی میں قائداعظم محمد علی جناح کی تقریر سننے کا موقع ملا۔ اسی زمانہ میں ترقی پسند ادب کی تحریک پروان چڑھی، جس کا نوجوان ذہنوں پر کافی اثر ہوا۔ حیدر آباد میں اس تحریک کے خاص علمبردار مخدوم محی الدین تھے جو جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل اور مقبول شاعر تھے۔

جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ معاشیات کے صدر ڈاکٹر انور اقبال قریشی تھے جو پاکستان میں حکومت کے معاشی مشیر بھی رہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اردو اور انگریزی میں متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ انہوں نے انجمن طلبائے معاشیات کے زیرِ اہتمام مختلف معاشی موضوعات پر طلباء سے کتابیں لکھوا کر شائع کرائیں۔ میرا ایک کتابچہ بھی ان میں شامل تھا ان کی شفقت آمیز رہنمائی ہمیشہ شاملِ حال رہی۔

سقوطِ ریاست حیدر آباد کے وقت میں عثمانیہ کالج گلبرگہ میں لیکچرار معاشیات تھا۔ حالات میں عظیم تبدیلیوں کے باعث پاکستان منتقل ہو گیا۔ یہاں دفترِ معاشی مشیر اور مرکزی دفترِ شماریات میں میرا تقرر ہوا۔ 1952ء میں اعلیٰ تربیت کے لیے مجھے امریکہ بھیجا گیا۔ جہاں عملی تربیت کے ساتھ ساتھ جارج ٹاؤن یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم۔اے کی سند بھی حاصل کی۔ انجمن ترقی

اردو پاکستان کے ماہانہ رسالہ "معاشیات" کا ایک سال تک ایڈیٹر بھی رہا لیکن مالی مشکلات کے باعث رسالہ بند کر دیا گیا۔ 1956ء میں انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن میں میرا تقرر بحیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر ہو گیا اور اگلے سال میں پی ایچ ڈی کی تحصیل کے لیے امریکہ چلا گیا۔ واپسی پر کچھ عرصہ انسٹی ٹیوٹ میں کام کیا اور پھر حکومت پاکستان کی قومی آمدنی کمیشن میں بحیثیت مشیر تقرر ہو گیا۔ وہاں سے فراغت کے بعد پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈویلپمنٹ اکنامکس سے بحیثیت ریسرچ ڈائریکٹر اور بعد میں جوائنٹ ڈائریکٹر وابستہ رہا۔ اس زمانے میں معاشی موضوعات پر متعدد مضامین اور رپورٹیں لکھیں جو بین الاقوامی رسالوں میں شائع ہوئیں۔

ملازمت کے آخری بارہ سال اقوامِ متحدہ کے انسٹی ٹیوٹ شماریات برائے ایشیا اور پیسفک میں گزرے جو ٹوکیو میں قائم کیا گیا تھا۔ اس ادارہ کے دائرہ کار میں جنوبی ایشیا کے تقریباً تیس ممالک ایران سے انڈونیشیا تک شامل تھے۔ ان ممالک سے افسران اطلاعاتی شماریات کی تربیت کے لیے نامزد ہوتے تھے اور ٹوکیو کے علاوہ مجھے ان ممالک میں جاکر اعداد و شمار اور خصوصاً قومی آمدنی کے موضوعات پر لیکچر اور عملی تربیت دینا ہوتی تھی۔ ان ممالک کے قیام میں دن تو اپنے فرائض کی تکمیل میں گزر جاتا لیکن صبح کرنا شام کا لانا تھا جوئے شیر کا۔ ہوٹلوں میں جہاں میرا قیام ہو تا شام کے مشاغل سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تنہائی کی ان راتوں نے غالباً شعر گوئی کے خفتہ شوق کو بیدار کیا اور اس طرح غزلیں اور قطعات لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد میں اپنے بچوں کے پاس امریکہ منتقل ہو گیا۔

شعر تو میں کہنے لگا لیکن ان کی واحد سامع میری اہلیہ تھیں جو کبھی تنقید اور کبھی تحسین سے میری ہمت افزائی کرتیں۔ شاعری، ہم عصروں کی تنقید اور تبصرے سے جلا پاتی ہے۔ اشعار میں کسی کو سنا تا نہ تھا نہ کسی مشاعرے میں شرکت کی۔ اس وجہ سے ان تبصروں سے میں محروم رہا۔ ممکن ہے بعض اشعار یا مصرعوں میں توارد ہوا ہو لیکن ان ممالک میں میرے پاس تنقیح کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔

اس مجموعے میں شامل چند غزلیں "پاکستان لنک" لاس اینجلز میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کو دیکھ کر میرے دیرینہ کرم فرما عبدالرحمٰن عابد صدیقی، ڈائریکٹر اسلامی مرکز ٹوکیو اور ڈاکٹر ذکی کاکوروی اس مجموعہ کی اشاعت پر مصر تھے۔ ذکی کاکوروی نظم اور غزل انسائیکلوپیڈیا کے مرتب اور کئی شعری مجموعوں کے مصنف ہیں۔ میری اہلیہ بھی ان کی ہمنوا ہو گئیں۔ محبّ گرامی محمد احمد سبزواری نے جناب محسن بھوپالی سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا جنہوں نے متعدد مفید مشوروں سے نوازا۔ میرے ایک شعر

داغ دل کے تمام روشن تھے
اس اجالے میں زندگی گزری

سے اس مجموعہ کا نام "اجالے دل کے داغوں کے" تجویز کیا۔ جس کے لیے میں ان کا شکر گزار

ہوں۔

اردو ادب میں اور اس کے مستقبل کے بارے میں توفیق فرماتے ہیں۔ "گزشتہ نصف صدی کے دوران اردو ادب مختلف تحریکوں سے متاثر ہوا۔ سر سید سے متاثر مکتب فکر کے نمائندے حالی اور آزاد نے اردو نثر اور نظم میں سادگی کی وکالت کی اور اس کا بتدریج اثر ہمارے نثری اور شعری ادب پر مرتب ہوا۔ اس صدی کی تیسری دہائی میں ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہوئی اور اس کے زوال کے بعد جدیدیت، مابعد جدیدیت اور مابعد ساختیت کی تحریکوں نے ادیبوں اور شاعروں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ان تحریکوں کے زیر اثر شائع ہونے والی کتب میر۔۔ مطالعہ میں رہی ہیں لیکن اردو ادب کے اس سفر میں غزل ہر دور میں قابل توجہ اور اپنا مقام برقرار رکھنے میں کامیاب رہی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بدلتی ہوئی ہم عصر زندگی نے غزل کے موضوعات کو یک گونہ وسعت سے ہمکنار کیا۔

برصغیر میں اردو چند اسلامی ریاستوں کے علاوہ کبھی سرکاری دفتری زبان نہیں رہی۔ پہلے فارسی دفتری اور درباری زبان رہی۔ گزشتہ ڈیڑھ یا دو سو سال سے انگریزی ہم پر مسلط رہی۔ اور آزادی کے بعد بھی انگریزی ہی دفتری زبان ہے۔ لیکن ان نامساعد حالات کے باوجود اردو مسلسل ترقی کرتی رہی اور امید ہے کہ آئندہ بھی ترقی کا یہ عمل جاری رہے گا اور اس کی بین الاقوامی حیثیت مستحکم ہوتی رہے گی۔

اردو اس وقت دو اہم مسائل سے دوچار ہے، ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ کیا اردو بحیثیت ایک علمی اور ادبی زبان ترقی کرتی رہے گی اور دوسرا رسم الخط کا مسئلہ ہے۔ ایک عام بولی کی حیثیت سے اردو کی توسیع کا امکان روشن ہے۔ آج بھی ہندوستان اور پاکستان کے مختلف زبانیں بولنے والے باہمی تبادلہ خیال کے لیے اردو ہی کا استعمال کرتے ہیں۔ فلموں کی زبان گو ہندی کہلاتی ہے لیکن واقعتاً یہ اردو ہی ہے جس میں فارسی کی ترکیبیں تک کثرت سے استعمال ہوتی ہیں۔ اردو کی علمی حیثیت کو جامعہ عثمانیہ میں دارالترجمہ کے بند ہونے کے باعث کافی نقصان پہنچا لیکن پاکستان میں کچھ متبادل ادارے قائم کیے گئے ہیں جو اس ضمن میں کوشاں ہیں۔ بدقسمتی سے سائنس، معاشیات، سیاسیات اور عمرانیات کے موضوعات پر شائع ہونے والی کتابوں کی تعداد بے حد محدود ہے اور اس کے لیے خصوصی توجہ درکار ہے۔

اردو کے رسم الخط کو اصل خطرہ ہندوستان میں ہے جہاں دیوناگری رسم الخط کی سرکاری سرپرستی کی جا رہی ہے۔ ایک تجویز یہ پیش کی گئی ہے کہ اردو رومن رسم الخط میں تحریر کی جائے اور اس کی موافقت میں ترکی کا تجربہ پیش کیا جا رہا ہے۔ راقم حروف اس تجویز کی تائید کرنے سے قاصر ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک، جاپان، چین اور مشرق وسطیٰ کے تمام ممالک میں رومن رسم خط رائج نہیں ہے۔ جاپان، چین، کوریا تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔ چین اور جاپان میں ایک قسم کا تصویری رسم الخط رائج ہے جس میں مہارت حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ لیکن

تبدیلیٔ خط کی کوئی تحریک زیرِ غور نہیں ہے۔ یہ دلیل کہ تبدیلی رسم خط سے بین الاقوامیت میں مدد ملے گی زیادہ قوی نہیں ہے کیونکہ اس طرح ہمارا تعلق فارسی اور عربی حروف سے منقطع ہونے کا امکان ہے۔

اردو ادب میں مختلف النوع اصناف سخن کی کمی نہیں ہے۔ نظم، مرثیہ، نعت، حمد مثنوی، مخمس، رباعی اور غزلیات سے اردو کا دامن مالامال ہے لیکن جہاں تک عام قبولیت کا تعلق ہے غزل کو ترجیح حاصل رہی ہے اور حالات کے ساتھ اسی کے موضوعات میں تنوع بڑھتا جارہا ہے۔ اب غزل کے اشعار صرف جذباتیت کی عکاسی کرنے کے بجائے زندگی کے حقائق کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ردیف، قافیہ اور بحروں کی پابندی کے ساتھ غزل کے روایتی اسلوب میں ان حقائق کو پیش کرنا کافی دقت طلب کام ہے۔ ان ہی مشکلات کے پیش نظر نثری نظم اور نثری غزلیں لکھی جارہی ہیں۔

برصغیر میں مشاعروں نے ایک بڑی ادبی خدمت انجام دی ہے۔ اردو غزلوں کی مقبولیت کا ایک اہم سبب مشاعرے بھی ہیں۔ ابتداء میں تو یہ مشاعرے ایک ایسا ادارہ تھے کہ جن میں مبتدی شعراء کی تربیت بھی ہوتی۔ سامعین آداب مشاعرہ کا پورا خیال رکھتے۔ داد و تحسین کے طریقے بھی متعین تھے لیکن آہستہ آہستہ مشاعرہ کے حالات میں تبدیلی آتی رہی۔ ادبی پارٹی بندی کے باعث صرف اپنے حلقے کے شعراء کو داد دی جانے لگی۔ ان شاعروں کا کلام داد کا مستحق سمجھا جاتا جو یا تو ترنم سے پڑھتے یا کم از کم ڈرامائی انداز میں اپنا کلام پیش کرتے۔ یہ داد اصل میں خوش گلوئی کو دی جاتی اور اب تو یہ حال ہے کہ سامعین کلام سے مستفید ہونے کے بجائے اسے ایک سماجی تقریب سمجھ کر شرکت کرتے ہیں۔ ان کمزوریوں کے باوجود مشاعروں کے افادی پہلوؤں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں معیاری ادب کی تخلیق میں مختصر ادبی نشستیں نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس قسم کی نشستوں کو مزید ترقی دی جائے۔

الیکٹرونک میڈیا یا برقی نظام ابلاغ کے باعث لوگوں کے مطالعہ کی عادات کا بدلنا ایک بدیہی امر ہے۔ تاہم اس مسئلہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ الیکٹرونکس میڈیا میں جو چیزیں پیش کی جاتی ہیں وہ عام طور پر اس قدر تفصیلی نہیں ہوتیں کہ قاری یا سامع کے ذوق کی مکمل تسکین کا باعث ہوں جبکہ پرنٹڈ میڈیا کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ اپنے موضوع پر سیر حاصل معلومات بہم پہنچائے۔ آج سے کچھ عرصے قبل جب اخبارات کی اشاعت ترقی کر رہی تھی تو یہ خیال عام تھا کہ اب کتابوں کی اہمیت کم ہوجائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا بالآخر ان دونوں کے دائرہ کار متعین ہوگئے اور دونوں ترقی کی منازل طے کرتے رہے ہیں۔

5322 LEATHER STOCKING LANE
STONE MOUNTAIN, GA 30087
JUNE 9, 1999 - TEL: (770)939-2563

انتخابِ کلام

توفیق محمد خان توفیق

ابھی تو حد نظر تک یہاں اندھیرا ہے
سیاہ شب کے مگر بطن میں سویرا ہے

دلِ فتادہ ہے یوں سرنگوں کہ جیسے یہ
شکست خوردہ کسی فوج کا پھریرا ہے

مآل دیدہ وراں اضطرابِ پیہم ہے
بہشت بے خبراں میں سکوں کا ڈیرا ہے

ہر ایک آفتِ ارض و سما کی زد میں ہے
وہ خشک شاخ کہ جس پر مرا بسیرا ہے

ہمیشہ موردِ اندیشہ ہائے دور دراز
تفکراتِ زمانہ نے دل کو گھیرا ہے

رکھیں وسائلِ قومی پہ اہل شرف نگاہ
تلاشِ مال میں مغرب کا اک لٹیرا ہے

حقیقتوں کا ہو ادراک ہم کو کیا توفیق
ابھی تو جہل کا سایہ بہت گھنیرا ہے

شروع عادل وسلیم کے نام سے

عدل گر آدمی کو مل جاتا
کیا ضرورت تھی کربلا ت کی

تمثیل جاوید
۱۲/۳/ سنہ ۲۰۰۰ء

تمثیل جاوید

کراچی

"جدید غزل اور نظم میں جو تجربات ہو رہے ہیں اور جو نیا فکری تصور سامنے آ رہا ہے وہ اگر ہمارے زمانے اور ہمارے عہد سے ہم آہنگ ہے تو ایسے تجربات ناکام نہیں ہوتے۔ شعری اظہار بلاشبہ اپنے مختلف پیکر تراشتا ہے لیکن بہر حال غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔"

ان خیالات کا اظہار شاعر تمثیل جاوید نے اپنے تعارف میں کیا ہے۔ مگر جب جاوید نے اپنی شاعری کی ابتدا کی تھی تو انہیں اندازہ نہ تھا کہ وہ ادب کی کس سیڑھی پر کھڑے ہیں۔ کہتے ہیں اک روز میری رگوں میں پھیلی ہوئی سچائی نے مجھ سے سوال کیا کہ "تو یہ سب کچھ کیوں لکھ رہا ہے؟" تو میرا جواب صرف یہ تھا کہ جب ہم دنیا سے کچھ حاصل کرتے ہیں تو ہمارا یہ فرض ہوتا ہے کہ ہم اپنے تجربے، مشاہدے یا اپنی فکر و شعور کو قرطاس پر منتقل کر دیں اور جس طرح ہم نے دوسروں کے تجربوں اور مشاہدوں سے کچھ سیکھا ہے، کل کی نسلیں ہمارے تجربوں سے مستفید ہوں۔"

جاوید نے بلاشبہ سچ کہا اور جو کہا اُسے حرف حرف صفحہ قرطاس پہ منتقل کر دیا۔ وہ آج بھی سچ کی راہ پر گامزن ہے 'سچ' ہی اس کا ایمان ہے اور سچ ہی اس کا مذہب۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا پہلا مجموعۂ نعتیہ

مجموعہ ہے جو "رشکِ بشر" کے نام سے اس کے پڑھنے والوں تک پہنچا ہے۔ اس مجموعے اور اس کے نام کا اشارہ جاوید کو ایک بہت متبرک گھڑی میں ملا۔ یہ گھڑی تھی سربسجود ہونے کی جب وہ اپنے خالق اقدس کے حضور تنہا تھا اور اپنے خالق کے حضور اس کے محبوب سے رہنمائی طلب کر رہا تھا۔ چنانچہ اگر آپ اب جاوید سے ملیں اور اُسے سمجھنے کا گیان مل جائے تو آپ جاوید کو عام انسانوں سے بہت مختلف پائیں گے۔ اس کا ظاہر و باطن آپ کو ایک سا ملے گا۔ دنیاداری سے بے نیاز شہرت جسے ڈھونڈھ رہی ہے لیکن وہ مسکرا کر قدم آگے بڑھا لے جاتا ہے۔

جاوید قیصر کا شعری سفر اُسے تمثیل جاوید تک کس طرح اور کب لے گیا یہ کہانی بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ آئیے میں ان کو آپ سے متعارف کراؤں۔

جاوید قیصر 24 اگست 1950ء کے دن حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ اسلامی ثقافت میں ماسٹر کی ڈگری سندھ یونیورسٹی سے لی۔ پھر ایل ایل ایم بھی کیا اور تیسری پوزیشن درجہ اول میں حاصل کی۔ اب پی ایچ ڈی کی تکمیل میں لگے ہیں۔ عنوان بھی بڑی جان کاری کا منتخب کیا ہے۔ "اسلام میں عدل کا تصور اور معاشرے پر اس کے اثرات"

جاوید نے 1977ء میں بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی کرنے کے بعد وکالت کے پیشے سے وابستگی اختیار کی۔ 1984ء میں سندھ پبلک کمیشن سے امتحان پاس کر کے سول جج و فرسٹ کلاس مجسٹریٹ بنے۔ آج کل ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج کے عہدے پر فائز ہیں۔

جاوید نے باقاعدگی سے شاعری تو 1969ء سے شروع کی اور تخلص تمثیل جاوید اختیار کیا۔ وہ سرکاری کالج ناظم آباد میں انٹر کے طالب علم تھے۔ ریڈیو پاکستان کراچی میں جشن طلبہ کے سلسلہ میں پہلا مشاعرہ پڑھا جس کی صدارت جناب حکیم محمد سعید مرحوم نے کی تھی۔ ان دنوں شعبہ اردو کے صدر جناب شاہد عشقی صاحب تھے انہوں نے جاوید کو تقریباً 18 شعراء میں سے منتخب کیا تھا۔ انہوں نے غالب کا ایک شعر دے کر اس کی گرہ لگانے اور ایک مزید شعر اسی زمین میں کہنے کو کہا اور جس گرہ کو پسندیدگی کا درجہ ملا وہ ان کا یہ شعر تھا۔

کیا تصور میں آپ رہتے ہیں
"نیند کیوں رات بھر نہیں آتی"
شب تلک جو تھے رونقِ محفل
صبح ان کی خبر نہیں آتی

"پھر یہ سلسلہ جاری کس طرح رہا؟" میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا "1970ء میں ایک مشاعرہ سرکاری کالج کی طلبہ یونین کے زیرِ اہتمام ہوا جس کی صدارت محترم فیض احمد فیض نے کی۔ ان دنوں سچ پوچھئے تو نہ شعر کہنے کا ڈھنگ تھا نہ شعر سمجھنے کا شعور ہاں لیکن اپنے اندر ایک شاعر کو موجود پاتا تھا۔ سو ایک غزل پڑھی جس کا مطلع تھا۔

جب سامنے تو اے میرے ہمدم نہیں ہوتا
بڑھ جاتا ہے یہ دردِ جگر کم نہیں ہوتا

فیض صاحب نے تو اس غزل کی کوئی پذیرائی نہ کی البتہ کالج کے لڑکوں نے کافی ہوٹنگ کی جسے ہم اپنی سمجھ کے مطابق پذیرائی کا درجہ دے بیٹھے۔ اس کے بعد تیسرا مشاعرہ سرکاری کالج کی نمائندگی کرتے ہوئے خالق دینا ہال میں پڑھا۔ اس مشاعرے کی صدارت جناب سراج الدین ظفر مرحوم نے کی۔ اس کی نظامت اُس وقت کی نیلوفر علیم اور آج کی نیلوفر عباسی نے کی تھی۔

1970ء کے تین مشاعروں کے بعد ہم نے شاعری تو برقرار رکھی لیکن مشاعروں کو خیر آباد کردیا۔ اس کی وجہ تعلیم کا حصول اور خود کو کسی قابل بنانے کی تگ ودو تھی۔

1990ء میں میری ملاقات کاوش عمر صاحب سے ہوئی جو فخر بنگال اور طوطی شکر مقال کہلاتے تھے۔ میں انہیں ویسے تو دس برس کی عمر سے جانتا تھا مگر یہ طالب علمی کا زمانہ تھا۔ کاوش صاحب چاٹ گام میں میرے چچا سلیم نگار کے ساتھ مل کر اردو جریدہ "روش" نکالا کرتے تھے۔ کراچی آکر کاوش صاحب گمنامی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس دوران میری شاعری خاصی ضخیم ہوچکی تھی۔ پھر میں نے اپنی تمام تر شعری کاوشیں استاد کاوش عمر کے آگے رکھ دیں اور ان سے دست بستہ عرض کیا کہ حضور اگر مجھ میں شعری جوہر موجود ہے تو اسے تراش خراش کر کے معتبر و منور بنادیجئے۔ ورنہ یہ کسی پان کی دکان والے کی نذر کردوں۔

یوں 1990ء میں کاوش عمر صاحب کی آشیرباد کے بعد باقاعدہ شاعری کا آغاز کیا اور چالیس برس کی عمر میں میدان شاعری میں وارد ہوا۔ مشاعرے میں داد و تحسین نے مجھ میں چھپے ہوئے شاعر کو عوام کے سامنے لا کھڑا کیا۔ پھر میں نے ہر صنفِ سخن میں شعر کہے۔ پہلا نعتیہ مجموعہ "رشک بشر" کے نام سے شائع ہوگیا ہے۔ جہاں تک مکتبہ فکر کا تعلق ہے۔ ہم اپنے آپ کو غالب کا طرف دار کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ جدید طرز کے شعراء میں ویسے تو بہت سے نام ہیں لیکن منفرد لب ولہجہ کے شاعر احمد فراز و ڈاکٹر بشیر بدر میرے پسندیدہ شعراء ہیں۔

ایک مدت تک ہماری غزلیں، مختلف روزناموں، ماہناموں میں پابندی سے شائع ہوتی رہیں۔ لیکن منصبی کی مصروفیت کی وجہ سے یہ کام اب کم ہو کر رہ گیا ہے۔ میرا دوسرا نعتیہ مجموعہ "لوح و قلم تیرے" کے نام سے ترتیب دیا جارہا ہے جو انشاء اللہ امسال ربیع الاوّل تک آجائے گا۔ البتہ شعری مجموعہ "بند ہونٹوں کے چاند" اگست 2000ء تک متوقع ہے۔

ویسے تو میرا پسندیدہ مشغلہ شخصیات کا مطالعہ ہے۔ میں انسانوں کو انسانوں کے لفظوں و حرفوں سے پڑھنا چاہتا ہوں۔ علاوہ ازیں منزل میری کمزوری بھی ہے اور محبوب صنفِ سخن بھی۔ مجھے اس صنف میں شعر کہنا زیادہ پسند ہے۔

میری زندگی میں پیش آنے والا یہ واقعہ میں ابھی تک نہیں بھولا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے

جب میری تعیناتی نواب شاہ میں ہوئی۔ مجھ سے پہلے نواب شاہ میں میری آمد کے چرچے ہو چکے تھے۔ میری حیثیت یہاں سول جج واسٹیٹ سیشن جج کی تھی۔ یہاں کے ادبی حلقوں میں آنا جانا ہوا تو معلوم ہوا کہ معروف شاعر ناطق لکھنوی کے صاحبزادے یہاں کے معروف شاعر و وکیل ہیں۔ جب رشید لکھنوی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے ہماری صدارت میں ایک مشاعرے کا انعقاد کر لیا۔ یہ سندھی اردو مشاعرہ تھا جس میں مقامی شعراء کی خاصی تعداد تھی لیکن میں وہاں کے شعراء سے ناواقف تھا۔ الغرض مشاعرہ شروع ہوا تو ایک صاحب نے ہماری ہی غزل ہمیں سنادی جو روزنامہ جنگ کے ادبی صفحہ میں شائع ہوئی تھی۔

دھوپ رکتی ہے اس سے اگر دوستو
کاٹ دو میرے گھر کا شجر دوستو

حیرت کی بات تو یہ تھی کہ ان صاحبزادے نے مقطع تک وہی رکھا اور اطمینان کے ساتھ غائب ہو گئے اور میں آج تک اُن کی دیدہ دلیری یا معصومیت پر حیران ہوں۔

اس حقیقت سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ بیرون ملک رہنے والے پاکستانی اس بات کے گواہ ہیں کہ اردو دنیا کی ان بڑی زبانوں میں شامل ہے جو رابطہ کے طور پر باضابطہ استعمال ہو رہی ہے۔ خصوصاً خلیج کی ریاستوں میں تو نہ صرف اردو کا رواج ہو تا جارہا ہے بلکہ یہاں مشاعروں کو بھی کافی حد تک شہرتِ دوام ملی ہے اور اب تو مغربی ممالک میں بھی اردو کے دلدادہ خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ اردو کی ترقی و ترویج میں اہل ادب کا ہاتھ تو ہے مگر خود اردو زبان کی بھی خاصیت یہ ہے کہ وہ جدید اصطلاحات کو اپنے اندر سمو لیتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو زبان دنیا کی وہ واحد زبان ہے کہ جب پیدا ہوئی تو اس کا نام برادر ملک ترکی نے رکھا۔ (اردو بمعنی لشکر)

میری رائے میں اردو شاعری میں سب سے خوبصورت صنف، غزل کی صنف ہے حالانکہ ناقدینِ غزل اس پر حرف گیری کرتے ہیں اور جوش ملیح آبادی جیسے بلند پایہ لوگ غزل کے حریف ٹھہرے مگر غزل وہ اندازِ سخن ہے جس میں شاعر ہر قسم کی بات اور ہمہ قسم کی بات کر سکتا ہے۔ آج کی غزل محبوب سے بات کرنے تک محدود نہیں۔ نہ ہی آج کی غزل زخمی غزال کے منہ سے نکلنے والی آہ تک محدود ہے۔ آج کی غزل کے لیے حمایت علی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

شاعر غزل کے محتسبوں کو خبر نہیں
کیا کام لے رہے ہیں تغزل سے آج ہم

کہتے ہیں کہ انسان تجربہ کی بھٹی سے نکل کر کندن بنتا ہے۔ جدید طرز سخن میں لوگوں نے نثری نظم و نثری غزل پر طبع آزمائی کی ہے۔ یہ صنف اظہار رائے کے لیے مقدم و مقدس ہو سکتی ہے لیکن پابند شاعری کا اپنا حسن و کمال ہے چونکہ اج کے شاعر کو جدید اسلوب سخن سے انحراف نہیں کرنا چاہئے لہٰذا ہمارے نزدیک یہ سخن بھی اظہار کا ایک خوبصورت ذریعہ ہے۔

میری رائے میں مشاعرے تخلیق کے لیے معاون تو نہیں ہوتے بلکہ تہذیب وتمدن کے لیے ان کا ہونا ایک اچھی روایت ہے۔ قدیم زمانے میں مشاعروں سے معاشرے کی تربیت کا کام لیا جاتا تھا۔ معاشرے کے اہم اور قابل ذکر لوگوں میں جو شامل ہوتے تھے وہ شعر وادب سے بھی وابستہ ہوتے تھے۔

جہاں تک تخلیقی عمل کا تعلق ہوتا ہے اس کے لیے چھوٹی چھوٹی نشستیں زیادہ سود مند اور کار آمد ہوتی ہیں۔ اس میں شعرا کو وہ کلام سنانے کا بھی موقع مل جاتا ہے جو بڑے مشاعروں میں نہیں پڑھا جاسکتا۔ لہٰذا میری نگاہ میں مشاعرے سے بہتر ادبی نشست ہوتی ہے جو بہترین کردار ادا کرسکتی ہے۔

اس حقیقت سے تو کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ الیکٹرانک میڈیا نے ادب پر ضرب کاری کا کام کیا ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ کتب بینی کا شوق تقریباً ختم ہوتا جارہا ہے لیکن ہمیں اس سے مایوس نہیں ہونا چاہئے بلکہ ہمیں جدید طرز پر عمل کرنا چاہئے، یہ بھی ممکن ہے کہ کل ایسا دن بھی آئے کہ لوگ شعری مجموعوں کو کتابی شکل میں یکجا کرنے کے بجائے وڈیو کیسٹ یا CD پر اپنی کتابوں کو منتقل کردیں اور قارئین اچھی کتاب پڑھنے کے بجائے CD یا وڈیو سے لطف اندوز ہوں۔ ویسے بھی دیوانِ غالب کسی خوش کن آواز میں زیادہ بھلا معلوم ہوگا اور قارئین وناظرین ہونے کا لطف اُٹھائیں گے۔

جہاں تک جرائد اور کتابوں کا تعلق ہے بہت ممکن ہے کہ یہ سب کچھ انٹرنیٹ کے حوالے سے پڑھے جائیں۔ گویا 12 ویں صدی کے رہنے والے لوگوں کو جدید شکل وصورت کے ہاتھوں اپنے ادب کو زندہ رکھنا ہوگا۔

تنقید برائے تنقید کا میں قائل نہیں صحت مند تنقید یقیناً ایک اچھے ادب کو جنم دیتی ہے لیکن اگر ناقد ذاتی مفاد وعناد کو ذہن میں رکھ کر کسی پر حرف گیری کرے تو یہ تنقید نہیں نشانِ حدف بن جاتا ہے ذاتی بغض وعناد اچھا ادب تعمیر نہیں کرتا بلکہ اچھے ادب میں عناد کی دراڑ پیدا کردیتا ہے۔ شاید اسی لیے راقم نے کبھی کسی تنقید نگار کے لیے کہا تھا

وہ اپنے عیب مجھ میں ڈھونڈتا ہے
میری اچھائیاں اس میں چھپی ہیں

JAWED QAISER KHAN
DV.SOLICITOR, BLOCK 13 SINDH SECRETARIAT NO. 4/A
COURT ROAD KARACHI 74200 (PAKISTAN)

انتخابِ کلام

تمثیل جاوید

آپ کا دستِ حنائی جو نظر آیا ہے
چاند چپکے سے ہتھیلی پہ اتر آیا ہے

☆

واسطے دعاؤں کے ہاتھ کب اُٹھانا تھا
یہ تو منہ چھپانے کا اس کے اک بہانا تھا

☆

بدن کی شاخ پہ جو بات لب نے لکھی ہے
تمہاری عمر میں وہ بات سب نے لکھی ہے

☆

آئینہ معصوم بچے کی طرح
اصل چہرہ دیکھنے کی ضد کرے

☆

وہ بچہ کس مسافر کی تھکن ہے
جو اب ایدھی کے گھر میں پل رہا ہے

☆

اک اُس کا ہاتھ تھا، اک میرا شاید
دعائے شب میں جو شامل رہا ہے

☆

میرے خدا تو اُسے آسماں کی رحمت دے
جو کاٹتا ہے زمیں کے عذاب بستر پر

☆

پرانے ہو گئے دیر و حرم کے قصے بہت
دعا ہے اہلِ نظر پر نیا نصاب اترے

۲۹ دسمبر ۹۹ء
ہیوسٹن

جاوید زیدی

جاوید زیدی

ہیوسٹن امریکا

یہی پڑھا ہے کہ شاعری کو شاعر کی ذات کے بغیر سمجھنے کی کوشش جز کو کل پر فوقیت دینے کی کوشش کے مترادف ہے اور یہ بھی غلط نہیں کہ شاعری سے شاعر کی زندگی، اس کی سوچ و فکر اور اس کی شخصیت کے کئی پہلو نمایاں ہوتے ہیں اور اس صورت میں کہ شاعر خود اپنے بارے میں معلومات فراہم کر رہا ہو، شک کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس پس منظر کے ساتھ مجھے سخن ور اوّل سے لے کر چہارم تک شعراء و شاعرات کے بارے میں لکھنے کے لیے ان کی شاعری سے بڑی مدد ملی۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے بعض جگہ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور بعض جگہ مصلحتاً، مجبوراً یا ضرورتاً پہلو تہی کی ہے۔ پھر ان کی شاعری کو فن کی کسوٹی پر پرکھنا میرا منصب بھی نہیں لیکن جو شاعری دل کے عمیق گوشوں میں جا اترتی ہے اس کے بارے میں اظہار نہ کرنا بھی بددیانتی سمجھتی ہوں۔

جاوید زیدی کو میں نے پڑھا ہے۔ ابھی ان کا کوئی مجموعہ کلام منظرِ عام پر نہیں آیا مگر جاوید کا جتنا کلام میری نظر سے گذرا ہے اس کے پیشِ نظر کہہ سکتی ہوں کہ جاوید نظموں اور غزلوں دونوں اصناف پر ملکہ رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں دھیما پن ہے، خلوص ہے، اپنی تنہائی کا دکھ ہے اور ہجرتوں کی بخشی ہوئی تپش بھی ہے۔

خواب یہ تھاملِ کے بانٹیں گے سبھی فصلِ بہار
ہائے اب تعبیر کو صحنِ وطن کافی نہیں
نئے رنگوں کی آمیزش سے گھبراتا ہے جب دل
میں تصویریں سجا کر پھر پرانی دیکھتا ہوں
میں اشکِ نم کو اکثر روک تو لیتا ہوں لیکن
برس جائے گا پل بھر میں یہ پانی دیکھتا ہوں

اپنے درد کا خود ہی درماں بنتے بھی کم لوگوں کو دیکھا ہے۔ جاوید زیدی یہ حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ ان کی فکر میں آفاقیت ہے۔ دیکھئے یہ شعر کتنا خوبصورت ہے۔

ع مجھے بوڑھا نہیں ہونے دیا ماں کی دعا نے
میں بیٹے کے مقدر میں جوانی دیکھتا ہوں

جاوید نے بڑی پُر اثر اور بلند آہنگ نظمیں بھی کہی ہیں۔ ان میں وطن سے دوری اور بے گھری کا دکھ نمایاں ہے۔ ان کی نظم "خونِ ناحق" ملاحظہ ہو۔ وطنِ پاک میں ہونے والی بے انصافیوں پر اس فنکار کے احساسات کیا کہتے ہیں۔

(پاکستان میں قصبہ کرم داد کے خونی حادثہ کے بعد کا اک تاثر!)
وہ "لشکر جھنگ" کے ہوں، یا "محمد کے سپاہی" ہوں
یہ پورس کے وہ ہاتھی ہیں، جو اپنے آپ کو خود ہی کچلتے ہیں
میرے اجداد کے سینوں پہ چلتے ہیں
یہ جذبہ کون دیتا ہے
یہ وحشت کیسے آتی ہے
کہ مسجد میں نمازی قتل ہوں
اور خون ناحق، شہر کی سڑکوں پر ہو ارزاں!
سنو، جہالت کے امیں
ہیں آج بھی انسان کے قاتل
جہالت کو مٹاؤ، روشنی لاؤ
روشنی علم کی، چاشنی علم کی، تشنگی علم کی، جستجو علم کی
مذہبی، راستی،
خود بخود آئے گی!

اب جاوید زیدی میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ سوالنامہ ہم دونوں کے بیچ رکھا ہے۔ جاوید سوالات پڑھتے ہیں اور جواب میں کہہ رہے ہیں: میرا نام سید جاوید اختر زیدی ہے۔ میں نجیب آبادی (ضلع

بجنور) میں 6 جنوری 1947ء کے دن پیدا ہوا۔ قلمی نام جاوید زیدی اختیار کیا۔ انگریزی ادب میں ایم۔اے کیا ہے اور انگریزی زبان کا معلم ہوں۔ میرے گھر کا ماحول شاعرانہ وادیبانہ تھا۔ والدِ مرحوم پروفیسر سید اختر رضا زیدی ادیب، شاعر و مورخ اور سندھ کے معروف ایجوکیٹرز میں تھے۔ میرا ابتدا ہی سے ادب اور خصوصاً شعر کی طرف رجحان رہا۔ اردو ادب کے ساتھ ساتھ انگریزی اور یورپین ادب اور پھر امریکی ادب سے بھی مجھے سروکار رہا اور تادمِ تحریر ہے! گویا بقول غالب ؎

شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

پاکستان میں محکمہ تعلیم سے وابستہ رہا۔ جرنلزم اور ایڈورٹائزنگ سے بھی تعلق خاطر رہا۔ امریکہ میں پچھلے سولہ برس سے انگریزی کے معلم کی حیثیت سے ہائی اسکول اور کالجز سے وابستگی رہی اور ہے۔ جو وقت غم روزگار سے بچ جاتا ہے وہ غم دوست کی نذر ہو جاتا ہے۔ ادبی وشعری محافل و ریڈیو، مشاعرہ، اخبارات کے لیے لکھنا لکھانا، پاکستان اور بھارت سے آئے اردو اخبارات ورسائل و کتب کا مطالعہ بھی اچھی خاصی توجہ چاہتا ہے لیکن واقعہ ہے کہ جس دل جمعی کے ساتھ، سکونِ قلب کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا کام کرنے کو جی چاہتا ہے، وہ میسر نہیں، بہر حال غنیمت ہے

میسر ہیں ہمیں یہ روز و شب بھی

پاکستان لنک، تخلیق، افکار، شاعر، مشعل، بیسویں صدی وغیرہ وغیرہ اور مقامی پرچوں میں میرا کلام شائع ہوتا ہے یا ریڈیو پر نگارش پیش کرنے کا موقع گاہے بگاہے ملتا ہے۔ مضمون نگاری، نظم و غزل اور خطوط پسندیدہ اصنافِ سخن ہیں۔ یوں میں میر و غالب واقبال و فیض وجوش سے لے کر سلطانہ مہر تک کے فن کو سرمۂ چشم کرتا ہوں۔ نئے شعرا اور ادبا کا مطالعہ کرنا اور انہیں تلاش کر کے متعارف کرانا میرا مشغلۂ جاں ہے۔ غزل کے مکتبہ فکر میں میر سے لے کر جون ایلیا تک اور نظم میں انیس سے لے کر جوش تک سبھی قلم کاروں سے متاثر ہوں۔ دراصل نام نہیں مجھے کام زیادہ متاثر کیا کرتے ہیں۔ خودنوشت، تاریخ، خطوط، مجموعۂ سخن، میری توجہ و دلچسپی خاص طور پر مطمع نظر رہتی ہیں۔

میرا مجموعہ کلام "صلیبِ ہجرت" زیرِ ترتیب ہے، دعا فرمایئے کہ زندگی کی صلیب سے اترنے سے پہلے میرے اشعار افقِ ادب پر نمودار ہو جائیں اور اگر ایسا نہ بھی ہو سکا تو کیا فرق پڑے گا؟

وہ وقت کیسے بھول سکتا ہوں جب فرسٹ ایئر کالج میں بزم ادب قائم کرنے پر جوش صاحب کی صدارت میں پہلا مشاعرہ پڑھنے کا موقع ملا۔ یہ زندگی کی یادگاروں میں سے ہے۔ جوش صاحب نے کہا تھا "میاں صاحبزادے، آپ کی مسیں نہیں بھیگیں، یہ آپ کن جان جوکھوں میں پڑ گئے۔" وہ دن ہے اور آج تک بھی بقول انیس ؎ عمر گزری ہے اس دشت کی سیاحی میں۔

اردو کے سلسلے میں عرض ہے کہ بقول قرۃ العین حیدر "اردو کو ہندوستان سے ہائی جیک کیا گیا لیکن آج بھی اردو زبان جسے وہ ہندی کہتے ہیں، نہ صرف برصغیر میں بلکہ یورپ، افریقہ اور اب شمالی امریکہ میں بھی بولی، لکھی اور سمجھی جاتی ہے۔" میں ذاتی طور سے زبانوں کا معترف ہوں اور اس

تہذیبی ورثہ کو ہمیشہ جیتا جاگتا دیکھنا چاہتا ہوں، نہیں معلوم کہ ارتقا کے ہاتھوں تہذیب و تمدن کی تبدیلی میں کتنا عرصہ لگتا ہے لیکن زبان تہذیب کا اوّل رکن ہے اور اسے اپنی تہذیب کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔ میں اس سے قطعی طور پر مطمئن ہوں۔"

میری رائے میں نظم بہتر ذریعۂ اظہارِ خیال ہے لیکن شعر میں موسیقیت اور خیال آفرینی نہ ہو تو نثر میں مضمون نگاری، افسانے، ناول، خطوط، خود نوشت، طنز و مزاح میں بھی گویا کہ بے حد گنجائش ہے۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ہر شخص شاعری پر اصرار کرے یا شاعر نثر نگاری کرے۔ نثری نظم و غزل، گویا کہ تجربے کی منزل میں ہیں اور ہماری طبیعت ادھر نہیں جاتی۔ مشاعرے ہماری تہذیبی روایت کی ایک کڑی ہیں، تخلیقی نشستیں بھی اپنا کردار ادا کر سکتی ہیں لیکن مشاعرے میں عوام الناس سے شاعر اور سامع کا ایک خاص ربط بنتا ہے جیسا نثر میں ادیب اور قاری کا ہے۔

ایک نئی ریسرچ کے معتبر حوالے سے دنیا میں کتب کی دکانیں سب سے زیادہ بڑھنے والا کاروبار ہے اور یہ ان خطوں میں زیادہ ہے جو الیکٹرانک میڈیا میں ترقی یافتہ ہیں! پرنٹ میڈیا کا اپنا ایک مقام ہے اور ہمیشہ رہے گا، البتہ کوالٹی کنٹرول اور مارکیٹنگ اور جہالت کا خاتمہ بے حد ضروری ہے! فن اول حیثیت رکھتا ہے۔ صحت مند تنقید معاشرہ کی ہر راہ میں مفید ہے لیکن پروفیشنل تنقید اور تنقید برائے تنقید فنکار اور قلم کار کے لیے ناگزیر نہیں ہے اور فرمائیے۔"

"شکریہ جاوید۔ رخصت ہونے سے پہلے ایک اچھا سا شعر سنا دیں۔" میں نے جاوید سے کہا پہلے تو وہ تھوڑا سا مسکرائے اور پھر بڑے تدبر سے یہ شعر گنگنایا۔

یوں شعر اترے ہیں مجھ کم نصیب پر زیدی
زمینِ فکر پر جیسے نئی کتاب اترے

Javed Zaidi
15719 Red Spring
Housten
Tex 77082
U.S.A

انتخابِ کلام

جاوید زیدی ہیوسٹن

کرسمس

ہر برس دسمبر میں
سوچتا ہوں اکثر میں
بتیاں خریدوں گا، گھر کو جگمگاؤں گا
اور پڑوسیوں کے سنگ
کرسمس مناؤں گا
پھر غریب بچوں کو
تحفے دے کے گھر گھر میں، مسکراتا جاؤں گا
ان کے غم بٹاؤں گا، اپنے بھول جاؤں گا

بس انہیں خیالوں میں
عمر گزری جاتی ہے
وقت سمٹا جاتا ہے
میرے اپنے بچے بھی
یوں بزرگ لگنے لگے
بات چیت سے ان کے
حوصلے ٹپکنے لگے، ولولے مچلنے لگے
ان کی زندگی کے الگ،
قافلے سے چلنے لگے
اور میں کہ رستوں پر
دھول بن کے بیٹھ گیا
زیست کے سفر کی ایک، بھول بن کے بیٹھ گیا!

پھر ہر برس دسمبر میں
چھٹیاں بھی آتی ہیں
اور مجھ کو تنہائیوں
گھر میں چھوڑ جاتی ہیں
ساحلوں پر ناؤ کوئی، اجنبی مسافر کو
جیسے چھوڑ جاتی ہے
لہر جیسے پانی کی، ریت چھوڑ جاتی ہے
خواب کے گھروندے کو
توڑ پھوڑ جاتی ہے

ریت کے یہی ذرّے
ساحلِ خیال پہ کچھ، اس طرح چمکتے ہیں
جس طرح "کرسمس" پر
بجلیوں کے چراغ جلتے ہیں
آؤ دشت غربت میں
ہم بھی روشنی کر لیں
آؤ تھوڑی دیر سہی، ہم بھی زندگی کر لیں
اجنبی زمینوں کو، دوستی کی شبنم سے
مائل کرم کر لیں
اس جہانِ وحشت کو
مل کے سب ارم کر لیں

والدلعت للعالمین سے جس بھی سچوں قدم ہیں
آ جاتے ہیں گر ہیں اُتا لا کل میں تھا اور آج بھی ہے

خاکسار حامد امروہوی
شکاگو
۱۰/ اکتوبر ۱۹۹۹ء

حامد امروہوی

شکاگو

شکاگو میں مقیم خواجہ ریاض الدین عطشؔ نامی گرامی شاعر اور ماہرِ لسانیات ہیں۔ نعتیہ شاعری سے متعلق ان کے زرین خیالات قارئین "سخن ور چہارم" کے لیے پیش ہیں۔ فرماتے ہیں :

"حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے اُلفت اور اُسوۂ حسنہ کی تبلیغ و اشاعت ایک مقدس فریضہ ہے جس میں ایمانِ دل، مسلمان کی پہچان مضمر ہے۔ یہ ایک ایسی نسبت ہے جو ہمارے قلوب کو روشن رکھتی ہے اور ہمیں صراطِ مستقیم کا پیام پتا دیتی ہے۔ نعتِ رسولؐ مقبول کا مقصد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم شخصیت اور اسوۂ حسنہ کے بلاغت آفریں اور مقدس بیان کو ضابطۂ نعت گوئی کے بلا تقصیر معیار کو برقرار رکھتے ہوئے شعری جامہ پہنا کر محبانِ رسولؐ کے دلوں کو ایمان کی حرارت سے گرمانا اور عوام الناس کو رسولِ اکرمؐ کی سیرت سے قریب تر لاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اصنافِ سخن میں نعت گوئی ایک مشکل ترین صنف ہے جس میں خیال و جذبہ کے ساتھ ہر ہر لفظ کو توقیر و تحقیر کے ترازو پر تولنا پڑتا ہے اور تنقیص یا الوہیت کی کڑی شرط کو ہر قدم پر ملحوظِ خاطر رکھنا پڑتا ہے اس لیے فکر، مضمون طرزِ بیان اور جذبوں کی بے اختیاری، پیرایہ

اظہار اور مبالغہ آرائی ان سب کو غلو سے مبرا رکھنے کے لیے کمالِ احتیاط ازبس ضروری ہے۔ ساتھ ساتھ دین کا گہرا مطالعہ، تبحرِ علمی، ایمانِ کامل اور حضورؐ سے قلبی لگاؤ اوّلین شرائط ہیں۔

شیشۂ نعت ہے بہت نازک
کیوں کوئی بے ہنر زباں کھولے
(ذہین شاہ، تاجی)

مدح رسول نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ہی ایک باقاعدہ فن کی صورت اختیار کرلی تھی۔ اس فن کی نمائندگی حضرت حسان بن ثابت، حضرت کعب بن زبیر، حضرت عبداللہ بن رواحہ، حضرت کعب بن مالک اور حضرت عباس بن مرداس رضی اللہ عنہم کے علاوہ دوسروں نے بھی کی اور اس فن کے معیار مقرر کیے۔ فنِ مدحِ رسول کو ایک مدت بعد فارسی میں اصطلاحاً نعت کہا گیا۔ حضرت حسان بن ثابتؓ شاعرِ دربارِ رسالت تھے۔ آپ کے اشعار توحید و رسالت کے فضائل اور محاسنِ سیرتِ رسولؐ سے پُر ہیں۔ حضرت کعب بن زبیرؓ نے جب حضورِ ختمی مرتبتؐ کی خدمت میں اپنا تاریخی قصیدہ پڑھا تو حضورؐ نے خوش ہو کر اپنی ردائے مبارک عطا فرمائی۔ حضورؐ نے ابو طالب کی ایک نعت کو پسند فرمایا جس کے مفہوم کو میں نے اس طرح ادا کرنے کی کوشش کی ہے:

جس حوالے سے طلب ابر کی بارش کیجیے
آپ کا ہی رُخِ روشن ہے رسولِ عربیؐ
ملتی بیواؤں کو جس میں ہے تحفظ کی بہار
ارضِ طیبہ وہی گلشن ہے رسولِ عربیؐ
نور میں جس کے یتیموں کا ہے وہ عہد سیاہ
آپ کا عدلِ ضیاء تن ہے رسولِ عربیؐ (عطش)

حامد امروہوی شکاگو کے ادبی حلقوں میں ایک نعت گو شاعر ہیں۔ ان کی نعتوں میں آہنگ و لحن ایک محور پر آملتے ہیں اور اس طرح انہیں ختمی مرتبت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ بے مثل میں معرف و مدح گو ہونے کی سعادت نصیب ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے لیے ان کی مدح نگاری سے خوش ہو کر جو یہ دعا فرمائی تھی: "اَللّٰھُمَّ اَیِّدْہُ بِرُوحِ الْقُدُس" کہ اے اللہ! جبرئیل کے ذریعے حسان کی مدد فرما" اس دعا کا دائرۂ اثر قیامت تک پیدا ہونے والے تمام مدحت نگاروں کے لیے پھیلا ہوا ہے (بشرط: بلطائف الاحسن، بحضور) ورنہ ہم عاجزوں کو نعت گوئی کی کیوں کر توفیق ہوتی۔ اور یہ اسی دعا کی برکت ہے کہ جناب حامد امروہوی کی نعت گوئی گام بہ گام ترقی پذیر اور درجہ بدرجہ پسندیدہ خاطر ہوتی چلی جارہی ہے۔ لفظ و معنی تک معتدبہ رسائی جہاں طبعی خصوصیت کو ظاہر کرتی ہے وہاں زبان کی اچاشنی، بندش کی

چستی، بیان کی تازگی، جدت کی دھنک، ترکیبات و تشبیہات کی ہم آہنگی ان کے اشعار کی شادابی کے آئینہ دار ہیں۔ حامد امروہوی میں اعجازِ فن کے وہ ہنر مند نکتے ہیں جو قاری اور سامع کے خوابیدہ خیالوں کو جھنجوڑ کر بیدار کرتے ہیں اور دل ودماغ کو اپنی آغوشِ طلسم میں لے لیتے ہیں۔

آقاؐ مرے ایسے ہیں رسولوں میں کہ جیسے
تسبیح کے دانوں میں امام اپنی جگہ ہے

جب تصور کرلیا وہ ہیں ہمارے سامنے
بحرِ غم میں آ گئے لاکھوں کنارے سامنے

خوشبو جس چیز سے خالق نے بنائی ہوگی
وہ یقیناً مرے آقاؐ کا پسینہ ہوگا

ہر آن بدلتی ہے خرد نظمِ سیاست
سرکارؐ جو لائے وہ نظام اپنی جگہ ہے

حامد بھائی سے میری ملاقات ایک نعتیہ محفل میں ہوئی۔ انہوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے فرمایا "مجھے حامد حسین مرزا کہتے ہیں اور نام کا ایک حصہ حامد تخلص ہے۔ حامد امروہوی 20 جنوری 1936ء کو امروہہ، یوپی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم جناب عبدالرؤف مرحوم امروہہ کے مشہور اساتذہ میں سے تھے اور امام المدارس سے منسلک تھے اور بہترین نعت گو تھے۔ ان کے چار دیوان یادگار ہیں۔ حامد بھائی کے بڑے بھائی احمد حسین سیفی اور چھوٹے بھائی ساجد حسین ساجد دونوں ہی صاحبِ دیوان ہیں اور خود حامد امروہوی صاحب بھی (ان کے خاندان کے بارے میں تفصیلات محترمہ مخفی امروہوی کے کے تعارف میں موجود ہیں) انہوں نے ہائی اسکول امام المدارس سے پاس کیا اور پھر ہندوانٹر کالج میں داخلہ لے لیا مگر بیماری کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ پھر جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب کامل کیا۔ 1952 کے آخر سے گئے کے سرکاری محکمہ میں ملازمت شروع کی اور تقریباً سترہ سال یوپی کے مختلف مقامات پر کام کیا اس کے بعد 1969ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے غیر تدریسی عملہ میں شامل ہوگئے اور مدرس مسعود ہال اور پھر داخلوں اور امتحانات کے کنٹرولر کے دفتر میں کام کیا 1991ء میں یونیورسٹی سے چھٹی لے کر امریکہ آگئے اور تاحال شکاگو میں مقیم ہیں۔

حامد بھائی بتارہے تھے "امروہہ میں میرے مکان پر تقریباً 77 سال سے ہر جمعہ کو نمازِ جمعہ کے بعد بڑے اہتمام سے نعت خوانی کی محفل منعقد ہوتی ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ اس طویل عرصے میں ایک بھی جلسہ ناغہ نہیں ہوا۔ جب ہوش سنبھالا تو خود کو اس محفل میں نعت خواں پایا۔ نعت پڑھتے پڑھتے خود بھی نعت کہنے لگا۔ سب سے پہلی غزل اپنے شفیق استاد مولانا سید صفی مرتضٰی صاحب مرحوم کی فرمائش پر کہی جب میں ساتویں جماعت میں تھا۔ افسوس یہ ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہوں پر تبادلوں کی بنا پر

تمام کلام ضائع ہو گیا۔ اور میں نے بددل ہو کر شعر کہنا چھوڑ دیا صرف امروہہ میں اپنے مکان پر ہونے والے سالانہ نعتیہ مشاعروں کے لیے نعتیں کہتا رہا۔ امریکہ آکر تقریباً پچیس سال بعد پھر شعر کہنا شروع کیا اور یادداشتوں کے سہارے صرف نعتوں کو جمع کر کے ایک دیوان "مدحت کے پھول" کے نام سے 1995ء میں شائع کیا۔ جس کو اللہ کا شکر ہے مقبولیت حاصل ہوئی اور پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا اب دوسرا ایڈیشن انشاء اللہ جنوری 2000ء میں آجائے گا۔

زندگی کے اہم واقعات میں میری پیدائش اور شادی ہے اور تیسرا واقعہ انتقال کا ہو گا۔

میرے نزدیک صنفِ ادب میں صرف شاعری ہی ایک ایسی صنف ہے جس میں آپ انتہائی موثر انداز میں اظہار خیال کر سکتے ہیں اور شاعری میں بھی غزل وہ صنف ہے جس کے دو مصرعوں میں آپ ایک مکمل بات کہہ دیتے ہیں۔"

"ان کا کلام شمع، نئی دنیا، الجمعتیہ، پاسبان، اردو جرنل، اور پاکستان لنک، وغیرہ میں شائع ہوتا رہتا ہے انہیں شاعری اور سوانح پڑھنے میں لطف آتا ہے ان کا کہنا ہے اردو مشاعروں، ڈراموں اور فلموں کی کامیابی اردو کی بقا کی ضامن ہے ان کے نزدیک نشستیں عام مشاعروں سے بہتر ہیں۔

ان کا مشورہ ہے کہ تحفے میں کتابوں کو دینا اردو زبان کی اشاعت اور بقا کا ذریعہ ہو گا اس میں کوئی شک نہیں کہ ادب کی ترقی کے لیے تنقید ضروری ہے مگر اس میں تنقیص نہ ہونی چاہیے۔"

HAMID AMROHVI
NATKAD, 1555 AMY AVE. GLENDALE HEIGHTS, IL 60139

نعت

اک ہم ہی نہیں اُنؐ کے جلووں کے تمنائی
خالق بھی خود اپنی تخلیق کا شیدائی

اُن سا نہ ہوا کوئی اُن سا نہ کوئی ہو گا
اللہ رے یکتا کے محبوب کی یکتائی

محبوب بھی پیارا ہے محبوب کی نگری بھی
اللہ نے قرآں میں دونوں کی قسم کھائی

میں ہوں درِ اقدس ہے اور سامنے جالی ہے
اے چشمِ تمنالے اب تو تری بن آئی

ہم عرضِ وفا حامدؔ کرتے ہیں نگاہوں سے
کس کو درِ اقدس پر، ہے جرأتِ گویائی

کون حیدر! مری سرکار کا ہوتا ہمسر
ہوتا ممکن تو پھر ان کا کوئی سایا ہوتا

سید افتخار حیدر

سید افتخار حیدر

ٹورنٹو کنیڈا

اس میں کوئی شک نہیں کہ غزل کا مزاج عاشقانہ ہے۔ غزل کے اندر جہاں میرا کا بھجن اور کرشن کی بنسی کی لے ہے وہیں لحنِ داؤدی کا سوز بھی ہے اور سرودِ ربانی کی کشش بھی۔ غزل میں جہاں عشق کی آگ ہے وہیں تصوف کے جمال کی ٹھنڈک بھی ہے۔ سید افتخار حیدر کی غزلوں میں بھی یہی گرمی و نرمی پائی جاتی ہے۔ ان کی دو قافیہ غزل کے چند اشعار انہی کیفیات کے مظہر ہیں۔

مری ڈائری کے ورق ورق گلِ یادگار کی پتیاں
مری زندگی کی خزاں میں بھی، ہیں اسی بہار کی بستیاں

ترے انتظار میں عمر بھر مرے در پہ شمع جلی رہی
اسی شوقِ دید میں آج بھی ہیں جلی مزار کی بتیاں

ذرا دیکھ میری پلک پلک پہ ہیں کتنے موتی جڑے ہوئے
مری ہر نظر نے چھپا رکھی ہیں دیارِ یار کی جھلکیاں

کسی سایہ دار شجر تلے کوئی غم گسار جو مل گیا
وہ بھلا گیا مجھے حیدری سبھی راہِ یار کی سختیاں

سید افتخار حیدر نے سرگودھا (پنجاب پاکستان) کی سرزمین پر 14 نومبر 1929ء کو جنم لیا۔ الیکٹرانکس اور لائٹنگ میں ڈپلوما لیا اور قریہ قریہ روشنی پھیلانا ان کا مشن بن گیا۔ فرماتے ہیں "مجھے اب تک یاد ہے 1946ء کا زمانہ تھا۔ میں زمیندار کالج گجرات سے اردو میں پہلا انعام اور کیمسٹری میں دوسرا انعام لینے پر کیمسٹری کے پروفیسر جناب ہاشمی شاہ صاحب نے دفتر میں بلا کر تنبیہ کی "تم میرے مایہ ناز شاگرد ریاض حیدر کے چھوٹے بھائی ہو۔ سائنس میں کامیاب ہونا چاہتے ہو تو اردو چھوڑ دو۔" تعمیل حکم تو کی لیکن حساس جذباتی مزاج کی تصوراتی دنیا کو خیرباد نہ کہہ سکا.... یہ میری تقدیر بن چکی تھی۔

انجینئرنگ کو بطور پیشہ اختیار کیا تو اس میں بھی آرٹ کا پہلو تلاش کرتے کرتے پاکستان کا پہلا اسٹیج لائٹنگ ایکسپرٹ اور لائٹنگ / الومینشن ڈیزائن انجینئر بن گیا۔ ذہن ہر مقام اور ہر منظر میں رنگ و نور کے طلسمات بھر لیتا اور ٹیکنالوجی کی مدد سے انہیں زندہ حقیقتوں میں ڈھال دیتا۔ 1952ء سے 1972ء تک اسی شعبے سے متعلق رہا۔ کراچی تھیٹر، کراچی آرٹس تھیٹر سوسائٹی کلفٹن پلیئرز، اور کراچی آرٹس کونسل میں رنگین لائٹنگ کو پاکستانی اسٹیج پر پہلی بار متعارف کروایا Our Town سرائے کے باہر Antigone لال قلعہ سے لالوکھیت، ہیلمٹ، مرزا غالب بندر روڈ پر، کے علاوہ بیسیوں ڈراموں میں لائٹنگ ڈیزائن، سیٹنگ اور کنٹرول کیا۔ 1961ء میں "فلپس الیکٹریکل کمپنی، کے مرکزی دفتر میں "لائٹنگ ایڈوائزری بیورو" کی داغ بیل ڈالی اور 1972ء میں امریکہ جانے تک اس کا مینیجر رہا۔ مزار قائداعظم، مینار پاکستان، اسلام آباد سٹریٹ لائٹنگ، اسمبلی ہال، ایوان صدر، ڈھاکہ اسمبلی ہال، شالامار باغ، شاہی قلعہ لاہور، داؤد سنٹر کراچی (جس کے لیے بین الاقوامی مقابلے میں ایوارڈ جیتا اور اس کی رپورٹ اور تصویریں انٹرنیشنل ریویو کی سالانہ کتاب میں شائع ہوئیں) تقریباً ایک ہزار کے قریب لائٹنگ پراجیکٹ ڈیزائن کیے۔ دس سال تک گورنمنٹ اسکول آف آرکیٹیکچر میں لائٹنگ پڑھاتا رہا۔ ذہن ایسا بن گیا تھا کہ راتوں کو اگر کسی کی یاد بھی آتی تو جوش ملیح آبادی کی اس باعی کی طرح

پھر تری یاد دل کی ظلمت میں
اس طرح آئی رنگ و نور لیے
جیسے ایک سیم پوش دوشیزہ
مقبرے میں جلا رہی ہو دیے

1956ء میں شاہی قلعہ لاہور میں انٹرنیشنل اسلامک آرٹ اور کلچر کی نمائش دنیا بھر کے

ممالک کے عجائب گھروں کی وساطت سے لگی تو تمام نوادرات، باغات، محلات اور راستوں کی لائٹنگ کا کام سونپا گیا۔

1962ء میں Time-Life اور Philips کی شرکت سے کراچی میں جب پہلا ٹیلی ویژن اسٹیشن لگایا گیا تو بینکاک سے بلوا کر پورے سٹیشن کی لائٹنگ انسٹالیشن اور پروگراموں کے دوران لائٹنگ کی سیٹنگ اور کنٹرول کا کام سپرد کیا گیا۔ اسٹیج اور ٹیلی ویژن سے متعلق جن لوگوں کی رفاقت سے مستفید ہوتا رہا ان میں خواجہ معین الدین مرحوم، رشید خان، سرور ضیاء، اسلم اظہر، نسرین اظہر، ضیاء محی الدین، حمید وائن، نعیم طاہر، رشید میاں، سمیع احمد صدر اسمٰعیلی، سہیل رانا، سگرڈ کیلے، ٹیڈ سیل، ایلیکس لطور قابل ذکر ہیں۔

تصورات پر جمالیاتی ذوق چھایا رہے تو ایک آرٹ فارم دوسری آرٹ فارم میں بدلتی رہتی ہے 1972ء سے 1983ء تک کولمبس کی نئی دنیا (امریکہ۔ کینیڈا) میں 12 سالہ بن باس کے دوران زندگی کو نئے نئے زاویوں سے دیکھنا نصیب ہوا۔ یوں تو پہلے بھی 1954ء اور 1958ء میں انگلینڈ اور امریکہ میں ایک عرصہ گزار چکا تھا لیکن اس وقت شوق ایک نوجوان طالب علم سیاح کے تھے۔ اس دفعہ تو عین قعر دریا میں تختہ بند رہا۔ نئے کام، نئے تقاضے، سب دم خم نکل گئے۔ تمام تعلقات سطحی ور سوماتی۔ دم گھٹنے لگا.....

کراچی میں صوفیا کرام کی نجی محفلوں میں چند اشعار طرحی مصرع پر چست کر لیا کرتا تھا حوصلہ افزائی بھی ہوتی، داد بھی ملتی۔ امریکہ پہنچا تو ان محفلوں کے فراق میں خوابوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ منقبتیں اور سلام ذہن پر اترنے لگے مگر ان کا ذکر عزیز و اقربا تک محدود رہتا۔ 1975ء میں آٹاوا کینیڈا میں ہونے والے ایک مشاعرے سے تو سوتے جاگ پڑے۔ یوں تو اس مشاعرے میں کسی کا بھی کچھ کہہ لینا غنیمت تھا چاہے اچھی آواز میں کلام اقبال ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر اپنے اشعار ہوں تو کیا ہی کہنا، خوب داد ملتی۔ اس مشاعرے سے ایسا چارج ہوا کہ رات بھر سو نہ سکا۔ صبح تک دو غزلیں لکھ ماریں۔ آٹاوا اور گردونواح کے مشاعروں میں بلایا جانے لگا۔ نیا کلام بڑے شوق سے لکھتا اور پڑھتا۔

پھر کچھ لکھنے سننے والوں سے مل کر آٹاوا میں "بزم ادب" کی بنیاد پڑی ہر ماہ باقاعدگی سے محفل ہوتی انور انصاری، حمیرہ انصاری، ولی شاہین، راشدہ سیال، روشن شرما، فقیر سہگل، ڈاکٹر ابرار الحسن، خالد فرید، معین الدین اشرف، عثمان صدیقی، اقبال بھٹی، ڈاکٹر ستار، ڈاکٹر شوکت مرزا، رخسانہ مرزا اور دیگر احباب کبھی لکھتے کبھی پڑھتے مشاعروں کا انتظام ہوتا جن میں فیض احمد فیض دوبار آئے۔ سردار جعفری اور کیفی اعظمی انڈیا سے آئے۔ احمد فراز اور افتخار عارف لندن سے آئے۔ صہبا اختر، قتیل شفائی، ضمیر جعفری، جمیل الدین عالی، حمایت علی شاعر، پروین فنا سید پاکستان سے آئے۔ میرے ذوق و شوق کو جلا ملتی رہی، میں لکھتا اور پڑھتا رہا لیکن ایک خیال اکثر ستایا کرتا۔

میرے ہی پاس وہ رہتے ہیں یہ مانا لیکن

ایک احساسِ خلا دل میں چھپا رہتا ہے

جانتا نہ تھا کہ یہی احساس خلا تو "محسوسات" پر محبوب کے ان نقوش کے چھا جانے کی دلیل ہے جو "معلومات" کی حدود سے آگے "حیرت" میں گم ہو جاتے ہیں۔ جیسے کسی خوبصورت منظر میں دور افق پر چھائے ہوئے دھندلکے اس منظر کی گہرائیوں کو غیر متناہی حسن عطا کر دیں۔ ایسے محبوب کا او جھل ہونا کبھی بھی چلمن سے جھانکنے والی آنکھوں سے زیادہ دور نہیں ہوتا اور اگر یہ چلمن مژگانِ یار کی ہو تو نشہ آ جاتا ہے۔

مے کدے کتنے چھپے ہیں حسن کی سرکار میں
پردۂ مژگاں کے پیچھے مست چشم یار میں

اسی مستی میں غزلیں اور اشعار لکھتا چلا گیا۔ ایسے میں دنیا کی طرف جب بھی لوٹ کر دیکھا تو اپنی اپنی ذہنی کمین گاہوں میں چھپی ہوئی آنکھیں اپنے تقاضوں، جذبوں اور خواہشات کی تسکین کے لیے بڑے پر خلوص انداز میں خود غرض نظر آئیں۔ تعجب اس بات پر ہے کہ انہی آنکھوں میں میری اپنی دو آنکھیں بھی یوں پس منظر پر پھیلی ہوئی تھیں جیسے باقی سب آنکھیں انہی دو آنکھوں کے اندر بنی ہوں۔ مامتا، جنسی میلان، بھوک، عزت، شہرت، قومی جذبہ، فرقہ واریت، سیاست، دوستی، سبھی پر خلوص خود غرضیوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے دکھائی دیتے۔ اگر کوئی "نفسِ مطمئنہ" ان زنجیروں سے آزاد نظر آیا تو فقط ایسا "مردِ فقیر" جو دارا و سکندر سے بھی اولیٰ ہو۔ جو فطرت کی عطا کردہ اپنی صلاحیتوں کو قوانین فطرت کے مطابق کر دے اور اپنے پرائے کے لیے باعثِ خیر و برکت بن جائے۔ اس کی فطرت سے ہم آہنگی ہی اسے وہ سکون عطا کرتی ہے جو محض معصوم بچوں کی مسکراہٹ میں دکھائی دیتا ہے۔ جس ذات سے وہ اپنی تمام صلاحیتیں اور توتیں حاصل کرتا ہے اسی کی خاطر وہ اپنا سب کچھ لٹا کر "شہادت" اور ابدی زندگی پا لیتا ہے۔ یہ کام "عشق" بغیر آسان نہیں

ہے کٹھن راہ محبت ہر قدم پر دار ہے
سہل ہے ان کے لیے ہو عشق جن کا پاسباں

یہی عشق اور سوز میری شاعری کا مرکزی خیال بنا رہا اور اسی سوز کی تشنگی سے جب دنیا سکڑ کر کسی کے قدموں کی خاک بن گئی تو میں آٹاوا (کینیڈا) چھوڑ کر گجرات (پاکستان) آ گیا تاکہ ان ذروں کے نور سے بصیرت حاصل کر سکوں۔

نارِ نمرود ہو یا شعلۂ سینائی ہو
تیرے ہی نور سے روشن میری بینائی ہو

تقریباً نصف صدی سے ایک ہستی آہستہ آہستہ دل و دماغ پر چھاتی گئی جس کا قول و فعل نہ صرف آسمانی صحیفوں کی وضاحت کرتا رہا بلکہ آسمانی صحیفے بھی اس کے قول و فعل کی تصدیق کرتے رہے۔ زندگی کی شام کے لمبے ہوتے ہوئے سائے ہر لمحہ یہ اعلان کرتے کہ وقت بہت کم ہے اور کام

بہت زیادہ، گجرات آگیا تو وقت نے صرف تین سال مہلت دی یہ تین سال میری ساری زندگی سے زیادہ قیمتی تھے۔ میری تقدیر کہ جس ذات پاک کے ساتھ حضرت پیر رشید الدولہ صاحب زندہ تھے اسی کے ساتھ ابدی وصال فرما گئے۔ دونوں جہانوں کی روشنیاں چاند ستاروں کو بخش کر 15 اگست 1986ء کو وہ سورج افق سے پار چلا گیا میری تمنا ہے کہ شام کے ستاروں کے اسی شفق میں ڈوب جانے سے پہلے "ملفوظات رشیدی" مکمل کر سکوں۔ ڈرتا بھی رہتا ہوں کہ

ابھی لکھنے تھے باقی داستاں کے کچھ ورق حیدر
کتابِ زندگی میں نے خدا جانے کہاں رکھ دی

اور ملتجی ہوں کہ

زندگی! اور چل! ذرا آگے
کچھ تعلق ابھی نبھانے ہیں

سید افتخار حیدر کی تصنیفات کے نام درج ذیل ہیں

1۔ "سوزِ ازل" شعری مجموعہ۔ جنگ پبلشرز لاہور۔
2۔ "صبحِ ازل" مجموعہ نعت و سلام "نقوش" اور المحہ پبلشرز
3۔ "الصلوٰۃ فی القرآن" صلوٰۃ کے قرآنی مفہوم پر ایک دعوتِ فکر
4۔ "قران بزبانِ قران" قرآن کا تعارف خود اس کی زبانی۔ "نقوش" قران نمبر کا جز بن چکی ہے
5۔ "سیرت محمدؐ بزبان قرآن" جلد اول مکی دور۔ "جنگ" پبلشنگ کے زیر اشاعت ہے
6۔ "سیرت محمدؐ بزبان قرآن" جلد دوئم۔ مدنی دور آج کل زیر طباعت ہے۔

ان کے علاوہ "نورِ بیکراں" کے نام سے دیگر شعرا و شاعرات کی نعتوں اور سلام کا مجموعہ بھی ترتیب دے رہے ہیں کہتے ہیں "شاعری، افسانہ، ناول، تاریخ، مذہب سبھی دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں مگر آج کل اپنی قلبی کیفیات کو مسائلِ زمانہ اور قرآنی تعلیمات کے شدید احساس نے جکڑ رکھا ہے۔

اردو کے مستقبل کے سوال پر ان کا کہنا ہے کہ "زبان کی دو قسمیں ہوتی ہیں نہیں بلکہ تین۔ پہلی وہ جسے مائیں بولتی ہیں اس لیے وہ ماں بولی کہلاتی ہے۔

دوسری وہ جو کلام الملوک ہونے کی وجہ سے ملوک الکلام بنتی ہے۔

تیسری وہ جو روزی کمانے کے لیے ایک ہنر کے طور پر مجبوراً سیکھی جاتی ہے۔

اردو بد قسمتی سے ان تینوں حالتوں سے خارج ہو رہی ہے۔

نثری نظم و غزل کے سلسلے میں انہوں نے کہا "صنفِ شاعری جو جذبات کی حسین ترجمانی کر سکتے وہی سب سے بہتر ہے لیکن جس میں "آہنگ" نہ ہو وہ شاعری نہیں نثر ہے۔ خوبصورت نثر اپنی الگ جاذبیت تو رکھتی ہے لیکن شاعری نہیں۔

ان کے خیال میں مشاعرے اور تخلیقی نشستیں دونوں اپنی اپنی الگ اہمیت کی حامل ہیں۔ تخلیقی نشستوں میں تخلیق کار سے تخلیق کار استفادہ کرتا ہے جبکہ مشاعروں سے عوام فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ ان میں تخلیقی تحریک پیدا ہوتی ہے اور نئے تخلیق کار پیدا ہوتے ہیں۔

کتابوں اور جرائد کو مقبول بنانے کے لیے انہوں نے کہا:

"الیکٹرانک میڈیا ہر موضوع پر مواد پیش کرتا ہے جسے آپ ایک بٹن دبانے سے بدل لیتے ہیں اور نئی کہانی نئی کتاب نیا موضوع گھر بیٹھے بٹھائے سامنے آجاتا ہے۔ روزناموں کے درمیانی صفحات بھی کوئی دس موضوعات پر مشہور لکھنے والوں کی تخلیقات پیش کر کے ہر ذوق کی تسکین فراہم کر دیتے ہیں مگر وہ دوسرے روز ردی بن جاتے ہیں۔

کتابوں کو مقبول کرنے کے لیے بھی الیکٹرانک میڈیا میں کتابوں کی مشہور ماڈلوں کے ذریعے تشہیر کرنی ہوگی۔ بالکل ایسے جیسے ٹی وی آنے کے بعد ایک دفعہ تمام سنیما حال ویران ہو گئے تھے مگر جب الیکٹرانک میڈیا نے فلم اسٹوڈیو بھی خرید لیے تو ہر نئی فلم کی میڈیا پر خوب پبلسٹی کی جاتی ہے اور جب تک وہ خوب پیسے نہیں بنالیتی نہ تو اس کی ویڈیو بنتی اور بکتی ہے نہ ہی ٹی وی پر دکھائی جاتی ہے۔ چنانچہ لمبی لمبی قطاریں سنیما کے باہر لگی رہتی ہیں۔ بڑے بڑے پبلشنگ ہاؤس بھی ایسا کرتے ہیں۔ ہر کام تجارت بن گیا ہے جس کام میں پیسہ نہیں بنتا وہ اس دور میں کسی کام کا نہیں۔ چاہے ادب ہو یا فن ہو۔ ادیبوں کی خود چھپوا کر خود بانٹی ہوئی کتابیں بصد شکریہ قبول تو کر لی جاتی ہیں مگر پڑھی کم ہی جاتی ہیں۔ تجارت میں جو بکتا ہے وہ بنایا جاتا ہے یا پھر جو بنا ہو اُس کی مانگ پیدا کی جاتی ہے۔ یہاں مانگ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔"

آخر سوال کے جواب میں حیدر کہتے ہیں:

"میں تنقید کی بجائے تعلیم کا قائل ہوں۔ ہر اُستاد، نقاد اور معلم ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ تعلیم کے مدارج طے کیے بغیر تنقید کی قلم ہاتھ میں لینے والوں نے مستند معیار کی بجائے، ذاتی رائے کو معیار سمجھ کر اُس سے اختلاف کرنے والوں پر تنقید کی یلغار کر رکھی ہے، جس سے ہنگامہ آرائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

175 CUMMER AVE, APT, 143
TORONTO-ONT, - CANADA- M2M 2E9

انتخابِ کلام

سید افتخار حیدر ٹورنٹو کنیڈا

آپؐ کے اسوۂ حسنہ کا یہی شیدا ہوتا
آپؐ کا فیض ہی مقصودِ تمنا ہوتا

آپؐ کی راہِ مقدس جو کبھی ہوتی نصیب
تو ہر ایک نقشِ قدم ہر مرا سجدہ ہوتا

آپؐ کی ذاتِ حقیقی کا جو ملتا جلوہ
تو یہی جلوہ مجھے جلوۂ سینا ہوتا

اپنی پلکوں سے چُنا کرتا میں ذرّہ ذرّہ
دسترس میں مری گر نور کا صحرا ہوتا

سایۂ دامنِ رحمت میں جو ہم آجاتے
پھر نہ دنیا میں کہیں بھی کوئی بھوکا ہوتا

آپ کی آلؑ پہ سب جان فدا کردیتے
دنیا والوں نے اگر آپؐ کو سمجھا ہوتا

دنیا قرآن سمجھتی تو سمجھ آتے آپؐ
پھر ہر اک سمت اُجالا ہی اُجالا ہوتا

دیکھ لیتا دمِ آخر جو رُخِ انور کو
جانِ عالم! مرا مرجانا بھی جینا ہوتا

کون حیدرؔ! مری سرکارؐ کا ہوتا ہمسر
ہوتا ممکن تو تو پھر ان کا کوئی سایا ہوتا

تم سے بت کافر کو نہ پوجوں کیوں کر
تم خدائے حسن ہو خدا نہ سہی

۲۲ ردسمبر ۱۹۹۸ء   حیدر

سید ولی حیدر

کراچی

نومبر 97ء میں کراچی جانا ہوا۔ دسمبر میں پروین شاکر کی برسی پر سالانہ تقریب تھی۔ رفعت حیدر کا فون پر پیغام ملا تھا۔ میں بھول بھال چکی تھی کہ رفعت کون ہیں۔ مگر رفعت کی یہ بات دل کو بھا گئی کہ انہوں نے مجھے ڈھونڈھ نکالا۔ پھر جب ملاقات ہوئی تو یہ ایک ملاقات کئی ملاقاتوں میں بدل گئی۔ رفعت حیدر کی شخصیت میں دل موہ لینے والی خوبی ہے۔ اتنی پیاری لڑکی جسے مل جائے اس کی زندگی تو زندگی عاقبت بھی سنور جائے۔ ملاقاتوں پر پتہ چلا کہ رفعت پروین شاکر ٹرسٹ سے ایسی وابستہ ہیں کہ ٹرسٹ کے کاموں کے لیے گویا خود کو وقف کر رکھا ہے۔ میں ان دنوں سخن ور سوم کی تیاری میں مصروف تھی۔ رفعت نے اس میں بھی میری مدد کی اور اپنے ابو کو لے کر سخن ور کی تعارفی تقریب میں بھی آئی۔ اسی تقریب میں میری ملاقات رفعت کے ابو محترم سید ولی حیدر سے ہوئی۔ انہوں نے اپنی کتابیں بھی عنایت کیں۔ ان کے کلام کے مجموعے "آباد ویرانے" کا انتساب ہے۔ "اس محبت کے نام جس سے سارے نام منسوب ہیں۔" ان کی شخصیت بھی مجسم محبت ہے۔ میں مارچ 98ء میں امریکا آ گئی۔ ستمبر 98ء میں سید ولی حیدر کی کتابوں کی تقریب آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی میں ہوئی۔ صدارت محترم پروفیسر ڈاکٹر حنیف فوق تھے اور مہمانِ

خصوصی جناب حق نواز اختر صاحب صدر نے اپنی تقریر میں ان کی اردو ادب سے لگن کو سراہتے ہوئے ان کی کتاب "اقبال کے خطوط" کا خاص طور پر ذکر کیا جو ان کا ایم اے کا مقالہ ہے۔ انہوں نے کہا "ڈاکٹر اینے میری شمل جنہوں نے علامہ اقبال اور ان کے کلام و فن پر خاصی ریسرچ کی ہے جس کے بعد علامہ اقبال پر تحقیق کے کاموں کے دروازے کھل گئے اور "اقبالیات" ایک عالمی موضوع بن گیا۔ انہوں نے سید ولی حیدر کی اس کاوش کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس زمانے کے اساتذہ اپنے طالب علموں کی تعلیم کے سلسلے میں کتنے سنجیدہ ہوتے تھے اس کا حال بھی اس کتاب میں مصنف کے مضمون بعنوان عرضِ حال میں ملتا ہے۔ طالب علم ہمیشہ سے چلبلے رہے ہیں اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی کے طالب علم۔ ان کی دلچسپ شرارتیں ذاکر علی خان صاحب کی کتاب علی گڑھ کی روایات میں پڑھ ڈالئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی یوں بھی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھی۔ اس مادرِ علمی میں تعلیم دینے والوں اور تعلیم پانے والوں کا رکھ رکھاؤ آج بھی قابلِ تحسین ہے۔ اسی ضمن میں سید ولی حیدر نے اپنے تعارف میں لکھا ہے کہ کس طرح انہوں نے 1944ء میں بی ایس سی کرنے کے بعد ایل ایل بی میں داخلہ لیا۔ ایم۔ اے کے مقالہ کے لیے "خطوط نویسی کی تاریخ" کا عنوان منتخب کیا تھا مگر ان کے استادِ محترم پروفیسر رشید احمد صدیقی نے فرمایا کہ "موضوع اچھا ہے، لیکن کسی شخصیت کے خطوط کے حوالے بھی شامل کرلو۔ انہوں نے مودبانہ غالب، مہدی اور دوسرے مشاہیر کے اسماء گرامی گنوائے کہ ان پر کافی مواد موجود تھا۔ ارشاد ہوا "ان سب کے متعلق بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، تم اقبال کو لے لو۔ یہ خاصے پریشان ہوئے۔ عرض کیا "میں سائنس کا طالب علم رہا ہوں، اقبال کو کہاں سمجھ سکوں گا۔" حکم ہوا "نہیں، بس یہی ٹھیک ہے۔ میں ابواللیث کو کہہ دوں گا، وہ تمہاری راہنمائی کرتے رہیں گے۔" چنانچہ انہوں نے اپنا ایم۔ اے کا مقالہ بہر حال خاصی تگ ودو کے بعد تیار کر ہی لیا۔ سید ولی حیدر بتا رہے تھے۔ ان دنوں تقسیم ہند کی تحریک زور و شور پر تھی۔ آئے دن ہنگامے ہو رہے تھے۔ قتل و غارت، کشت و خون کا بازار گرم تھا۔ یونیورسٹی چھوڑنی پڑی۔ اس کے ساتھ ہی کمرہ 60 ایس۔ ایس ویسٹ چھوٹا، اساتذہ چھوٹے، دوست احباب چھوٹے، وہ ہمیشہ یاد آنے والی صحبتیں چھوٹیں، وہ کبھی نہ بھولنے والے شب و روز چھوٹے، علی گڑھ چھوٹ گیا۔ میں اپنے گھر واپس چلا گیا۔ چند ماہ بعد وہ سرزمین بھی چھوٹ گئی جہاں ہمارے آباواجداد آٹھ نو سو سال سے آباد تھے۔

کراچی میں ہمارے ایک ہم جماعت صاحبزادہ تجمل علی خان، ایم۔ اے، ایل۔ ایل بی (علیگ) 1955ء میں ایک ماہنامہ "نوائے کراچی" نکالا۔ اس میں انہوں نے اپنا اور میرا مقالہ قسط وار شائع کیا لیکن رسالہ بند ہو گیا اور یہ سلسلہ بھی۔ ہم سب زندگی کی تگ و دو میں ایسے الجھے کہ بہت سے خواب ادھورے رہ گئے۔

تاریخ پیدائش کا ذکر چلا تو انہوں نے بتایا کہ دستاویزات کے مطابق 1923ء کی پہلی جنوری

تھی، وقت ڈھائی بجے شب، مقامِ پیدائش ہے ہندوستان کے صوبہ بہار کا صدر مقام پٹنہ، ایک تاریخی قدیم شہر جو پاٹلی پتر سے پٹنہ، پٹنہ سے عظیم آباد اور پھر پٹنہ بن گیا۔ اسی شہر کے پرانے علاقہ پٹنی سٹی میں میرے نانا کا مکان کشمیری کوٹھی ہے جہاں میں پیدا ہوا۔ میرے والد سید علی حیدر عرف صدیق عالم مرحوم نے میرا نام سید ولی حیدر عرف محمد رکھا۔ سید ولی حیدر کو قلمی نام اور حیدر کو تخلص کہہ لیجئے۔ ویسے میرے کلام میں تخلص خال خال ہی ملے گا۔

میرے بچپن کے ساتھ آٹھ سال کشمیری کوٹھی میں گزرے۔ پھر میرے والد اور ان کے بڑے بھائی سید نور حیدر عرف محبوب عالم مرحوم اپنے خاندان کے ساتھ صوبہ بہار کے ضلع گیا، سب ڈویژن جہان آباد (اب ضلع جہان آباد) کے مضافات میں واقع ایک بستی پنجورہ چلے آئے جو میرے دادا کے گھرانے کا مرکز ہے، یہیں میرے والد، چچا اور دوسرے بزرگوں کی زندگی گزری۔ تقریباً نو سو سال قبل میرے جدِ اعلیٰ سیدنا علی حمزہؒ اپنے خاندان کے ساتھ مدینہ منورہ سے ہجرت کر کے بغداد آ گئے تھے۔ ان کا وہیں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہیں۔ اس کے بعد ان کے صاحبزادے سیدنا عمرؒ خاندان کے باقی ماندہ افراد کے ساتھ خراسان چلے گئے، چند سال وہاں قیام کے بعد انہوں نے ہندوستان کا رخ کیا اور پنجورہ میں آباد ہوئے۔ یہیں ان کی اور ان کے آل اولاد کی قبریں ہیں۔ اس خاندان کی شاخیں بہار کے دوسرے علاقوں میں بھی پھیل گئیں۔ 1947ء میں تقسیم ہند کے وقت ہمارے بزرگوں نے پھر مغرب کا رُخ کیا اور کراچی پاکستان میں آ بسے، ہمارا خاندان یہیں آباد ہے۔ کچھ نوجوانوں نے برطانیہ اور امریکہ میں بھی رہائش اختیار کی اور وہاں خوش ہیں۔

میری ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، پھر ہم پٹنہ چلے گئے جہاں ایک سال اسکول میں گزرا، پٹنہ یونیورسٹی سے میٹرک اور آئی۔ ایس۔ سی کیا۔ 1941ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ایس۔ ایس۔ ویسٹ میں قیام رہا۔ وہاں سے بی۔ ایس۔ سی اور 1946ء میں اردو میں ایم۔ اے کیا۔ قانون کے آخری سال کا طالب علم تھا کہ تقسیم ہند کے وقت اُسی سال علی گڑھ چھوڑنا پڑا۔ ان ہی دنوں میری شادی میری چچازاد بہن سے ہوئی جن کے بطن سے میرے دو بیٹے سید علی حیدر اور سید حسنین حیدر اور دو بیٹیاں فرحت پرویز اور رفعت حیدر ہیں۔ علی، حسنین اور فرحت شادی شدہ اور صاحبِ اولاد ہیں۔

کراچی میں کاروبار شروع کیا۔ ملازمت کرنے کا کبھی ارادہ نہ تھا لیکن 1950ء میں آنکھ کے آپریشن کے لیے لندن گیا جہاں ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق کوئی دو سال رکنا پڑا۔ وہاں قیام کے آخر چھ ماہ میں نے پاکستان ہائی کمیشن میں ملازمت کی یہ تجربہ کرنے کے لیے کہ پڑھنے لکھنے سے آنکھ پر کیا اثر ہوتا ہے۔ تجربہ کامیاب رہا، میں کراچی واپس آکر پھر اپنے کاروبار میں مشغول ہو گیا۔ آباواجداد نے کبھی کاروبار نہیں کیا تھا۔ میں بازاروں میں بیٹھا لیکن بازاری نہ بن سکا۔ اس کے باوجود اپنی زندگی کے بتیس سال برباد کرنے کے بعد 1980ء میں اسے بند کر دیا۔

سید ولی حیدر کے سامنے سوالنامہ تھا اور وہ ترتیب وار جواب دے رہے تھے۔ سوال نمبر 3 کے جواب میں کہنے لگے۔ علی گڑھ چھوٹا، گھر بار چھوٹا، عزیز و اقارب چھوٹے، دوست احباب چھوٹے، کتابیں چھوٹیں، شیرازہ بکھر گیا۔ کراچی میں زندگی کے گرداب میں پھنس گیا۔ ماحول بدل گیا۔ حالات بدل گئے پڑھنے لکھنے کا سلسلہ جاری، نہ رہ سکا۔ یوں بھی ارادتاً نہیں لکھتا ہوں۔ میرے یہاں آورد نہیں ہے۔ آمد ہوتی ہے تو اپنے خیالات اور جذبات کو قلمبند کر لیتا ہوں۔ زیادہ تر آزاد نظمیں، کچھ ٹوٹے پھوٹے اشعار، کچھ نثر کے چھوٹے بڑے ٹکڑے، اردو، انگریزی اور بقدر ذرہ فارسی میں، وقت تاریخ اور جگہ کے تعین کے ساتھ۔ یہ سلسلہ 1938ء سے جاری ہے۔ میرے ایک دوست اشتیاق ہاشمی نے ایک اخبار "فارم بزنس" کے نام سے جاری کیا۔ اس کا تعلق کاشتکاری اور باغبانی سے تھا لیکن انہیں ادب سے بھی دلچسپی تھی اس لیے میری آزاد نظمیں اپنے اخبار میں شائع کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد یہ سلسلہ بھی ترک ہو گیا۔ چند احباب کچھ واقف تھے ان کی ہمت افزائی سے 1954ء میں ان بکھرے ہوئے اوراق کو جمع کرنا شروع کیا، نئے خیالات کو بھی قلمبند کرتا رہا، نتیجہ پانچ کتابوں کی شکل میں رونما ہوا جو درج ذیل ہیں۔

1۔ "اقبال اپنے خطوط میں" یہ ایک مقالہ ہے جو میں نے 46-1945ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اردو میں ایم۔ اے فائنل امتحان کے لیے لکھا تھا۔

2۔ "آباد ویرانے" یہ 1938ء سے 1995ء تک ستاون سال پر محیط میرے شاعرانہ افکار کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس میں آزاد نظمیں بھی ہیں، اشعار بھی، نثری عبارتیں بھی۔

3۔ "بجھے دیے" یہ 1995ء سے 1997ء تک میری آزاد نظموں اور نثری تحریروں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس میں رنج و الم کے خیالات کی زیادہ عکاسی ہے۔

4۔ "جلتے دیپ" یہ بھی 1995ء سے 1997ء تک میری آزاد نظموں اور اشعار کا تیسرا مجموعہ ہے جس میں مسرت و شادمانی کے جذبات موجزن ہیں۔

5۔ "!Heavens And Beyond" انگریزی زبان میں میری پانچویں کتاب کیا کتابچہ ہے۔ اس میں بھی 1938ء سے 1996ء تک میرے خطوط اور دوسری تحریروں کے اقتباسات شامل ہیں۔ ان کا رنگ بھی شاعرانہ اور فلسفیانہ ہے۔ اس کتاب کا خاکہ اور سرورق بھی ہم نے خود بنایا اور اسے خود ہی شائع کیا ہے۔

زندگی بذاتِ خود واقعات کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جن سے آدمی کوئی اثر نہیں لیتا، کچھ ایسے جن کا اثر اس کی ذات تک محدود رہتا ہے اور رہنا چاہیے، کچھ ایسے جو آدمی کی زندگی کی زندگی بدل دیتے ہیں، کچھ ایسے جو نہ صرف فرد کے لیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی قابلِ توجہ ہیں ایک ایسا ہی واقعہ بیان کرتا ہوں جو میں سمجھتا ہوں سب کی دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے اس میں اُس معاشرے، تہذیب، خلوص، محبت، اور اُن اقدار کی جھلک ملتی ہے جو اب ہم میں کم ہوتا جا رہا ہے۔

غالباً 1943ء کی بات ہے میں اپنے چھوٹے بھائی سید سجاد حیدر عرف احمد کے ساتھ گرمی کی چھٹیوں میں علی گڑھ سے پٹنہ آیا۔ اُن دنوں دوسری عالمی جنگ کا زمانہ تھا۔ میرے ماموں زاد بھائی ملٹری اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ میں کام کرتے تھے۔ ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر گیا، معلوم ہوا وہ دفتر سے واپس نہیں آئے ہیں۔ وہ ہمارے یہاں آئے تو ہم گھر پر موجود نہیں۔ طے یہ کیا کہ اگلی صبح اُن کے دفتر جا کر اُن سے ملا جائے۔ ہم دونوں بھائی وہاں پہنچے۔ میں پتلون اور قمیص میں ملبوس، احمد شروانی پہنے ہوئے۔ علی گڑھ کی پہچان علی گڑھ کا بلّا تھا اور شروانی کے کالر پر علی گڑھ کا بیج۔ استقبالیہ کے کارندہ سے مدعا بیان کیا، بھائی کا نام بتایا، اُس نے کہا یہاں اس نام کے دو آدمی ہیں آپ شعبہ بتائیں۔ شعبہ ہمیں معلوم نہ تھا لہٰذا طے یہ کیا کہ شعبہ معلوم کرنے کے بعد آیا جائے۔ لوٹنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ ایک صاحب کمرے سے باہر آئے۔ اتنی مدت گزارنے کے بعد افسوس ہے ان کا نام ذہن کے کسی ایسے گوشے میں گم ہے اس لیے اب میں انہیں ہمارے محسن ہی کہتا ہوں۔ ہمیں دیکھا، پاس آئے، سلام علیک کے بعد دریافت کیا کیا کام ہے؟ ہم نے اپنا مدعا دہرا لیا۔ انہوں نے ایک چپراسی سے کہا فلاں صاحب کو بلا کر لے آؤ، دوسرے چپراسی سے کچھ کہا وہ کہیں اور چلا گیا۔ چشم زدن میں میرے بھائی آ گئے۔ ہم تینوں وہیں کھڑے باتیں کرنے لگے کہ ہمارے محسن نے کہا آپ میرے ساتھ آئیں، میں یہیں کام کرتا ہوں، مجھے یہیں ایک کمرہ ملا ہوا ہے وہیں بیٹھ کر باتیں کریں۔ ہمارے تذبذب کو سمجھتے ہوئے انہوں نے کہا آپ تکلف نہ کریں۔ ہم سب ان کے ساتھ ہو لئے، دو قدم پر ان کا کمرہ تھا، وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ پر تکلف ناشتے کا انتظام ہے۔ ہم نے عرض کیا اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی، جواب ملا یہ اس بلے اور بیج کا کرشمہ ہے جو آپ کی ہیٹ اور شروانی کے کالر پر لگا ہوا ہے۔ پھر موصوف نے بتایا کہ وہ بھی علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ہیں۔ تعلیم سے فراغت کے بعد سرکاری ملازمت ملی، پٹنہ میں تقرر ہوا، وہ یہاں کسی کو جانتے نہیں تھے لیکن انہیں یہ معلوم تھا کہ پٹنہ میں علی گڑھ کے بہت سے "اولڈ بوائز" ہیں جو عمر کے لحاظ سے بھی اب بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کا پتہ لگایا، ان کے حالات اور معمولات معلوم کیے، سب سے معمر بزرگ کو چنا جنہوں نے غالباً سر سید کے زمانہ میں وہاں تعلیم پائی تھی۔ عام روش کے مطابق وہ دن کا کھانا کھانے کے بعد قیلولہ کرتے تھے۔ شدید گرمی کے دن تھے، ہمارے محسن عین دوپہر میں جب ان بزرگ کے آرام کا وقت تھا وہاں پہنچے بیڈ روم کے باہر دربان بیٹھا تھا اس سے کہا صاحب سے ملنا ہے۔ اُس نے جواب جواب دیا "ابھی وہ آرام کر رہے ہیں آپ شام پانچ بجے آئیں۔" ان حضرت نے بلند آواز سے کہا "میں علی گڑھ سے آیا ہوں اور ابھی ملنا چاہتا ہوں۔" اتنا سننا تھا کہ بزرگ محترم نے آواز دی۔ "ٹھہرو" اور ننگے سر ننگے پاؤں کمرے سے باہر آ کر سلام کیا، گلے سے لگا لیا، پوچھا خیریت ہے، کیا کام ہے؟ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ یہ بے حد نادم ہوئے کہ ناحق تکلیف دی۔ کہا کہ بے ادبی اور گستاخی معاف میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آپ کے زمانہ

کے علی گڑھ کے طلبا کا کیا رویہ ہوتا تھا اور ہوتا ہے۔ پھر کہاں کا آرام اور کہاں کا سونا۔ ڈرائنگ روم میں نشست جمی، پرانی باتیں دہرائی گئیں، پرانے لوگوں کو پوچھا، نئے ماحول کو دریافت کیا، غرض شام کی چائے کے بعد یہ وعدے لے کر رخصت کیا کہ اُن کے یہاں کھانا کھاؤں جب بھی جس وقت کوئی کام ہو بلا تکلف ان کے پاس یہ تھی وہ محبت، اخوت اور روایت جو معاشرہ سے کم ہوتی جارہی ہے۔ انہیں جاری رکھنے سے بہت سی خرابیاں دور کی جاسکتی ہیں۔

بدلتے ہوئے حالات اور معاشرے کا زبان پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ دنیا کی کوئی ایسی زبان نہیں جو تغیرات سے دوچار نہ ہوئی ہو۔ اردو کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ دکنی انداز بدلا، اردوئے معلیٰ کا دور گیا، لکھنؤ اور دلّی کی چھیڑ چھاڑ چلی، انگریزی نے رنگ جمایا، عربی اور فارسی کے اثرات کم ہوتے گئے۔ یقیناً یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ حسن نظامی کی "گلابی اردو" کی خوشبو غالب کی شگفتہ بیانی کے گل بوٹے، مہدی آفادی کی متبسم شوخی، محمد علی جوہر کی پر اثر تحریروں کا انداز کم بلکہ بہت کم نظر آتا ہے لیکن امید افزا صورت حال یہ ہے کہ بدلتے ہوئے رنگ کے ساتھ اردو جاری و ساری ہے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے، بولیاں بھی موجود ہیں، دونوں میں فرق بھی آتا گیا ہے لیکن جب تک روایات باقی ہیں، ادبی دلچسپیاں باقی ہیں، زبان باقی ہے زبان کا حسن باقی ہے۔ مجھے امید اور یقین ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ اردو زبان کو نہ صرف زندہ رکھے گا بلکہ حسن بیان، شگفتگی، دل آویزی سے بھی اسے سنوارتا رہے گا جو اعلیٰ ادب کا معیار ہیں۔ یہ خوبیاں اور دوسری صفات عظیم شعراء اور ادیبوں کے کلام اور تصنیفات میں ملتی ہیں۔ عوام بھی اسے مرنے نہیں دیں گے کہ یہ روزمرہ کی بات ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ سائنسی اور دیگر اہم اصطلاحات کو اپنایا جائے۔ یہ لازم نہیں ہے کہ ان کی جگہ کوئی متبادل لفظ ہی ڈھونڈا جائے بلکہ دوسری زبانوں کے عام رائج الفاظ کو اردو میں ضم کیا جائے تاکہ ترقی کی دوڑ میں ہم پیچھے نہ رہ جائیں اور زبان میں مناسب اور مفید اضافوں ہوتا رہے۔ ایسا کرنا کوئی نئی بات نہ ہوگی۔ اردو میں عربی، فارسی، اور دوسری زبانوں کے الفاظ بہ کثرت موجود ہیں کہ اردو ان سب سے مل کر بنی ہے۔ انگریزی زبان کو دیکھیں۔ اس میں بھی عربی، فارسی اور دوسری زبانوں کے الفاظ اس طرح ضم ہیں کہ بادی النظر میں پتہ نہیں چلتا۔

شاعری کی مختلف اصناف کو ان کی مخصوص صفات کے ساتھ جاری رکھنا چاہئے کہ یہی ان کی پہچان اور ان ہی سے شاعری میں جان ہے۔ یہ شاعری کا عظیم سرمایہ ہیں۔ ان میں ردوبدل کرنا ناقابل معافی جرم ہوگا۔

یوں تو ہر صنف کا اپنا اپنا حسن، اپنا اپنا دل فریب انداز ہے لیکن ہر دور میں غزل کو فوقیت حاصل رہی ہے۔ شعراء نے ہر زمانے میں زیادہ تر غزل ہی کو اظہارِ خیال کے لیے اپنایا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاعر کو اپنے مزاج کے مطابق اُس صنف کو اپنانا چاہئے جس کے ذریعہ وہ اپنے خیالات کا بہتر سے بہتر اظہار کر سکیں۔۔ دوسروں کی ریس میں اپنی روش نہیں چھوڑنا چاہئے۔

جہاں تک مشاعروں اور تخلیقی نشستوں کا تعلق ہے میرے خیال میں ادب کی تخلیق کے لیے دونوں ضروری ہیں۔ مشاعرے اس لیے کہ ان کے ذریعہ زبان عوام تک پہنچتی ہے، ان کے ذوق کی اصلاح ہوتی ہے اور ادب سی ان کا ایک تعلق قائم رہتا ہے۔ تخلیقی نشستیں ارباب علم و فنِ ادب کا ستون ہیں، آپس میں مل بیٹھ کر ادب کو خوب سے خوب تر بنانا ان کا فرض ہے۔ تخلیق مخصوص مزاج رکھنے والے اصحاب کرتے ہیں یہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ ہر شخص ادیب یا شاعر نہیں ہو سکتا۔ کسی بھی فن کو لے لیں ہر شخص فنکار نہیں ہوتا لیکن فنکار کی تخلیق سے اثر ضرور قبول کرتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ الیکٹرونک میڈیا کی وجہ سے کتابوں کا مطالعہ کم ہو گیا ہے، ان کی مانگ بھی کم ہو گئی ہے لہٰذا ان کی اشاعت میں بھی کچھ نہ کچھ کمی واقع ہوئی ہے۔ لیکن علم کی تبلیغ میں بے حد آسانیاں پیدا ہوئی ہیں، علم کے پھیلاؤ میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ پل کے پل میں قاری مطلوبہ معلومات اسی الیکٹرونک میڈیا کے ذریعہ حاصل کر سکتا ہے۔ ہمیں اس سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ پرنٹڈ میڈیا کے بغیر الیکٹرونک میڈیا نہ بن سکتا ہے نہ قائم رہ سکتا ہے۔ مشین وہی پیش کرتی ہے جو انسان اس کے ذخائر میں جمع کرتا ہے۔ انسان فعال اور خالق ہے۔ مشین انسان کی طرح فعال اور خالق نہیں۔ کتابوں اور رسائل کی طباعت اور اشاعت کا کام جاری رکھنا چاہئے اور انہیں الیکٹرونک میڈیا کے ذریعہ بھی محفوظ کر لینا چاہئے۔

وصال و فراق

یہ ساری باتیں یہ سارے قصے
تمہارے دم سے ہمارے دم تک
رہی ہیں باقی، رہیں گے زندہ،
یہ تخلیق ہیں سب ازل کی
یہ تعبیر ہیں سب ابد کی،
محبت کے لمحوں کو طول دے کر
جدائی کی صدیاں گھٹا کے رکھ دوں

لگا کے گلے سے قربتوں کو
عذاب فرقت سے نجات پاؤں
ہزار چاہا تھا ایسا کرنا
مقدروں کے نشان لیکن
انمٹ تھے ایسے
نہ مٹ سکے وہ
نہ مٹا سکے ہم
بچھڑ گئے ہم!

SYED WALI HYDER
102/II 8TH STREET
OFF KHAYABAN-E-RAHAT D.H.A. KARACHI 75500 (PAKISTAN)

مجھے بھی سوچنا پڑتا ہے میرا اک دشمن
میں دور رہ کے بھی دشمن کے گھر میں رہتا ہوں

لاس اینجلس خالد خواجہ

خالد خواجہ

لاس اینجلس امریکا

میں نے "سخن ور اوّل" کا سلسلہ شروع ہی اسی لیے کیا تھا کہ شعر کہنے والوں کی شخصیت کا مطالعہ قریب سے کر سکوں۔ بہت سے افراد میں مماثلت پائی اور کئی منفرد بھی ملے۔ ویسے شاعرانہ بے نیازی تو مشہور ہے اور شعراء و ادبا کی نازک مزاجی کا تو جواب نہیں۔ گو یہ میر تقی میر کا زمانہ نہیں مگر اس دور میں بھی کچھ ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو میر تقی میر کی گرد کو بھی نہیں پہنچ پاتے مگر مزاج میں رعونت ایسی کہ آپ انہیں میر تقی میر تسلیم کریں یا نہ کریں وہ بضد ہیں کہ آپ سے منوا کر رہیں گے۔

مگر ایک شخص اس بھیڑ میں ایسا بھی ہے جو میر کی سی بانی رکھتا ہے، میر کی سی نازک مزاجی بھی رکھتا ہے مگر اس کے لہجے میں رعونت نہیں، تکبر نہیں بلکہ خواجہ میر درد کی سی فقیری ہے، درویشی ہے اور قلندری بھی۔ شاعری کے لہجے میں میر اور درد، دونوں کی جھلک ہے۔ یہی جھلک اس کے مزاج میں بھی ہے۔ اس کے رہن سہن میں بھی اور اس کے سلوک میں بھی ہے۔

آپ اُسے پہلی نظر میں، پہلی ملاقات میں ہی پہچان جائیں گے۔ ہاں اگر آپ اُس کو جاننا چاہیں۔ پہچاننا چاہیں ورنہ وہ آپ کو ایبٹ آباد کے پٹھانوی انداز میں بھی مل سکتا ہے۔ وہ بھی میر کی

طرح حالات کا شکار ہے۔ سر خم کر کے سلام کرنا اُسے پسند نہیں۔ سر اُٹھا کر برابری کے درجے سے دوستی کرنا اُسے پسند ہے۔ ایسے لوگوں کو ملازمتیں کہاں راس آتی ہیں اور وہ اگر جبراً اس لاتے ہیں تو ان کی روح کا پور پور زخمی ہونے لگتا ہے۔ وہ تو پیدا ہوئے ہیں صرف حرف کی صورت گری کے لیے مگر زمانے کا ستم ہے کہ حرف کے صورت گروں سے ان کا قلم پرے رکھوا کر ان سے ناآشنائے مزاج کام لیے جاتے ہیں۔ مگر یہ بھی اسی شخص کا وصف ہے کہ شاعری کو بھی اس نے طریقِ حیات بنا کر ہنر مندی سے روزمرہ کے ساتھ ہم آہنگ کر لیا ہے۔ چاہے صورتِ حال یہ ہو کہ

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

اور غمِ دل لاکھ نکتہ چیں ہو، بہر حال غالب کو زندگی کرنا ہے۔ سو آج کا غالب زندگی بھی کر رہا ہے اور شعر بھی کہہ رہا ہے۔

میں حرف حرف جس کی تصویر کے نقش ابھار رہی ہوں وہ خالد خواجہ ہے۔ خالد جو نثر بھی بہت خوب لکھتا ہے اور شعر کہہ کر اِدھر اُدھر رکھ کر بھول بھی جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک اس کے دل نشیں کلام کا مجموعہ نہیں آسکا۔ (مگر اب آنے کو ہے)

میرے سوالنامے کے ذریعے اس سے کچھ گفتگو ہوئی ہے۔ خالد لکھتے ہیں:

"سلطانہ مہر کا میں بہت احترام کرتا ہوں مگر ان کا احترام بھی میرے مسلسل تساہل کو کئی سالوں سے بدلنے میں بری طرح ناکام رہا ہے۔ میں "سخن ور" کی سابقہ دو جلدوں سے غیر حاضر ہوں۔ وجہ صرف اور صرف میری خاندانی اور ذاتی سستی اور کاہلی ہے۔

جہاں تک ابلاغ کا مسئلہ ہے تو خواتین و حضرات سارا شاخسانہ ہی ابلاغ کا ہے۔ اگر مجھ سے کوئی کہے کہ وہ اپنے لیے اپنی ذات کے لیے افسانہ لکھتا ہے یا شعر کہتا ہے تو وہ جھوٹ کہتا ہے۔ ادب تو محبت کا پیغام ہے اور یہ جہاں تک پہنچے بہتر ہے۔ ترسیل اور ابلاغ کی تراکیب پاکستان کے ادبی پرچوں میں کئی دہائیوں سے بے تحاشہ استعمال کی گئی ہیں اور بے شمار ادیب اور شاعر اس سلسلے میں اظہارِ خیال فرما چکے ہیں۔ جی ہاں ابلاغ ادب کا ایک بہت ضروری حصہ ہے مگر اس کا مطلب وہ پی آر نہیں ہے جس میں کئی لوگ یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔

اردو کا مستقبل بہت روشن ہے۔ میں پٹھان ہوں اردو زبان کا والہ و شیدا ہوں اسی طرح فی الوقت پنجاب اور سرحد میں جو ادب تخلیق کیا جارہا ہے۔ وہ ادب زبان کے سفر میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو ایک میٹھی اور طرح دار زبان ہے مگر جو لوگ مغرب میں رہتے ہیں انہیں اس بات کا خیال رکھنا پڑے گا کہ ہماری آنے والی نسلیں اس زبان کی اہمیت کو ہماری ثقافتی بقا کا ایک حصہ جانیں۔

جب تک ظفر رضوی، عرفان مرتضیٰ، سلطانہ مہر، فضل الضیاء سحرؔ، نیر آپا (نیر جہاں) افتخار نسیم، فاروق طراز، نسیم سید، نزہت صدیقی، فیاض الدین اور نور جہاں نوری جیسے لوگ مغرب میں

ادب تخلیق کرتے رہیں گے اردو کا مستقبل محفوظ اور روشن رہے گا۔

جہاں تک اہم ادبی اقدامات کا تعلق ہے۔ ایک فلم ہے واقعات کی جو ذہن میں چلنے لگتی ہے جب بھی تنہائی میسر آئے۔ خاص طور پر دو چہرے یاد آتے ہیں دو نام، دو عہد، دو شاعر، دو حق گو انسان یاد آتے ہیں۔ احمد فراز اور حبیب جالب۔ دونوں کے ساتھ جو وحشیانہ اور غیر انسانی سلوک ضیاء الحق کے شرمناک دور میں روا رکھا گیا تھا میں اس کا عینی گواہ ہوں۔ جس معاشرے میں دو عہد ساز قلم کاروں کے ساتھ علی الاعلان وحشیانہ سلوک کیا جائے اس معاشرے کا خدا حافظ ہے۔ میرا سلطانہ مہر سے وعدہ ہے کہ الگ سے اس دور کی زیادتیوں پر قلم اٹھاؤں گا۔"

(خالد مجھے نہیں امید کہ تم اپنا وعدہ نبھاؤ گے)

یہاں میں خالد کی شریک حیات رخسانہ خالد جسے سب پیار سے روزی کہتے ہیں اس کی خالد سے شدید محبت کا ذکر نہ کروں تو ناانصافی ہوگی۔ روزی، خالد کی بکھری شاعری کے پرزے چنتی ہے۔ انہیں سینت سینت کر رکھتی ہے۔ اپنے اور خالد کے بیٹے بلال کے اسکول سے لے کر گھر تک کی دلچسپیوں میں خود بھی شریک رہتی ہے اور خالد کو بھی شریک رکھتی ہے۔ سو آج خالد کے پاس چند غزلیں اور چند بکھرے اشعار محفوظ ہیں۔ انہی میں سے چند اشعار اور ایک غزل میں سخن ور کے قارئین کے لیے چن لائی ہوں۔ ملاحظہ ہو

تو میرے پاؤں میں زنجیر بنا پھرتا ہے
تو مرا ساتھ نہ دیتا تو بھلائی کرتا

اپنی حد سے کبھی گزر دیکھو
گھر سے نکلو ادھر اُدھر دیکھو

کتنے برسوں سے بندھا بیٹھا ہوں اس کھڑکی سے
میرے حصہ میں فقط ایک نظارہ آیا

اس غزل کے چند اشعار خالد کے جذبات کے حقیقی ترجمان ہیں۔

شہر میں رہ کے بھی حق بات ہی کہنے والا
میرے اندر ہے کوئی گاؤں کا رہنے والا

داستاں گو سے کہو پہلے رُلانا سیکھے
یوں ہی آنکھوں کا سمندر نہیں بہنے والا

دھیان مجرم کی طرف بعد میں جائے گا مگر
قتل ہو جائے گا یہ وقعہ کہنے والا

منکشف ہوگی حقیقت کبھی تجھ پر آخر
ترا دشمن ہے ترے ظلم کو سہنے والا

سہرا اترا تو اڑا لے گئے سر کو ڈاکو
کٹ گیا ہاتھ بھی کل رات دہ گہنے والا

آخری سوال کا جواب خالد نے لکھا ہے۔

"تنقید کا جہاں تک تعلق ہے یہ عرض کردوں کہ یہ مسئلہ خاصا گھمبیر ہے۔ تنقید کبھی بھی کلیتاً غیر جانبدارانہ نہیں رہی ورنہ آزاد، اپنے استاد ذوق کے مقابلے میں غالب جیسے شاعر کو تقریباً نظر انداز نہ کرجاتے۔ آپ کو میر تقی میر کا تذکرۃ الشعراء بھی یاد ہوگا جس میں ان کے خیال میں اس وقت (میر کے وقت) صرف ڈھائی شاعر تھے۔ نقاد ہونے کے لیے نہ صرف وسیع مطالعہ، علمی پس منظر، شعر اور نثر سے یکساں رغبت اور خاص طور پر زمانہ ناشناس اور دلیر رویے رکھنے والی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ صفات ایک انسان میں بہت کم میسر آسکتی ہیں اور پھر گروہی سیاست اور سیاسی جھکاؤ بھی جانبداری کی طرف مائل کرنے والے عناصر ایماندارانہ تنقید کے راستے کے پتھر ہیں۔ میرے خیال میں فی الوقت ہندوستان میں تنقید کے نام پہ کچھ نہ کچھ کام ہو رہا ہے۔ پاکستان میں تنقید بھی ہر دوسرے شعبۂ زندگی کی طرح ابتری اور بے راہ روی اور جانبداری کا شکار ہے۔"

Khalid Khuwaja
6651 Western
BUENA PARK
CA 90621 U.S.A

انتخابِ کلام

محسن نقوی کے قاتلوں سے

خالد خواجہ

اب تو خوش ہو؟
موت کے سوداگرو!
رہزنو، امن وسکوں کے قاتلو
اب یوں کرو
یوں کرو، سب آئینوں کو توڑ دو
اور ساری کرچیاں یکجا کرو
اور پھر یہ کرچیاں
ان جاگتی آنکھوں میں جا کر جھونک دو
جن کو نسبت ہے کتاب و حرف سے
ظالمو، خنجر بدستو
یوں کرو
نطق ولب کے سارے رشتے کاٹ دو
یوں کرو، جن انگلیوں میں ہو قلم

ایسی ساری انگلیاں کر دو قلم
اور پھر اس لاش کو
اس زندگی کی لاش کو
موت کا پرچم بنا کر
علم ودانش کے گلی کوچوں میں
لہراتے پھرو
دندناتے، ناچتے، گاتے پھرو
اور جب یہ کر چکو
پھر یوں کرو
اپنے ملبوسات کے ہر تار کو
نوچ کر جسموں سے اپنے
پھینک دو
اپنے عقیدوں کو سروں تک اوڑھ لو

لوحِ جاں پہ شخصیات کی مائل نہیں ہوئے
ہم تو خدا کے رب کے بھی قائل نہیں ہوئے

خالد یوسف
آکسفورڈ ۱۲ فروری ۱۹۹۹ء

خالد یوسف

آکسفورڈ برطانیہ

میرے محترم بھائی مقصود الٰہی شیخ نے جب اپنے ہفتہ وار جریدے "راوی" میں "سخن ور چہارم" اور "گفتنی" کی اشاعت کی خبر شائع کی تو بہت سے بچھڑے لوگوں سے نصف ملاقات کی تجدید ہوئی۔ ان میں آکسفورڈ برطانیہ میں رہنے والے خالد یوسف بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے خط میں یاد دلایا کہ سندھ کی ایک ادبی نشست میں ان سے ملاقات ہوئی تھی اس کے بعد 75ء میں خالد یوسف بطور سفارت کار لندن آگئے تھے۔ ایک غزل سے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں

ذہنِ بشر کی زرخیزی پر یزداں کو بھی حیرت ہے
جو بھی صحیفہ بھیجا اس نے سو معنی ایجاد کیے
نام سنو تو سب شہزادے، راجہ سید مرزا خان
کام مگر ان شہزادوں نے سب ننگِ اجداد کیے

خالد یوسف کا کلام ایسا نہیں کہ بھلایا جا سکے۔ بلاشبہ بڑا ادب وہ ہوتا ہے جس کو قارئین سراہتے ہیں اور یاد رکھتے ہیں۔ خالد یوسف تعلقاتِ عامہ کے چکر میں بھی نہیں پڑتے۔ وہ گھر بیٹھ کر اپنی فکر کو اشعار کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ معاشرے کے مختلف رجحانات انہیں متاثر بھی کرتے

ہیں ان کا یہ شعر دیکھئے

گوتم، ٹیپو، غالب، حسرت، گاندھی، قائد، بوس، اقبال
رب نے کیسے دیس میں پیدا یہ نادر افراد کیے
خونِ جگر سے ہم نے کیا کیا پھول کھلائے صحرا میں
ہوس پرستوں، کم ظرفوں نے چن چن کر برباد کیے

25 دسمبر 1940ء کو خالد یوسف خان تلہر ضلع شاہجہاں پور، یوپی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ پاکستان ایئر فورس پبلک اسکول سرگودھا سے سینئر کیمبرج کیا۔ بی۔ اے گورنمنٹ کالج حیدر آباد (سندھ) سے اور انگریزی ادب میں ایم۔ اے سندھ یونیورسٹی سے اور ایل۔ ایل۔ بی سندھ لاکالج حیدر آباد (سندھ) سے کیا۔ 1961ء سے 1963ء تک سندھ یونیورسٹی سے بطورِ لکچرر وابستہ رہے۔ 1964ء میں مقابلے کا امتحان پاس کر کے پاکستان ٹیکسیشن سروس میں داخل ہوئے اور حیدر آباد، میرپور خاص، کراچی اور اسلام آباد میں انکم ٹیکس آفیسر اور اسسٹنٹ کمشنر ٹیکسز کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 1967ء سے 1982 کے دوران سفارت خانہ پاکستان لندن میں بطور سفارت کار خدمات انجام دیں۔ مختلف بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کی اور انٹرنیشنل گندم کونسل میں پاکستان کے مستقل مندوب رہے۔ 1986 سے 1992 کے دوران آکسفورڈ میں اردو کی تدریس کی۔ 1949ء میں پاکستان ہجرت کے بعد خالد یوسف نے حیدر آباد (سندھ) میں سکونت اختیار کی۔ طالب علم رہنما کی حیثیت سے جمہوری جدوجہد میں حصہ لیا اور ایوبی آمریت کے خلاف آواز بلند کی جس کی پاداش میں معتوب بھی ہوئے۔ کئی سال تک حیدر آباد کی ادبی تنظیم "انجمن" کے سکریٹری رہے جس کے تحت کئی عمدہ ادبی تقریبات منعقد ہوئیں۔

برطانیہ آمد پر برٹش اسٹرالاجیکل (نجوم) ایسوسی ایشن سے وابستگی اختیار کی۔ طبّی نجوم میں ان تحقیقی مقالہ شائع بھی ہوا۔ لندن اور آکسفورڈ میں نجوم کی تدریس کی اور کئی نجوم کانفرنسوں میں شرکت کی اور اس نوعیت کی کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں برطانیہ کی نمائندگی کی۔ آکسفورڈ سے چار سال تک (88-1984ء) اردو کا پندرہ روزہ جریدہ 'جمہور' نکالا جس کے مدیرِ اعلیٰ رہے۔

خالد بتا رہے تھے اپنے والد محمد احمد خان مائل تلہری (مرحوم) سے اصلاح لی۔ ترقی پسند تحریک سے متاثر اور وابستہ رہے۔ ان کے تین شعری مجموعے 1۔ حسرتِ گفتار، 1971ء میں کراچی میں، 2۔ لبِ سحر 1987ء لندن میں، 3۔ زخمِ سفر 1997ء لندن میں منظر عام پر آچکے ہیں۔ چوتھا مجموعہ چاند ستارہ باتیں، زیرِ طباعت ہے اور رواں سال میں طلوع ہوگا۔ ان کی تخلیقات، نئی قدریں، اور بشارت (حیدر آباد)، ہم قلم، افکار، سیپ، منشور، سخنور (کراچی)، تخلیق (لاہور)، ابلاغ (نوشہرہ)، تلاش (دہلی)، انشاء (کلکتہ)، انشعاب (ملتان)، جنگ (لندن)، راوی (بریڈ فورڈ)، جمہور (آکسفورڈ) اور 'سفیرِ اردو، (لیوٹن) میں چھپتی رہتی ہیں۔

شاعری کے علاوہ نثر میں انہیں خاکہ نگاری سے دلچسپی ہے۔ کئی خاکے شائع ہو چکے ہیں اور اس ضمن میں ایک کتاب زیرِ ترتیب ہے۔ علم نجوم پر ان کے مضامین برٹش اسٹرالاجیکل ایسوسی ایشن اور اسٹرالاجیکل لاج لندن کے جرنلز اور 'جنگ' اور 'صدا' (لندن)، 'راوی' (بریڈفورڈ)، انڈین اسٹرالاجیکل میگزین (بنگلور) میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ سالانہ پیشگوئیاں 'جنگ' (لندن) اور دی نیشن (لندن) میں شائع ہوتی ہیں۔

اپنی زندگی کا اہم واقعہ سناتے ہوئے انہوں نے کہا: ہمارے لڑکپن کے دور میں پٹارو کیڈٹ کالج کے ایک شفیق پروفیسر شیدا عظیم صاحب جب بھی حیدر آباد آتے تو ہم لوگوں سے ملنے آتے۔ ایک بار جب وہ ملنے آئے تو کچھ دیر گپ شپ کر کے چائے پی کر چلے گئے۔ اس وقت ہم نے دیکھا کہ ہماری میز پر ایک ڈبہ پڑا ہے۔ ہم نے کھولا تو از قسم حلوہ کوئی شے نظر آئی۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ ہمارے لیے لائے ہوں گے اور ہمیں کہنا بھول گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم بھائی بہنوں نے پورا ڈبہ صاف کر دیا۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم نے دروازہ کھولا تو باہر عظیم صاحب کھڑے تھے۔ "ارے بھئی وہ میں اپنی آنکھوں کی دوا کا ڈبہ غالباً تمہاری میز پر بھول گیا ہوں۔ ذرا اسے اٹھا لاؤ۔" وہ بولے۔ "آنکھوں کی دوا!" ہم نے حیرت سے کہا۔ "ہم نے تو حلوہ سمجھ کر صفاچٹ کر دیا۔" ہنسی بھی آئی اور شرمندگی بھی ہوئی۔

اردو کے مستقبل کے سلسلے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے خالد نے کہا:

دنیا کی تیسری بڑی زبان کی حیثیت سے اردو کا مستقبل تابناک ہے۔ اردو ہندوستانی حکمرانوں کے تعصب اور پاکستان کے سامراج نژاد اربابِ اقتدار کی سرد مہری اور نااہلی کے باوجود آج بھی نہ صرف برصغیر بلکہ دنیا بھر میں پھل پھول رہی ہے۔ ہاں اگر دنیا کے کسی ملک میں یہ عوام الناس کے معاشی مستقبل سے بھی وابستہ ہوتی تو اس کی ترقی کی رفتار کو پر لگ جائے۔

میں صنفِ سخن میں غزل کو پسند کرتا ہوں کیونکہ غزل کے اشعار ازبر ہو کر ضرب الامثال بن جانے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں اس لیے اردو شاعری کی منفرد صنف ہونے کی حیثیت سے اسے فوقیت حاصل ہے۔ غزل کا ہر شعر ایک مکمل نظم ہوتا ہے اور کوزے میں دریا بند کر لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ نثری نظم یا نثری غزل کو میں شاعری نہیں مانتا۔ اسے زیادہ سے زیادہ نثرِ لطیف کہا جا سکتا ہے۔ ادب کی تخلیق میں مشاعرے اور تخلیقی و تنقیدی نشستیں دونوں ہی مساوی اہمیت کی حامل ہیں۔

برقی میڈیا اپنی تمام تر ترقی کے باوجود سنجیدہ اور فکری ادب پر مبنی پرنٹڈ میڈیا کی جگہ نہیں لے سکتا۔ برصغیر میں شرح خواندگی اور پبلک لائبریریوں کا جال بچھا کر ہی کتابوں اور جرائد کی بقا کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔"

انہوں نے کہا موجودہ اردو ادب میں تنقید تو جاری ہے مگر افسوس کہ یہ تنقید بے لاگ غیر

جانبدارانہ اور بے لوث نہیں۔ ذاتی تعلقات کی نوعیت اور ذاتی دوستیاں اور مناقشات اس میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس مسئلے کا تعلق مجموعی طور پر من حیث القوم ہماری اخلاقی سطح سے ہے جس کا گراف گزشتہ پچاس سال میں ہولناک طور پر نیچے آیا ہے۔ بہت ممکن ہے اگلی صدی کے تغیرات کسی مثبت تحریک کے نتیجے میں ہمارے ادیبوں، شاعروں اور تنقید نگاروں میں دوبارہ انسانیت کی روح پھونک دیں۔

Khalid Yousuf
57 Masons Road.
Headington Oxford ox3 8QL U.K

غزل

تمام شہر ہے خدشات کے حصار میں گم
امیرِ شہر مگر اپنے اختیار میں گم
نمو ہو جوہرِ تخلیق کی تو کیسے ہو
حسد کی آگ میں ذہن اور دل غبار میں گم
وہ جس کے لوٹ کے آنے کی ابھی امید نہیں
دل و نظر ہیں ابھی تک اسی بہار میں گم
جہاں میں فصلِ تغیر ہے لیکن اہلِ وطن
ہنوز غربت و افلاس کے خمار میں گم
ہزار وعدہ شکن آزما چکے لیکن
فریب خوردہ عوام اب بھی اعتبار میں گم
سپاہِ کفر تو صف بندیوں میں ہے مصروف
مگر سدا کے نمازی ہیں خلفشار میں گم
قدم عدو کے ستاروں پہ ہیں مگر اب تک
جنابِ شیخ شریعت کے لالہ زار میں گم
تمام عمر کی چاہت کے بعد بھی خالد
وہ بزمِ غیر کی رونق، ہم انتظار میں گم

خاورؔ سے فقط چند ہی احباب ہیں واقف
خاموش طبع لوگوں کا چرچا نہیں ہوتا

۹/۸/۱۹۹

پروفیسر ڈاکٹر خورشید خاور امروہوی

کراچی

پروفیسر ڈاکٹر ابوالفہیم خورشید خاور امروہوی میرے بزرگ اور مربی ہیں۔ مجھے ان کا تذکرہ تو "سخن ور سوم" میں ہی کرنا چاہئے تھا پتہ نہیں مجھ سے یہ کوتاہی کیسے سرزد ہوئی جبکہ میں ان کے گھر منعقد ہونے والے مشاعرے میں بھی شریک تھی مگر اب اس "اگر مگر" سے کوئی فائدہ نہیں کیونکہ شرمندگی تو بہر حال ہے ہی۔

ڈاکٹر خورشید خاور کو بھلا کسی تعارف کی کیا ضرورت ہے۔ ان کا کلام خود ان کے تشخص اور فن کا مظہر ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا اعتراف ملاحظہ ہو:

"محترم پروفیسر ڈاکٹر ابوالفہیم خورشید حیدر صدیقی خاور امروہوی کے بارے میں میری یادوں کا سلسلہ پچاس برس پر محیط ہے۔ میری ابتدائی یادوں کے "خورشید بھائی" بھی اتنے ہی کرم فرما اور مشفق ہیں جتنا کہ آج کے پروفیسر ڈاکٹر خورشید خاور امروہوی ہیں۔ انہوں نے مجھے اور میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا ہے اور بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے انتھک جدوجہد اور مثالی یکسوئی کے ساتھ تعلیم و تعلم کے سلسلہ کو بڑی سنجیدگی اور وقار کے ساتھ جاری و ساری رکھا ہے۔ آج وہ دو مضامین (اردو اور اسلامی تاریخ) میں ایم اے ہیں اور اردو ادب کے پی ایچ ڈی

(Ph.D) ہیں۔

اب تک ان کی دس تصانیف شائع ہو چکی ہیں اور اس سال استقلال پاکستان کی طلائی جوبلی کے اہم موقع پر وہ بیک وقت بارہ تصنیفات شائع کرنے کا اعزاز حاصل کر رہے ہیں۔ میری یادداشت میں بھی اتک کسی مصنف نے اپنی پچھترویں سالگرہ کے موقع پر قلدئین ادب کو بیک وقت اپنی اتنی مصنفہ کتابوں کا تحفہ نہیں پیش کیا۔

یہ بائیس کتابیں علم وادب کے مختلف شعبہ جات سے متعلق ہیں۔ علم وادب سے لگاؤ رکھنے والے ان کتابوں کے متنوع ناموں (Titels) سے ہی اندازہ لگا سکیں گے کہ پروفیسر خورشید خاور امروہوی نے اپنی ساری عمر ادب کے لیے وقف کر رکھی ہے۔

میں ان کی عمر کے 60 سال سے 75 سال تک کی وقیع مساعی دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہوں کہ آخر یہ ہفت خواں کس طرح طے ہوا۔ ایک بات جو فوری طور پر سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ دھن کے اس قدر پکے Persevering ہیں کہ اگر کسی کام کو سر انجام دینے کا ارادہ کر لیں تو ہزار دشواریوں کے باوجود ارادہ تبدیل کر دینا انہوں نے سیکھا ہی نہیں۔ ڈی لٹ (D.lit) کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے مزید کچھ کام منثور یا منظوم کی ضرورت انہوں نے چند کتابیں تیار کیں پھر سوچا کہ کیوں نہ انہیں پاکستان کے پچاس سالہ گولڈن جوبلی کا حصہ بنا دیا جائے۔ بس کام شروع ہو گیا۔ ان کی انفرادیت یہاں بھی مسلم ہو گئی کہ بیک وقت اتنی کتابیں ابھی تک کسی شاعر یا ادیب کی شائع نہیں ہوئیں۔

مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر "مقدمتہ الکلام عروض و قافیہ" کی منفرد حیثیت پیش نظر رہنی چاہیے۔ میرے سامنے اس موضوع پر کئی پرانی تصانیف ہیں لیکن اس موضوع پر اس قدر جامع و ضخیم تصنیف میری نظر سے نہیں گزری۔ سوائے بحر الفصاحت مصنفہ حکیم نجم الغنی رامپوری کے جو سو سال پہلے شائع ہوئی تھی۔

خاور صاحب کی یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہو سکتی ہے پہلا حصہ ارکان شعر، عروض و قافیہ، نظم کی جملہ اقسام اور علوم رائجہ و فنون لطیفہ پر مشتمل ہے اور دوسرے حصہ میں علم بیان و علم بدیع کی جن شاخوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ صرف یہی نہیں وہ تمام اسباب جو شعر کی قدر و منزلت کے تعین میں مددگار ہو سکتے ہیں وہ بھی موضوع بحث ہیں۔

کتاب کے آخر میں سانیٹ Sonnet پر بھی گفتگو کی گئی ہے اور خورشید خاور صدیقی امروہوی نے اپنی Sonnets بھی اس صنف سخن کے میزان عدل کے حوالہ کی ہیں۔ میں خورشید خاور صدیقی امروہوی کے "مقدمتہ الکلام عروض و قافیہ" کو ان کی تمام تصنیفات کا "حاصل" سمجھتا ہوں کہ اس تصنیف میں جس ذہن رسا اور نظر گراں مایہ کی جھلکیاں جا بجا نظر آتی ہیں وہ اس موضوع پر کسی اور مصنف کی کتاب میں نظر نہ آسکیں۔ آپ اس بیان کو میری کوتاہ نگہی Shortsighted-

ness پر محمول کریں یا اسے کسی اور خانہ میں ڈالیں لیکن اس حقیقت کے اعتراف سے مفر نہیں ہے کہ "مقدمتہ الکلام عروض و قافیہ" فن شاعری کے سلسلے میں منفرد کتاب ہے۔ "مقدمتہ الکلام عروض و قافیہ" کی خاص خوبی یہ ہے کہ مثالوں کے لیے کلاسیکی دور کے قدما، متوسطین اور متاخرین کے کلام کے نمونوں پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ سلسلہ مصنف اور اس کے ہم عصر شعراء کے اشعار تک پھیلا ہوا ہے اور اس طرح یہ عصر حاضر کے شعراء کے کلام میں علم صنائع بدائع کی مثالیں دیکھنے کی پہلی باقاعدہ کوشش ہے جسے اس دور کی شاعری پر قلم اٹھانے والا مصنف نظر انداز نہ کر سکے گا۔"

محترم پروفیسر ڈاکٹر ابوالفہیم خورشید حیدر صدیقی خاور امروہوی 16 دسمبر 1923ء کو امروہہ یوپی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ اردو اور تاریخ اسلام میں ایم۔اے ہیں اور پی ایچ ڈی (ڈی لٹ کی ڈگری جلد ہی متوقع ہے)، سر سید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کراچی میں پروفیسر ہیں۔ انہیں 1965ء میں بدست صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم صدارتی ایوارڈ۔ 1973ء میں بدست گورنر سندھ بیگم رعنا لیاقت علی خان مرحوم، اکیڈمک ایوارڈ اور ایک ادبی ایوارڈ برائے اردو ادب ایک سماجی تنظیم کی طرف سے بدست سفیر قطر 1996-1995ء میں انہیں عطا کیا گیا۔ ان کی تصانیف درج ذیل ہیں۔

1۔ تاثرات قلب: مطبوعہ 27 اکتوبر 1965ء (صدر ایوب خان سے ایوارڈ یافتہ)

2۔ قومی نظموں کا مجموعہ: مطبوعہ 1971ء (گورنر سندھ سے ایوارڈ یافتہ)

3۔ مکاشفات و مشورے: مطبوعہ 1980ء۔ 4۔ مکاشفات و فکر فلاسفہ مطبوعہ 1948ء

5۔ تذکرہ دینوری: مطبوعہ 1984ء۔ 6۔ ترسیل مسرت: مطبوعہ 1986ء

7۔ عفت تغزل: مطبوعہ 1987ء 8۔ ہشت بہشت: 1993ء۔ 9۔ مقدمتہ الکلام عروض و قافیہ: مطبوعہ 1993ء برائے ڈی لٹ کی ڈگری جامعہ کراچی میں جمع کرائی ہوئی ہے)

10۔ منشائے قومی منظومات: مطبوعہ 1994ء (ادبی ایوارڈ یافتہ) خاور صاحب نے فرمایا "میں نے مختلف اوقات میں مندرجہ بالا دس کتابیں 2224 صفحات پر مشتمل شائع کرانے کے بعد بسلسلہ گولڈن جوبلی استقلال پاکستان 2704 صفحات پر مشتمل مندرجہ ذیل بارہ کتابیں یکم اگست 1997ء کو شائع کرائیں اور بیک وقت اتنی زیادہ کتابیں شائع کرانے کا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ ان کتابوں کے نام ہیں:

1۔ چراغ چہرہ، 2۔ خیال رُخ روشن۔ 3۔ غوامض علمی، 4۔ نظائر فلاسفہ، 5۔ اقتباس بلاغت، 6۔ ایثار مستور، 7۔ تصریح سخن، 8۔ رخانِ متنوع، 9۔ تبحر خاور، 10۔ چراغ آرزو، 11۔ تصورات گلرنگ، 12۔ انکشاف بلاغت۔ 656 صفحات پر مشتمل ایک کتاب "کہتے ہیں تجھے" شائع ہوئی ہے جس میں دو سو سے زائد حضرات نے میرے متعلق لکھا ہے۔

انہوں نے مزید فرمایا "اہل علم و ادب خوب واقف ہوں گے کہ دنیا میں سب سے پہلی کتاب 11 مئی

868ء کو شائع ہوئی تھی اس کے بعد دنیا کے کسی مصنف کی کتابیں کسی زبان میں بیک وقت اتنی بڑی تعداد میں شائع نہیں ہوئیں۔ گویا میں دنیا کا سب سے پہلا مصنف ہوں کہ جس کی کتابیں اتنی بڑی تعداد میں بیک وقت شائع ہوئی ہیں۔ ابھی تک میری لکھی ہوئی 4928 صفحات پر مشتمل 22 کتابیں شائع ہو چکی ہیں مگر میری کیا قدر و منزلت کی گئی؟ اگر پاکستان کے صوبہ سندھ کے اس کم سخن شاعر، ادیب و نقاد اور پروفیسر کے علاوہ کسی اور ملک کا کوئی مصنف اتنی کتابیں بیک وقت شائع کراتا تو اقصائے عالم میں دھوم مچ جاتی اور ذرائع ابلاغ اس کی خوب خوب تشہیر کرتے مگر میری حکومت نے میری کیا قدر کی؟ میں حکومت پاکستان اور بالخصوص حکومت سندھ کے ارباب حل و عقد سے یہ سوال کرنا چاہوں گا کہ پاکستان میں کتنے شاعر و ادیب اور نقاد میرے برابر تعلیم یافتہ ہیں کہ جن کی کتابیں ایک ہی وقت میں مجھ سے زیادہ یا میرے برابر شائع ہوئی ہیں۔ حکومت پاکستان بالخصوص حکومت سندھ کے ارباب اقتدار سے بصد ادب و احترام گزارش ہے کہ کم از کم علم و ادب کے معاملات کو تو سیاسی جوڑ توڑ کی وجہ سے عصبیت کی چھری سے ذبح نہ کیا جائے اور حقدار کا حق دینے میں اس قدر بخل سے کام نہ لیا جائے کہ وہ حوصلہ چھوڑ بیٹھے۔ میں نے ڈھائی لاکھ روپیہ سے زائد رقم خرچ کر کے پاکستان گولڈن جوبلی کے سلسلہ میں یہ بارہ کتابیں شائع کرائی تھیں کہ جن کی ابھی تک پذیرائی نہیں کی گئی۔ بہر حال یہ ہیں میرے ذاتی کوائف جو پیش کر رہا ہوں۔

اب ملاحظہ ہو "سخن ور" کے سوالنامہ کی روشنی میں ڈاکٹر خاور کے جواب۔

میں تحقیق میں مصحفی کے سلسلے کی کڑی ہوں۔ حضرت احسان دانش اور حضرت افسر صدیقی امروہوی کا شاگرد ہوں۔ میری اپنی کتابوں میں اسلامیات اور تاریخ کا مطالعہ کرتا ہوں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو سید مصطفیٰ علی بریلوی کی فرمائش پوری کرنے کے لیے اپنی آپ بیتی لکھوں گا۔ بڑی حد تک پر امید ہوں اس لیے کہ لا تقنطوا من الرحمۃ اللہ قرآن میں حکم دیا گیا ہے۔ صنفِ غزل کو پسند کرتا ہوں۔ تخلیقی نشستیں زیادہ بہتر کردار ادا کرتی ہیں۔ اب تو مائیکرو فلمیں تیار ہونے لگی ہیں پھر کیا ڈر ہے۔ اس سے نہ صرف شاعری کے منہ زور گھوڑے کے لگام لگتی ہے بلکہ شاعری منجھتی چلی جاتی ہے مگر آج کے میر و سودا اسے کب برداشت کرتے ہیں۔

توجہ طلب: میں ایک کھلی کتاب کی طرح ہوں جہاں سے چاہو مجھے پڑھ لو۔ ویسے میرے متعلق لکھی گئی کتاب "کہتے ہیں تجھے دانشمنداں" میں صفحہ 19 تا 30 تک اور 582 تا 587 تک خاصی حد تک میرا تعارف موجود ہے سوائے اس کے کہ میری زندگی کی گاڑی کا ایک پہیہ نکل گیا اب ایک ہی پہیہ کے سہارے گاڑی چل رہی ہے۔ 48 سال تک میرا ساتھ دینے والی میری شریکِ حیات 10 اپریل 1995ء کو میرا ساتھ چھوڑ گئیں اب مئی 1973ء سے میری زندگی میں داخل ہونے والی میری ساتھی ہیں۔

بیت الفیاض اے 308 این شمالی ناظم آباد کراچی 74700

انتخابِ کلام

ڈاکٹر خورشید خاور امروہوی

اے دوست اس قدر تو نہ شیخی بگھاریئے
پگڑی کسی کے سر سے نہ ہرگز اتاریئے

پژمردگی کا میری سبب جانتے ہیں آپ
ابر کرم سے اپنے اسے بھی بہاریئے

بہتر ہے درگزر کو بنا لیجئے شعار
ہنس بول کر ہی وقت کو اپنے گزاریئے

اپنوں کی بے رخی سے جو کچھ میل آگیا
سونے کی طرح قلب کو اپنے نکھاریئے

اخلاق سے بنایئے دشمن کو اپنا دوست
اخلاص سے نقوشِ محبت ابھاریئے

حالات سازگار بنانے ہیں ناگزیر
عقلِ سلیم سے انہیں بڑھ کر سنواریئے

مجبور کی مدد کریں جس طرح بھی بنے
مرتے ہوئے کو اور تو لاتیں نہ ماریئے

اللہ ہی سمیع و بصیر و قدیر ہے
اللہ کے ماسوا نہ کسی کو پکاریئے

موسیٰ کی طرح جو ملے فرعونِ وقت سے
خورشیدِ خاورؔ کہہ کے اسی کو پکاریئے

اب [illegible] اپنی جگہ پر بیٹھے تو
ظلمت کا سینہ چاک کیا تھا طارق کے دل گردے نے

[illegible] محدود اور کوئی اُمید نہ تھی
میرے اپنے انقلاب کا میں خون سے [illegible] نے

دلنواز صدیقی
[illegible]

ڈاکٹر دلنواز صدیقی

پنسلوانیا۔ امریکا

زبان بھی عجیب شے ہے لیکن تبدیلیاں اس میں پیدا ہوتی ہیں اور اس مدھم انداز میں کہ ہمیں فوری پتہ بھی نہیں چلتا۔ یہ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ ہم وہی زبان بول رہے ہیں جو ہمارے پر دادا یا لکڑ دادا بولتے تھے۔ یقیناً بہت سے نئے الفاظ اور محاورے ہماری زبان میں داخل ہوئے ہیں اور بہت سے جو بولے جاتے تھے متروک ہوئے ہیں جیسے بمبئی میں ہرے دھنیے کو، کوتھمیر، آلو کو بٹاٹا، اور پیاز کو کاندا کہنا عام سی بات ہے۔ اسی طرح کراچی میں عام بول چال میں "پھڈا" یوں در آیا ہے کہ سن کر حیرت ہوتی ہے۔ ناگوار گزرنا اور بات ہے۔ بہر حال آپ کو سننا ہی پڑتا ہے۔ جیسے ہمارے پنسلوانیا کے شاعر محترم دلنواز صدیقی کو ایک "غزل" سننی پڑی تھی اور وہ زبان کی اس پامالی پر دل مسوستے بھی رہے اور محظوظ بھی ہوتے رہے کہ قسمت کو یہ دن بھی دکھانا تھا انہیں۔

وہ ہمیں بتا رہے تھے کہ "1961ء کا واقعہ ہے جب میں پہلی بار انگریزی شعبہ میں لیکچرر کی حیثیت سے مہاراجہ ساجی راؤ کالج (مہاراشٹرا اسٹیٹ) پہنچا تو وہاں ایک مقامی (پونہ سے آئے ہوئے) لیکچرر آف اکنامکس جن کو موسیقی سے گہرا شغف تھا میری اردو دانی کی خبر سُن کر مجھے غزلیں سنانے میرے کمرے میں تشریف لائے۔ میرے اظہارِ شوق پر انہوں نے کمرے میں

رکھی سینٹرل ٹیبل اپنی طرف کھینچ لی اور طبلہ کے طور پر استعمال کرتے ہوئے گویا ساز کے ساتھ غزل سرائی کا آغاز کردیا۔ ایک لمبی سُریلی تان کے بعد غزل شروع ہوئی : آں۔۔۔۔۔۔ آکمری جانکرو کرار نہی ہے۔۔۔۔۔۔ آں۔۔۔۔۔۔ تا کے تیے دادے انتے جار نہی ہے آں۔ آواز پُورن پَرچُورے صاحب کی واقعی نہایت دلکش اور سُریلی تھی۔ لطف آرہا تھا لیکن اردو میری مادری زبان ہونے کے باوجود ان کی اردو میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

میں نے خاصے صبر اور تکلف (نئی نئی ملاقات کے باعث) کے بعد سوال کرہی لیا کہ یہ کس شاعر کا کلام ہے ؟ تو کہنے لگے "گالب کی گجل ہے۔" تو مجھے اور حیرت اور پریشانی ہوئی کہ میری اُردو دانی کا دعویٰ جھوٹا ثابت نہ ہو جائے۔ تاہم میں نے کہہ ہی دیا کہ یہ کلام تو غالب کا نہیں لگتا۔ یہ غزل آپ کو کہاں ملی پروفیسر پَرچورے ؟ تو مسکراتے ہوئے اُنہوں نے وہ کتاب جس سے وہ پڑھ کر سنا رہے تھے، مجھے پیش کردی۔ مراٹھی اور ہندی چوں کہ ایک ہی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں نہایت معمولی تفاوت کے ساتھ تو مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ مراٹھی میں دیوانِ غالب کا ایک نسخہ تھا۔ میرے یہ دریافت کرنے پر کہ کون سی غزل اور کہاں سے پڑھ رہے تھے، اُنہوں نے ایک صفحہ پر اُنگلی رکھ دی تو معلوم ہوا وہ یہ غزل سنا رہے تھے :

آ کہ میری جان کو قرار نہیں ہے   طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

میں نے مسکراتے ہوئے ہمت افزائی کی اور ذوقِ شعری کی اور موسیقی کی تعریف کے پُل باندھ دیے لیکن یہ بھی ہلکے سُروں میں کہہ دیا کہ حضرتِ غالب کی روح قبر میں ضرور تڑپ رہی ہوگی کہ آپ نے کس قدر دانی کے ساتھ اُن کے کلام کا قیمہ فرمایا ہے، تو انکساری کے لہجہ میں کہنے لگے "اس تعریف کا بہت بہت شکریہ اگرچہ میں اِس کا مستحق نہیں۔" یہ سب اُنہوں نے انگریزی میں فرمایا۔ اُس کے بعد اُن کا اور ہمارا دو سال سے کچھ زیادہ ساتھ رہا۔ بیڈ منٹن بھی ہم لوگ ساتھ کھیلتے تھے مراٹھی اور ہندی گانوں کے ساتھ اُن سے کبھی کبھی "گالب کی گجلیں" بھی سنتے رہے۔ اور لطف بٹورتے رہے۔"

بات ہو رہی تھی اردو زبان کی بقا کی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ "دراصل زبانوں کی ترقی کافی حد تک بولنے والوں کے سیاسی اقتدار پر منحصر ہوتی ہے خصوصاً اس امر پر کہ وہ اقتصاد کے میدان میں کس حد تک مستقبل اور مروّج ہے۔ صرف تفنّنِ طبع یا باقیاتِ ثقافت کے طور پر وہ کچھ عرصہ تک چل سکتی ہے ورنہ باہر کے ملکوں میں اُردو کی بقا صرف ایک یا دو نسل تک شاید چل پائے۔ لیکن چونکہ ہماری اگلی نسل کا کُلی انحصار انگریزی پر ہے کم از کم باہر کے ملکوں میں رہنے والوں کی حد تک (Anglophone ممالک کی حد تک)۔ اصل بقاء اُردو کی بھارت میں بہت مشکل نظر آتی ہے۔

اس میں پاکستان کا کردار بہت اہم ہے اگر وہاں کے سب لوگ اس طرف توجہ دیں اور ذہنی غلامی سے آزاد ہو کر اردو کی ترقی کو انگریزی زدگی پر ترجیح کو تیار ہوں تو بات بن سکتی ہے، اس کا مستقبل محفوظ

ہوسکتا ہے اور اس میں لکھا ہوا مذہبی اور تہذیبی سرمایہ بھی۔ ہم اگر اپنی اسلامی اقدار پر زور دیتے ہوئے مسلمانوں میں اتحاد حاصل کر کے قوتِ اُمتِ مسلمہ پر زور دیں تو اُن کی ہماری زبانیں بھی دشمنوں کی زد سے بچی رہیں گی ورنہ اگر بقائے اُمت ہی خطرہ میں رہے تو باقی سرمایہ کی کیا فکر۔ تو ہمیں اپنی اولیات میں تقدیم و تاخیر کرنے کی ضرورت ہے۔"

دل نواز احمد صدیقی کی جائے پیدائش امروہہ یوپی (ہندوستان) ہے اور تاریخ پیدائش 4 جولائی 1937ء ہے۔ 1957ء میں بی۔اے، 1959ء میں ایم۔اے اور 1960ء میں بی۔ایڈ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے کیا۔ اس کے بعد 1966ء سے 1968ء تک پوسٹ گریجویٹ، ڈپ ایڈ کی سند کے لیے یونیورسٹی آف لندن، انگلینڈ سے تعلیم حاصل کی۔ 1980ء میں پی۔ایچ۔ڈی سراکیوس یونیورسٹی، سیراکیوس، نیویارک، یو۔ایس۔اے سے مکمل کیا۔ 1984ء سے 1985ء تک خرطوم سوڈان میں اور 1992ء میں حکومت اردن (عمان) کے لیے بحیثیت مشیر خدمات انجام دی ہیں۔ پروفیسر دل نواز صدیقی نے خود کو تعلیمی میدان سے وابستہ ہی نہیں بلکہ اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ ان کی تدریسی خدمات کے سلسلے میں انہیں کئی اعزازات ملے ہیں جن میں 1997ء میں اے ایف ایم آئی (AFMI`S) کا ایوارڈ، ہونوریز کاؤسا ایوارڈ 97ء (HONORIS CAUSA) اور 1979ء میں بحیثیت وائس چانسلر سارا کاؤس یونیورسٹی (SYRACUSE UNIVER-SITY) کینیا، تنزانیہ اور زمبیا سے ملنے والے ایوارڈ بھی شامل ہیں۔

Who`s who in the world اور دیگر عالمی پروفیشنل ڈائرکٹریز میں ان کی خدمات کا ذکر موجود ہے۔ ملازمت کا آغاز انہوں نے 1963ء سے کیا تھا۔ 1963ء سے 1965ء تک تدریس، تنظیم اور تحقیق سے متعلق تنسرانیا زامبیا میں خدمات انجام دیں۔

1975ء سے 1980ء تک بحیثیت گریجویٹ، ریسرچ اسسٹنٹ سیراکیوس یونیورسٹی سیراکیوس نیویارک میں رہے۔

1980ء سے 1983ء تک چیف یوایس ایڈوائزر برائے حکومت یمن شمالی سینٹرل پلاننگ آرگنائزیشن، پرائم منسٹر آفس صنعا یمن شمالی میں خدمات انجام دیں۔

1984ء میں ڈائرکٹر آف کریکولم اور بحیثیت مشیر یونیورسٹی آف آرکنساس میں برائے میڈیکل سائنسز لٹل ورک آرکنساس اور اسی یونیورسٹی میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ برائے ہیلتھ پروجیکٹ کے لیے بھی خدمات انجام دی ہیں۔

پروفیسر دل نواز صدیقی کو دنیا کے سفر اور مختلف ملکوں میں رہ کر کام کرنے کا موقع ملا ہے یوں متعدد تہذیبوں سے واسطہ پڑا ہے۔ کہتے ہیں "مغرب کے نام نہاد عالموں نے دیگر ثقافتوں اور تہذیبوں کا مطالعہ اکثر سیاسی اور معاشی مفاد کے نقطہ نگاہ سے کیا ہے اور نوع انسانی کو اختلافی انداز سے زیادہ سے زیادہ دیکھا ہے اور اُن کے بنیادی مشترکہ اثاثہ کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا ہے۔ میں نے

ایشیا، افریقہ، یورپ اور دیگر مقامات کے ادب اور دوسری نگارشات میں ایک جیسی ہی اقدار کا مشاہدہ کیا ہے۔"

شعر گوئی کے علاوہ انہیں ادبی تنقید سے بھی لگاؤ ہے۔ دوران گفتگو کہہ رہے تھے۔

"اگرچہ ترقی پسند تحریک کے مارکسی نظریہ سے میرا تعلق ہرگز نہیں لیکن اس تحریک نے نظم اور غزل میں جو فکری تنوع اور اقتصادی اور سماجی مسائل کے لیے جو راہیں کھولیں ہیں اُن کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور شعر برائے شعر یا ادب برائے ادب کے تصور سے گھبراتا ہوں۔"

ان کا کلام شاعر (بمبئی)، انشاء (کلکتہ)، گلبن (احمد آباد)، جنگ (لندن)، اردو میں جدہ سے نکلنے والے اخبار میں چھپتا رہا ہے۔ چند تحقیقی مضامین دیگر رسالوں میں بھی چھپے ہیں۔ لیکن اب تک ان کا زیادہ کام انگریزی میں لکھے گئے مقالات اور کتابوں پر مشتمل ہے۔

فلسفہ، تاریخ اور معاشرتی نظریات کے ساتھ ساتھ عالمی سیاست پر لکھتے اور پڑھتے رہتے ہیں۔ صرف قصہ کہانیوں پر مشتمل ادب سے انہیں دلچسپی نہیں ہے، البتہ عالمی تقابلی ادب اور فلسفہ کے مطالعہ میں کافی وقت گزرا ہے۔

سوال نمبر 6 کے جواب میں کہہ رہے تھے "جس صنف شعر میں شاعر میں آمد کے ساتھ الہامی کیفیت پیدا ہو جائے وہ اُس صنف کو ذریعۂ اظہار بنائے۔ ذاتی طور پر میں غزل کو ترجیح دیتا ہوں اور اُس کے دامن کو وسیع تر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تاکہ نئے دور کے نئے افکار کو راہِ اظہار مل سکے۔ نثری نظم اور نثری غزل کے تجربے لوگ کرتے رہیں ایک زمانے میں لوگ منظوم مقفّی اور مسجع اردو لکھتے تھے۔ دل لگتی اگر ان اصناف میں کہی جا سکتی ہے تو حوصلہ افزائی نہ کریں تو حوصلہ شکنی بھی روا نہیں۔ سخت مقابلہ میں نکھار اور استوار پیدا ہوتا ہے اور شعر و ادب کی ترقی ہوتی رہے لیکن اصل بات حق کی تلاش اور اُس کا اظہار ہے اور موثر ترین انداز میں۔ بد قسمتی یہ ہے کہ ہمارے ادب میں فکری بحث بہت کم ہوتی ہے۔ لفظی، شخصی، مقامی اور تاریخی اور تذکراتی جمع خرچ کا رواج زیادہ رہا ہے میرے نزدیک مشاعرہ بھی ایک تخلیقی نشست کی ہی حیثیت رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اُن تخلیقی نشستوں سے ہم کام کیا لینا چاہتے ہیں۔ اس سوال کے پیچھے میری خواہش یہ ہے کہ کوئی رفاہی اور اصلاحی تحریک ہو جو حالی اور سر سیّد سے لے کر اقبال تک رہی اور اُن کے بعد یا اُن کے آخری دور میں ترقی پسند تحریک "انگارے" کے ساتھ پنپی۔ اب کون سی تحریک اردو والوں کے پاس ہے؟ یہ ہے اصل سوال ہمارے سامنے۔ اس پر غور کریں۔

مادّی تحریکوں کی ایک شکل ہمارے سامنے اشتراکیت کے نام سے آئی جو شہنشاہیت، استعمار اور سرمایہ داری کے خلاف تھی۔ جس کا دیوالیہ نکل گیا۔ اب بظاہر سرمایہ داری اپنی نئی شکل میں مستولی نظر آتی ہے لیکن اس پر دوبارہ نکتہ چینی بھی ہو رہی ہے اور اپنی مادیت کے ہاتھوں اندر اندر روحانی اور سماجی گھُن کے ہاتھوں کھوکھلی بھی ہو رہی ہے۔ اسلامی تحریکیں اپنی قدامت پرستی کا شکار ہیں۔ انہیں

سنجیدگی کے ساتھ غیر اسلامی قدامت پسندی سے آزاد کرادیں اور نئی تہذیب کے کھوکھلے پن سے دُور رکھیں اور اُن کی خالص اسلامی اقدار کو ایک تحریک کے طور پر منظر عام پر لائیں اور نظم و نثر کے جملہ اصناف کو اُن کی خدمت میں لگادیں تو مسلم تہذیب اور مسلم زبانیں بچ سکتی ہیں۔ میں ذاتی طور پر دوسرے مسلمانوں (مختلف ملکوں سے) کے ساتھ Association of Muslim Social Scientists کے کاموں میں اپنی خدمت پیش کرتا ہوں۔ پاکستان میں ہم لوگوں نے مرحوم و مغفور حکیم محمد سعید صاحب (ہمدرد) کے تعاون سے دو کانفرنسیں 1992ء اور 1997ء میں کیں۔ اس سلسلے میں مزید مساعی جاری ہیں اور مساہمت درکار ہے۔ اس کا کچھ رنگ آپ کو میری غزلوں اور دیگر اصناف میں ملے گا۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں مشاعرے ہوں یا تخلیقی نشستیں، تحریکی مقاصد کے ساتھ ہونا چاہئیں ذہنی عیاشی کے لیے نہیں وقف ہو جانی چاہئیں، انشاء اللہ۔

اُن کے کلام سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جن کی طرف شاعر دل نواز صدیقی نے توجہ دلائی ہے۔

شکم کی آگ بجھ گئی ہے سر کو چھت نصیب ہے
مگر نظر ترس گئی فضائے دردمند کو

اپنی عزت نے گئے وقت کا پایا ہے مزاج
کھوئی وقعت بھی کہیں بار دگر آتی ہے

یاد بھی موت سے کچھ کم تو نہیں ہے اے دوست
لاکھ چاہو کہ نہ آئے، یہ مگر آتی ہے

سزا ہے کس گناہ کی کہ ایسے پاسباں ملے
جو دشمنوں سے مانگتے ہیں بھیک التفات کی

پیاز کے پانی پہ لکھی تقدیر
میں نے کاغذ کو جلا کر پڑھ لی

اب سوال نمبر 7 ہم نے پوچھا۔ فرمانے لگے :

"الیکٹرونک میڈیا کے باعث جہاں رسمی ذرائع ابلاغ مثلاً کتابوں کی ترویج میں کمی آگئی ہے وہاں انہی میڈیا کے باعث مغرب میں کتابوں کی بکری میں اضافہ بھی ہو رہا ہے اور اُن کی پبلسٹی کا ذریعہ یہی میڈیا ہیں۔

Amazan.com اور Fornyaninoble.com کے ذریعے اور اُس کے ساتھ ساتھ

C-span2 پر Book TV کا اجراء جب سے ہوا ہے انگریزی کتابیں دنیا بھر میں مانوس اور مقبول ہو رہی ہیں۔ یہی کام اردو والے بھی الیکٹرونک میڈیا سے اپنے اپنے علاقوں میں لے سکتے ہیں۔ بات ساری فکری اپج کی ہے۔ پس ماندہ قوموں خصوصاً آج کے مسلمانوں کو میرے نزدیک تین (قسم کی) چیزوں کی طرف فوری طور پر توجہ کی ضرورت ہے، اوّلاً (جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں) اسلامی اقدار کا صحیح جاذی (Active/dynamic) شعور اور دین اور ثقافت کے طور پر اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں اُن پر عمل۔ ثانیاً اپنے سارے کاموں میں نظم و ضبط (Management & Administration) کا استعمال جس کے لیے جہاں تدریب و تربیت کی ضرورت ہے ہر پیمانہ پر ہمارے سماج میں وہاں دورِ حاضر کے تقاضوں کے پیشِ نظر تنظیموں اور اداروں (ثقافتی، علمی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی) کے قیام کی ضرورت ہے۔ ان ہی کے ذریعہ عقل سلیم رکھنے والے اتحاد کی ضرورت محسوس کریں گے اور فضا پیدا کرنے کے اہل بھی یہی لوگ ہوں گے۔ اردو زبان اور اردو ادب ذرائع ہیں آخری اغراض و مقاصد نہیں۔ کتابوں اور جرائد کی بقاء کا راز بھی تحریک کے ساتھ وابستہ ہے۔ سطحی لسانی ذوق و شوق وقتی اور سطحی ہی ہوتا ہے۔ الیکٹرونک میڈیا بھی اسی وقت آپ کے ہاتھ میں آسکتے ہیں جب آپ کے معاونین اور مسابین آپ کی تحریک کے اغراض و مقاصد سے متفق ہوں گے اور عملی طور پر سپورٹ کریں گے۔

اردو ادب میں تنقید کے موضوع پر بھی مندرجہ بالا خیالات کی روشنی میں غور فرمائیں کہ نقد اور نظر ہم معنی الفاظ ہیں۔ نظر سے نظریہ اور نظریہ سے نظر پیدا ہوتے ہیں۔ تنقید، اظہارِ نقد و نظر کا نام ہے ایک ادب پارہ میں اور اُس کے سیاق و سباق میں۔ گھوم پھر کے پھر بات اقدار پر آ کے رُکتی ہے کیوں کہ ہر فکر و عمل کے اوّل و آخر یہی ہیں۔ اقدار کو سمجھنا، اُن کی تشریح اور ترویج ہوگی تو آپ کی تنقید زندہ اور پائندہ ہوگی۔ ادب کی مختلف اصنافِ سخن پروان چڑھیں گی لوگ اُن کے بارے میں بحث و تمحیص کریں گے اور تنقیدی ادب کی ترقی ہو سکے گی۔

37- 841
Dr. Dilnawaz Siddiqui
Dept of Communication Cup
Clarion, PA 16414

انتخابِ کلام

دل نواز صدیقی

"بوزنیا" میں ایک مسلمان خاتون کی موت کا منظر
(کسی بھی ماں پر منطبق)

نہ رہا اُس پہ وہ عقیدہ بھی
کیا ملا ہو کے، آب دیدہ بھی

دونوں دشمن میں حق شناسی کے
بے عقیدہ، بھی بدعقیدہ بھی

آ کے بازار نفسا نفسی میں
بک گئے ہم سے چیدہ چیدہ بھی

سب ہی کٹ حجتی میں ماہر ہیں
عقلِ کُل اور نارسیدہ بھی

یہ سخن قابلِ قبول ہے آج
عمر کے ساتھ عمر رسیدہ بھی

ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں
سرو قامت کمر خمیدہ بھی

موت سے سرد تھا چہرہ اُس کا
بلبلاتا رہا بچہ اُس کا

دنیا کس راہ پہ آ نکلی ہے؟
دھیان تک بھی نہیں آیا اُس کا

جھوٹ کے سامنے سچ بولنے پر
کوئی اپنا نہ پرلیا اُس کا

لوٹ کے اُس کو آج ظالم نے
نام لکھوا دیا اُلٹا اُس کا

اُس کے منکر ہیں کچھ ایسے جیسے
کوئی منظر نہیں دیکھا اُس کا

"یا تو مجھ سے چھین لو یہ بت تراشی کا ہنر
ورنہ میں جو بت تراشوں گا خدا ہو جائے گا"

راحت

۵ فروری ۱۹۹۹

اوم کرشن راحت

سڈنی

اوم کرشن راحت آدمی بھی کھرے ہیں اور شاعری بھی سچی سچی کرتے ہیں۔ ان سے گفتگو کیجیے یہی جی چاہے کہ وہ بولتے رہیں اور ہم سنتے رہیں۔

پورا نام اوم کرشن ہے۔ تخلص راحت ہے، لدھیانہ پنجاب میں 26 جنوری 1925ء کو پیدا ہوئے۔ لب و لہجے میں اب تک بھی پنجاب کی مہک ہے۔ انہوں نے بی اے کے بعد ہریانہ الیکٹرک سٹی بورڈ سے ملازمت کا آغاز کیا اور بطور آفس سپرنٹنڈنٹ 1983ء میں ریٹائر ہوئے اس سے پہلے بمبئی میں وی شانتارام کے اسٹوڈیو راج کملا کلا مندر سے بطور اسسٹنٹ کیمرہ مین وابستہ تھے۔

ہم نے پوچھا کہ آپ نے شاعری کا آغاز کب کیا؟

کہنے لگے "لدھیانہ میں تعلیم کے دوران ہی 1939ء میں شاعری کا آغاز کیا اور چودہ سال ہی کی عمر میں پہلا شعری مجموعہ "شعاع نور" شائع ہوا جو اغلاط اور بچگانہ شاعری کا پلندہ تھا۔ کالج کی تعلیم کے دوران جنگ آزادی میں کود پڑا۔ 1945ء سے 1948ء تک میں ضلع لدھیانہ کی اسٹوڈنٹ کانگریس کا صدر تھا۔ شاعری اور سیاست نے تعلیم پر جو اثر کرنا تھا کیا۔ بی اے کا چار سالہ کورس سات سال میں مکمل کیا۔ پھر بمبئی چلا گیا لیکن وہاں کا فلمی ماحول راس نہیں آیا کہ خوشامد میرے بس کا کام نہیں تھا اور فلم انڈسٹری میں یہ بہت کام کی چیز تھی اور ہے۔ اسی سلسلے میں میرا ایک شعر ہے

سنا ہے لفظِ خوشامد سے کھل بھی سکتا تھا   وہ ایک در جو ہمیشہ ہی مجھ پہ بند رہا

باقی زندگی بہت سپاٹ گزری ہے۔ زندگی میں کوئی رومانس کیا ہی نہیں۔ شاعری عبادت سمجھ کے کی ہے جس میں رومانس کی کمی اکھرتی ہے۔ لوگوں سے جڑا رہا ہوں غیر مذہبی آدمی ہوں اور اس کی جھلک میری شاعری اور افسانوں میں خوب خوب نظر آتی ہے۔ ملازمت کے دوران اپنی انفرادیت اس طرح بنائے رکھی کہ ہر افسر سے جھگڑا بنا رہا کہ ان سبھوں کے منہ کو رشوت لگی تھی اور میں اسے حرام سمجھتا تھا چنانچہ میں نے ایسے پیسے کو کبھی چھوا تک نہیں۔ پھر جب ایک بیٹی اور بیٹا آسٹریلیا آگئے تو اپنا گھر بار بڑی بیٹی کو سونپ کر اب ادھر آبسا ہوں۔ زندگی میں کوئی قابلِ ذکر سانحہ ہے ہی نہیں ہاں بیگم نے پورا پورا ساتھ دیا اور کندھے سے کندھا ملا کر چلیں۔ وہ سینٹرل گورنمنٹ کے ادارے میں ذہنی معذور بچوں کو پڑھاتی تھیں۔ 1989ء میں اپنی خوشی سے ریٹائرمنٹ لے کر میری دیکھ بھال میں لگ گئیں اور مجھے ہمیشہ پڑھنے اور لکھنے پر اکساتی رہیں۔ بس اپنی تو یہی زندگی ہے۔"

کچھ دیر کے وقفے سے پھر فرمانے لگے۔ "شاعری کے علاوہ میں افسانے اور ون ایکٹ ڈرامے بھی لکھتا ہوں اور "اردو" "ہندی" اور پنجابی میں بھی ان تینوں صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ ہندوستان کے سبھی مشہور جرائد میں میرا کلام اور میرے افسانے شائع ہوتے رہے ہیں جن میں، شمع، بیسویں صدی، انشا، تعمیر، پرواز ادب، آج کل، وغیرہ اور پاکستان کے کئی جرائد میں کلام چھپتا رہا ہے۔ میرا ترقی پسند تحریک سے بہت تعلق رہا ہے اور اسی مکتبہ فکر سے میری شاعری اور افسانے متاثر رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں نے اردو شاعری کی روایت کو اپنی شاعری میں کبھی نظر انداز نہیں کیا کہ مجھے اردو زبان سے بہت لگاؤ ہے اور جدید ادب میں اس کی شان کو بہت کم لوگوں (تخلیق کاروں) نے ملحوظ رکھا ہے۔"

ان کا شعری مجموعہ "شفق زار" یوپی اردو اکادمی لکھنو سے انعام یافتہ ہے اور افسانوی مجموعہ "ایک آنکھ والا ہرن" ہریانہ ساہتیہ اکادمی اور مغربی بنگال اردو اکادمی سے انعام یافتہ ہے۔ شعری مجموعہ "خوشاب" آل انڈیا میر اکادمی سے انعام یافتہ اور افسانوی مجموعہ "کہی ان کہی" یوپی اردو اکادمی لکھنو سے انعام یافتہ ہے جبکہ "باسی ہونٹ" افسانوی مجموعہ بھاشا وبھاگ پنجاب (پٹیالہ) سے انعام یافتہ ہے۔

"کوہِ ندا" (شعری مجموعہ) حال ہی میں شائع ہوا۔ ایک شعری مجموعہ "لہو ترنگ" اور ایک افسانوی مجموعہ "اپنے مرکز کی طرف" شائع ہو چکا ہے یہ مجموعے "سکے رکھاں دی چھان" (پنجابی شاعری) "ایک تصویر ادھوری سی" (ہندی افسانے) اور "کھلی کھڑکی بند دروازہ" ایک ایکٹ کے ڈرامے زیرِ طبع ہیں۔

انھوں نے بتایا "مجھے ہریانہ اردو اکادمی نے صوبائی سطح کے خواجہ احمد عباس ایوارڈ سے اور پنجاب بھاشا وبھاگ پٹیالہ نے راجندر سنگھ بیدی ایوارڈ سے نوازا ہے۔"

راحت نے اردو شاعری کے تمام شعرا کی کتابوں کو جی لگا کر پڑھا ہے اس میں "کلاسیکی" "ترقی

پسند اور جدید شاعری بھی شامل ہیں۔ دنیا کی ہر زبان کے افسانے جو اردو، ہندی یا انگریزی میں ترجمہ ہو کر چھپے، خوب خوب پڑھے ہیں اور وہ کتابیں بھی جن کے خالق زندگی اور عوام سے جڑے رہے۔ ہر اچھا ادب جو کسی بھی زبان میں کسی نے بھی تخلیق کیا ہو ان کے لیے روح کی غذا ہے۔

اردو کے مستقبل کے بارے میں کہتے ہیں "کچھ لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہندوستان میں یہ زبان سیاست کا شکار ہو کر رہ جائے گی اور پاکستان میں نام نہاد "قومی زبان" بن کر فائلوں میں دفن ہو جائے گی کہ وہاں میں گیا تو بچے علاقائی زبان بولتے ہیں یا انگریزی۔ اس زبان کو کسی کی نظر لگ گئی ہے حالانکہ دنیا کی کسی زبان میں ایسی کشش اور توانائی نہیں پائی جاتی اور شاعری کے لیے اس سے عمدہ زبان تو فارسی بھی نہیں۔ اردو تو ہندی، فارسی، عربی، ترکی اور ہندوستانی علاقائی زبانوں کا مرکب ہے۔ دو مصرعوں میں جہاں بھر کی باتیں تو اسی زبان میں کہی جا سکتی ہیں۔ خاکم بہ دہن، میں اس کے مستقبل سے بہت خائف ہوں۔"

اصنافِ سخن میں انہیں غزل پسند ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "میرے نزدیک اردو غزل اور پابند نظم اظہارِ خیال کے لیے بہتر ہیں۔ (یہ میری ذاتی رائے ہے) کہ شاعروں نے جو نثری نظم و غزل کے تجربے کیے ہیں یہ ان تخلیق کاروں کی سہل پسندی ہے۔ شاید وہ شاعر محنت کرنے سے کتراتے ہیں۔ ان کے تجربات نے شاعری کو کون سی اونچی منزل پر پہنچا دیا ہے۔ وہ کیا بات کہنا چاہتے ہیں جو پہلے اور روایتی شاعری میں نہیں کہی گئی۔ وہ کون سے خیالات ہیں جو پابند شاعری میں ادا نہیں ہو سکتے۔

رہی مشاعروں کی بات تو مشاعرے تو ہمیشہ ہی تفریح کا سامان رہے ہیں لیکن یہ بنے رہیں تو ہرج بھی کیا ہے کم از کم اردو سننے سمجھنے کا موقعہ تو مہیا ہو جاتا ہے۔ ہاں تخلیقی نشستیں اور تخلیقات پر تنقید (اگر شاعروں اور ادیبوں کو گوارا ہو) اردو کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔"

کچھ وقفہ کے بعد انہوں نے کہا کہ "آپ کا یہ کہنا درست ہے کہ الیکٹرانک میڈیا نے مطالعہ اور کتابوں پر گہرا اثر چھوڑا ہے اور یہ وقت کے ساتھ بھی اگلی صدی میں ٹھیک ہو پائے تو ہو پائے کہ لوگ ضرور اس بارے میں غور کریں گے۔ ابھی تو نہیں شاید پچاس سو سال بعد۔ اس کے بارے میں کیا کرنا چاہیے۔ میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں کہ میں اپنے گھر میں کچھ نہیں کر پا رہا۔"

اوم کہتے ہیں "یہ درست کہ ادب کی ترقی کے لیے تنقید بہت اہم ہے لیکن آج کی نسل کسی معاملے میں سنجیدہ ہے ہی نہیں۔ وہ تو زندگی کو بھی بہت سہل بنا کر جینا چاہتی ہے۔ وہ اچھی شاعری، اچھا افسانہ پڑھ کر اس پر رائے دینے کے اہل ہی نہیں تنقید تو دور کی بہت دور کی چیز ہے اور مزید برآں آج کے ادیب اور شاعر اسے برداشت بھی کہاں کرتے ہیں۔ تنقید کو جھیلنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔

OM KRISHAN RAHAT, 4, MELODY STREET
TOONGABBIE NSW 2146 SYDNEY AUSTRALIA

انتخابِ کلام

اوم کرشن راحت

کہیں بھی آپ کا راحت کا کوئی مقام نہیں
گناہ گاروں کی فہرست میں بھی نام نہیں

کسی کی یاد بھی آنے میں اب جھجکتی ہے
ہمارے ذہن میں پہلی سی دھوم دھام نہیں

ہماری روح پگھلتی ہے شعر کہنے میں
یہ کام لوگ سمجھتے ہیں کوئی کام نہیں

کہاں سے روشنی آئے گی خانۂ دل میں
کہ شام ڈھلنے لگی ہے، طلوعِ جام نہیں

ہم اس کے فیض سے جنت مکیں تو ہیں لیکن
اُدھر کسی سے ہماری دعا سلام نہیں

مری تلاش نئی منزلیں دکھاتی ہے
"ٹھہر گیا ہوں جہاں میں مرا مقام نہیں"

ابھر بھی سکتا ہوں راحتؔ میں ورطۂ غم سے
بشر کے بس کا نہ ہو ایسا کوئی کام نہیں

یک طرفہ کبھی دوستی ہوتی نہیں، دیکھو تو
کہ دوست حقیقت میں مخفف ہے دو دولت کا

محمد نقیب اللہ رازی

چترال پاکستان

"سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے" داغ یہ کہہ کر اردو زبان کی مقبولیت پر سند نہ لگاتے۔ تب بھی وقت یہ ثابت کر دیتا کہ اردو وہ واحد زبان ہے جو دنیا کے کونے کونے میں بولی جاتی ہے اور اردو بولنے اور سمجھنے والے کہیں نہ کہیں اپنی اپنی طاقت بھر اردو کے چراغ جلائے جاتے ہیں۔ جیسے یہ ہمارے محمد نقیب اللہ رازی ہیں۔ رہتے ہیں پہاڑوں سے گھری ایک وادی "شیشی کوہ برگہ" میں جو تحصیل دروش اور ضلع چترال میں واقع ہے۔ مادری زبان ان کی کھوار ہے۔ جس کا نام ہم میں سے بہتوں نے سنا بھی نہ ہوگا مگر انہیں اردو زبان سے بھی عشق ہے۔ چنانچہ انہوں نے مقامی ادبی تنظیم "انجمن ترقی کھوار چترال" کی رکنیت حاصل کی۔ اس فعال تنظیم کی ایک شاخ "حلقۂ دروش" کے نائب صدر رہے اور اب اسی حلقہ کے شعبہ نشرواشاعت کے صدر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

اسی حلقے کے زیر اہتمام ادبی خبرنامہ ماہنامہ "ہم کلام" جو ان کی مادری زبان کھوار کے ساتھ اردو میں بھی شائع ہوتا ہے اور سہ ماہی مجلّہ "بزمِ کھوار" (کھوار اور اردو زبان کا مجلّہ) کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اردو کے پودے کی آبیاری میں مصروف ہیں۔

"چراغ سے چراغ جلتا ہے" والا مقولہ پڑھا تھا۔ عملی حیثیت میں یوں دیکھا کہ شکاگو کے نامور

شاعر محترم حسن چشتی نے مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے مجلّہ "اخبار اردو" میں سخن ور چہارم اور گفتنی کی اشاعت کی خبر شائع کرا دی۔ انہوں نے ایسے نیک کاموں میں ہمیشہ میرا ہاتھ بٹایا ہے چنانچہ مجھے ڈیرہ غازی خان سے غلام حسین محبّ کا خط ملا۔ میں نے انہیں سوال نامہ بھجوایا اور انہوں نے محمد نقیب اللہ رازی کو متعارف کرا لیا۔ یوں ہم اور آپ اس رازی سے متعارف ہو رہے ہیں جو کوہساروں میں اردو زبان و ادب کی اذان دیتے ہیں۔ آیئے ہم ان سے ان کے بارے میں سنیں کہ انہوں نے کس طرح کی زندگی کی ہے اور اردو کے لیے کیا کام کر رہے ہیں۔

محمد نقیب اللہ ان کا پورا نام ہے۔ تخلص رازی ہے۔ 15 مارچ 1965ء کو بمقام شیشی کوہ دروش میں پیدا ہوئے۔ تعلیم فاضل علوم دینیہ کے علاوہ پشاور یونیورسٹی سے انہوں نے اسلامیات میں ایم۔اے کیا اور محکمہ تعلیم کھوار میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

انہوں نے کہا میں شاعری کے علاوہ نثر میں ادبی، تعلیمی، تحقیقی اور تربیتی مضامین لکھتا رہتا ہوں۔ شاعری کا آغاز زمانہ طالب علمی سے ہوا۔ ابتدا میں فرد اور قطعات لکھنے کی طرف متوجہ ہوا۔ پھر نظمیں بھی لکھیں لیکن رفتہ رفتہ غزل کو ترجیح دی۔ درج ذیل جرائد میں کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ ماہنامہ صدائے مجاہد کراچی، افکارِ معلم اور قلم قافلہ لاہور، ماہنامہ الحق پشاور، ماہنامہ جمہور اسلام کھوار اور ہمکلام نثری ادب کے حوالے سے میرے مضامین مذکورہ جرائد اور دیگر مقامی مجلوں کے علاوہ روزنامہ "آج" پشاور، ہندوکوش چترال وغیرہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

تخلیقات = مطبوعہ : کھوار زبان و ادب (اردو)۔ 2۔ معراج مومن (اردو) 3۔ جنگلات اور رائلٹی کا مسئلہ (اردو) اور 4۔ کھوار عروض و قوافی (کھوار) غیر مطبوعہ کھوار گرامر 2۔ بہترین معاشرہ 3۔ اسلامی اخلاق 4۔ رسول اکرمؐ تبلیغو طریقہ (ترجمہ) شاعری میں : غیر مطبوعہ = مجموعہ حمد و نعت (کھوار) 2۔ مجموعہ کلام کھوار 3۔ مجموعہ کلام (اردو)، تینوں زیرِ ترتیب ہیں عنقریب کسی موزوں نام کے ساتھ منظرِ عام پر آئیں گے۔

انہوں نے کہا "میری رائے میں اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ضرور ہے مگر اردو کا مرکز پاک و ہند ہونے کے باوجود ابھی تک یہ کسی ملک کی سرکاری اور دفتری زبان نہیں بن سکی۔ زبان اور مذہب کا معاملہ یکساں حیثیت رکھتا ہے۔ دونوں جب تک سرکاری حیثیت اختیار نہ کریں، ان کی بقا اور ترقی کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اردو پاکستان کی قومی زبان ہے لیکن یہی معاملہ یہاں بھی اردو کے ساتھ روا رکھا گیا ہے کہ آج صوبائی زبانوں کی اہمیت اس سے بڑھتی جا رہی ہے اور اردو ان صوبائی زبانوں کا ملغوبہ کی صورت میں موجود ہے۔ دوسری طرف انگریزی زبان یہاں کی قوم کے دل، زبان اور دماغ پر غلبہ پا رہی ہے۔ پاکستانی اردو کا تقریباً 75% حصہ انگریزی سے متاثر ہے۔ مقامی زبان والے اردو ٹھیک طرح ادا ہی نہیں کر سکتے اور نہ صحیح تلفظ کے ساتھ بول سکتے ہیں۔ ہر صوبے کے دفتروں میں مقامی زبان ہی ذریعہ اظہار ہے اور دوسروں سے گفتگو کرتے وقت مقامی زبان

+انگریزی اور اردو کی ترکیب سے ہی ایک جملہ ادا کیا جاتا ہے۔ ان حالات کے تناظر میں اردو کے مستقبل کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔"

کہتے ہیں "میں صنف شاعری میں غزل کو اظہار خیال کے لیے بہتر سمجھتا ہوں۔ غزل میں ہر قسم کے مضامین سما سکتے ہیں۔ استدلات، حوالات، تشبیہات اور تقابل کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ایک ہی مکمل شعر و تقریر و تحریر کے مرحلے میں درکار ہوتا ہے اور نظم اس کی جگہ نہیں لے سکتی۔ اسی تناظر میں نثری نظم اور نثری غزل کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس میں وقت کا ضیاع ہے۔

ادب کی تخلیق کے لیے تخلیقی نشستوں کو مشاعروں کے صف میں کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ مشاعرہ تسکین ذوق کا ایک ذریعہ ہے ورنہ اس کی ہر چند ضرورت نہیں۔ اس کا تعلق شاعر کی ذات سے ہے تخلیقی نشستیں ماضی کی آئینہ دار، حال کی ترجمان اور مستقبل کے لیے منصوبہ اور لائحہ عمل ہوتی ہیں۔ شعر کہنا کوئی اہم کام نہیں، لیکن شعر کس طرح کہا جائے؟ یہ کام اہم ہے اس کا حل مشاعروں میں نہیں ملے گا، تخلیقی نشستوں ہی میں اس کے عناصر زیر بحث آئیں گے۔ اگر انسانی ترقی کو کتب بینی اور کتب نگاری پر ٹھہرا لیا جائے، اس حیثیت سے کہ ایک انسان اپنے تجربات بروئے کار لا کر معاشرے کو کچھ دے سکتا ہے اور معاشرے سے کچھ لے سکتا ہے۔ تو یہ کہنا بجا ہے کہ الیکٹرونک میڈیا اس ترقی کی راہ میں حائل ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ الیکٹرونک میڈیا کو بھی کار آمد بنانے والے اور انہیں مواد فراہم کرنے والے بھی اہل قلم ہی ہوتے ہیں لیکن ایک ہی فرد کے تجربات پوری دنیا کے افراد کے تجربات سے بڑھ کر نہیں ہوتے اور نہ ان کی جگہ لے سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج "علم" کم ہے اور "معلومات" زیادہ ہیں۔ آج انسانیت کی تاریخ ایک ڈرامے سے کچھ زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اس کے لیے ہمیں سب سے پہلا یہ کام کرنا چاہئے کہ الیکٹرونک میڈیا کے اوقات کار اور دورانیہ کو محدود کرنے پر زور دینا چاہئے۔

اردو ادب میں حقیقت نگاری اور رواداری کا رجحان کم ہوتا جا رہا ہے۔ ادب کی ترقی کی غرض سے ادب اور ادیب کو ٹولیوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ گروہ بندی اگر تعمیری سوچ کے پیش نظر ہو تو اس کے نتائج بھی تعمیری ہوں گے لیکن اس کے ذریعے ادب کے پرخچے اڑائے جا رہے ہیں۔ ایک گروہ کے ارکان جو کچھ رطب و یابس جمع کرتے ہیں، وہ ان کے نزدیک ادب عالیہ کہنے کے قابل ہوتے ہیں تو تنقید کی گنجائش کہاں رہ گئی؟ شخصیت پرستی کی وبا یہاں تک پھیل گئی ہے کہ آج ایک شاعر اپنا سارا دیوان اپنے دوست یا سہیلی کے نام سے شائع کروا کر اسے بھی "بڑا شاعر" بنا سکتا ہے اور بنایا بھی ہے۔ پھر یہ کہ بڑے عہدے کا شاعر بھی بڑا اور چھوٹے عہدے کا شاعر بھی چھوٹا تصور کیا جاتا ہے تو ایسی صورت میں حقیقت پر مبنی تنقید انتہائی ضروری ہے تاکہ فن اور صلاحیت کو عہدے اور رشتے سے ماورا خیال کرتے ہوئے تنقید برائے تعمیر کا سلسلہ جاری رکھا جا سکے۔

MOHD. NAQEEBULLAH RAZI
HINDUKUSH N.W.F.P PAKISTAN

انتخابِ کلام

محمد نقیب اللہ رازیؔ

سلام

سلام اے شافعِ محشر، سلام اے ساقیٔ کوثر
سلام اے ہادیٔ و رہبر، سلام اے، پیکرِ انور

سلام اے رحمتِ عالم، سلام اے افضل و اکرم
سلام اے نغمۂ شاہاں، سلام اے نعرۂ مضطر
سلام اے باوفا دلبر، سلام اے جاں فزا پیکر
زباں پہ تادم، آخر، ترا ہی نام ہو ازبر

سلام اے سرورِ اعلیٰ، سلام اے مرجع و ماویٰ
ہے تیرا گنبدِ خضریٰ، خلائق کے لیے محور

سراپا تو ہی رحمت ہے، ترا کیا غم جو اُمت ہے
سبھی کی تجھ سے نسبت ہی، ترا دشمن ھوالابتر

جو روئے والضحیٰ بھی ہو، رسولِ مجتبیٰ بھی ہو
امام الانبیاء بھی ہو، وہی ہے میرا پیغمبر

خطاکاروں پہ شفقت ہے، تجھے اذنِ شفاعت ہے
خدا کے بعد تو ہی ہے ہمارا سایۂ گستر

اے رازیؔ وہ میرا آقاؐ، جو بزم دو جہاں زیبا
ہمہ اوصاف میں تنہا، نہیں ان کا کوئی ہمسر

کوئی اُس سے پوچھے جو گھر کا بڑا ہے
وہ کتنے محاذوں پہ تنہا کھڑا ہے

رخسار
۱۵ جنوری ۲۰۰۰ء

محمد رخسار انصاری ناظم آبادی

بحرین

محمد رخسار انصاری 22 اکتوبر 1959ء کو کراچی پاکستان اور غالباً ناظم آباد میں پیدا ہوئے کہ رخسار ناظم آبادی تخلص اپنالیا۔ ایف۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ 1991ء سے بحرین (عربین گلف) میں ملازمت کے سلسلے میں مقیم ہیں۔

اپنے بارے میں انہوں نے بتایا کہ ان کی شاعری غم دوراں سے زیادہ متاثر ہے ان کا کلام اردو نیوز جدہ سعودی عربیہ، روزنامہ پرتاب دہلی، جنگ کراچی، خبریں لاہور اور نوائے وقت رام پور بھارت میں شائع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ "ریڈیو جدہ" سعودی عربیہ "ریڈیو ایشیا" دبئی متحدہ عرب امارات سے بھی کلام نشر ہوتا رہتا ہے۔ وسائل نہ ہونے کے سبب دو مجموعے "انتظار کی زحمت" اور "زندگی" کے مسودات طباعت کے منتظر ہیں۔

شعری کتب کے علاوہ انہیں اسلامی، تاریخی اور عروضی کتب سے دلچسپی ہے اور مزاح نگار محترم مشتاق احمد یوسفی کو ضرور پڑھتے ہیں۔

انہوں نے بتایا زندگی میں دلچسپ واقعہ کوئی نہیں ہاں اہم واقعات کافی ہیں جن میں ایک واقعہ جو بار بار رونما ہوا اور عجیب ہے وہ یہ کہ جس سے بھی تھوڑا یا بہت دلی قرب رہا پھر اس سے ایک طویل

عرصے کے لیے دور رہنا پڑا جن سے بھی محبت رہی، دوستی رہی، انسیت رہی لگاؤ رہا کسی نہ کسی بہانے بچھڑنا پڑا۔

اردو کے متعلق ان کی رائے ہے اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے اور اس کا مستقبل روشن ہے اور امید ہے کہ اس صدی میں اردو مزید ارتقائی منازل طے کرے گی۔ پروردگار سے دعا ہے کہ اس صدی میں اردو دوسری بڑی زبان کا درجہ پا جائے۔"

ان کی رائے میں شاعری میں اظہارِ خیال کے لیے غزل سب سے موزوں ہے۔ نثری نظم اور نثری غزل کے تجربے ہو رہے ہیں مگر ان تجربوں کو کامیابی نہیں ملی، جو کلام عروضی پابندیوں کے ساتھ تخلیق ہوگا وہی کلام زندہ رہے گا اور ادب کی تخلیق کے لیے آج بھی نشستیں زیادہ اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔

کہتے ہیں الیکٹرونک میڈیا سے جہاں بے شمار فوائد ہیں وہیں کچھ نقصانات بھی ہیں جس میں سب سے اہم ایک نقصان یہ بھی ہے کہ اب کتابوں کا مطالعہ بہت کم رہ گیا ہے اس لیے ہمیں کتابوں اور جرائد کی بقا کے لیے نئی نسل کو مطالعہ کے لیے راغب کرنے کی کوششیں کرنی چاہیے۔

انہوں نے کہا" ہر دور میں تعمیری تنقید ادب کے لیے مفید ثابت ہوئی ہے آج بھی معیاری ادب کے لیے تنقید بہت ضروری ہے مگر (تنقید برائے ادب) کیونکہ آج کل تنقید ادب سے زیادہ شخصیت پر ہوتی ہے جو کہ نقصان دہ ہے اور آخر میں ایک اہم مسئلے کی جانب آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ آج کے دور میں معیاری رسائل اور جرائد میں نئے معیاری لکھنے والوں کا کلام شائع نہیں ہو پاتا۔ اچھا اور معیاری کلام ردّی کی ٹوکری کی نذر ہو جاتا ہے آج کے دور کا یہ نئے لکھنے والوں کا اہم مسئلہ ہے۔ اس بارے میں بھی کچھ آپ کی کاوشوں کی ضرورت ہے۔"

RUKHSAR NAZIMABADI
SHOP NO: 30 ROAD NO:387
BLOCK 318, HOORA. BAHRAIN. (A.G.)
PH: 294559

انتخابِ کلام

رخسار ناظم آبادی

غزل

اِس اُداسی کی کوئی تدبیر کر
ہاتھ میں ریکھا نئی تعمیر کر

پیار کو انسانیت کا گُل سمجھ
اور خوشبو کی طرح تشہیر کر

جنگ لڑنے کی ضرورت ہی نہیں
صرف اُس کا حوصلہ زنجیر کر

فیصلہ یہ بھی مرے حق میں رہا
پھر رقم کوئی نئی تعزیر کر

زندہ رہنا ہے، اگر تاریخ میں
پُل محبت کے یہاں تعمیر کر

میرے بارے میں ترے اس ذہن میں
جو تصور ہے اُسے تصویر کر

نیند میں رخسار سپنے تھے بہت
جاگتے میں خواب اک تعبیر کر

صرف مانع تھی حیا بندِ قبا کھلنے تلک
پھر تو وہ جانِ حیا ایسا کھلا ایسا کھلا

رسا چغتائی
۱۸ ستمبر ۱۹۹۹ء

رسا چغتائی

کراچی

کچھ گفتگو سے پہلے جی چاہتا ہے چند اشعار آپ کی نذر کردوں۔ اسے سرسری انداز میں نظر سے نہ گزاریئے گا۔ اسے خوبصورت، گداز ترین اشعار سمجھ کر پڑھیے گا تو جی میں اتر جائیں گے۔

کیسے کیسے خواب دیکھے، دربدر کیسے ہوئے
کیا بتائیں روز و شب اپنے بسر کیسے ہوئے

نیند کب آنکھوں میں آئی، کب ہوا ایسی چلی
سائباں کیسے اڑے، ویراں نگر کیسے ہوئے

حادثے ہوتے ہی رہتے ہیں مگر یہ حادثے
اک ذرا سی زندگی میں اس قدر کیسے ہوئے

یہ کون شاعر ہے۔ اتنی خوبصورت باتیں کرنے والا اتنی المناکی سے دوچار کیسے ہوا؟ یہ تو ایک لمبی کہانی ہے مگر اس شاعر سے ملنے کے بعد میرا تجزیہ یہ ہے کہ

کچھ تو ہوتے ہیں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

سالہا سال سے اس زمین پر بسنے والے انسانوں نے دنیا کو خوبصورت اور آسودہ بنانے کے لیے ہر طرح کی جدوجہد کی ہے۔ اس خواہش کی تکمیل میں انسانی تاریخ طرح طرح کی ہلاکتوں اور بے شمار خون ریزیوں سے بھی گزری ہے۔ ہر زمانہ اپنی محبتوں کی تلاش میں نکلتا ہے۔ زندگی کی عمر اور وقت کی رفتار سیاہ و سفید، میلے اور اُجلے منظر ناموں کے ساتھ آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے کہ زمین آسمان اور خلاء کے درمیان زندگی اور وقت کا تسلسل کبھی نہیں ٹوٹا اور یہی ہمارے زندہ رہنے کا جواز بھی ہے اور ہمارے باقی رہنے کی تمثیل بھی۔ ہم سب اپنی باہر کی دنیا میں ٹوٹتے اور بنتے رہتے ہیں۔ بکھرتے اور سمٹتے رہتے ہیں۔ ہم اپنی اپنی خواہشوں کی صورت گری کے لیے عمل کے چاک پر اپنے اپنے خدوخال کو ادھورے پن سے نجات دلانے کے لیے مختلف علوم وفنون کا سہارا لیتے ہیں۔ ایک عمر اس جدوجہد میں گزارتے ہیں اور پھر بھی ایسا کم ہی ہو پاتا ہے کہ ہمیں اپنے مکمل ہونے کا اعتبار حاصل ہو سکے۔

مرزا محتشم بیگ عرف رسا چغتائی نے بھی ایک عمر اپنی تکمیل کے اعتبار کے حصول میں گزاری اور شاعری کو زندگی سے محبت کا ثمر سمجھا تو پھر یوں ہوا کہ شاعری ہی ان کی محبت اور طمانیت کا باعث بن گئی۔

رسا چغتائی 1929ء میں مادھوپور ریاست جے پور ہندوستان میں پیدا ہوئے 1949ء میں میٹرک کیا۔ اس کے بعد ملازمت کی۔ ان کی شعر گوئی کا آغاز 1944ء سے ہو گیا تھا۔ 1950ء کا زمانہ ان کے شعری سفر کی تیزی کا زمانہ تھا۔ ان کے باغیانہ احساس اور شاعری کے ایک منفرد انداز نے انہیں نوجوانوں کا محبوب شاعر بنا دیا۔ اس "ترنگ" کے زمانے میں بے تحاشا شعر لکھے جن میں سے اکثر ضائع ہو گئے۔ "ترنگ" کا میں نے یوں لکھا کہ محتشم بیگ چغتائی رسا چغتائی بننے سے بہت پہلے ہی "بے خودی" کے سلسلے سے وابستہ ہو گئے تھے۔ حالانکہ ان کا گھرانہ انتہائی مذہبی تھا ان کے دادا فجر کے وقت کسی کو سوتا ہوا دیکھنا گوارا نہیں کرتے تھے اور بلا تکلف بید سے سرزنش کر کے نماز کے لیے کھڑا کر دیتے تھے مگر رسا چغتائی پر ان کا کوئی حربہ، حملہ کارگر نہیں ہوا۔ یہ 1951ء میں کراچی آ گئے۔ یک گونہ بے خودی میں آمد ہوتی تو سگریٹ کے خالی پیکٹ اور کاغذ کے ٹکڑوں پر شعر لکھتے تھے۔ کہتے ہیں، خدا بھلا کرے میری نیک دل بیوی کا کہ جس نے پھٹے ہوئے کاغذوں اور سگریٹ کے ٹکڑوں کو محفوظ کیا اور یوں آج سالوں بعد رسا چغتائی کا پہلا مجموعہ بعنوان "چشمہ ٹھنڈے پانی کا" 1999ء میں خواجہ آشکار حسین اکیڈمی کے زیرِ اہتمام منظر عام پر آیا۔ اس میں رسا صاحب کا 1946ء سے 1999ء تک کا کلام موجود ہے۔

ایک طویل مدت کے بعد میری رسا صاحب سے ملاقات کینیڈا میں جشن جون ایلیا کے موقع پر

ہوئی جو منیر پرویز نے اپنی انجمن رائٹرز فورم کے تحت ستمبر 99ء میں منعقد کیا تھا۔ اس مشاعرے میں رسا صاحب بطورِ خاص مدعو کیے گئے تھے۔ منیر پرویز، خواجہ آشکار حسین صاحب مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ آشکار صاحب کراچی میں بنی باغ کالج کے پرنسپل تھے۔ اپنے وقت کے معروف شاعر تھے اور پیغمبری وقت میں بھی دوستوں کے دوست تھے۔ چنانچہ منیر میں بھی خواجہ صاحب کی یہی خوبیاں موجود ہیں۔ منیر نے خواجہ صاحب کی یاد میں ان کے نام پر "خواجہ آشکار حسین اکادمی" قائم کی۔ اس اکادمی کے زیرِ اہتمام کئی فلاحی اداروں اور جامعات کی امداد اور طالب علموں کو وظائف کی سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ منیر شعرا اور ادیبوں کے قدردان بھی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اسی جذبے کے تحت خصوصی طور پر "جشن جون ایلیا" منایا اور رسا چغتائی کا پہلا مجموعۂ کلام بھی شائع کیا۔

رسا چغتائی "بے خودی" سے تائب ہوئے ہیں اور یہ بلاشبہ ان کی زندگی کا نہایت اہم واقعہ ہے۔ کہہ رہے تھے "شراب کا چھوڑنا سب سے مشکل نظر آتا تھا وہ آسانی سے ہو گیا۔"

"مگر ہوا کیسے؟" میں نے پوچھا تو انہوں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ "غالباً 1974ء کا زمانہ تھا۔ میرے مرشد حکیم جمیل احمد عارفی کا کمال ہے۔ ویسے تو انہوں نے مجھے کبھی ٹوکا نہیں بلکہ اکثر جب میرے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے وہ خود میری بے کیفی کا اندازہ کر کے مجھے چپکے سے پیسے دے دیتے تھے اور میں وہاں چلا جاتا جہاں کوئی غم نہیں ہوتا لیکن ایک دن یوں ہوا کہ جب مجھے میری "بے خودی" کے حصول کا کوئی ذریعہ نہیں ملا تو میں نے "ترکِ بے خودی" کا ارادہ کر کے بیوی سے کہا کہ میں کل روزہ رکھوں گا۔" بیوی نے میری اس بات کو ہمیشہ کا معمول جانا اور سحری کے لیے نہیں جگایا۔ شام کو میں مرشد کے آستانے پر حاضر ہوا تو وہ مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور بلند آواز سے فرمایا "لیجیے روزہ دار آ گئے۔" میں یہ سن کر سناٹے میں رہ گیا۔ بس اس طرح میری "بے خودی" رخصت ہوئی۔"

رسا چغتائی بتا رہے تھے کہ شعری احساس نے انہیں بچپن سے ہی اسیر کر رکھا تھا۔ آٹھویں جماعت میں تھے تب اپنے ہم جماعتوں کو اشعار موزوں کر کے دیا کرتے تھے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے بھگوان داس ناگر بہت پڑھے لکھے آدمی تھے۔ کئی مضامین میں ایم اے کر رکھا تھا۔ فارسی کے زبردست عالم تھے اُن کی نظر ان اشعار پر پڑ گئی۔ جو اقبال کی زمین میں لکھے گئے تھے آٹھ شعر میں سے چھ شعر انہوں نے کاٹ دیے مگر ان کے والد سے کہا کہ اس لڑکے کے شروع رجحان میں کبھی رخنہ اندازی نہ کرنا۔ پھر اس کے ساتھ ہی ان کی شعری تربیت کا زمانہ شعری ہو گیا۔ یہ 1944ء کی بات ہے۔ بھگوان داس ناگر کی سرپرستی میں انہوں نے سب سے پہلے داغ کا مطالعہ کیا۔ پھر مصحفی اور انشاء اور سودا کا۔ اس کے بعد دیوان غالب جن کے بارے میں ناگر صاحب نے کہا کہ اگر سمجھ نہ آئے تو بھی اسے زبانی یاد کر لینا۔ پھر پاکستان ہجرت سے قبل آخر میں میر کو پڑھا۔

پاکستان آنے کے بعد انہوں نے فیض اور راشد کا بھی مطالعہ کیا۔ اقبال اور جوش کو تو پہلے

پڑھ چکے تھے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ کس کی شاعری سے آپ متاثر ہوئے؟ انھوں نے فرمایا۔ "شاعری سے متاثر ہونا اور بات ہے اور اس کے زیرِ اثر خود ان کے لب و لہجے میں شعر کہنا الگ مسئلہ ہے۔ میں کسی سے متاثر اس طرح نہیں ہوا کہ میری شاعری میں کسی اور کا اسلوب نمایاں ہوتا۔ میں اس طرح تو متاثر کرنا جانتا ہوں متاثر ہونا نہیں۔"

نثری نظم کے حوالے سے ان کا کہنا ہے "مجھے کسی بھی صنف سے بیر نہیں۔ بس شعریت کا ہونا شرط ہے۔ میں نے خود بہت سی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے چنانچہ ہر صنف کو بہتر سمجھتا ہوں لیکن کیا کروں غزل میری طرزِ حیات بھی ہے اور طرزِ اظہار بھی۔ زندگی نت نئے تجربوں سے عبارت ہے اور شاعری زندگی کی ترجمان پھر ہم اپنی رائے دینے والے کون؟ انھوں نے کہا ادیبوں اور شاعروں کی نجی نشستیں تخلیقی ہو سکتی ہیں۔ بشرطیکہ وہ نشستیں برائے نشستن، گفتن و برخاستن کی حد تک نہ ہوں۔ مشاعرے ادبی و شعری فضا کو خوشگوار بنانے میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

رسا چغتائی کہہ رہے تھے کہ "ہم نے چونکہ پرنٹیڈ میڈیا سے پڑھا ہے اس لیے ہمیں یہ میڈیا اچھا لگتا ہے لیکن اب جو لوگ الیکٹرونک میڈیا سے پڑھیں گے وہ اس سے مانوس ہو جائیں گے۔ رہی بات اہمیت کی سو وہ تخلیقی ادب کو حاصل ہے اور رہے گی۔"

تنقید کے باب میں ان کا کہنا ہے کہ لوگ تنقید کو دوسرے درجے کا ادب سمجھتے ہیں اور اس کے فقدان کا رونا بھی روتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ کوئی تو ان کی تخلیقات کا سمجھنے والا ہو۔ ہماری تنقید شاید گروہی، نظریاتی اور مختلف تعصبات میں گھر کر رہ گئی ہے۔ اس لیے سچ بر آمد نہیں ہو رہا ہے۔

1/96 Korangi No.5
Karachi- 31

انتخابِ کلام

رسا چغتائی

شہر کراچی یاد ہے تجھ کو تیرے شب بیداروں میں
مرزا رسا چغتائی بھی تھا یار ہمارا یاروں میں

ان گلیوں ان بازاروں کی نوک پلک کے متوالے
کیسے کیسے لوگ تھے جن کے نام چھپے اخباروں میں

کس پہ کتاب دل اتری اور کس نے اسمِ عشق پڑھا
کس نے یہاں بسرام کیا ان حرف و صوت کے غاروں میں

نوکِ سناں کی صورت دیکھے رات کو ہم نے تارے بھی
رات کو ہم نے چاند بھی دیکھا تیرے پہرے داروں میں

اس بستی کے پس منظر میں دُور تلک دیواریں ہیں
اور کسی نے چُن رکھے ہیں سائے ان دیواروں میں

اور طنابِ خیمۂ شب کو کھینچ کے باندھو لفظوں سے
اور گھٹن کو موسم لکھو شاہوں کے درباروں میں

یوں تو اپنی چپ پہ مجھ کو ناز بہت ہے
لیکن اب کے سانسوں میں آواز بہت ہے
رشمی بادشاہ
15.11.99

رشمی بادشاہ

کان پور ہندوستان

میرے لیے قابلِ توجہ بات یہ تھی کہ رشمی، محترم قتیل شفائی کی چہیتی شاگرد ہے۔ میں نے رشمی کو، ہاں اس رشمی کو سخن ور چہارم کا سوالنامہ بھیجا جس کے لیے قتیل نے اپنے مجموعہ کلام "مونا لزا" کے پیشِ لفظ بعنوان "یہ مونا لزا" (یکم دسمبر 98ء) میں لکھا ہے کہ "میں نے ہمیشہ سے بھی کچھ زیادہ سچ کے کینوس پر اپنے محسوسات اور تجربات کی تصویریں بنائی ہیں۔ یہ تصویریں مجھ سے کس نے بنوائی ہیں۔ مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو میرے اس مجموعہ کلام میں میری وہ ہمدم و دمساز رشمی، زیرِ لب یوں مسکراتی دکھائی دے گی جیسے لیونارڈ کی مونا لزا اس کی پینٹنگ کے الہامی رنگوں میں مسکراتی دکھائی دیتی ہے۔"

میں 8 نومبر 99ء کو لاس اینجلس سے دہلی روانہ ہوئی۔ پھر مجھے 15 نومبر 99ء کا رشمی کا لکھا خط اور تعارف لاس اینجلس ہوتا ہوا دسمبر میں کراچی میں ملا جس میں رشمی نے اپنے شریکِ حیات طیب بادشاہ کے انتقال کی افسوسناک خبر لکھی تھی۔ رشمی نے لکھا کہ 25 اکتوبر 99ء کے دن وہ دل کے اچانک جان لیوا دورے کے باعث رشمی کو چھوڑ گئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) اب رشمی کان پور میں اپنے میکے میں ہیں۔

میں نے رشمی کو تعزیت کا خط لکھا۔ خدا تعالیٰ اسے اپنے شریکِ حیات کی جدائی کے دکھ کا بوجھ اُٹھانے کی ہمت دے۔ آمین

قتیل شفائی کی شاگردی میں رشمی نے شاعری کی کئی منزلیں سر کی ہیں۔ اکثر جگہ رشمی کے اشعار قتیل کی مشاقی اور ان کے رنگ کے بھی مظہر نظر آتے ہیں اور یہ امر فطری ہے۔

آیئے ہم آپ کو ایک خوبصورت شاعرہ سے ملائیں جو کہتی ہیں میرا نام تو رشمی بادشاہ ہے اور تخلص بھی رشمی ہے، جائے پیدائش کان پور (یوپی) ہے، 18 دسمبر 1966ء کو دنیا میں آئی تھی۔ انٹر تک تعلیم حاصل کی، اس کے بعد شادی ہو گئی۔

شاعری مجھے زیادہ عزیز ہے، رہی بات یہ کہ کس مکتبہ فکر سے میرا تعلق ہے تو اس کے جواب میں اپنا ہی ایک مقطع لکھ رہی ہوں

پڑھی ہی تھی کتابِ زندگی میں نے کہ بس رشمی
نظر آیا مجھے بے حد بڑا اک مدرسہ مجھ میں

میرا مجموعۂ کلام "رنگولی" 1997ء میں الحمد پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا جو شان و شوکت سے چھپا اور سال ڈیڑھ سال میں اس کا پہلا ایڈیشن فروخت ہو کر ختم ہو گیا۔ مجھے غالب، قتیل، جوش، فراق اور زندہ ہستیوں کے کلام کے مطالعہ کا شوق ہے اور اس کے علاوہ منٹو اور عصمت چغتائی کے افسانے بہت دلچسپی سے پڑھتی ہوں۔ ہندی ادب میں شوانی، شرت چندر، رویندر ناتھ ٹیگور اور پریم چند، منو بھنڈاری وغیرہ کا مطالعہ بھی کرتی ہوں۔

زندگی کے اہم واقعات میں میری شادی ہی ہے کہ میں ہندو برہمن تھی اور میرے شوہر (طیب بادشاہ) مسلمان تھے۔ جب میں نے اُن سے شادی کا ارادہ کیا تو گھر میں وبال ہو گیا، نتیجتاً میں نے زہر پی لیا۔ چھ دنوں تک کوما میں رہی۔ نہ جانے کس کے نصیب سے بچ گئی۔ ماں باپ کے دل نرم پڑ گئے مگر اس کے بعد اب طیب کی قربانی کی باری تھی لہٰذا انہیں ہندو بنا کر شادی کی گئی لیکن شادی کے چار سال بعد اچانک ایک دن مجھے بشارت ہوئی، حضرت محمدؐ میرے دل و ذہن پہ طاری ہوئے اور اُن کے کردار سے جو عشق ہوا اسی کے سرور میں ایسا ڈوبی کہ ایمان لے آئی اور اسلام قبول کیا اور طیب کو دوبارہ مسلم کیا (الحمد للہ)۔ یہ تو ہوا اہم معاملہ۔

دوسرا دلچسپ واقعہ قتیل شفائی صاحب سے میری ملاقات ہے اور ملاقات بھی ایسی کہ جو آج تک ختم ہی نہ ہوئی، قتیل صاحب کا میری زندگی میں داخل ہونا، میرے نزدیک ایک بے حد دلچسپ واقعہ ہے جس کی تفصیل بیان سے بھی باہر ہے اس لیے اس سوال کو یہیں ختم کرتی ہوں کہ اس دلچسپ واقعہ کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ہر جواب ایک سوال بن جاتا ہے!

اب یہ جو اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے اس کے مستقبل کے بارے میں کس حد تک پُر امید ہوں یہ بتانے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ اس کے پاسبانوں کا اس کے ساتھ کیا

سلوک ہے!

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ایک امتحان ہوتا ہے جناب "ادیب کامل" اور یقین جانئے کہ امتحان میں بیٹھنے والوں کا ادب تو کیا اردو کے الف تک سے دُور دُور تک ان کا واسطہ نہیں ہوتا جو ہوتا ہے وہ یہ کہ اردو کے پاسبان اسٹوڈنٹس سے کچھ پیسے لے کر اُن کے گھر ہی یہ پرچے لا دیتے ہیں اور جنہیں اردو آتی نہیں اُن کے پرچے کوئی اور لکھ کر دے دیتا ہے یہی حال معلم کے امتحان میں ہوتا ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو کا الف تک نہ جاننے والے ادیب کامل اور معلم پاس کر لیں گے تو اردو کا مستقبل کیا ہوگا؟ باوجود اس کے میں اردو کے مستقبل کے بارے میں پُر امید اس لیے ہوں کہ یہ زبان ایسی زبان ہے کہ جس میں گفتگو کرنے والا اپنے دل کو دوسرے کے سینے میں پیوست کر دیتا ہے یہ خاصیت صرف اور صرف اردو زبان میں ہے! مسلمانوں نے اس کو اپنی کہا تو ہندو نے اسے سوتیلی قرار دے تو دیا مگر ہندی کے نام پہ بھارت میں ہر زبان پہ جس کا رنگ رچا ہوا ہے وہ کچھ اور نہیں اردو ہی ہے، ہندوی کہہ لیں ہندی کہہ لیں اردو کہہ لیں زبان بھارت کی یہی ایک ہے جو کہ بھارت میں عام طور پہ بولی جاتی ہے یہ نہ ہو تو یقین جانئے بھارت گونگا ہو جائے گا۔

شاعری میں اظہارِ خیال کے لیے اپنی اپنی جگہ ہر صنف پیاری ہے مگر مجھے غزل زیادہ پسند ہے دو مصرعوں میں بہت بڑی کہانی کہنا ایک نشے کی طرح ہے۔

نثری غزل یا نثری نظم کے بارے میں، میں یہ کہوں گی کہ ذاتی طور پہ مجھے ان سے کوئی پریشانی نہیں۔ میں نے ہاتھ میں قلم اُٹھایا تو میرا فرض یہ ہے کہ میں قارئین کو نئے خیالات اور نئے نظریات دوں، نئی سوچ دوں، کس صنف میں دے رہی ہوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہاں خیال بہترین ہو اور پھر نثری نظموں یا غزلوں کی بھی کچھ پابندیاں ہیں جنہیں دھیان میں رکھ کر اگر نثری نظم یا غزل کہی جائے تو کوئی غیر مناسب نہیں ہوگا۔

کتابوں اور جرائد کی بقا کے لیے ہمیں کرنا یہ چاہئے کہ ٹیلی وژن کا استعمال کم کر دیا جائے۔ ٹی وی سوچ کو مار دیتا ہے اسی لیے آج کے بچے احمق، بنتے چلے جا رہے ہیں۔ ٹی وی سے وقت بچے تب تو کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو جناب ایک ٹی وی ہی سارے فساد کی جڑ ہے اسی کو ختم ہونا چاہئے نہیں تو جیسے اردو کے بغیر ہندوستان گونگا ہو سکتا ہے اسی طرح ٹیلی وژن کے ساتھ جئے تو ذہن گونگے ہو جائیں گے۔

کون کہتا ہے بھائی کہ دورِ حاضر میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے۔ میرے پیچھے تو ایک صاحب لٹھ لے کر پڑے ہیں کہ وہ میری تنقید کیے بنا مانیں گے ہی نہیں۔ اوروں کی تنقید یعنی تنقیص بھی سنا ہے کیا کرتے ہیں ایسے ایسے چار اور تنقید نگار ہو جائیں تو آپ کو پتہ چلے کہ تنقید کتنی کم ہوئی ہے؟

خیر یہ تو مذاق ہے دراصل آج کل ہر چیز یوں ہو گئی ہے کہ جوں کوئی کسی کا قرض اُتار رہا ہو ہر چیز ایک پروفیشن بن گئی ہے اور پروفیشن ہو جانے سے آدمی بس اُتنا ہی کرتا ہے جتنے کے اسے دام

ملے ہوں یا پھر اگر کسی تنقید کرنے والے سے آپ کے تعلقات اچھے ہوں دوستانہ ہوں تو وہ اہتمام کے ساتھ واہ واہ سے بھرپور، ایک خوبصورت سی تنقید لکھ کر چھپوا دے گا۔ آپ بھی خوش اور وہ تو خوش ہے ہی۔ جب کہ پہلے زمانہ میں تنقید نگار رہنما کا کردار ادا کرتے تھے جبکہ آج ہر شخص یا تو پروفیشنل ہے یا کیلکولیٹڈ۔ اور یقیناً ادب کی ترقی میں یہ بہت بڑا روڑا اور رکاوٹ ہے!

62-B, TAGOR REL CANTT KANPUR
PIN-208001 INDIA
0512 - 357932

اکیلی چھوڑ کر دنیا میں مجھ کو کھو نہ جانا
میں ساری عمر جاگوں گی کہیں تم سو نہ جانا

سدا محسوس ہو جس کی خلش نس نس میں مجھ کو
کوئی ایسا ادھورا لمس مجھ میں بو نہ جانا

میرا دشمن تو سارا آسماں ساری زمیں ہے
مرے تم ہو تو ان جیسے کہیں تم ہو نہ جانا

جو تم نے روح کے اقرار نامے پہ لکھا تھا
کہیں وہ نام اپنی زندگی سے دھو نہ جانا

ابھی تک آرزو کا درد میری جلد میں ہے
نئی حسرت کوئی دے کر میرے دل کو نہ جانا

مہکتے پھول جیسا ذہن جو پایا ہے تم نے
گمان و وہم کی اس پر چٹانیں ڈھو نہ جانا

خدا خود بولتا ہے شاعری میں سچ ہے رشمی
وہ شاعر کیا زمانے کا مقدر جو نہ جانا

دور کہیں سوچوں میں ہے گھر، ابھی ناؤ نہ باندھو
مانجھی رے! اباقی ہے سفر، ابھی ناؤ نہ باندھو

کالی داس گپتا رضا
16/12/1999

کالی داس گپتا رضا

ممبئی

کالی داس گپتا رضا کو غالب کے حوالے سے جب جب پڑھا، ان سے ملاقات کی تمنا کی طلب بڑھتی گئی۔ دسمبر 1999ء میں یہ تمنا اس وقت پوری ہو گئی جب میری ان کی ملاقات برہانی کالج بمبئی میں ایک تقریب میں ہوئی۔ بمبئی کے ایک درویش منش شاعر عبدالاحد ساز اس تقریب کے منتظمین میں سے تھے وہ برہانی کالج کے پروفیسر "قاسم امام اور ڈاکٹر زبیدہ رحمانی کے علاوہ ڈاکٹر زہرہ موڈک (صدر شعبہ اردو) اور پرنسپل شیخ قربان حسین سعید کی معاونت کر رہے تھے۔

گپتا جی سے دوسری ملاقات ان کے گھر ہوئی۔ گفتگو اور تفصیلی ملاقات کا موع ملا تو "سخن ور چہارم" کے تعارف کے لیے میں نے انھیں زحمت دی۔ انہوں نے مجھے اپنی بہت سی کتابوں سے نواز اور میں نے علم کے لعل و گہر سمیٹ کر اپنی خوش بختی پر خدا کا شکر ادا کیا۔ گپتا جی نے اپنے مجموعۂ کلام "ابھی ناؤ نہ باندھو" کا تازہ نسخہ بھی عنایت کیا جس کی پشت پر ان کے ہم عصر نامور شاعر علی سردار جعفری کی ان کے لیے کہی گئی آٹھ اشعار کی نظم درج ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں

"روش رضائے الٰہی کی ہے عجیب و غریب
ہمارے عہد میں آیا ہے ایک رمز شناس

ہے اس کے علم کے شعلے میں جوہرِ شمشیر
اور اس کے ذوقِ سخن میں جوہرِ الماس
خدا کرے وہ ملے اس کو منزلِ تحقیق
پہنچ سکیں نہ جہاں رہروانِ وہم و قیاس
"سلامتِ ہُنر و حرف، در سلامتِ تُست"
کہ جزوِ اعظمِ گپتا ہے اسم کالی داس

"شعاعِ جاوید" ان کی رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنے مضمون "کالی داس گپتا رضا دیارِ شاعری میں" تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "جو شخص تحقیق میں سر کھپاتا ہو اس کی طبیعت کو مشکل پسندی سے یک گونہ مناسبت تو ہو گی ہی۔ رباعی کو مشکل صنف کہا گیا ہے۔ شاید ہیئت کے اعتبار سے نہیں معنی کے اعتبار سے کہ تین مصرعوں میں بات کو کھولنا چوتھے میں مکمل کرنا، صرف مصرعے جوڑنے کا معاملہ نہیں بلکہ کچھ پیچ معنیاتی فضا کا ہے یعنی ایسی بات پیدا کرنا جو تین مصرعوں میں کھل سکے اور چوتھے مصرعے میں مکمل بلکہ اکمل اس طرح سے ہو کہ نکتہ آفرینی کا حق ادا ہو جائے۔ یہ ہے رباعی کا کمال۔ کتنے اہلِ کمال اس پر پورے اترتے ہیں۔ چار مصرعوں کی "جمل بندی" تو سب کر لیتے ہیں۔ رضا کی رباعیوں کو پڑھ کر یوں خوشی ہوئی کہ ان میں خیال کی تتلی کو پکڑنے، اس کے رنگوں کو گرفت میں لینے اور ان سے اظہار کا ہیولہ تیار کرنے کا جوہر ملتا ہے۔"

ایک رباعی ملاحظہ ہو

آفاق ادھر کھولے ہوئے ہیں باہیں
بھرتا ہے ادھر رات دن انساں آہیں
بہتی ہے ندی، ہے، نہ پہچانیں ہم
اور پیاس سراب سے بجھانی چاہیں

اب ہم گپتا جی سے ملیں اس سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ انہیں غالب پر کام کرنے کے حوالے سے 1989ء میں آل انڈیا غالب ایوارڈ کے علاوہ 1996ء میں ال انڈیا بہادر شاہ ظفر ایوارڈ اور 1997ء میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ایوارڈ برائے سراج اورنگ آبادی، تو ملا ہی ہے مگر 1999ء میں انہیں ان کی خدمات کے اعتراف میں "فروغ اردو ادب دوہا قطر کے چوتھے عالمی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ یہ اعزاز بذاتِ خود بہت بڑا اعزاز ہے۔ اس سلسلے میں برہانی کالج کے مجلّے میں جو اداریہ لکھا گیا ہے اس میں کہا گیا ہے "یہ ایوارڈ جہاں ہم ہندوستانیوں کے لیے باعث افتخار ہے وہیں اس بات کا ملال بھی ہے کہ 60 کتابوں کے مصنف رضا صاحب کی کاوشوں کی ہم نے آج تک وہ پزیرائی نہیں کی جس کے وہ مستحق ہیں۔ غالب شناس اور داغ فہم، گپتا صاحب کی ادبی خدمات کا ایک لامتناہی سلسلہ

جسے ہندوستان سے زیادہ پاکستان نے سراہا۔ یہ ہماری کم علمی کا ثبوت ہے کہ ہم اپنے شہر میں مقیم ایک عظیم المرتبت شخصیت کے جوہرِ بے پایاں سے ناواقف ہیں۔"

محترم کالی داس گپتا رضا کی تمام زندگی اردو کی بقا اور فروغ میں گزری لیکن پچھلی ایک دہائی سے وہ اپنی کاروباری زندگی سے سبک دوش ہو کر صرف اردو کے فروغ اور نشر و اشاعت میں منہمک ہیں۔ ان کی تمام کتابیں مختلف موضوعات پر لکھی ہوئی ہیں۔ وہ ایک خوش فکر شاعر ہیں۔ ان کی شعریات کا دامن وسیع ہے۔ غزل، نظم، رباعی اور گیت جیسی تخلیقی اصناف پر ان کی دو کتابیں موجود ہیں۔ نثر میں ان کا رنگ انفرادی ہے۔ مشرقی افریقہ میں اردو کے موضوع پر ان کی دو کتابیں تحقیق اور تنقید کی عمدہ مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔

کالی داس گپتا رضا گرچہ اگروال ہیں لیکن ان کا ادبی سلسلہ جوش ملسیانی کے توسط سے براہِ راست مرحوم داغ دہلوی سے ملتا ہے۔

رضا صاحب کی ادبی پذیرائی کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اب تک آپ کے فکر و فن پر 19 کتابیں چھپ چکی ہیں اور کئی یونیورسٹی میں آپ پر تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ رضا صاحب کا ادبی کام مختلف جہتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ آپ نے بے شمار کتابوں پر حرفے چند لکھ کر نئے اذہان کی رہنمائی کی ہے۔ کئی نامور جدید شعرا پر تنقیدی مضامین لکھ کر اپنی تنقیدی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔

کالی داس گپتا 25 اگست 1925ء کو سکندر پور تحصیل نواں شہر جالندھر پنجاب میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کے بعد جامعاتی تعلیم تو حاصل نہ کر سکے مگر اردو ادیب فاضل، منشی فاضل اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ مشرقی افریقہ جانے کے بعد وہاں سے سینئر کیمبرج کیا۔ انگریزی اور فارسی کورس کی بنیادی زبانیں تھیں۔ لندن چیمبر آف کامرس اور رائل سوسائٹی آف آرٹس سے اکاؤنٹس کے امتحانات میں اعزازات کے ساتھ کامیابی حاصل کی اور بار ایٹ لا کی سند بھی لے لیتے اگر انہیں درمیان میں اپنے ذاتی کاروبار کی مصروفیات کی وجہ سے قانون کی تعلیم ادھوری نہ چھوڑنی پڑتی۔

میں نے ان سے پوچھا تھا کہ انہوں نے رضا تخلص کیونکر اپنایا؟ جواب میں انہوں نے ماضی کی یادوں کو جمع کیا اور کہنے لگے۔ "ہمارے گاؤں میں عاشورے کے دن علم اٹھایا جاتا تھا۔ ہمارے گھر کے پاس ایک کنواں تھا جو شربت سے بھر دیا جاتا تھا اور والد صاحب ہم تمام بھائیوں کو کنویں کے پاس کھڑا کر کے یہ ذمہ داری سونپ دیتے تھے کہ ہم سب مہمانوں کو شربت پلائیں۔ علم اٹھنے، نوحے پڑھنے اور تبرک تقسیم کرنے کے اخراجات والد صاحب کے ذمے ہوتے۔ یہ روایت کوئی سو سال سے چلی آ رہی تھی۔ رمضان شریف کے پورے متبرک ماہ میں بھی افطار کے بعد روزہ داروں کو کھانا کھلایا جاتا۔ اسی طرح دیوالی کے تہوار پر بھی منوں کے حساب سے مٹھائیاں بنوا کر تقسیم کی جاتیں۔ گویا کہ یہ ہندو مسلم یک جہتی کی مثال تھی۔

1947ء کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس زمانے کا ایک روپیہ آج کے سو روپیوں کے برابر

تھا۔ 1930ء میں بھی سونا 31 روپیہ تولہ اور چاندی بارہ آنے تولہ ملتی تھی۔ اس وقت میری عمر بارہ تیرہ سال تھی۔ میں نے محرم کی مجلسوں اور اماموں کے نام کے زیرِ اثر یہ تخلص اپنایا۔ شاعری میں نے فارسی میں شروع کی تھی افسانے بھی اسی زمانے میں لکھے تھے۔ بمبئی آکر 1970ء میں تحقیق کے کام کا آغاز کیا۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے "تذکرہ گلشن بے خار پر ایک نظر" کے عنوان سے مقالہ لکھا۔ یہ شیفتہ کا تذکرہ ہے اور خود انہوں نے اس میں اپنی جتنی تعریف لکھی ہے وہ بے جا ہے۔ شاعر وہ بلاشبہ بہت اچھے تھے لیکن اپنی تعریف اور وہ بھی اپنی کتاب میں! بے معنی ہے۔"

کالی داس گپتا جی بتا رہے تھے کہ میری شاعری داغ کے مکتبہ فکر سے متاثر ہے۔ انہوں نے شاگرد سے استاد کا سلسلہ ملاتے ہوئے کہا کہ جوش ملسیانی کے بعد داغ۔ پھر ذوق اور شاہ نصیر کے بعد مائل، سودا اور سودا کے بعد مہر علی حاتم کا نام آتا ہے۔

پھر ذکر چلا چند آوارہ مصرعوں کا جو بہت مشہور ہوئے ہیں مگر ان کے خالق کا نام بہت سوں کو نہیں معلوم۔ اس ضمن میں بھی رضا صاحب نے دو سو اشعار جمع کر کے کام کیا ہے جیسے

نالۂ بلبل و شیدا تو سنا ہنس ہنس کر
"اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی"

یہ فراق گورکھپوری کا شعر ہے جو 1896ء میں پیدا ہوئے اور 1982ء میں ان کا انتقال ہوا۔

کالی داس گپتا جی صنفِ شاعری میں غزل کو پسند کرتے ہیں۔ کہنے لگے اس کی جڑیں بہت مضبوط ہیں۔ اب تو مراٹھی اور گجراتی زبان میں بھی غزل کہی جا رہی ہے۔ نثری غزل کے حوالے سے انہوں نے کہا "عربی میں آتا ہے کہ شعر وہ ہے جو قصداً کہا جائے اور وزن میں ہو۔" لہٰذا آپ دو رکن میں کہیں یا دس ارکان میں اس کا وزن میں ہونا ضروری ہے۔ آزاد نظم کی حد تک تو قابلِ برداشت ہے اس سے زیادہ نہیں۔ گپتا جی شعری نشستوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور ان مشاعروں کو بھی جن کے ذریعے تہذیب و ثقافت پروان چڑھتے ہیں۔ ان کا مشورہ ہے کہ نثری نشستوں کو فروغ ملنا چاہئے۔ انگریزی کی طرح اب نثری تحریر میں بھی اختصار پیدا کرنا چاہئے کہ یہ موجودہ زمانے کا تقاضا ہے۔ گو اس میں محنت بہت درکار ہے۔

کتابوں کی بقا کے لیے ان کا مشورہ ہے کہ ہم پہلے بحیثیت قوم خود کا سدھار کریں۔ میرٹ کی بجائے ہم ادبی اداروں میں سفارشی آدمی بھر لیتے ہیں جو انگریزی اور اردو کوئی زبان بھی ٹھیک سے نہیں جانتے۔ انگریزی کی استعداد بھی بہت ضروری ہے کہ اج اس کے جانے بغیر ہم ترقی کی جانب نہیں بڑھ سکتے۔

ایک سوال یہ بھی تھا کہ پاکستان اور ہندوستان کی شاعری میں وہ کوئی فرق پاتے ہیں؟ ان کا جواب تھا کہ کوئی خاص نہیں۔ پاکستانی ادیب چونکہ پاکستان کے حالات کے پس منظر میں لکھتے ہیں لہٰذا ان کی تحریروں میں وہ آزادی نہیں پائی جا سکتی جو ہندوستان کے ادیبوں کی تحریروں میں ملے گی۔

حالانکہ پاکستان میں اچھے جرائد ہندوستان کی نسبت زیادہ شائع ہوتے ہیں۔

تنقید کے حوالے سے بھی وہ اس بات پر متفق ہیں کہ آج اس طرح سے فنی تنقید نہیں ہو رہی کہ نئے لکھنے والے کچھ سیکھ پائیں۔ آج تو نقاد تنقید کرتے کرتے شاگرد بنا لیتے ہیں۔ ہمارے استاد شاگرد نہیں بناتے تھے مگر فنی رہنمائی کرتے تھے۔ ہم گفتگو گفتگو میں ہی بہت کچھ سیکھ جاتے تھے۔

اردو کے تحفظ کے سلسلے میں انہوں نے مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ "ہمیں لائبریریاں زیادہ سے زیادہ بنانا چاہئیں اور کتابیں خرید کر پڑھنا چاہئیں اور لائبریریوں کو دینا چاہئیں۔ میں خود ایسا کرتا ہوں اور یہ میں اپنی زبان سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میرے بعد کوئی یہ بات میرے حوالے سے نہیں کہے گا۔ میں ہر ماہ رسائل خریدتا ہوں اور لائبریریوں کو دیتا ہوں۔ لوگوں میں مطالعے کا شوق کم ہو گیا ہے ہمیں انہیں مطالعے کی طرف مائل کرنا چاہیے۔"

اپنے آئندہ کے پروگرام پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ وہ "شہر شہر غالب" کے عنوان سے ایک رسالہ شروع کرنا چاہتے ہیں جسے ہم کتاب کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ یعنی غالب پہلی کتاب غالب دوسری کتاب۔ اس میں غالب سے متعلق ہی سارا مواد ہوگا اور جو بھی لکھنا چاہے۔ ہم اُسے خوش آمدید کہیں گے۔ یہ رسالہ 30یا32 صفحات پر مشتمل ہوگا۔ ابھی ہمیں غالب کو اور جاننا ہے۔ غالب جس معاشرے میں پیدا ہوا تھا ہم کلی طور پر اس کے بارے میں کیا جانتے ہیں اور کتنا جانتے ہیں؟ ہمیں نہیں بھولنا چاہئے کہ اردو کی شعری روایت ہی نہیں پوری ادبی روایت بھی غالب کے بغیر نہیں سمجھی جاسکتی۔"

گپتا صاحب نے مجھے جو کتابیں عنایت کیں میں نے ان کا بھی مطالعہ کیا۔ انہوں نے دیوان غالب (مطبوعہ 1841ء) کی عکسی اشاعت 1986ء میں کی۔ اس میں رضا صاحب کا پیش لفظ شامل ہے۔ یہ ایڈیشن کم یاب تھا۔ اس کا مسودہ غالب نے 25 جون 1860ء کو شیو نارائن کو بھیج دیا تھا۔ گپتا جی نے پہلے ایڈیشن کی عکسی اشاعت اس لیے کی کہ اس مسودے کو خود غالب نے اپنے قلم سے درست کر کے اور نظر ثانی کے بعد اشاعت کے لیے دیا تھا۔ اس مسودے کے اور بھی ایڈیشن شائع ہوئے تھے اور غالب کے کلام میں تحریفیں بھی ہوئیں۔ ش۔ کاف نظام نے گپتا جی پر جو مضمون لکھا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ مرزا غالب کی مشہور غزل جس کا مطلع ہے ؎

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہوتے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک

اصل مطلع ہے جبکہ ہم تک یہ "ہوتے تک" کے بجائے "ہونے تک" پہنچا ہے۔ اسی طرح عکسی اشاعت میں غالب کا ایک مطلع ہے

؎ دوست غم خواری میں میری سعی فرماویں گے کیا

زخم کے بڑھنے تلک ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا

کو "جائیں گے" اور "فرمائیں گے" کر دیا گیا ہے۔ یہ تحریف "نسخۂ حمدیہ" میں بھی موجود ہے اور دیگر لوگوں کا ذکر کیا مولانا نظم طباطبائی، بے خود دہلوی، حسرت موہانی، بے خود موہانی، سلیم چشتی، جوش ملسیانی اور آغا محمد باقر کی شرحوں میں بھی یہ تحریفات موجود ہیں۔

چنانچہ رضا صاحب کا یہ تاریخی کام 1988ء میں سامنے آیا جسے اردو دنیا "دیوانِ غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے" کے نام سے جانتی ہیں۔ اس دیوان کی ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں رضا صاحب نے سولہ صفحات کی "توقیت غالب" بھی شامل کی ہے جو 1995ء کے ایڈیشن میں انتیس صفحات تک پھیل گئی ہے۔ اس توقیت سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مرزا غالب کو کن واقعات نے کتنا متاثر کیا ہوگا اور انسوں نے اس کا اظہار کس طرح کیا ہے۔ غرض یہ کہ غالب کی شخصی اور شعری شخصیت کی تشکیل، تعمیر اور تفہیم میں ہی "توقیت" کلیدی حیثیت کی حامل ہے۔ ان کے علاوہ یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ہمارے داستان پسند معاشرے نے شعر کو سامنے رکھ کر کس کس طرح کی بے سروپا باتیں مشہور کر رکھی ہیں۔

ان کی اردو زبان سے محبت ہی ان سے یہ سارے تحقیقی کام کروا رہی ہے۔ کالی داس گپتا رضا کا یہ جملہ بھی تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ

"اردو مجھ سے نہیں ہے، میں اردو سے ہوں"

اور پھر ان کے یہ اشعار ؂

دھکے دیتا ہے ہر اک چھوٹا بڑا اردو کو
ہائے کیا میٹھی زباں ملک بدر ہوتی ہے
اے رضا شعر ہی وہ کیا نہ ہوں معنی جس میں
جنگِ الفاظ معانی ہی سے سر ہوتی ہے

MR. KALIDAS GUPTA RAZA
2A JALDARSHAN, 43 A 4TH FLOOR
NEPEON SEA ROAD
BOMBAY 300036 INDIA

انتخابِ کلام

کالی داس گپتا رضاؔ

کھل گئے بھید جب زمانوں کے
اڑ گئے ہوش رازدانوں کے

لذتِ درد بٹ گئی گھر میں
پیٹ خالی ہیں میہمانوں کے

دیکھیں کس بے گناہ پر جھپٹیں
بھوکے کردار داستانوں کے

جیسے کچی کپاس کا چننا
قہقہے یوں ہیں بدگمانوں کے

حق تھا اپنا جلا دیا تو کیا
ہم پڑوسی ہیں آشیانوں کے

پنکھ تولو، مگر خیال رہے
اب اصول اور ہیں اڑانوں کے

گو رضاؔ سوچ میں ہیں شام و سحر
کھولے رکھتا ہے در مکانوں کے

دورِ فصلِ بہار آئے گا
فضلِ پروردگار آئے گا

رفیق احمد
۲۷ مئی ۱۹۹۹ء۔

رفیق احمد رفیق

کیلی فورنیا۔ امریکا

اصنافِ سخن میں یوں تو رفیق احمد رفیق غزل اور نعتیہ شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں لیکن اگر ان کی نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ رفیق بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں یا نظم کے۔ ان کی نظموں میں عصرِ جدید کا کرب اور عہدِ جدید کی بے چہرگی نمایاں ہے۔ ملاحظہ ہو :

یہ بھی اک دورِ انقلابی ہے
آج ہر شخص اضطرابی ہے

علم و عرفاں کا دور ختم ہوا
اب وسیلوں میں کامیابی ہے

کیوں تنزل رفیق برپا ہے
ضابطوں میں کہیں خرابی ہے

رفیق احمد نام اور تخلص رفیق ہے۔ 15 جون 1925ء کو قصبہ انچولی ضلع میرٹھ (یوپی)

ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ 1946ء میں میرٹھ کالج سے بی۔اے کیا اور اسی سال الہ آباد میں کلکٹر آفس لینڈ کسٹم سے ملازمت کا آغاز کیا۔

1953ء میں اس محکمہ سے استعفیٰ دے کر پاکستان انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن کراچی میں ملازمت شروع کی۔ 1963ء میں پاک عرب کھاد فیکٹری میں ترقی پر تعیناتی ہوئی 1985ء میں ریٹائر ہو کر کراچی میں رہائش پذیر ہو گئے۔ ملازمت کے دوران ادبی محافل کا انعقاد، نعت خوانی کے عظیم الشان اجتماعات اور مشاعروں کی مجالس کا باقاعدگی سے اہتمام اور علماء کرام کے روحانی جلسے کراتے رہے۔ ان تمام محافل میں پاک عرب کھاد فیکٹری کے اعلیٰ ترین حکام اور فیکٹری کے تمام عملے اور عمائدینِ شہر کی شرکت سے عجب پر کیف منظر ہوتا تھا۔ انتظامیہ نے مکمل اختیاراتِ نظم و ضبط انہیں تفویض کیے تھے۔ علاوہ ازیں مسجد کمیٹی کی انتظامیہ نے بیس پچیس سال مسلسل انہیں کبھی چیئرمین اور کبھی سیکریٹری بنائے رکھا۔ فیکٹری ہٰذا کے دو ہائی اسکول کے چیئرمین اور سیکریٹری بھی رہے ہیں۔ ملازمت کی آخری مدت میں صدرِ پاکستان نے جو صلوٰۃ کمیٹی بنائی تھی اس کے چیئرمین بھی رہے۔ حج کے لیے روانہ ہوئے تو حج آفس نے انہی کو امیر الحجاج بنا کر روانہ کیا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے۔

شاعری کے علاوہ ان کی ادب کی کسی اور صنف سے وابستگی نہیں رہی۔ شاعری میں مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خاں سے متاثر ہیں۔ مجموعہ کلام میں نعتیہ کلام کا کچھ ذخیرہ جمع ہو چکا ہے اور اسی کو شائع کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ کلام شائع کرانے کا مقصد ذاتی شہرت نہیں بلکہ نذرِ عقیدت کے طور پر سرکارِ رسالت مآبؐ کی خدمت میں پیش کرنا ہے اور حضورؐ کی شفاعت حاصل کرنا ہے۔ مصروفیات کی بناء پر رفیق احمد منتخب افسانے، اساتذہ کا کلام، اور سیاسی مبصرین کے مضامین پڑھتے رہتے ہیں۔ پابندی سے مفتی شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی تفسیر کا آج کل مطالعہ کر رہے ہیں اور اپنے علم میں اضافہ کر رہے ہیں۔

اپنی زندگی کا اہم واقعہ سناتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ایک بار میں عصر کی نماز پڑھنے مسجد گیا تھا۔ وہاں ایسا دل لگا کہ مغرب تک ذکر میں مشغول رہا۔ گھر سے عدم موجودگی کے درمیان کئی بار جنرل منیجر کا ڈرائیور گھر پر آیا اور ہر بار یہ کہہ کر چلا گیا کہ جنرل منیجر صاحب رفیق صاحب کو گھر بلا رہے ہیں وہ جیسے ہی آئیں جنرل منیجر صاحب سے گھر پر ملیں۔ مغرب کی نماز کے بعد گھر پہنچا تو اہلیہ نے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ میں حیران و پریشان۔ قرآنی آیات کا ورد کرتا ہوا جنرل منیجر صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھلا اور ملازم نے اندر لے جا کر جنرل منیجر صاحب کے سامنے پیش کر دیا۔ انہوں نے پوچھا کہاں تشریف لے گئے تھے؟ میں نے بتایا عصر کی نماز پڑھنے گیا تھا جناب۔ وہاں ایسا دل لگا کہ اُٹھنے کو دل ہی نہیں چاہا۔ انہوں نے کہا۔ دیکھو ہیڈ آفس سے فلاں صاحب آئے ہوئے ہیں۔ ان سے جا کر ملو۔ یہ سنتے ہی دل کی دھڑکنوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ میں نے گھبرائے

لہجے میں پوچھا حضور کیا اس تابعدار بندے سے کوئی خطا سرزد ہوگئی ہے کہ ہیڈ آفس سے خصوصی طور پر افسر مذکور تشریف لائے ہیں۔ انہوں نے فرمایا پہلے تم افسر مذکور سے ملو پھر مجھ سے آکر ملنا۔
میں افتاں و خیزاں افسر مذکور کے پاس ریسٹ ہاؤس پہنچا۔ آداب نیاز مندانہ بجالایا۔ افسر نے بھی تبسم آمیز لہجہ میں جواب دیا اور فرمایا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں نے فلاں پوسٹ پر تمہاری ترقی کی سفارش کی تھی وہ منظور کرلی گئی ہے۔ کل سے تم ترقی پر ہو۔ میں تمہیں چارج دلوانے کے لیے آیا ہوں۔ واپس جاکر ترقی کا آرڈر بھیج دوں گا۔ یہ سنتے ہی میرا تو خوشی کے مارے بلیوں دل اچھلنے لگا۔ میں نے افسر مذکور کا شکریہ ادا کیا اور سلام کر کے گھر واپس آیا اور معبود حقیقی کا شکر ادا کیا۔
رفیق کہتے ہیں میں اردو کے مستقبل سے بہت پُر امید ہوں۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے

ع مسلم ہستی سینہ را از
آرزو آباد دار

اردو زبان کی ترقی میں بے شمار ماہرین تعلیم اور مصلحین نے حصہ لیا ہے اور لے رہے ہیں۔ اس کی ترقی میں ہندو مسلم سکھ اور عیسائیوں نے حصہ لیا ہے۔ یہ زبان کوئی علاقائی زبان نہیں ہے بلکہ ہندوپاک کی قومی زبان ہے حال ہی میں حیدر آباد (ہندوستان) میں اردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا ہے۔ ہندوستان کے تمام کالجوں میں بیشمار طلبا اردو میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ پی ایچ ڈی اور نئی نئی تحقیقات کر رہے ہیں۔ پاکستان میں یہ سرکاری زبان تسلیم کی جاچکی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ جن بھائیوں کی زبان اردو نہیں ہے وہ بھی اس زبان کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ غیر ممالک کی یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم کا اہتمام ہے اور غیر ملکی حضرات اس مضمون سے خاطر خواہ استفادہ کر رہے ہیں۔ ان وجوہات کے پیشِ نظر میں امید کرتا ہوں کہ چمنستان اردو مزید سرسبز و شاداب ہوگا اور ایک دور آئے گا جب تمام دنیا میں اسی زبان کو مقبولیت حاصل ہوگی۔"
ان کا کہنا ہے کہ آج کے دور میں مشاعرے ادب کی تخلیق میں زیادہ معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ اور مشاہدہ آپ اردو زبان کی گزشتہ دو سو سال کی تاریخ سے لگا سکتے ہیں مشاعروں میں پروازِ تخیل اور کائناتی مطالعہ کا وسیع مظاہرہ دیکھنے میں آتا ہے۔"
کتابوں کی مقبولیت کم ہونے کے سلسلے میں انہوں نے کہا۔
"آپ کا یہ فرمانا بجا ہے کہ الیکٹرونک میڈیا کی وجہ سے کتابوں کی اشاعت کم رہ گئی ہے جبکہ پرنٹیڈ میڈیا کی زیادہ ہونی چاہئے۔ کتابوں اور جرائد کی بقاء کے لیے ہمیں مندرجہ ذیل اقدام کرنے چاہئیں۔
1۔ کتابوں اور جرائد کے مضامین زیادہ طویل نہ ہوں۔ آج کل مصروفیات اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ انسان طویل مضامین پڑھنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔
2۔ یہ دور ٹیکنالوجی کا ہے۔ ہماری کتابوں کے مضامین ٹیکنالوجی پر مشتمل ہونے چاہئیں۔
3۔ اصلاحی، معلوماتی اور معیاری مضامین شائع ہونے چاہئیں۔

4۔ مذہبی اور دینیات پر مشتمل مضامین زیادہ سے زیادہ شائع ہوں تاکہ ہمارا معاشرہ روبہ اصلاح ہو۔
5۔ بچوں کے لیے اصلاحی مضامین زیادہ شائع ہوں کہ مستقبل کی باگ ان ہی بچوں کے ہاتھ میں ہوگی۔

اردو ادب میں تنقید کے سوال پر ان کے خیال میں تنقید میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ انہوں نے حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ایک زمانہ تھا مولانا الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی نے تنقیدی مضامین پر اپنی توجہ مبذول کی۔ بعد میں نیاز فتح پوری نے ایسی معلوماتی تنقیدی مضامین تحریر کیے کہ ادیبوں اور شاعروں کو اپنی تحریروں میں اور اشعار میں خامیاں نظر آنے لگیں۔ حال کے دور میں ایسے بے شمار مشاہیر اور مصنفین دیکھائی دیتے ہیں جنہوں نے اردو ادب کو تنقیدی نظر سے دیکھا۔ اس وسیع میدان میں ڈاکٹر اقبال مولوی عبدالحق۔ فراق گورکھپوری۔ سلیم احمد۔ جمیل جالبی۔ اور حسن عسکری وغیرہ بہت سے ناقدین نظر آتے ہیں جن کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان ناقدین اور بیشمار دیگر ناقدین کے ہوتے ہوئے ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اردو ادب میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے۔

RAFIQ AHMED
32792 ARTISTRY LOOP UNION CITY, CA 94587

نعت

دعا ہے خالق کون و مکاں سے
ادا ہوتا رہے کلمہ زباں سے

نظر آتی ہے ہم کو صف جنت
محمد مصطفیٰ کے آستاں سے

جھلکتا ہے وہ نور مصطفائی سے
قمر سے شمس سے اور کہکشاں سے

مدینہ میں انہیں کیا مل رہا ہے
کوئی پوچھے ہجوم عاشقاں سے

رسول پاک کی اک نعمت لکھنا
ستارے توڑنا ہے آسماں سے

جو کلمہ پڑھ کے مومن مر گیا ہے
ہوائیں آئیں گی باغِ جناں سے

نمو کا جوش سلامت، میں بے نشان نہیں
کمال یہ ہے کہ ہر خاک نم ہے میرے لیے

۱۲
۹۹ء/۱

رؤف خیر

آندھرا پردیش

رؤف خیر آندھرا پردیش (A.P) ہندوستان کے شہر جنگاؤں کے گورنمنٹ جونیئر کالج میں اردو کے لکچرار ہیں۔ اپنے بارے میں انہوں نے بتایا:

محمد عبدالرؤف نام اور خیرؔ تخلص ہے۔ 5 نومبر 1948ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے اور پہلی جماعت سے لے کر اردو میں ایم۔اے تک عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں تعلیم پائی۔ کہتے ہیں کٹر مذہبی گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے قرآن و سنت سے شروع سے لگاؤ رہا۔ بقول خود

ہر بے جواز بات پہ کرتے نہ تھے یقیں

وہ کہہ رہے تھے "1969ء سے 1984 تک سٹی سول کورٹ میں بحیثیت اسٹینوگرافر ابتدائی ملازمت کی۔ وہاں بھی جواز و دلیل ہی اہمیت رکھتے ہیں۔ بحیثیتِ لکچرر بھی اپنی گفتگو مدلل پیش کرنی پڑتی ہے۔ فطری طور پر بھی افکار و اعمال کی قرآن و سنت سے دلیل لانی پڑتی ہے اور دلیل مانگنے کا مزاج بھی رہا۔ یہی رویہ اپنی تنقیدی تحریروں میں بھی میں نے برتا۔ اپنے مضامین اور مختلف کتب پر تبصرے کرتے ہوئے یہی دلائل و براہین کا رویہ اختیار کرتا رہا۔ زبان و بیان کا پورا پورا خیال رکھنے کی حتی المقدور پوری پوری کوشش کرتا ہوں (الا ماشاء اللہ کیونکہ خطا و نسیان تو انسانی فطرت ہے) بے

دلیل گفتگو نہ خود کرتا ہوں اور نہ سننا پسند کرتا ہوں۔ قصے کہانیوں، داستانوں اور کرامات پر یقین نہیں کرتا مگر جنت و دوزخ کی حقیقت پر ایمان ہے۔

آپ کے سوال نمبر 2 کے جواب میں کہوں گا کہ شاعری کی اصناف میں غزل پسندیدہ صنف ہے اس کے علاوہ پابند نظم اور آزاد نظم دونوں میں دلچسپی ہے۔ میں نے اک نئی صنف "یک مصری نظم" ایجاد کی یعنی صرف ایک مصرعے پر مشتمل بے شمار نظمیں لکھیں جن میں سے چند منتخب نظمیں میرے تیسرے شعری مجموعے "شہداب" میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ فرانسیسی صنفِ سخن "ترائیلے" بہت لکھے۔ میرا دوسرا شعری مجموعہ "ایلاف" ترائیلو Triolets پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ سانیٹ اور آزاد مثنوی بھی لکھی۔ آزاد مثنوی بھی میری ایجادِ بندہ ہے۔ شاعری کے علاوہ "تنقید" سے لگاؤ ہے۔ بے شمار کتابوں پر تبصرے کرتے کرتے تنقیدی مضامین بھی لکھنے لگا چنانچہ 1997ء میں میرے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "خطِ خیر" شائع ہوا۔ تنقید کے علاوہ بڑے آدمیوں کی زندگی کے واقعات خاص طور پر خود نوشت سوانح پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ تراجم نظم و نثر سے بھی دلچسپی رہی۔ خاص طور پر خلیل جبران کی بیشتر کتابوں کے تراجم اور علامہ اقبال کی فارسی شاعری کے تراجم دیکھے بلکہ اقبال کی رباعیات "لالہ طور" (پیام مشرق) کا منظوم اردو ترجمہ کر ڈالا۔ اقبال ہی کی مستعملہ بحر اور اسلوب میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تراجم "قنطار" کے نام سے جلد شائع ہونے والے ہیں۔

میں کسی خاص مکتبہ فکر سے وابستگی کے بجائے فن سے والہانہ شیفتگی کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ روایتی شاعری میرے نزدیک کلاسیکی سرمایہ ہے۔ زبان و بیان کو بگاڑنے کے حق میں نہیں ہوں اور جدید طرزِ فکر کا ہم نوا ہوں لیکن لایعنیت Absurdity کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتا۔ میری رائے میں ایہام و اہمال ادب کے لیے سم قاتل ہیں گو ایہام ایک حد تک شعر کا حسن ہے مگر مہملیت کی حد میں داخل ہو جائے تو زہر بھی ہے۔ ترقی پسندوں نے فکری جہات میں جو بڑے تجربے کیے وہ خوب ہیں لیکن مذہبی و اخلاقی اقدار سے ان کی کھلواڑ مجھے سخت ناپسند ہے۔ میں روایت، ترقی پسندی اور جدیدیت کے اچھے پہلوؤں سے استفادہ کرتا ہوں اور برے پہلوؤں کو نظر انداز بھی کر دیتا ہوں۔ شعر میں اعجاز و شعریت اور نثر میں جواز و حقانیت کو اہمیت دیتا ہوں۔ سپاٹ شعری اظہار اور بے روح نثر گو بے معنی ہیں۔ مجھے میر و غالب اور اقبال کے علاوہ یگانہ کی سرکشی بھی اچھی لگتی ہے۔ اسی طرح جوش کی شاعری بھی پسند آتی ہے فیض کی ترقی پسند خوش آتی ہے مگر دیگر ترقی پسندوں کی نعرہ بازی کھلتی بھی ہے۔ احمد فراز، شکیب جلالی، ناصر کاظمی اور ظفر اقبال کا اسلوب بھی اچھا لگتا ہے مگر جہاں تک "رطب" کا تعلق ہے "یابس" میرے کس کام کا۔ پروین شاکر کا لہجہ مجھے پسند ہے۔ خود نوشت سوانح حیات بھی پسند ہیں چنانچہ سمرسٹ ماہم کی Summing up کملا داس کی My Story جسٹس ہدایت اللہ کی My own Boswell جبکہ تنقید میں علامہ نیاز

فتح پوری کی مالہ وماعلیہ ،انتقادیات سے لے کر شمس الرحمٰن فاروقی اور ساقی فاروقی کا ہدایت نامہ شاعر تک بہت کچھ پڑھ ڈالا ہے۔

اردو کے مستقبل کے سلسلے میں رؤف خیر کہتے ہیں کہ جب تک مذہب اسلام روئے زمین پر باقی ہے اردو بھی رہے گی۔ اردو میں وہ چاشنی ہے کہ دشمن سے بھی اپنا لوہا منوالیتی ہے۔ گو ہندوستان میں اردو کے ساتھ سوتیلانہ سلوک ہو رہا ہے مگر سوتیلی اولاد کا کردار سگی اولاد سے بہتر ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت انھیں ماننی ہی پڑ رہی ہے ذاکرین وواعظین کے ذریعے اس کا فروغ ہوتا رہے گا۔ ادبی حلقہ تو اسے زندہ رکھے گا ہی مگر روٹی روزگار سے جوڑنے کے جتن بھی کیے جانے چاہئیں۔

اگلے سوال کا جواب تفصیل سے دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "شاعری میں صنفِ "غزل" مجھے محبوب ہے۔ دو مصرعوں میں ایک دنیا رکھ دی جاتی ہے۔ قافیہ وردیف کی تکرار بھی حسن پیدا کرتی ہے۔ "دوہے" میں پسند نہیں کرتا۔ یہ دراصل اردو کو ہندیانے کی ایک سازش ہے۔ (رؤف خیر یہاں آپ ہندی سے تعصب برت رہے ہیں) نثری نظم اور نثری غزل جیسی اصناف کے ذریعے تساہل کو فروغ ہو رہا ہے۔ جنھیں زبان و بیان پر دسترس نہیں ہوتی اور جو فن کو فن کی طرح برتنا نہیں چاہتے وہی ایسی بے معنی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ یہی تساہل کتابت میں صادقین کی تحریریں بنتا ہے اور آرٹ میں تجریدیت کو بھی ہوا دیتا ہے۔ نثری نظم دراصل فلسفیانہ خیالات کی نکاسی کا ذریعہ ہے۔ اسے سیدھے سادھے جملوں میں بھی بیان کیا جاسکتا ہے ادب لطیف کے نام پر ایسا بہت کچھ کہا گیا ہے مگر اسے "نظم" کا نام دینا زیادتی لگتا ہے۔ میں تو "آزاد غزل" ہی کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔ ترائیلے، ہائیکو، سانیٹ، ماہیے البتہ مخصوص اوزان و بحور میں ہوتے ہیں۔ آزاد نظم بھی بحر میں ہوتی ہے یہ اصناف ایک اصول کے تحت لکھے جاتے ہیں جبکہ نثری نظم و نثری غزل بے اصولی کی یادگار ہے۔

مشاعروں کے سلسلے میں عرض ہے کہ آج کے دور میں ہی کیا مشاعرے ہر دور میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ میر نے جب کہا تھا کہ

شعر میرے ہیں گو خواص پسند

تو اس کا مطلب یہی ہے کہ شعر وہی کامیاب ہے جو عوام و خواص دونوں سطح پر پسند کیا جائے۔ ادب زندگی کا ترجمان بھی ہوتا ہے اس لیے عوامی احساسات کی ترجمانی عوام سے داد لے تو شاعر مشاعروں میں بھی کامیاب ہوتا ہے۔ محض ترنم کی بنیاد پر چلنے والے شاعر مشاعروں کے ساتھ مر جاتے ہیں جبکہ شعریت سے بھرپور شعر صرف کانوں کو نہیں بلکہ دلوں کو بھی متاثر کرتا ہے۔

مخصوص تخلیقی نشستوں میں اچھا اور سچا ادب تخلیق پاتا ہے خواص کے لیے خاص اہتمام کرنے کا جذبہ و عمل فن کار سے شاہکار تخلیق کرواسکتا ہے یہاں تساہل کا کوئی گزر نہیں ہوتا۔ ریاض ہر فن میں ضروری ہے میر اشعر ہے۔

بے ریاضت کوئی پہچان کہاں بنتی ہے
شعر کہنا ہی اگر ہے تو مرصع کہنا

رسائل وجرائد کی مقبولیت میں اضافے کے لیے انہوں نے مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے یہ ادب کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ شاعروادیب کی بقا کا تمام تر انحصار ان جرائد کی بقاء پر ہوتا ہے۔ آج ہمارے ادیب و شاعر ماشاء اللہ مرفہ حال ہیں انھیں اپنی آمدنی کا کم از کم ایک فی صد حصہ ہر ماہ ادب پر خرچ کرنا چاہیئے۔ اگر ہر ادیب و شاعر صرف ایک فی صد آمدنی بھی ادب کے لیے وقف کردے تو ہر ماہ ایک رسالے کا خریدار بن سکتا ہے یا کم از کم دو رسالے ہر ماہ خرید سکتا ہے۔ سرکاری رسالے یوں بھی بہت سستے داموں مل جاتے ہیں۔ سرکاری رسالوں کو زندہ رکھنا بھی ہم اردو والوں ہی کی ذمہ داری ہے۔ ایک استاد اپنے شاگردوں کو پابند کرسکتا ہے کہ وہ ہر ماہ اتنی رقم جمع کروائیں جس سے اردو کے رسالوں کا چندہ بھیجا جاسکے۔ مین نے خود بھی اپنے شاگردوں سے ہر ماہ صرف دس روپے جمع کرکے اپنے طور پر رسالوں کو چندہ بھیجنے کی گزارش کی تھی لیکن اس پر عمل نہ کیا جاسکا۔ دراصل دلچسپی کا فقدان ادب کو پنپنے نہیں دیتا۔ ہر سطح پر دلچسپی اور ریاض سے کام لینا پڑتا ہے۔

دورِ حاضر کے نقادوں کے رویے سے رؤف خیر نالاں ہیں۔ کہتے ہیں " تنقید ان دنوں شخصی جذبات واحساسات کے ترازو میں ادب کو تولنے کا نام ہو کر رہ گئی ہے۔ تعصبات و تعلقات کی بنیاد پر تنقید کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے اس لیے اج کل ادیب و شاعر باغی ہو کر الابلا لکھنے لگا ہے اور خود کو تنقید سے ماوراء بھی سمجھنے لگا ہے۔ ایسے میں ضروری ہے کہ تنقیدی پیمانوں کو غیر شخصی کردیا جائے۔"

انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعے "خطِ خیر" میں اپنے نکتہ نظر کی وضاحت کی ہے۔

ان کی تصنیفات درج ذیل ہیں۔

شعری مجموعے: 1۔ اقراء 1977ء، 2۔ ایلاف 1982ء، 3۔ شہداب 1993ء،
4۔ حیدر آباد کی خانقاہیں (تحقیق 1994ء)، 5۔ خطِ خیر 1997ء، تنقیدی مضامین
6۔ قنطار۔ زیر طبع ہے جو علامہ اقبال کی فارسی رباعیات "لالۂ طور" کا منظوم ترجمہ ہے۔

RAUF KHAIR
HOUSE NO.9-10 202/19 RISALA BASAZAR GOLCONDA
FORT HYDERABAD- 500008. AP. INDIA

انتخابِ کلام

رؤف خیر

جو تیرے نام نہیں وہ مری عبارت کیا
تجھے نہ دیکھ سکوں تو مری بصارت کیا

میں ایک خشت سہی جذب ہوں ترے اندر
مرے وجود سے ہٹ کر تری عمارت کیا

مہاجرین سے انصار خوش نہیں ہوتے!
تو پھر کہاں کی یہ ہجرت برا ہے بھارت کیا

تباہ ہوگئے خیمے چراغ ہوگئے گل
ہوا کرے گی بھلا اور اب شرارت کیا

رگوں میں خون اچھلتا رہے تو بہتر ہے
یہ رکھ رکھاؤ پس اندازئ حرارت کیا

خوشی یہ ہے کہ تری دسترس میں ہوں، یوں بھی
مری اڑان ہی کتنی مری جسارت کیا

اسے خرید لیا خود کو بیچ کر ہم نے
ہے اور اس سے زیادہ بڑی تجارت کیا

رہیں گے ہم کسی صورت یہیں کہیں نہ کہیں
کرے گی خیرؔ یہ مٹی ہمیں اکارت کیا

میں ایک کانچ کا پیکر وہ شخص پتھر تھا
سو پاش پاش تو ہونا مرا مقدر تھا

نیویارک
۶ر اکتوبر 99ء

رئیس وارثی

نیویارک، امریکا

1998ء کے کسی ماہ میں لاس اینجلس میں مقیم شاعرہ ریحانہ قمر چودھری کے گھر رئیس وارثی کے اعزاز میں ایک شعری محفل منعقد کی گئی تھی۔ رئیس وارثی مہمانِ خصوصی تھے۔ لازم تھا کہ ہم رئیس سے پہلے پڑھتے کیونکہ وہ ہمارے نہ صرف مہمان بلکہ مہمانِ خصوصی تھے اور محفل ہی ان کے اعزاز میں تھی۔ مگر رئیس اس پر تیار نہیں ہو رہے تھے۔ یہ رئیس کی روایتی پاسداری تھی۔ رئیس سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

ان سے دوسری ملاقات نیویارک میں ہوئی جب میری دو کتابوں سخن ور دوم، اور سوم کے لیے اعزازی تقریب منعقد ہوئی۔ اس زمانے میں رئیس سے کئی کئی ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ ان کا کلام سننے کا موقع بھی ملا اور رئیس سے گفتگو کا بھی۔

رئیس داستان گو ہے۔ اس کے کلام میں بھی گویا داستانیں چھپی ہوئی ہیں۔ ہر شعر ایک خوبصورت واقع کا تاثر دیتا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں جن میں تلمیح بھی کسی خوبصورت پیرائے میں سامنے آئی ہے

خواب آزادی کی یارو کیا یہی تعبیر تھی
شاخ سے بچھڑے ہوئے پتے ہوا کی زد پہ ہیں

وقت کی میزان پہ اب مصلحت کے باٹ ہیں
اہلِ فن ایسے میں بھی سقراط کی مسند پہ ہیں

رئیس کی شاعری میں غزل کا کلاسیکی رنگ بھی سوز و گداز لیے ہوئے ہے۔

کسی کے لمس کی خوشبو سکھا گئی ہے رئیس
ہے کفرِ مشربِ آوارگی میں گھر رکھنا

امید و انتظار کی کیفیات بھی رئیس نے بڑے دلکش انداز میں رقم کی ہیں

گیا ہے وہ تو نہ آئے گا لوٹ کر لیکن
چراغ جلتا ہوا یونہی بام پر رکھنا

خود اعتمادی رئیس کے کردار کا ایک جز ہے اور وہ اس کے اشعار میں بھی جگہ جگہ نمایاں ہے

نہ اعتبار کسی پر بھی عمر بھر رکھنا
تمہیں پسند ہے گر خود کو معتبر رکھنا

میرے فنکار مری شکل کے پتھر نہ تراش
مری پہچان یہی جراَتِ گویائی ہے

ہم جو کارِ آذری میں بے ہنر ٹھیرے تو کیا
ان کی صورت شعر کے قالب میں ڈھالی جائے گی

رئیس وارثی نیویارک کے ادبی حلقوں بلکہ پاکستانی حلقے کی بھی ہر دلعزیز شخصیت ہے۔ رئیس نام کا ہی نہیں دل کا بھی رئیس ہے۔ ہمارے مذہب اور روایات کی مہمان نوازی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ رئیس اپنے دوستوں کے ساتھ ساتھ شعرا اور ادیبوں کے لیے چشم براہ رہتے ہیں۔ ضمیر جعفری مرحوم، انصار برنی اور عمر شریف جیسی مختلف النوع شخصیات رئیس کی انسان دوستی کا دم بھرتی ہیں۔ دامے درمے قدمے سخنے کام آنا رئیس کا مشن ہے۔

نیویارک میں مقیم کئی شعرا کو متعارف کرانے میں بھی رئیس کا بڑا ہاتھ ہے۔

1997ء میں اقوامِ متحدہ (یونائیٹڈ نیشن) کی جانب سے این جی اوز (NGO'S) کی غیر سرکاری فلاحی تنظیموں کا سالانہ اجلاس اس کی پچاسویں سالانہ کانفرنس کے موقع پر منعقد کیا گیا تھا۔ اس اجلاس میں مرحوم حکیم سعید، انصار برنی اور رئیس وارثی نے شرکت کی تھی۔ ستمبر 99ء

میں 52ویں کانفرنس کے موقع پر پاکستانی وفد میں انصار برنی اور افشاں کرن کے ساتھ رئیس وارثی بھی شریک تھے۔ اس کی صدارت اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری جنرل کوفی عنان نے کی تھی جس میں اُردون کی ملکۂ نور کے علاوہ دنیا بھر کے سو سے زیادہ ممالک کے ممتاز سماجی رہنماؤں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کا موضوع موجودہ دور میں نئے چیلنجز کا سامنا اور ان کی تدابیر تھا۔ موجودہ دور میں درپیش مسائل کے حل کے لیے پاکستانی وفد کی جانب سے ٹھوس تجاویز پیش کی گئیں۔

اب آیئے رئیس سے کچھ تبادلۂ خیال ہو جائے۔ ویسے اُن کا پورا نام رئیس احمد خان وارثی ہے جسے انہوں نے خاندانی روایت کے مطابق مختصر کر کے رئیس وارثی کر لیا جو اب ان کا ادبی نام بن گیا ہے۔ 1963ء میں کراچی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول ڈرگ کالونی سے حاصل کی اور وہیں دو سال اسکول کے وال پیپر "مشعلِ راہ" کے مدیر رہے۔ اس دوران انہیں کراچی بورڈ کے منعقد کردہ پینٹنگ کے مقابلے میں پہلا انعام وزیر تعلیم کے ہاتھوں ملا۔ میٹرک کے امتحان کے بعد اسکول میں الوداعی تقریب کا اہتمام ہو رہا تھا جس کے لیے ان کے اردو کے استاد ظفریاب علی زیدی صاحب نے انہیں الوداعی نظم لکھنے کا فریضہ سونپا۔ انہیں رئیس کے گھر کے ادبی ماحول کا علم تھا۔ رئیس کے والد گرامی ستار وارثی کا شمار ممتاز نعت گو شعراء میں ہوتا ہے اور ان کے مجموعۂ ہائے کلام "آیۂ رحمت" معطر معطر، حرف معتبر اور خوشبوئے دوست شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ بڑے بھائی ڈاکٹر سعید وارثی اپنے چار مجموعہ ہائے کلام خواب خواب چہرہ، ورثہ، ناگفتہ اور آوازیں کے سبب ادبی حلقوں میں اپنی خاص شناخت رکھتے ہیں۔ دوسرے بڑے بھائی رشید وارثی کہنہ مشق شاعر بھی ہیں اور نقاد بھی۔ اس ماحول میں رئیس کے لیے شعر کہنا ایک قدرتی عمل بھی تھا اور مشکل بھی۔ سعید بھائی کے مشورے پر انہوں نے اسکول میں گزرے ہوئے وقت کو ذہن میں رکھ کر شعر موزوں کیے اور انہی کی اصلاح سے وہ ایک کامیاب نظم بنی جس کی کاپیاں الوداعی تقریب میں تقسیم کی گئیں۔ یہ رئیس کی شاعری کی ابتدا تھی۔ پھر انہوں نے باقاعدہ غزلیں کہنی شروع کیں جن پر والد محترم اور بھائی سعید نے اصلاح دی۔ رئیس کہتے ہیں "ان کی عنایت سے مجھ پر شاعری کے رموز و آگہی کا دروازہ کھل گیا۔" رئیس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "گورنمنٹ سپیریئر سائنس کالج میں تعلیم کے دوران میں نے کالج کے سالانہ مجلّہ "پائرین" کی ادارت میں دلچسپی کا اظہار کیا تو شعبہ اردو کے سربراہ پروفیسر نظیر الحسنین زیدی صاحب نے بتایا کہ کوئی بی ایس سی فائنل کا طالب علم ہی اس مجلّے کا مدیر بنتا ہے لیکن میرا شوق دیکھ کر انہوں نے پرنسپل پروفیسر عبید الرحمٰن صاحب سے بات کی اور ان کی رضامندی کے بعد ایک مقابلہ فی البدیہہ مضمون نگاری کا ادارت کے خواہشمندوں میں کرلیا۔ اس کا موضوع "اقبال اور عہدِ حاضر" تھا۔ اس کے بعد میں "پائرین" کا سب سے کم عمر مدیر بنا اور یہ ذمہ داری دو سال نبھاتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی میں کالج کے انتخابات میں میگزین سکریٹری منتخب ہوا اور اگلے سال اسٹوڈنٹ کونسل کا صدر رہا۔ دوسری غیر نصابی سرگرمیوں

میں ریڈیو پاکستان کے پروگرام بزمِ طلبہ میں پروفیسر احمد علی شاہ صاحب کے ساتھ "سائنس کلب" کا ہفتہ وار سلسلہ شروع کیا جس کے پروڈیوسر ضمیر علی صاحب اور شہناز سلیم صاحبہ تھیں۔ ہمارے کالج کے سالانہ ہفتہ طلبا میں ہونے والے مشاعرے میں جس میں تقریباً تمام کالجوں سے طلبہ و طالبات نے شرکت کی تھی مجھے پہلا انعام ملا۔ اس مشاعرے کی صدارت ماہر القادری مرحوم نے کی تھی اور مہمانِ خصوصی شاذ تمکنت مرحوم تھے۔ ڈاؤ میڈیکل کالج میں ہونے والے مشاعرے میں شامل طلبا میں مجھے دوسرا انعام دیا گیا۔ باضابطہ مشاعروں میں شرکت کا آغاز ایک ایسی شعری نشست میں ہوا جہاں سیّد ہاشم رضا صاحب صدارت کر رہے تھے۔ انہوں نے حوصلہ افزائی کی۔ اس نشست میں شرکت کا احوال میں نے والد گرامی کو سنایا اور انہوں نے غزل پڑھوا کر سنی پھر کو پھتر پڑھنے پر شفقت سے بھرے لہجے میں ڈانٹا۔ میں اس سلسلے میں بہت خوش قسمت رہا کہ گھر کے بزرگوں اور اساتذہ نے میری شعر گوئی کی حوصلہ افزائی کی ساتھ ہی ادبی نشستوں میں شرکت کا موقع ملا۔ اس زمانے میں سعید بھائی کے خدمتِ خلق کے ادارے مجلس سماجی کارکنان پاکستان کے مرکزی دفتر میں ہر ماہ ایک شعری نشست ہوتی تھی۔ ان شاعروں کی وجہ سے رئیس امروہوی، جمیل الدین عالی، کنور مہندر سنگھ بیدی، اطہر نفیس، خالد علیگ، حمایت علی شاعر، صہبا اختر، ساقی امروہوی، راغب مراد آبادی، راز مراد آبادی، رؤف شیخ، منظر ایوبی، اختر انصاری اکبر آبادی، شاعر لکھنوی وقار صدیقی، سرشار صدیقی، عارف رئیسی، مقبول نقش، احمد جاوید، جاذب قریشی اور سلیم کوثر جیسے شعرا کے سامنے اپنا کلام پیش کرنے اور ان سے اکتساب فن کے مواقع بارہا ملے۔ جامعہ کراچی کے شعبہ طبیعیات کے سربراہ ڈاکٹر انصار حسین صاحب شاعر بھی تھے اور مرزا یگانہ چنگیزی کے عزیز بھی ان کے دفتر میں شعر و شاعری پر طویل مباحثے ہوتے اور محسوس ہوتا کہ ہم شعبہ اردو میں بیٹھے ہیں۔ انصار صاحب کے کہنے پر ہی میں نے بی ایس سی مکمل کرنے کے بعد ایم اے صحافت میں داخلہ لے لیا۔ اس داخلے کے شوق میں، میں نے پرائیویٹ بی اے بھی اسی سال کر لیا جب کہ پروفیسر ذکریا ساجد (سربراہ شعبہ صحافت) میری شائع شدہ نگارشات کی بنا پر مجھے ایم اے صحافت میں بخوشی لینے پر آمادہ تھے۔

ایم اے صحافت کی تعلیم کے دوران میں نے جامعہ کراچی کے نوجوان اہل قلم کے لیے ''ادبی آوازیں'' کی بنا ڈالی۔ جس کی نشستوں میں احمد نوید، ن۔ م دانش، حسنین جعفری، لیاقت علی عاصم، معین قریشی، خالد معین، انیق احمد، عتیق احمد، فیاض وید، اوج کمال، لیاقت حسین عامر، فرخ گل، عذرا لطیف، شاہین خواجہ، سیّدہ نقوی، ن۔ م شہزاد، شجاع حسین اور یعقوب غزنوی شرکت کرتے رہے۔ اس بزم کی سرپرستی جاذب قریشی، اقبال حیدر، خالد علیگ، ساقی امروہوی، آذر حفیظ اور نگار صہبائی کرتے تھے اور ہر نشست میں ان میں سے کوئی نہ کوئی ضرور موجود ہوتا تھا۔ کیا دن تھے وہ بھی جنھوں نے علم و ادب کے خزانے سے ہمیں مالا مال کر دیا۔ اس زمانے میں جامعہ

کراچی کے وائس چانسلر ڈاکٹر جمیل جالبی تھے اور رجسٹرار ڈاکٹر اسلم فرخی۔ ہماری ادبی سرگرمیوں کے کامیاب ہونے میں اردو ادب کی ان معتبر ہستیوں کا تعاون بھی شامل تھا۔ میں نے ٹی وی پروگرام "درخشاں" میں بحیثیت شاعر جامعہ کراچی کی نمائندگی بھی کی۔ میرا کلام اس زمانے میں جنگ، حریت، نوائے وقت، اور مشرق میں شائع ہو رہا تھا۔

1986ء میں صہبا لکھنوی صاحب نے میری غزل افکار میں چھاپی اس ابتدا کے بعد ممتاز ادبی جریدوں جیسے سیپ (کراچی)، اوراق (لاہور) اور سائبان (بہاولپور) شاعر (بمبئی)، انشاء (کلکتہ)، چہار سو (راولپنڈی) وغیرہ میں میرا کلام شائع ہونے لگا۔ کوئٹہ ٹیلی ویژن کے ڈرامے 'کوہ کن' کے لیے ثریا ملتانیکر نے میری غزل گائی جو بہت پسند کی گئی۔ ممتاز گلوکار نزاکت علی اور اقبال قاسم نے بھی میری غزلیں گائی ہیں۔

1987ء میں ایم اے ماس کمیونیکیشن فرسٹ ڈویژن میں پاس کر کے میں اقوام متحدہ کے یوتھ ایکسچینج پروگرام میں امریکہ آ گیا۔ وطن سے دُور جہد حیات میں مصروف اردو ادب سے وابستگی رکھنے والے نوجوانوں کو ملنے کا موقع اور ایک آواز دینے کے لیے میں نے 1990ء میں ایک ادارے "اردو مرکز نیویارک" کی بنیاد رکھی۔ "اردو مرکز" کے زیرِ اہتمام متعدد شعری نشستوں کے علاوہ کئی بین الاقوامی مشاعروں کا بھی انعقاد کیا گیا جن میں محشر بدایونی (مرحوم) سرشار صدیقی ضمیر جعفری (مرحوم)، رضی اختر شوق (مرحوم)، نقاش کاظمی، سلیم کوثر، شبنم رومانی، ممتاز مرزا (مرحومہ)، بیکل اتساہی، اعجاز راہی، انعام الحق جاوید، ساغر خیامی اور محسن بھوپالی کے علاوہ شمالی امریکہ کے کئی ممتاز شعراء نے شرکت کی۔ "اردو مرکز" کے زیرِ اہتمام مذاکروں کا بھی اہتمام کیا گیا جن میں پروفیسر گوپی چند نارنگ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ڈاکٹر آغا سہیل، جناب مختار مسعود اور پروفیسر جناب متین الرحمٰن مرتضیٰ نے خصوصی لیکچر دیے۔ شمالی امریکہ کی ممتاز شاعرہ حمیرا رحمٰن کے دوسرے مجموعہ کلام "انتساب" کیلی فورنیا کی شاعرہ ریحانہ قمر کے مجموعہ کلام "سوچ کی دہلیز پر" پاکستانی شاعر جناب غوث متھراوی کے مجموعہ کلام "دشتِ جنوں" اور نوجوان پاکستانی شاعر خالد معین کے مجموعہ کلام "بے موسم وحشت" کے لیے تعارفی تقریبات منعقد کیں اور اردو کے کئی ممتاز شعرا اور اہلِ قلم حضرات کے ساتھ خصوصی شامیں منائی گئیں۔

اردو مرکز کے زیرِ اہتمام اردو ٹائمز رائٹرز فورم کے تعاون سے جشنِ محسن بھوپالی، جشنِ انعام الحق جاوید اور جشنِ خالد عرفان منائے گئے۔

اردو مرکز نے حضرت ستار وارثی کا نعتیہ کلام "حرفِ معتبر" بھی شائع کیا اور شمالی امریکہ کی ممتاز ترقی پسند شاعرہ ڈاکٹر شہلا نقوی کا مجموعہ کلام "نخلِ مریم" بھی شائع کر رہا ہے، جو اشاعت کے آخری مراحل میں ہے۔ اردو مرکز نے کئی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں مالی تعاون فراہم کیا۔ مرکز نے اردو کے شاعروں، ادیبوں، دانشوروں اور دیگر اہلِ قلم حضرات کے کوائف کو یکجا کرنے اور رابطے کو

فروغ دینے کے لیے اہلِ قلم کی عالمی ڈائریکٹری مرتب کرنے کا آغاز کر دیا ہے۔ یہ تو تھا اردو مرکز کے کاموں کا تذکرہ۔ اپنے بارے میں عرض ہے کہ مجھے خود شاعری کے علاوہ افسانہ نگاری اور مضمون نگاری سے بھی دلچسپی ہے۔ میرا مجموعہ کلام "تنہائی کا موسم" زیرِ ترتیب ہے۔ مجھے مطالعہ سے شغف ہے اساتذہ کے کلام کے علاوہ تاریخ، تنقید اور سوانح میرے پسندیدہ مضامین ہیں۔

میرے خیال میں جیسا کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بھی کہا ہے کہ اردو دنیا کی دوسری سب سے بڑی زبان ہے جس کے بولنے والے پاکستان ہندوستان بنگلہ دیش، نیپال، برما، متحدہ عرب ریاست، خلیجی ممالک، افغانستان، ایران کے علاوہ شمالی امریکہ اور یورپ میں بھی موجود ہیں لیکن اس کا مستقبل تشویش ناک ہے۔ گو موجودہ صدی میں اردو نے بہت ترقی کی ہے اور اس میں نئے الفاظ شامل ہونے سے وسعت بھی پیدا ہوئی ہے اور اردو پڑھنے والوں نے بھی اسے ایک خوشگوار اضافے کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ پھر بھی اردو کا مستقبل میرے نزدیک امید افزا نہیں۔ پاکستان اردو زبان کا دارالخلافہ ہے، وہاں کے دوہرے نظام نے اردو کو متاثر کیا ہے اور وہاں اس کے فروغ کے لیے سنجیدگی سے کام نہیں ہو رہا جس کی وجہ اردو بولنے والوں میں خود اعتمادی کی کمی ہے۔

مجھے غزل کا میدان زیادہ پسند ہے۔ میری رائے میں شاعری میں کربِ ذات، اردگرد کے ماحول کے اثرات، محسوسات، خیالات اور نظریات کے اظہار کے لیے غزل اور نظم ہی موثر ذریعہ ہو سکتے ہیں۔ نثری نظم کبھی بھی ادبِ عالیہ کا حصہ نہیں بن سکتی۔ میرے خیال میں وہ لوگ جو ادب کا ذوق رکھتے ہیں لیکن شعر کہنے کی قدرتی صلاحیت سے محروم ہیں اور کچھ کہنا چاہتے ہیں اس کے اظہار کے لیے انھیں نثری غزل یا نظم کا سہارا لینا پڑتا ہے ایسے لوگوں میں نثر کہنے کی صلاحیت نسبتاً بہتر ہوتی ہے لہٰذا انھیں چاہئے کہ وہ نثر کی طرف توجہ دیں اور اچھی شاعری کا مطالعہ کریں۔

مشاعرے دراصل شاعری کو باذوق لوگوں تک پہنچانے اور ان کے ادبی ذوق کی تسکین کا سامان کرتے ہیں۔ اساتذہ نے مشاعروں کو محض ایک ادبی مجلس سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر شعرا مشاعروں وہ کلام سناتے ہیں جو سامعین کو بھاتا ہے جبکہ شعری نشستوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو ادب سے گہرا لگاؤ، رموزِ شاعری سے واقفیت اور علم و فن سے آگہی رکھتے ہیں۔ ان نشستوں سے سب سے زیادہ نو آموز شعرا کو فائدہ ہوتا ہے سینئر شعرا اپنے کلام کو سنا کر حاضرینِ مجلس سے داد وصول کرتے ہیں اکثر اوقات کلام کی حیثیت بھی فوری طور پر معلوم ہو جاتی ہے۔ یہ بات ہرگز درست نہیں کہ الیکٹرونک میڈیا کی وجہ سے کتابوں کا مطالعہ اور اشاعت کم ہو گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پہلے صرف اساتذہ اور معروف اہل قلم کی کتابیں شائع کی جاتی تھیں جبکہ آج کل لوگ لکھنا شروع کرتے ہیں اور اسی سال کتاب چھاپ لیتے ہیں اس طرح کتابوں کی اشاعت میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ پاکستان سے باہر مختلف ممالک میں لینے والے اہل قلم حضرات کی کتابیں اس تیزی سے منظر عام پر آ رہی ہیں صاحبِ کتاب لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اس بات کی

دلیل ہے کہ الیکٹرونک میڈیا نے کتابوں کی اشاعت کو متاثر نہیں کیا۔ رہا مطالعہ کا مسئلہ تو جناب لوگ پڑھتے وہی چیز ہیں جوان کے خیال میں معیاری ہو۔ آپ دیکھ لیں کئی سو شعرا کے مجموعہ ہائے کلام شائع ہو کر ان کے گھروں میں یا ناشرین کی الماریوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف معیاری ادب کی پذیرائی بھی ہوئی ہے مثلاً دیوانِ غالب، شکیب جلالی کا مجموعہ (روشنی اے روشنی)، جون ایلیا کا (شاید) کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو کر مارکیٹ سے غائب ہو گئے اسی طرح قدرت اللہ شہاب، کرنل محمد خان، عصمت چغتائی، بانو قدسیہ، قرۃ العین حیدر وغیرہ کے نثری شاہکار مقبول عام ہیں۔ لوگوں میں کسی طرح بھی ذوقِ مطالعہ کم نہیں ہوا ہے بلکہ معیاری کتابیں بہت کم چھپ رہی ہیں۔ چنانچہ اب ناشرین کو معیار کا تعین کرنا ہوگا اور انہیں شاعر یا ادیب کی طرف سے رقم کی فراہمی کے باوجود غیر معیاری کتابیں شائع کرنے سے گریز کرنا ہوگا۔ پاکستان میں نوآموز شعرا نے کتاب کی اشاعت کو فیشن بنالیا ہے۔ حالانکہ کتاب شائع ہونے سے ادیب یا شاعر کی پوری شخصیت اور فن سامنے آجاتا ہے لہٰذا کتاب کی اشاعت میں جتنی تاخیر ہو بہتر ہے۔

تنقید برائے ادب یقیناً تعمیری کردار ادا کرتی ہے جس کے لیے ناقد کا صاحب علم اور وسیع النظر ہونا لازمی ہے اور جو ادب کی کسوٹی پر فن کو پرکھے اور اپنی سچی اور کھری رائے دے آج کل اس قسم کی تنقید بہت کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ اردو کے ممتاز ترین ناقدین نے قلم کی حرمت کی لاج رکھنا چھوڑ دی ہے۔ محض تعلقات اور ذاتی فوائد کو مدِ نظر رکھ کر ہی جھوٹی تعریف کی جاتی ہے۔ میں تو یوں کہوں گا کہ ”تعمیری تنقید“ کا وجود کمزور پڑ گیا ہے کیونکہ اس کو لکھنے پڑھنے اور برداشت کرنے والوں کا حوصلہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ کوئی کتاب اٹھائیں کسی کی بھی رائے پڑھ لیں صرف تعریف ہی لکھی ہوگی جس سے ادب کے باذوق قارئین کو قے آنے لگی ہے۔ دوسری جانب اتنی گھٹیا تنقید ہو رہی ہے کہ فلاں شاعر کو شعر کہنا نہیں آتا وغیرہ وغیرہ یہ دونوں رویے ادب کو بہت نقصان پہنچا رہے ہیں۔ میرے خیال میں آج ادب کا سب سے سچا کھرا اور موثر نقاد خود قاری ہے۔ جو معیاری ادب کے ساتھ پورا انصاف کرتا ہے۔

Raees Warsi
741300 Woodside Ave, Elmnhurst. NY 11373 U.S.A
email : RAIES warsi@Hotmail.com

انتخابِ کلام

رئیس وارثی

دلوں میں وہم جدائی رکھ کر وصال کیسا عجیب سا تھا
وہ لمحہ لمحہ خوشی میں شامل، ملال کیسا عجیب سا تھا

نہ چاند چمکا، نہ ابر برسا، نہ پھول مہکے، نہ خواب آئے
بچھڑ کے تم سے کسے بتائیں کہ حال کیسا عجیب سا تھا

ملیں گے آخر دوبارہ کیا ہم، وہ بھیگی آنکھوں سے پوچھتا تھا
دمِ جُدائی، وہ اُس کا مجھ سے سوال کیسا عجیب سا تھا

عجب تھی قامت عجب تھا چہرہ، عجب تھیں باتیں عجب تھا لہجہ
نہیں تھا کوئی بھی اُس کے جیسا، جمال کیسا عجیب سا تھا

سجے گی دریا پہ دھوپ لیکن تمام صحرا پہ ابر ہوگا
یہ خواب کیسا حسین سا تھا خیال کیسا عجیب سا تھا

رئیس سقراطِ عہدِ حاضر خود ہی بتائیں ہے بات سچ کی
ہماری بستی میں حق پرستوں کا حال کیسا عجیب سا تھا

[illegible] آجا کہ وحشتوں کا تلاطم تھم نہ جائے
کہیں یہ سمندروں میں یہ دریا اتر نہ جائے
میں یہ بھی جانتی ہوں نہیں [illegible]
اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تو [illegible]

ریحانہ روحی

ریحانہ روحی

سعودی عرب

ایک سوال اکثر ذہن میں ابھرتا ہے، میں سخن کے موتی کیوں پروتی ہوں؟ اور "سخن وروں" کے موتیوں کو ایک مالا میں پرونے کا کام کیوں کرتی ہوں کہ یہ انگلیاں فگار کرنے کا کام ہے۔

مجھے جواب ملتا ہے۔ "یہ مرہم ہے ایک کسک کا۔ یہ عمل ہے ایک الجھے الجھے ریشم کو سلجھانے کا اور یہ کوشش ہے اس نا انصاف سماج میں انصاف کی فراہمی کا۔ جن سوالات کا جواب میں دانش مندوں سے چاہتی ہوں وہ صرف اردو ادب کے قارئین کے لیے ہی نہیں ہیں بلکہ اس معاشرے کے، اس ملک کے اور اس دنیا کے ان پڑھے لکھے لوگوں کے لیے بھی ہیں جو ظلم و نا انصافی کی اس دیمک کو جڑ سے صاف کرنا چاہتے ہیں جس نے انسانیت کی بنیاد کو کھوکھلا کرنے کا عمل جاری رکھا ہے۔"

دیگر سخن وروں کی طرح ریحانہ روحی بھی اس جہاد میں مصروف ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام "عشق زاد" (جو طباعت کے مراحل میں ہے) کی غزلیں نظمیں میرے اس قول کی تصدیق کریں گی۔

ریحانہ سے جب دوبدو ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا "تم نے لکھنے لکھانے کا سلسلہ

کب سے شروع کیا اور کچھ اپنے بارے میں بھی بتاؤ۔"

ریحانہ نے چائے کا کپ میز پر رکھا اور بتانے لگیں :

"ویسے تو میرا نام ریحانہ خلیل ہاشمی تھا جو شادی کے بعد ریحانہ آصف علی ہوا۔ قلمی نام ریحانہ روحی ہے۔ جائے پیدائش کراچی پاکستان ہے۔ اکنامکس میں ایم۔اے کیا اور کمپیوٹر اکاؤنٹنسی میں ڈپلوما بھی لیا۔ پھر کاٹن ایکسپورٹ کارپوریشن میں بطور اسسٹنٹ منیجر اکاؤنٹس ملازمت کی اور دمام سعودی عرب کے اسکول دارالطفولہ میں انگلش لینگویج ٹیچر کی حیثیت سے ملازم ہوئی۔"

ریحانہ نے کچھ دیر سکوت کیا پھر بولیں :

"میں نے بہت بچپن سے لکھنے کا آغاز بچوں کے رسالے غنچہ، پھلواری، بچوں کی دنیا، کھلونا وغیرہ سے کیا تھا۔ پھر افسانے لکھے جو حور، زیب النساء، اخبار خواتین، اخبار جہاں، تہذیب اور اردو ڈائجسٹ میں شائع ہوتے رہے۔ رفتہ رفتہ شاعری کی طرف رجحان ہوا اور میں نے شاعری کو بطور اظہاریہ منتخب کرلیا۔ ویسے تو پہلی غزل بارہ سال سے بھی کچھ پہلے لکھ لی تھی مگر گورنمنٹ کالج فیریئر روڈ جہاں محترمہ وحیدہ نسیم کی سرپرستی حاصل تھی اور اسلامیہ کالج سکھر جہاں پروفیسر آفاق صدیقی "صدر بزم ادب اردو" کے منعقدہ طرحی مشاعرے سے باقاعدہ مشاعروں کا آغاز ہوا اس سے قبل ایک معزز خاندان سے تعلق کی بنا پر ادبی دنیا سے عملی تعلق قائم نہ رکھ سکی کیونکہ نام نہاد معزز خاندانوں کا تمام اعزاز صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کی عورتوں کو غیر مرد نہ دیکھ سکیں لہٰذا اس کی کمی کو مطالعے کے ذریعے سے پورا کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ 1977ء میں سعودی عرب چلی گئی۔ الخبر مشرقی صوبہ کا بہت خوبصورت شہر ہے۔ یہ صوبہ پٹرولیم کا سب سے بڑا مرکز ہے لہٰذا یہ ایک امریکن کالونی کی طرز پر قائم ہے۔ یہاں اس وقت بہت کم اردو کمیونٹی تھی کوئی ادبی ماحول تھا نہ کوئی ادبی فضا..... لہٰذا 1983ء میں، میں نے یہاں ایک ادبی انجمن "نخلستان ادب" کی بنیاد ڈالی اس کا افتتاح جناب جمیل الدین عالی نے کیا اب سترہ سالوں میں "نخلستان ادب" ایک تناور درخت بن چکا ہے جس کے بینر سے ہم سعودی عرب میں اردو کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں اب تو یہاں انٹر سعودیہ بلکہ انٹر گلف مشاعرے ہو رہے ہیں انشاء اللہ جلد ہی عالمی مشاعرہ بھی ہوگا۔

سعودی عرب میں ادبی مشاغل کے علاوہ سوشل ورک بھی بہت کیا۔ تین سال پاکستان وومنز گروپ کی صدر رہی۔ کئی ثقافتی شوز کرائے اور دامے درمے قدمے سخنے اپنے وطن کی خدمت کی۔ سعودی عرب اور امریکن کالونی میں 20 سال رہائش رکھنے کے باوجود خود کو اور اپنے خاندان کو خالص "پاکستانی" کہلوانے کی فخریہ کوشش کی اور کامیاب رہی الحمدللہ۔ شاعری کے علاوہ تنقید سے بہت دلچسپی ہے لیکن نظمیں مجھے بہت متوجہ کرتی ہیں۔ اگرچہ غزل میرا خاص پسندیدہ ترین میدان ہے مگر نظمیں، ہائیکو، تروینی، قطعات اور کچھ مصرعوں پر مشتمل اظہاریے بھی مجھے اپنی طرف بہت راغب کرتے ہیں کیونکہ میں کسی سے اسقدر متاثر ہی نہیں ہوئی کہ قصیدہ لکھوں۔"

ریحانہ کہہ رہی تھیں "میں کسی خاص مکتبۂ فکر سے وابستہ نہیں ہوں جو زندگی میرے سامنے بکھری پڑی ہے اسے ہی ہر رنگ میں اور ہر جہت میں جیسی نظر آتی ہے وہ سچائی اور انتہائی ایمانداری کے ساتھ لکھ دیتی ہوں... کسی نظریے کی عینک لگا کر میں خود کو محدود نہیں کر سکتی۔ میرا کلام ملک و بیرون ملک کے ادبی جرائد میں شائع ہوتا ہے۔ میرا دوسرا مجموعہ کلام "جاگتے لوگ حرف لکھتے ہیں۔" زیرِ طبع ہے جس میں ہائیکو اور اظہاریے ہیں۔ الخبر سے ایک چھوٹا سا ادبی مجلہ "مشعل" کی ادارت بھی کرتی ہوں۔

مطالعہ میرا پہلا اور آخری شوق ہے سو اس ضمن میں میرے زیر مطالعہ ہر علم سے متعلق کتب رہتی ہیں مگر میری خاص دلچسپی نفسیات، سیاسیات اور فلسفے سے ہے اس کے علاوہ اعلیٰ معیار کا فکشن بھی بہت دلچسپی سے پڑھتی ہوں۔ ادب کا مطالعہ از بس ضروری ہے کیونکہ آج کے ادیب کا انتہائی چوکنا اور بے حد الرٹ رہنا اس کی ذمہ داریوں میں سے ایک ہے۔ ویسے یہ بات طے ہے کہ مجھے نثر کی طرف واپس آنا ہے۔

زبان کوئی سی بھی ہو اس کے یکسر ختم ہو جانے کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہوتا، خصوصاً جہاں جہاں وہ بولی جاتی ہے اور بولنے والوں کے ساتھ سفر بھی کرتی ہے۔ اب رہا سوال اردو زبان کا تو اس کے ادب کی ساخت اتنی پرکشش ہے کہ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب کے مقابلے میں متعدد اہمیت کی حامل ہے مثلاً ہمارے مشاعرے جو پرفارمنگ کے لحاظ سے بہت پسند کیے جاتے ہیں ان میں عام قاری بھی بہت ذوق و شوق سے شریک ہوتا ہے۔ پھر اب جو یہ دنیا حد درجہ گلیمرائزڈ ہو چکی ہے تو مشاعرہ کچھ نہ کچھ حد تک اس دنیا کے جدید تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ ادب کا یہ انسٹی ٹیوشن باوقار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی دلچسپی کا عنصر بھی اپنے اندر لیے ہوئے ہے لہٰذا اردو زبان کی ترویج میں مشاعرے بہت اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس کا رسم الخط بھلے کوئی سا بھی ہو لیکن بولنے کا جو قاعدہ ہے وہ ساری دنیا میں یکساں ہے لہٰذا اردو زبان کا مستقبل کا بہت شاندار ہے.... آپ انڈیا، عربی ممالک اور یورپی ممالک اور امریکہ کی مثال سامنے رکھیں یہاں اردو قطعاً رسم الخط کے لحاظ سے ناپید ہی سمجھیں مگر پھر بھی کتنی گونج اور شناسائی ہے کہ اعداد و شمار کہتے ہیں کہ اب اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ باقی رہا اس کو لٹریچر کے طور پر اعتبار بخشنے کا کام، تو یہ تو ہم اردو ادیبوں پر منحصر ہے کہ ہم اپنی زبان کے ساتھ کتنے مخلص ہیں یعنی کم از کم میں نے تو سعودیہ میں اردو کا بول بالا کر کے اپنے حصے کی شمع جلا دی ہے۔"

ریحانہ کہہ رہی تھیں "میری زندگی کا اہم ترین واقعہ میری تین سال کی عمر میں ماں کا مر جانا ہے۔" انہوں نے دکھی لہجے میں دو شعر سنائے:

کچھ نہ سننے کچھ نہ کہنے کی کہانی یاد ہے
آج تک مجھ کو ترا چہرہ زبانی یاد ہے

وقت مرہم ہے تو روحی پھر مجھے کیوں آج بھی
بچپنے کی عمر بن ماں کے بتانی یاد ہے

سوال نمبر 6 کے جواب میں ریحانہ نے کہا۔ "نثری نظم کو اب تک کوئی ن۔م راشد یا میرا جی جیسا طاقتور پرفارمر نہیں مل سکا ہے۔ جس دن ایسا ہو گیا نثری نظم پر اختلافی مباحث ختم ہو جائیں گے۔ البتہ نثری غزل میرا خیال ہے صرف ان لوگوں کا چھوڑا ہوا فضول شوشہ ہے جو غنائی غزل لکھنے سے معذور ہیں۔

ادب میں بے سروپا تحریکیں احساس کمتری کی مظہر ہیں۔ کچھ لوگ سستی شہرت حاصل کرنے اور گفتگو میں رہنے کے لیے اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں کہ

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

تنقید سے متعلق گفتگو ہوئی تو ریحانہ روحی مسکراتے ہوئے کہنے لگیں "آپ کے سوالنامے کا یہ سب سے زیادہ اہم سوال ہے۔ دراصل یہ ہمارے عہد کا المیہ ہے کہ ہمیں تنقید نگار میسر ہی نہیں ہیں۔ دورِ حاضر میں تنقید کا میدان بالکل خالی ہے جبکہ یہ بات بالکل درست ہے کہ ادب کی ترقی کے لیے اس کے تجزیہ کی شدید ضرورت ہے جو صرف تنقید نگار کا ہی منصب ہے۔ ادیب کو اپنی محنت کے معیار کا اندازہ تنقید نگار کے تنقید کے پیمانے سے ہی ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے تنقید ادب کی سب سے مشکل ترین صنف ہے کیونکہ اس میں تنقید نگار کا نہ صرف اپنے علم میں انتہائی قابل ہونا ضروری ہے بلکہ تجزیہ نگاری میں انسانی جذبات پر انتہائی گرفت بھی لازمی ہے کیونکہ ہر طرح کی وابستگی سے لاتعلق ہو کر ہی انصاف پر مبنی فیصلہ عمل میں آسکتا ہے اور یہی سفاک فیصلہ ادب کی ترقی کا باعث ہوتا ہے وگرنہ جیسے اب P.R پر سارے کام چلائے جانے لگے ہیں تو اس کا نتیجہ بھی سامنے ہے... کوئی بڑا ادیب سامنے آتا دکھائی نہیں دے رہا ہے کاش ہمیں بھی کوئی "حالی" میسر آجائے جو پھر سے "مقدمہ شعر و شاعری" تصنیف کر کے ہمیں صحیح منزل کی طرف guide کر سکے۔

HASHMIS .
C-34- BLOCK 'J'
NORTH NAZIMABAD KARACHI.
PH: 6635699

انتخابِ کلام

ریحانہ روحی

مصروفیت اسی کی ہے فرصت اسی کی ہے
اس سرزمینِ دل پہ حکومت اسی کی ہے

ملتا ہے وہ بھی ترکِ تعلق کے باوجود
میں کیا کروں کہ مجھ کو بھی عادت اسی کی ہے

جو عمر اس کے ساتھ گزاری اسی کی تھی
باقی جو بچ گئی ہے مسافت اسی کی ہے

ہوتا ہے ہر کسی پہ اسی کا گماں مجھے
لگتا ہے ہر کسی میں شباہت اسی کی ہے

لکھوں تو اس کے عشق کو لکھنا ہے شاعری
سوچوں تو یہ سخن بھی عنایت اسی کی ہے

درِ آستاں کوئی ہو بظاہر سرِ سجود
لیکن پسِ سجود عبادت اسی کی ہے

وہ جس کے حق میں جھوٹی گواہی بھی میں نے دی
روحی مرے خلاف شہادت اسی کی ہے

ساحر جو اپنے آپ کو کہتا پھرے خدا
دم ایسے شخص کا کبھی بھرتا نہیں ہوں

ساحر شیوی 2.2.99

ساحر شیوی

برطانیہ

ایک چھوٹی سی نظم "انتظار" نظر سے گذری

میں نے کھڑکیاں دل کی
اپنے کھول رکھی ہیں
انتظار ہے جس کا
وہ ابھی نہیں آیا
پھر نہ ہو کبھی ایسا
آندھی زور کی آئے
اور دل کی کھڑکیاں
بند ہو کے رہ جائیں

اس چھوٹی سی نظم میں جو معنی آفرینی ہے اس نے متوجہ کیا کہ شاعر کی کھوج لگائی جائے۔ نام تو نظم پر موجود تھا۔ ساحر شیوی، مگر کاغذ کا یہ ٹکڑا کس پرچے کا ہے اس کے لیے جتن کرنے پڑے تو پتہ چلا کہ یہ کراچی کا ماہنامہ "سخنور" ہے جس کے مدیر نقوش نقوی ہیں اور دسمبر 1998ء

کے اس "سخن ور" میں ساحر شیوی کا گوشہ لگا ہے جس میں ان کے لکھے ماہیے، دوہے، تدوینی، ہائیکو، کہہ مکرنیاں اور افسانے بھی شامل ہیں۔ ان کے بارے میں مضامین پڑھنے سے پتہ چلا کہ موصوف صحافی بھی ہیں اور برطانیہ کے شہر لیوٹن سے ایک سہ ماہی جریدہ "سفیر اردو" 1997ء سے شائع کر رہے ہیں۔ گویا ہر فن مولا ہیں۔

ذرا ان کی کہی ایک کہہ مکرنی ملاحظہ ہو۔

روپ لیے انسانوں کا
کبھی کبھی بھگوانوں کا

مندر کا کھاتا ہے مال
اے سکھی! ساجن
نا سکھی! کنگال

اس کہہ مکرنی نے ہمیں ساحر شیوی تک پہنچا دیا۔ اور نصف ملاقاتوں میں پتہ چلا کہ وہ جتنے اچھے شاعر ہیں۔ ادیب ہیں صحافی ہیں اس سے کہیں اچھے انسان ہیں۔ مہمان نواز ہیں۔ محبت کرتے ہیں اور محبت کرنا سکھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا حلقۂ احباب اتنا وسیع ہے کہ ان کی بے زبانی زبان بن گئی ہے۔

انہیں میں نے "بے زبان" یوں کہا کہ ساحر شیوی اہل زبان نہیں۔ جی جناب! انہیں تو اس وقت تک اہل زبان کی ہواؤں نے بھی دور دور تک چھوا نہ ہوگا جب انہوں نے اردو زبان میں شعر گوئی شروع کی تھی۔ تو پھر بات ٹھیک ہے نا کہ "زبان اردو" کسی کی میراث کب ہے۔ گو ساحر کی مادری زبان مراٹھی ہے مگر اردو سے انہیں انوکھا پیار ہے۔ میں نے ان سے کہا 'صاحب! اپنا تعارف ذرا تفصیل سے کرائیں۔ بولے "یہی بہت مشکل کام ہے۔ اپنا تعارف اور میں خود؟" انہیں اُلجھن ہو رہی تھی مگر جب کہنے پر آئے تو پھر کہتے چلے گئے۔ وہ کہہ رہے تھے :

میرا پورا نام عبداللہ محمد پالیکر ہے۔ 29 دسمبر 1936 کے دن میں نے بھارت کے اس خطہ میں آنکھ کھولی جسے کوکن کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے کوکن کے تین اضلاع تھانہ، قلابہ، رتناگیری ہیں۔ میرا تعلق رتناگیری سے ہے۔ اس خطہ کی سب سے بڑی زبان مراٹھی ہے۔ گو اردو ادب کی ترقی و ترویج کے لیے یہاں بہت کم کام ہوا ہے مگر اردو بولنے کا رواج عام ہے۔ جگہ جگہ اردو مدارس بھی ہیں۔ اسے مہاراشٹر گورنمنٹ کی فراخدلی کہئے کہ اردو میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو سرکار کی پوری حمایت حاصل ہے۔

اگر تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں ہو جائے گی کہ یہاں کے باشندوں نے بھی شروع ہی سے اردو ادب کی زلفوں کو سنوارنے میں اپنی قابل قدر خدمات پیش کی ہیں۔ یہاں آج بھی چمنستانِ اردو کے نونسال موجود ہیں اور اس کی آبیاری اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہ بندۂ اردو بھی جو اپنے وطن سے

تین ہزار میل دور افریقہ کے صحراؤں میں مقیم تھا۔ کوکن کے ان ادبی خادموں سے ایک ہے۔

میں نے آٹھویں جماعت میں پہلا افسانہ "ارے آپ!" کے نام سے لکھا۔ اینگلو اردو ہائی اسکول داپولی جو آج نیشنل ہائی اسکول داپولی کے نام سے مشہور ہے۔ وہاں ہمارے زمانے میں کئی شاعر و ادیب زیر تعلیم تھے۔ اسکول میں ان کے بڑے چرچے ہوتے تھے اور طلبا انہیں بڑی قدر و منزلت سے دیکھا کرتے تھے۔ گو سب مبتدی ہی تھے مگر خود کو اوّل درجہ کے گروپ میں شمار کرتے تھے۔ میں دل ہی دل میں سوچتا رہتا تھا۔ کیسا اچھا ہوتا اگر میں بھی ادیب ہوتا اور کوئی کہانی لکھ کر بچوں کے رسالہ میں شائع کراتا۔ اسکول میں بچوں کے چند رسالے جاری تھے۔ رسالہ "غنچہ" بجنور کو سب سے زیادہ پسند کیا جاتا تھا۔ بچے اس میں اپنی کہانی شائع کرانا باعث فخر سمجھتے تھے۔ میں نے بھی اپنی ایک کہانی شائع کرائی اور جماعت کے بچوں میں میرا بھی ذکر ہونے لگا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں بھی اس کہانی کی اشاعت کے بعد اپنے آپ کو اسکول کے فنکاروں میں شمار کرنے لگا۔

زندگی کی ناہمواری، بے سکونی اور مالی پریشانی کے باعث نویں جماعت کے لیے داپولی سے فردوس ہائی اسکول میں داخلہ لینا پڑا۔ جہاں میری ادبی زندگی گویا مٹ کے رہ گئی۔ البتہ اسکول کے سالانہ جشن پر ایک میگزین "شعلہ و شبنم" کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں میرا ایک افسانہ "پابندیٔ مذہب" کے نام سے چھپا مگر میں نے یہ قیامِ داپولی ہی میں لکھا تھا۔ سالانہ جشن کی تقریب میں ایک طرحی مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا۔ اس طرح میں ایک ٹوٹی پھوٹی غزل میں نے بھی کہی اور یہی غزل میری شاعری کا آغاز ثابت ہوئی۔ غزل کے اشعار بے وزن سی مگر میں نے مشاعرے میں سنائے۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے کوئی معرکہ سر کیا ہو۔

گرمیوں کی تعطیل میں جب اپنے گھر گیا تو یہی غزل میں نے اپنے گاؤں کے ایک ادیب و شاعر جناب حسرت علی شیوی کو دکھائی۔ میرا شوقِ شاعری بھی ان ہی کا مرہونِ منت ہے۔ حسرت صاحب نثر نہایت ہی حسین اور دلکش لکھتے تھے۔ ان کے لکھنے کا ایک منفرد انداز تھا۔ اُس وقت ان کے افسانے اور تخلیقات رسالہ شاعر، خبر دار بمبئی اور دیگر رسالوں میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے تھے۔ انہیں مولانا قمر نعمانی سہرامی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ ان کی وساطت سے میں نے اپنی غزل مولانا قمر نعمانی سہرامی کے پاس اصلاح کے لیے بھیج دی۔ میں نے اپنا تخلص نصرت رکھا تھا۔ مولانا کے مشورہ سے میں نے اپنا تخلص ساحر کو دیا کیونکہ ان کے ایک اور شاگرد کا تخلص بھی نصرت تھا اور ادبی دنیا میں وہ مجھ سے سینئر تھے اور اب آدم نصرت کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔

دسویں جماعت کے لیے مجھے فردوس ہائی اسکول بھی خیر باد کرنا پڑا۔ مالی پریشانیاں ہمیشہ دیوار بن کر آڑے آتی رہیں۔ میرے چچا بمبئی پولیس میں ملازم تھے۔ انہوں نے بمبئی میں مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ بمبئی آنے کا فائدہ یہی ہوا کہ مولانا قمر نعمانی صاحب کی صحبت نصیب ہوئی۔ قیام افریقہ میں

بھی ڈاک کے ذریعے ان سے اپنے کلام پر اصلاح لیتا رہا۔ 1953ء میں داپولی ہائی اسکول سے ای۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کیا۔ مالی حالت اجازت نہیں دیتی تھی کہ مزید تعلیم حاصل کر سکوں۔ ایک سال مایوسی و نامرادی میں کٹ گیا۔ ایک عزیز کے ذریعے 18 مارچ 1954ء کو مشرقی افریقہ کی دھرتی پر قدم رکھا۔ یہاں آکر گھر کی ذمہ داریوں اور مادی ضرورتوں نے آہستہ آہستہ کاروباری دنیا میں دھکیل دیا۔ تاہم کاروبار زندگی کے ساتھ مشقِ سخن بھی جاری رہی اور مالی پریشانیاں بھی دور ہوتی گئیں۔

ممباسہ کی بندرگاہ جسے گیٹ وے آف کینیا بھی کہا جاسکتا ہے۔ میرے لیے ایک عجوبہ تھی۔ یہاں اترتے ہی ایسا محسوس ہوا جیسے میں نئی دنیا میں آگیا ہوں۔ نیا ماحول، نیا ملک، نئے لوگ، نئی زبان، غرض ہر شئے نئی تھی۔ ممباسہ میں ایک دو روز قیام کے بعد کینیا کے پایۂ تخت "نیروبی" میں اپنے احباب واقارب کے ہمراہ پہنچ گیا۔ یہ شہر ممباسہ سے تین سو میل کی دوری پر واقع ہے۔ نہایت حسین اور دلکش شہر ہے۔ یہ ملک جو 12 دسمبر 1963ء تک انگریزوں کا محکوم رہا۔ میرے لیے آج تک جنت نشاں بنا رہا ہے۔ عرصہ دراز سے یہاں ایشیائی باشندے مقیم ہیں۔ تلاش معاش میں آئے مگر اس ملک کی زُلفیں سنوارنے میں اپنی قیمتی جانوں تک کو ضائع کیا۔ یہاں کی ریلوے لائن انہیں کی مرہون منّت ہے۔ ایشیائی باشندوں نے اس ملک کو کبھی غیر نہیں سمجھا۔ یہ مقامی باشندوں کے دوش بدوش آج بھی ہر راہ میں گامزن ہیں حتیٰ کہ جنگِ آزادی میں بھی انہوں نے مقامی باشندوں کا ساتھ دیا۔ جب تک انگریزوں کا راج رہا یہاں اسکولوں میں اردو سکھائی جاتی رہی لیکن آزادی کے بعد آہستہ آہستہ دوسری ایشیائی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی اسکولوں سے خارج کر دیا گیا۔

جب میں مشرقی افریقہ کے ساحل پر اترا تھا تو میں نے اپنی زندگی کے سوالہ خزاں زدہ سال پورے کر لیے تھے۔ زندگی کے یہ سولہ سوال پریشانی۔ بے سکونی اور بے ثباتی کی نذر ہوگئے۔ خیال تھا نیروبی آنے کے بعد یہیں مستقل سکونت ہوگی مگر مقدر نے یہاں بھی ساتھ نہ دیا۔ ایک دو ماہ بعد فکرِ معاش نے کسمو (Kismu) پہنچا دیا جو کینیا میں لیک وکٹوریہ کے کنارے آباد ہے اسی شہر سے میری کاروباری زندگی کا آغاز ہوا اور یہیں میری شاعری نے پرپُرزے نکالے۔ اگرچہ میں ڈاک کے ذریعہ قبلہ قمر صاحب سے اپنے کلام پر اصلاح لیا کرتا تھا لیکن یہ بہت دقت طلب بات تھی۔ اسی آمدورفت میں میرا کلام کافی گم ہوگیا۔ شروع شروع میں، میں اپنے کلام کی نقل اپنے پاس نہیں رکھتا تھا۔ یہ عادت میں نے بعد میں ڈالی۔

1962ء میں جناب کالیداس گپتا رضاؔ سے ملاقات ہوگئی۔ مشرقی افریقہ میں رضا صاحب عرصہ دراز تک اپنی زندگی کے قیمتی لمحات اردو ادب و زبان کے گلستاں کو سرسبز و شاداب کرنے میں صرف کر چکے ہیں۔ میرے پاس ان کو خراج تحسین ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں جس کے وہ سو بار مستحق ہیں۔ رضا صاحب سے ملاقات کے بعد میں قمر صاحب کی اجازت سے اپنا کلام رضا

صاحب کو دکھانے لگا۔ قبلہ رضا صاحب کی صحبت اور محبت کام آگئی اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھنے کی طرح سیکھا۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ شاعری کو میں نے اپنا پیشہ یا ذریعہ معاش نہیں بنایا مگر کاروباری مصروفیات سے نجات پانے کے بعد شعر گوئی میرا دلچسپ اور شیریں مشغلہ ہے۔

میں نے 1980ء میں کوکن اردو رائٹرز گلڈ کی شاخ نیروبی میں قائم کی جس کے ذریعے کوکن کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کو کتابی شکل دی گئی۔ بعد میں اس گلڈ کا دائرہ کار وسیع ہوتا چلا گیا اور 1991ء میں سید معراج جامی کا شعری مجموعہ روزنِ خیال، 1995ء میں کراچی میں مقیم داغ اسکول کے آخری استاد شاعر حضرت فدا خالدی کی رباعیات کا مجموعہ "آتشِ خوابیدہ" شائع کیا۔ 1990ء میں نیروبی کے چند ممتاز اہلِ قلم کے ساتھ مل کر "کینیا اردو سینٹر" کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی جس کے تحت ہندوپاک کے ممتاز اہلِ قلم کو نیروبی بلا کر ان کی پذیرائی کی گئی۔

اب مرحلہ "سخن ور چہارم" کے سوالات کا تھا۔ ساحر نے بڑی خوش دلی سے ان کے جواب بھی دیے۔ اس سے قبل میں آپ کو یہ بتادوں کہ 1954ء میں ساحر کی پہلی غزل میرے شہر بمبئی کے ایک ہفتہ وار رسالہ "فنکار" میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد سے مسلسل ان کا کلام اور مضامین ہندوپاک کے مقتدر جریدوں میں شائع ہوتا رہا ہے۔

ان کی تصانیف کی تفصیل یوں ہے:

ا۔نیم شگفتہ (مجموعہ کلام) 1979ء ۲۔وقت کا سورج 1983ء)، ۳۔صحرا کی دھوپ (1987ء)، ۴۔سلسلہ منتشر خیالوں کا (1991ء) ۵۔پانچواں آسمان (1993ء)، ۶۔ابھی منزل نہیں آئی (1996ء)، ۷۔پہلا نعتیہ مجموعہ "وسیلۂ نجات" (1998ء) کمال کی بات یہ ہے کہ ساحر شیوی دوسروں کے مجموعے تو اپنی گلڈ سے شائع کرتے رہے مگر تمام اختیارات کے حامل ہونے کے باوجود انھوں نے اپنا کوئی مجموعہ اپنی گلڈ کے تحت نہیں چھپوایا۔ یہی ان کی اعلیٰ ظرفی کی سب سے بڑی مثال ہے۔

اب ہم ساحر شیوی سے پوچھتے ہیں کہ شاعری کے علاوہ ان کی کس صنفِ سخن سے وابستگی ہے۔

ساحر کہہ رہے تھے:

"شاعری کے علاوہ نثر سے بھی میری وابستگی ہے۔ افسانے بھی لکھے اور مضامین بھی، مگر نثر کی جانب کم رجحان ہے۔ شاعری ہی میرے اظہارِ خیال کا ذریعہ ہے۔ میرے یہاں کس قسم کی تنگ نظری یا تنگ دلی نہیں ہے۔ بحیثیت تخلیق کار میں وسیع النظر اور فراخدل ہوں۔ میں کسی ضابطہ کا پابند ہو کر رہنا پسند نہیں کرتا۔ یہ ایک شعر ہے ؎

جدید کہنہ روایات میں الجھتا نہیں
سخن نرالا ہے ساحر کا اس کی سیدھی ڈگر

میری زندگی کا سب سے اہم اور افسوسناک واقعہ میرا بڑا بیٹا کلیم جو صرف تیرہ سال کا تھا 7 ستمبر

بروز اتوار ایک ہائی حادثے میں کینیا کے ایک جنگل میں گم ہو گیا۔ اس کے پلٹنے کا آج بھی انتظار ہے۔
نیروبی کینیا مشرقی افریقہ میں لٹیروں نے میری ذات پر چھ بار قاتلانہ حملے کیے مگر اللہ کی شان میں آج بھی زندہ ہوں۔
بے شک اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ میں اردو کے مستقبل کے بارے میں کافی پُر امید ہوں۔ اس کو مٹانے کی ساری کوششیں ناکام ہو جائیں گی۔ حاسد جتنا دبانے کی کوشش کریں گے۔ یہ زیادہ اُبھرتی رہے گی۔ البتہ مغربی ممالک میں اردو کے مستقبل کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔ نئی نسل دن بہ دن اردو سے ناآشنا ہوتی جا رہی ہے۔ چودہ پندرہ سالوں کے بعد اردو کا نام لیوا مشکل سے نظر آئے گا۔
ایک قطعہ ملاحظہ ہو:

گو برا آج حالِ اردو ہے
چار جانب جمالِ اردو ہے
خود ہی بیمار اور خود ہی طبیب
بس یہی تو کمالِ اردو ہے

میں شاعری میں غزل اور نظم کو اظہارِ خیال کے لیے بہتر سمجھتا ہوں۔ نثری نظم اور نثر یا آزاد غزل کے تجربے۔ بشرطہ کہ ان میں ابہام نہ ہو تو اظہارِ خیال میں آسانی ہو سکتی ہے مگر آج کل میری رائے تو یہی ہے کہ اکثر نثری نظمیں ان چیزوں کا شکار رہتی ہیں۔ آغاز کچھ ہوتا ہے اور اس کی انتہا کچھ ہوتی ہے۔ اگر شاعر یہ فکر کرے کہ جو کچھ میں تحریر کر رہا ہوں۔ وہ صرف میرے لیے نہیں ہے بلکہ دوسروں کے لیے بھی تو اوزان اور ردیف و قافیہ۔ علم عروض کی قید سے آزاد رہ سکتا ہے۔
میرے نزدیک مشاعرے اور تخلیقی نشستیں دونوں ادب کی تخلیق و افادیت کے لیے معاون اور بہتر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ بشرط کہ شاعر اپنا کلام بار بار وہی نہ سنائے۔ مطلب ایک غزل جسے کچھ پہلے داد ملی ہو دوبارہ ہر مشاعرے کی نذر کرے۔
جب تک ہم میں ایک دوسرے کی کتابوں کی خرید کر پڑھنے کا شوق پیدا نہیں ہوتا، کتابوں اور جرائد کی بقا میں مشکلیں پیدا ہوتی رہیں گی۔
ادب کی ترقی اور بقا کے لیے تنقید بے حد ضروری ہے اور سود مند ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن تنقید ایسی نہ ہو کہ لوگ ادب کے بجائے ذاتیات پر اتر آئیں۔ بعض نقاد یہ بات سوچتے ہیں اور ایسے ایسے الفاظ تحریر فرماتے ہیں جو دل شکنی کا باعث بن جاتے ہیں مگر تنقید ایسی بھی نہ ہو کہ صرف تعریفوں کے پل باندھیں اور فن کاروں کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچائیں۔

SAHIR SHIWEE
47 Sutton Garden, Sundon Park, Luton Beds LU3 3AF, U.K

انتخابِ کلام

ساحرؔ شیوی

جھوٹ سچ سب کچھ پرکھ لیتی ہے دانشور کی آنکھ
حشر میں ڈھونڈے گی ہم کو شافعِ محشر کی آنکھ

ہر قدم پر ہم کو سمجھائے نکاتِ زندگی
کتنی تھی باریک بیں اسلام کے رہبر کی آنکھ

گو گنہگاروں میں ہوں میں نام پیاسوں میں بھی ہے
کیا پلائے گی نہ مجھ کو ساقیِ کوثر کی آنکھ

بادشاہوں اور فقیروں کا رہا یکساں مقام
کیوں نہ یکساں دیکھتی کونین کے سرور کی آنکھ

دیکھ کر حالت مسلمانوں کی یا رب آج کل
خون کے آنسو بہاتی ہوگی پیغمبر کی آنکھ

جس نے محبوبِ خدا پر رات دن بھیجا درود
دیکھتی ہے پیار سے ہر دم اُسے داور کی آنکھ

بے حیائی کو ہمیشہ دور آنکھوں سے رکھا
باحیا تھی اس قدر اللہ کے دلبر کی آنکھ

نام آتا ہے زباں پر جب محمدؐ کا کبھی
کیا ہی جھکتی ہے ادب سے ساحرِ کمتر کی آنکھ

اک عمر نذرِ ادب رہے ہیں نوکِ قلم کے ساز
اک شعر سی دل میں چھو جائیں تو آپ دن

عبدالاحد ساز

۱۲ - نومبر ۱۹۹۵ء

عبدالاحد ساز

بمبئی

ایک بار مرحوم جناب فیض احمد فیض سے پوچھا گیا کہ آپ کو اپنی کتابوں کی رائلٹی کتنی ملتی ہے۔ جبکہ آپ اپنے دور کے مقبول ترین شاعر ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ اوسط نکالا جائے تو سو روپیہ ماہوار بنیں گے۔"

ممکن ہے اب صورت حال کچھ بہتر ہو مگر تمام شعراء کے لیے نہیں۔ چند نام ہیں جو انگلیوں پر گنے جا سکے ہیں جن کے شعری مجموعے بازار سے جلد اٹھ جاتے ہیں ورنہ اب شعراکا، ادباکا اور ان کی کتابوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔

دراصل ہماری زندگی کی ترجیحات میں اب تیزی سے تبدیلی آگئی ہے۔ ہم نے ظاہری نمود ونمائش کو اتنی اہمیت دے دی ہے کہ ادب اور شعر ہماری ترجیحات میں سب سے نیچے والے خانے میں دب گئے اور یہ بد قسمتی اردو ادب کے شعراء وادبا کے حصے میں آئی ہے۔ آپ 'سخن ور' اور 'گفتنی' میں تقریباً اسی فیصد قلم کاروں کا یہ شکوہ پڑھیں گے کہ کتابوں کی پذیرائی نہیں ہو رہی ہے جبکہ دوسری زبانوں کا ادب اس کس مپرسی کا شکار نہیں ہے مگر پھر بھی آفرین ہے ہمارے شعراء وادبا پر کہ وہ اردو کی آبرو کو گھٹنے نہیں دیتے۔

بمبئی کے مصروف شاعر عبدالاحد ساز کا نام بھی ایسے ہی شعراء کی فہرست میں سرفہرست

رکھا جاسکتا ہے جو اردو زبان و ادب کی بقا کے لیے سرگرداں ہیں اور جو لکھ رہے ہیں بڑے خلوص سے لکھ رہے ہیں۔

عبدالاحد ساز 16 اکتوبر 1950ء کو میری جنم بھومی بمبئی (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ بمبئی یونیورسٹی سے بی۔ کام تک تعلیم پائی اور کمپیوٹر پروگرامنگ میں ڈپلوما لیا۔ رزق روزگار کے لیے کپڑوں کی ایک تجارتی فرم میں شرکت و ملازمت کر رہے ہیں۔

ساز نے بہت عمدہ غزلیں کہی ہیں لیکن ان کی نظمیں ان کے احساسات اور مشاہدات کو ایک ایسی کیفیت عطا کرتی ہیں کہ الفاظ پیکر تراشتے ہیں۔ 84ء میں فیض احمد فیض کی وفات پر انھوں نے جو نظم کہی اس کے دو بند ملاحظہ ہوں:

حرف اور صورت کی بندش میں ابھرتے پیکر
ایسے مضمون کہ جنہیں دیکھ سکیں چھو بھی سکیں
پھول سے نرم و سبک لہجے میں خوشبو سا کلام
زندگی بھر جسے دہراتے رہیں اور نہ تھکیں

نئی راہیں نئی سمتیں نئی منزل ہے مگر
آج بھی تیری صدا سنگِ نشاں ٹھہری ہے
تو نے جو طرزِ فغاں کی تھی قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

ساز نے ایک بڑی ہی خوبصورت نظم کہی ہے نانی اماں کی وفات پر، پوری ایک تہذیب کا نقشہ کھینچا ہے۔ آیئے اس خوبصورت کلام کے خالق سے کچھ دیر کے لیے مل بیٹھتے ہیں اور مکالمہ کرتے ہیں۔

ہمارے سوال پر ساز نے مسکرا کر ساز چھیڑا اور عمر رفتہ کو آواز دیتے ہوئے بولے:

"میری ابتدائے سخن کا زمانہ وہی تھا جو عنفوانِ شباب کا تھا۔ والد مرحوم عبدالرزاق سعید صاحب خود پختہ کلام شاعر ہونے کے ساتھ اردو، فارسی، عربی، اور انگریزی ادبیات سے گہرا شغف رکھتے تھے، اُنھیں علامہ سیماب اکبر آبادی سے شرفِ تلمذ حاصل رہا اور اُن کے کلام کے چار مجموعے "فضائے غزل"، "نغمہ توحید"، "نشاطِ عمل" اور "نغماتِ حرم" شائع ہو چکے تھے۔ گھر میں پڑھنے لکھنے کا ماحول اور شعر و ادب کی کتابیں شروع ہی سے میسر رہیں۔ پھر اپنے اندر شاعری کے "اجزا" کی موجودگی اور اپنی طبیعت کے موزوں ہونے کا انکشاف ہوا چنانچہ 64ء کے اواخر میں 9ویں جماعت کی طالب علمی کے زمانے ہی میں ٹوٹے پھوٹے شعر کہنے شروع کر دیے۔ میں نے باقاعدہ اصلاح کسی سے نہیں لی لیکن میرے ادبی و شعری ذوق کی تربیت میں والد مرحوم اور اپنے اسکول کے لائق اُستاد اور 'اردو' دنیا کے ممتاز مدرس ایس جالب مظاہری مرحوم کا بڑا ہاتھ رہا۔ میری پہلی

مطبوعہ نظم "نجوم ہند" ہے جو اتفاقاً 1965ء ہی میں روزنامہ اردو ٹائمز بمبئی میں شائع ہوتی تھی۔

پھر "اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری" میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کرنے کے بعد سڈنہم کالج آف کامرس میں داخلہ لیا۔ کامرس میرے لیے بڑا ہی خشک مضمون تھا مگر کالج کے ہنگاموں، بزم آرائیوں، رومان اور معاشقوں نے اس کی تلافی کرر کھی تھی "جو کچھ تھا" اور "جو ہونا چاہئے تھا" کے تضاد نے شعری صلاحیت کی دھار کو تیز کیے رکھا۔ پھر 1974ء میں ایک دیرینہ دھواں دھار عشق ازدواج کی شکل میں زندگی و شخصیت کا مستقل حصہ بن گیا، جو میری بیوی فریدہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس واردات کو اب پچیس برس پورے ہو چکے ہیں اور میری شاعری موضوعات کے تمام تر تنوع اور عصری فکر و احساس کے باوجود آج بھی اس سے صد جہت انسلاک رکھتی ہے۔

ابتدائے سخن کے آٹھ دس برس شوقِ شعر گوئی اور مشق و ریاضت ہی کے رہے۔ بعد کو رفتہ رفتہ سوچنے، جاننے، محسوس کرنے اور لکھنے کے عمل کے مابین ارتباط قائم ہوتا گیا اور شاعری اپنی ذات کے اظہار کا وسیلہ اور پیرایۂ اظہار کا چیلنج بنتی چلی گئی جس سے نبرد آزمائی آج بھی جاری ہے۔"

سوال نمبر 2 کے جواب میں ساز نے کہا کہ ان کے کلام کی اشاعت کا باقاعدہ سلسلہ 1975ء کے بعد ہی شروع ہوا گزشتہ بیس برسوں سے ان کی نظمیں غزلیں ہندوستان کے بیشتر مقتدر رسائل، شاعر، شب خون، ایوانِ اردو، آج کل، کتاب نما، نیا دور، ذہنِ جدید، فکر و فن، نیا ورق وغیرہ اور پاکستان کے افکار، اقدار، سیپ، تخلیق، طلوعِ افکار، ارتقا وغیرہ ہیں شائع ہو رہی ہیں۔ اس عرصے کے دوران کینیڈا سے شائع ہونے والے اشفاق حسین کے جریدے "اردو، انٹر نیشنل" میں بھی ان کا کلام متواتر شائع ہوا ہے۔

پچھلے آٹھ دس برسوں سے آل انڈیا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے بمبئی اور بیرون بمبئی کے مشاعروں اور "مباحثوں میں بحیثیت شاعر اور بحیثیت ناظم شرکت رہتی ہے ہندوستان کے مختلف شہروں کے علاوہ بیرون ملک بھی تین ادبی مشاعرے پڑھے ہیں۔ 1982ء میں کراچی میں فیض صاحب کی صدارت میں پڑھنے کی سعادت و مسرت نصیب ہوئی اور 1987ء میں کراچی پریس کلب کے مشاعرے میں مدعو کیا گیا جسے جون ایلیا اور زاہدہ حنا نے ترتیب دیا تھا۔ ابھی حال ہی میں ستمبر 1998ء میں تین عالمی انڈو پاک مشاعروں، دوحہ (قطر) ابو ظہبی اور دبئی (متحدہ عرب امارات) میں شرکت رہی جو جشنِ علی سردار جعفری کے سلسلے کے تھے۔

شاعری کے علاوہ گاہے گاہے تنقیدی اور تجزیاتی مضامین بھی آٹھ دس برسوں سے لکھ رہے ہیں جو ہندوستان کے موقر جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ بمبئی، لکھنؤ احمد آباد اور دیگر ریاستی اردو، اکادمیوں کے سیمیناروں میں بحیثیت مقالہ نگار شرکت رہا کرتی ہے دو تین مقالے جو بطورِ خاص پسند کیے گئے ان کے موضوعات یہ ہیں:

"اردو شاعری اور انسانیت کا سفر" "فیض کی ترسیلی فضا کا تعین، نقشِ فریادی کی نظموں میں" "فراق کی غزل سے نئی غزل کے جمالیاتی سروکار۔"

کہنے لگے۔ "میں موقفِ فکر کے اعتبار سے اسلامی نظریہ حیات کا حامی ہوں لیکن شاعری کے براہِ راست کسی مکتبہ فکر کے ساتھ کمیٹیڈ ہونے کا قائل نہیں ہوں۔ ایک سوچنے سمجھنے والے آدمی کا زندگی کو اپنی نظر سے دیکھنے کا ایک ڈسپلن ضرور ہوتا ہے اور اس کے نظریے کا فنی اظہار میں در آنا ناگزیر بھی ہے لیکن اس اظہار کا پیرایہ مبلغانہ و خطیبانہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ آرٹسٹک اور جمالیاتی انداز میں منجذب ہونا چاہئے۔ میں شاعری کو واضح اصطلاحی خانہ بندیوں مثلاً ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت وغیرہ میں تقسیم کرنے کا بھی قائل نہیں ہوں۔ اچھی شاعری بیک وقت انفرادی، عصری اور آفاقی ہوتی ہے۔

میرا مجموعہ کلام "خموشی بول اُٹھی ہے۔" 1991ء میں شائع ہوا ہے ادبی حلقوں میں سنجیدگی سے دیکھا گیا اور اسے ناقدین و قارئین کی خاطر خواہ توجہ اور پذیرائی حاصل ہوئی۔ اسے اس سال کا مہاراشٹر اسٹیٹ اردو، اکادمی ایوارڈ بھی ملا تھا۔ اس کی اشاعت کے بعد دو رسائل سہ ماہی 'ترسیل' بمبئی اور سہ ماہی 'تکمیل' بھیونڈی نے مجھ پر مبسوط گوشے بھی شائع کیے تھے جن میں مشاہیر، ادیبوں اور نقادوں کے علاوہ میرے ہم عصر لکھنے والوں کے مضامین اور آراء بھی شامل تھے۔"

وہ کہہ رہے تھے :اپنی طالب علمی کے دور سے لے کر اب تک اپنی صوابدید اور بساط کی حد تک اساتذہ کی شاعری روایتی و کلاسیکی شاعری پھر ترقی پسند اور جدید عصری شاعری کا مطالعہ میسر آتا رہا۔ مجھے شاعری وہی اپیل کرتی ہے جس میں اپنے عہد کے سماجی سیاسی معاشرتی کوائف کے بیچ زندگی کرتے ہوئے انسان کے کرب اور راحت کا جذباتی و نفسیاتی اظہار ہو مگر جو صرف اپنے عہد کے حصار ہی میں محدود نہ رہ کر زندگی کی روحانی قدروں Divine value سے بھی اپنا مثبت اور غیر مشروط رابطہ استوار رکھتی ہو جس میں حسن و جمال کی لطافت، فکر کی روشنی و وسعت اور انسانی دردمندی ہو، خدا کی بنائی ہوئی کائنات کے حسن، سچائی اور شگفتگی پر ایمان جس کے خمیر میں رچا بسا ہو۔

ساز نے بتایا "میری زندگی کا ایک اہم ادبی واقعہ کراچی کے ایک انڈو پاک مشاعرے سے متعلق ہے۔ مجھے یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ فیض احمد فیض اتفاقاً ان دنوں چار روز کے لیے بیروت سے کراچی تشریف لائیں گے اور یہ مشاعرہ انہیں کی صدارت میں ہوگا۔ یہ مارچ 1982ء کی بات ہے اور یہ مشاعرہ کراچی یونیورسٹی کے سابق طلباء کی انجمن نے آرٹس کاؤنسل کے گراؤنڈ پر منعقد کیا تھا۔ مشاعرے سے دو روز قبل جب فیض صاحب کی آمد کی اطلاع ملی تو میرے دل کی کلیاں کھل گئیں۔ اپنے عہد کے ممتاز اور اپنے بے حد محبوب شاعر فیض کی موجودگی میں کلام سنانا اور اُن کے ساتھ اسٹیج پر بالکل قریب بیٹھ کر انہیں سننا میرے لیے اس وقت ناقابلِ بیان مسرت کا باعث تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میرا جی چاہتا تھا کہ کچھ کچھ وقفے سے فیض کو چھو کر بھی دیکھتا رہوں۔ اسی مشاعرے مرحومہ

پروین شاکر (جنہیں مرحومہ لکھتے ہوئے آج بھی دل دکھتا ہے) سے تعارف ہوا تھا اور چند روز بعد اُن سے ایک تفصیلی انٹرویو لینے کی بھی سبیل ہوئی تھی جو ہفتہ وار 'قومی آواز' بمبئی اور سہ ماہی کی 'فکر و فن' میں شائع ہوا۔"

سوال نمبر 5 کے جواب میں ان کا کہنا ہے کہ

"اردو، یقیناً رابطے کی ایک بڑی زبان ہے۔ اردو کی ترویج و اشاعت اور لف و نشر کا دائرہ ہندو پاک تک ہی محدود نہیں بلکہ خلیجی ممالک، برطانیہ، امریکہ، کنیڈا اور دیگر ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔ مجموعی طور پر میں اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ ہندوستان میں صورت البتہ کشمکش کی ہے۔ حالانکہ پورے ہندوستان میں عام بول چال کی زبان، فلم، ٹی وی اور میڈیا کی زبان اردو ہی ہے لیکن اس پر ہندی کا لیبل چسپاں کیا جا رہا ہے۔ ہم ہندی زبان و ادب کی قدر کرتے ہیں خود اردو، کا ہندی سے گہرا ارتباط ہے۔ خود ہندی کے اور علاقائی زبانوں کے ادیب و شاعر اردو کے حق میں ہیں مگر سرکاری سطح پر فریب ناکی مغالطہ انگیزی اور اردو کی شناخت کے ساتھ غاصبانہ رویے کا سلسلہ جاری ہے۔ میں اردو شعر و ادب کو دیوناگری لیپی میں غیر اردو داں طبقے تک پہنچانے کے بھی حق میں ہوں لیکن یہ اس وضاحت کے ساتھ ہونا چاہئے کہ یہ اردو زبان ہے جو دیوناگری ہی میں لکھی گئی ہے اور یہ صرف اک اضافی قدم ہونا چاہئے۔ اس کا مقصد اردو رسم الخط کی تبدیلی ہرگز ہرگز نہ ہونا چاہئے۔ اردو زبان اور رسم الخط کی بقا اور فروغ کے لیے ہندوستان میں اردو والوں کو باضابطہ جہد کرنی ہوگی۔"

وہ کہہ رہے تھے "میں نظم اور غزل دونوں ہی تقریباً یکساں تناسب میں کہتا ہوں۔ خیال اور احساس اپنا پیراہن خود تراش لیتا ہے کبھی نظم کا ہیولیٰ سمٹ کر غزل کے ایک شعر میں مرتکز ہو جاتا ہے اور کبھی غزل کے شعر کا ارتکاز نظم کے در و بست میں پھیل جاتا ہے۔

جہاں تک نثری نظم اور آزاد غزل کا تعلق ہے تو صاحب آزاد غزل تو کسی طرح اپنے گلے سے نہیں اترتی۔ غزل کا ایک انوکھا اور منفرد فارم ہے۔ اس میں عہد بہ عہد معنوی و ترسیلی تبدیلیاں تو ہزاروں ہو سکتی ہیں لیکن ہیئتی تبدیلی کسی طرح برداشت نہیں کی جا سکتی۔ ہاں نثری نظم کے امکانات ہیں مگر نثری نظم کہنے کا حق اُسی کو ہے جو پہلے پابند نظم اور آزاد نظم کہنے پر قدرت رکھتا ہو۔

آج کے دور میں تخلیقی نشستیں جن میں تنقید کے تہذیبی شعور کے ساتھ مباحثے اور مکالمے کی کشادگی اور گنجائش ہو، ادب کی تخلیق ہیں زیادہ معاون ہو سکتی ہیں۔ جہاں تک مشاعروں کا تعلق ہے گو کہ ان کی ادبی اہمیت ثانوی اور ضمنی ہے مگر ان کی افادیت سے یکسر انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ بڑے پیمانے کے مشاعروں میں بھی اگر سامعین کا ایک طبقہ تفریحی اور سطحی شاعری کا دلدادہ ہوتا ہے تو ایک طبقہ اچھی ادبی شاعری کو ذوق و رغبت اور سنجیدگی کے ساتھ سننے اور پسند کرنے والا بھی ہوتا ہے۔ مشاعروں میں مناسب ادبی توازن قائم کرنے اور محض مشاعرہ باز شاعروں کی اجارہ داری کو کم کر کے عام سامعین کے ذوق کی تربیت کی جا سکتی ہے۔ اس کا

اپناہی ایک لطف ہے۔

7۔اس میں کوئی شک نہیں کہ الیکٹرونک میڈیا نے پر سکون اور منہمک مطالعے کے اوقات اور عادات ہم سے چھین لی ہیں۔اس "انفارمیشن سپر ہائی وے" پر دوڑتی ہوئی زندگی میں اطلاعات اور معلومات کی تو بھرمار ہے لیکن بصیرت، انضباطِ فکر اور ارتکازِ نظر کا فقدان ہے جو صرف کتابیں ہی فراہم کر سکتی ہیں۔ ہمیں نوجوانوں اور نونہالوں کے ٹی وی اور انٹر نیٹ کے لیے صَرف ہونے والے اوقات کی حد بندی کر کے انہیں کتب بینی کی طرف بھی راغب کرنا ہوگا۔ ہمارے یہاں کتاب لکھنے والوں، کتاب چھاپنے والوں اور کتاب پڑھنے والوں کے درمیان رابطے کے صحیح چینل بھی نہیں ہیں۔اس سلسلے میں کوئی ضابطۂ عمل وضع کیا جانا چاہیے۔ جہاں تک جرائد کا تعلق ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہندوپاک کے مقتدر اور بڑے رسائل کے علاوہ مختلف شہروں اور گوشوں سے جو چھوٹے چھوٹے ماہانہ وسہ ماہی ادبی رسائل نکلتے ہیں ان میں اردو،والوں کا سرمایہ اور وسائل خواہ مخواہ چھوٹے چھوٹے خانوں میں بٹ کر ضائع ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ صلاحیتیں، سرمایہ اور وقت مجتمع طور پر منتخب اور معیاری رسائل کو فراہم ہوں اور انہیں صحیح قارئین تک پہنچانے کے لیے جدید طریقہ کار، نمائش، اشتہارات، اطلاعات اور دستیابی کی آسانیاں مہیا کی جائیں تو کہیں بہتر صورت پیدا ہو سکتی ہے۔

8۔اس ضمن میں میرے نزدیک دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ شعر و ادب کی تخلیق کے ساتھ ساتھ متوازی خطوط پر صحت مند تنقید کا جاری رہنا لازمی ہے تا کہ ادب کے ارتقائی عمل کو رجحانات اور رویوں کے بننے بگڑنے کو عہد بہ عہد بدلتی ہوئی زندگی کی ترجیحات اور نفسیات کو سمجھا اور پہچانا جا سکے اور نمائندہ عصری ادب کو غیر نمائندہ ادب سے تمیز کیا جا سکے۔ دوسری جانب یہ بھی ہے کہ تنقید کو اس قدر بھی اہمیت نہ دی جائے کہ وہ تخلیق پر فوقیت حاصل کر لے اور تخلیق کار نقاد کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس کا حلقہ بگوش بن جائے۔

ABDUL AHAD SAZ
ZAKRIA MANOR
FORTH FLOOR , 148, YOUSUF MEHER ALI ROAD.
BOMBAY 40003. (INDIA)

انتخابِ کلام

عبد الاحد ساز

نانی اماں کی وفات پر ایک نظم

آج بچپن کو دفن کر آئے

سوہنی جھریاں، سبک آنکھیں،
مہرباں شفقتوں سے پُر چہرہ،
تھپکیاں دیتے ہاتھ نرم آغوش،
چاہتیں، دیکھ بھال، پیار دلار،
سارے کنبے کی فکر، سب کا خیال،
رابطے، رشتے داریاں، ناطے،
خاطریں، وضع داریاں، مہمان،
مرتبے، حیثیت، حساب نساب،
نظم و ترتیب، گھر کے اخراجات،
موت میت، بسیارہ، پیدائش،
تعزیت، تہنیت کے چال چلن،
چھٹی، عاشورہ، عید اور برات،
ہر بڑے چھوٹے دن کا پاس لحاظ،

روزے، نفلیں، وظیفے، تسبیحیں،
صدقہ، منت مراد، پیر فقیر،
خیر خرات، بخششیں، نذریں،
لاگ لگ، لین دین، میل ملاپ،
پوچھ پچھ، رکھ رکھاؤ، ریت رواج،
رونقیں، خوش کلامیاں، آداب،
رات، قصے کہانیاں، چہلیں
میز، الماری، پاندان، پلنگ،
ذائقے، رنگ، خوشبوئیں، چہرے

ان محلوں کا خوشنما ماحول
ان گھروں کی روایتی تہذیب
آج اک دور جیسے ڈوب گیا

آج طِفلی کا ساتھ چھوٹ گیا
آج بچپن کو دفن کر آئے

ساقی فاروقی

لندن

آج 6 اپریل ہے اور سن 2000ء۔ آج کے دن کو بھی پاکستان کی تاریخ میں رقم ہونا ہے۔ جس طرح 4 اپریل 78ء کا دن پاکستان کی تاریخ میں رقم ہوا تھا۔ وہ دن۔۔۔ پھانسی کے تختے پر پاکستان کے ایک وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی زندگی کا آخری دن تھا اور آج۔ پاکستان کے ایک اور وزیراعظم میاں نواز شریف کے مستقبل کا فیصلہ سنایا جانے والا ہے۔ شہر کراچی میں خوف و دہشت کی فضا چھائی ہوئی ہے اور قانون نافذ کرنے والے لوگ بھی سرگرم ہو جائیں گے، اس فضا میں سخن ور (چہارم) میں شامل، اپنے دور کے ایک ہنگامہ پسند، سیماب صفت، مضطرب اور نڈر شاعر ساقی فاروقی کا تعارف لکھنے جا رہی ہوں۔ 1959ء میں ساقی فاروقی نے صاحبزادہ تجمل علی خان کے ماہنامہ "نوائے کراچی" کی ادارت سنبھالی تھی۔ "اُجالے کا زخم" کے عنوان سے ایک منظوم اداریہ بھی (یوم جمہوریہ کی یاد میں) لکھا تھا۔ وہ نظم آج 44 سال بعد بھی اپنے سیاق و سباق کے ساتھ پاکستان کے حالات پر منطبق ہوتی ہے۔

سحر! یہ ملگجی سحر!
کلنک ہے یہ صبح پر

ہمیں کچھ اور چاہئے
عزیز سے عزیز تر
سحر کہ جس کے واسطے
سلگ چکے ہیں رات بھر
وہ جس کی آستین پر
نجوم کا لہو نہ ہو
سحر کہ جس کے ہاتھ میں
لہو بھرا سُبو نہ ہو
سحر کہ جس کے بعد پھر
سحر کی آرزو نہ ہو

مجھے یہ نظم اور ساقی کے دو ایک انٹرویوز اور ان کی شاعری پہ لکھے ہوئے مضامین محترم تجمل علی خان نے بھیجے تھے۔ میں نے غالباً جنوری 1999ء میں ساقی کو سوال نامہ بھیجا تو انہوں نے اس کے جواب میں لکھا کہ

"پیاری سلطانہ پہلے میری دو کتابیں زندہ پانی سچا (شاعری) اور ہدایت نامہ شاعر (تنقید) پڑھ لو۔ جب تک ان کتابوں کو نہیں پڑھو گی تمہیں پتہ نہیں چلے گا کہ میں کون ہوں۔ میرے بارے میں مشفق اور حمایت سے معلومات حاصل کر لو۔

ساقی فاروقی کو معلوم نہ تھا کہ میں نے ان کے بارے میں ان کتابوں کے علاوہ اور بہت کچھ پڑھ رکھا ہے وہ مجھے عزیز حامد مدنی (مرحوم) کی طرح ایک "پڑھی لکھی ٹیڑھی کھیر" معلوم ہوئے۔ انہی دنوں میں نے "مزاحمتی ادب اردو" میں ساقی کی نظم "سوگ نگر 83ء پڑھی۔

چوک چوک، خامشی کھڑی ہوئی
جس کے بند کان میں، ایک سبز خوف کے
سرخ زہر میں بجھی
زرد زرد بالیاں پڑی ہوئی
رات کے طلسم سے، لوگ اداس بھی نہ تھے
روشنی خیال کے آس پاس بھی نہ تھی۔

میں یہ بھی جان گئی تھی کہ ساقی فاروقی نے لندن ہجرت کیوں کی۔ گو کہ ساقی نے اپنے ابتدائی کسی انٹرویو میں اپنی ہجرت کے سبب پر بہت کھل کر گفتگو نہ کی تھی اور کی بھی ہو گی تو میری نظر سے نہیں گزری۔ ان کا "جنگ لندن" کا وہ انٹرویو بھی میں نے پڑھا تھا جس میں انہوں نے اپنے ایک گروسری اسٹور میں کام کرنے اور ایک پاکستانی خاتون کے اسٹور میں آنے پر گھبرا کر سیڑھی سے

گرنے کا ذکر زور شور سے کیا تھا۔ غالباً ساقی نہیں چاہتے تھے کہ کوئی انہیں اس حیثیت میں پہچانے۔
جب میں نے ساقی کو مزید جانا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا بھی ایک پس منظر ہے۔ "خوداعتمادی" حاصل کرنے میں یقیناً ساقی کو ایک طویل عرصہ درکار ہوا ہوگا۔ ساقی نے جس گھر میں جنم لیا تھا وہ یقیناً جاگیرداری کے آس پاس والا گھرانہ ہوگا کیونکہ ساقی نے اپنے ایک انٹرویو میں (جو ابھی شائع نہیں ہوا ہے مگر میں نے اُسے پڑھ لیا ہے) کہا ہے کہ اس کے بچپن میں اُس کے ہاتھ میں ایک کوڑا تھمادیا جاتا تھا اور گھر میں چوری کرنے والے ملازم کو لایا جاتا تھا کہ اُسے کوڑے مارے جائیں۔ اس گھر میں پالتو جانوروں پر بھی تشدد کیا جاتا تھا۔ ساقی اپنی نوجوانی سے ہی جینئس تھا۔ چنانچہ 13 دسمبر 1936ء کو گورکھپور کے ایک ایسے خاندان میں جنم لینے والے بچے قاضی محمد شمشاد نبی فاروقی نے جب بی۔اے تک تعلیم حاصل کرلی تو اس کا فطری شاعرانہ مزاج اُسے علم کی کھوج کی طرف لے آیا۔ ورنہ محمد شمشاد نبی فاروقی آج کا ذہین ساقی فاروقی نہ ہوتا بلکہ کوئی چور لٹیرا اور ڈاکو ہوتا جیسے کہ آج کے پاکستان کے بہت سے پڑھے لکھے ذہین اور طباع نوجوان ہیں۔ جن میں ڈاکٹر بھی ہیں اور پی ایچ ڈی بھی جو منہ پر ڈھاٹے باندھے لوگوں کے گھروں میں کلاشنکوف لیے کھڑے نظر آتے ہیں اور اپنی بیروزگاری کے زخموں کو چاٹ کر اس طرح خود کو Justify کرتے ہیں۔
ساقی 1984ء تک ہندوستان میں رہے۔ پھر 1952ء تک بنگلہ دیش میں رہے۔ پاکستان آئے تو 1963ء تک یہیں قیام کیا۔ یہیں سے بی۔اے کیا اور برطانیہ سدھارے۔ لندن سے انہوں نے کمپیوٹر پروگرامنگ میں مہارت حاصل کی۔ مگر ان کی زیادہ مہارت اپنے اندر کے شاعر کو اُجاگر کرنے میں صرف ہوئی تھی جس کی خاطر وہ کراچی کی زبان میں ہر ایک سے "پنگے" لیتے پھر رہے تھے۔ کتابیں بھی لکھتے رہے۔ انٹرویو دیتے رہے، مضامین لکھتے رہے اور اپنے کو بنانے میں دوسروں کی کھال اُدھیڑتے رہے۔ کبھی افتخار عارف کی شاعری کو رد کررہے ہیں تو کبھی احمد فراز کے بخیے ادھیڑ رہے ہیں۔ ان کے سینئر محترم احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا صاحب بھی ان کی دست برد سے نہیں بچے۔ اگر ساقی نے صرف یہی کیا ہوتا تو ان کے قدم میدان سے اُکھڑتے نہیں اُکھاڑ دیے جاتے۔ مگر ساقی نے کچھ تعمیری کام بھی کیے۔ ان میں ان کی شاعری کے مجموعے 1۔ پیاس کا صحرا، 2۔ راڈار 3۔ بہرام کی واپسی (یہ کوئی جاسوسی ناول نہیں ساقی کی شاعری کا مجموعہ ہے) ،4۔ حاجی بھائی پانی والا، اور 5۔ زندہ پانی سچا، (جس میں ساقی کا 1955ء سے لے کر 1991ء تک کا تمام کلام موجود ہے) جیسی کتابیں لکھیں۔
پھر ساقی نے تنقید پر بھی کام کیا اور دو کتابیں لکھیں۔ بازگشت و بازیافت اور ہدایت نامہ شاعر۔ ساقی کی نظموں کا انتخاب "رازوں سے بھرا بستہ" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ساقی کی خود کی لکھی انگریزی نظموں کا مجموعہ Nailing Dark Storms کے نام سے طبع ہوا ہے۔ ان کی نظموں غزلوں کا ترجمہ A Histening game کے عنوان سے شائع ہوچکا ہے۔

ساقی سے میری "خط بازی" جاری تھی۔ میں نے 13 فروری 99ء کو انہیں دوسرا خط لکھا جس کے جواب میں ساقی نے اپنا تعارف اس نوٹ کے ساتھ بھیج دیا کہ "مجھے تمہارے بارے میں بالکل علم نہیں تھا اس لیے اپنے کراچی کے دوستوں سے (جو تمہیں جانتے ہیں) پوچھا۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ "میں تمہارا دل نہ دکھاؤں۔") غرض کہ پتا مار کے اپنی مختصر سوانح لکھ ڈالی۔ یار تم بڑی ضدی ہو۔ خدا کرے کہ اتنے بڑے پروجیکٹ کے بوجھ تلے دب کر بھی تم خوش رہو۔"

انہوں نے جناب مشفق خواجہ اور مشتاق یوسفی صاحب کے لکھے مضامین کی فوٹو کاپیاں بھی بھجوائیں۔ میں نے شکریہ کا خط لکھا تو ساقی کا جواب آیا" لاہور کی ایک خاتون نے اور دلی کے ایک آدم زاد نے اور الہ آباد کے ایک شخص نے (ساقی! وہ شمس الرحمٰن فاروقی تو نہ تھے) پچھلے دس برسوں میں مجھے خطوط لکھے تھے کہ وہ یا تو ایم۔ اے کا تھیسس مجھ پر لکھنا چاہتے ہیں یا مجھ پر ڈاکٹریٹ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات مجھے عجیب احمقانہ لگی کہ ابھی تو میں زندہ ہوں، میرا کام ادھورا ہے۔ یہ لوگ مجھ پر تھیسس کیسے لکھ سکتے ہیں اور میں نے سختی سے انہیں منع کیا اور اتنے ہولناک خط لکھے کہ وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔" (ذو معنی فقرہ ہے ساقی۔ آپ پر انہیں ہمیشہ کے لیے خاموش کرانے کے الزام میں دفعہ 307 کا اطلاق بھی ہو سکتا ہے) آگے لکھتے ہیں "تمہیں بھی میرا مشورہ یہی ہے کہ تم اپنی کتاب میں مجھے شامل نہ کرو۔ "پابندی" اس لیے لگائی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان میں تو دو چار میرے برابر کے شاعر اور افسانہ نویس موجود ہیں مگر برصغیر سے باہر صرف دو ہیں۔ عبداللہ حسین (نثر) ساقی (نظم) بقیہ سینکڑوں اچھی بری شاعری کر رہے ہیں اور اچھی بری نثر لکھ رہے ہیں مگر وہ اس Leegue میں نہیں ہیں۔ مگر یہ سب باتیں میں تمہیں کیوں لکھ رہا ہوں۔ Please Please, Don't, include me in your book پیار دلار۔ ساقی"

مجھے ساقی کی یہ خود پسندی اچھی لگی۔ اس لیے کہ انہی دنوں مجھے ماہنامہ "شاعر" بمبئی کا ایک شمارہ (اکتوبر 98ء) ہاتھ لگا۔ میں کچھ لکھنے سے پہلے پرانے رسالے کتابیں بھی کھنگالتی رہتی ہوں۔ چنانچہ ساقی کی یہ غزل نظر سے گزری۔ ساقی کا اسلوب اچھا لگا۔ اشعار میں کوئی نئی بات نہ تھی مگر ساقی کے خوبصورت الفاظ نے ان اشعار کو ایک بالکل نئی کیفیت کا پیکر دے دیا تھا اور غزل اپنی پرانی روایت سے ہٹ کر پکاسو کی ایک خوبصورت پینٹنگ میں ڈھل گئی تھی۔ ملاحظہ ہو

میں جھوٹ ہوں اعتبار کر لے
سچ بھول گیا ہوں، پیار کر لے
دشمن کی طرح جو منکشف ہو
اپنوں میں اُسے شمار کر لے
یہ خاموشی کیا پناہ دے گی
جا! لفظ کوئی شکار کر لے

اک رات بدن میں تیرتی ہے
اک خواب کا انتظار کر لے
انکار نہ کر چراغ ہو جا
اب روشنی اختیار کر لے

ساقی نے مجھے لکھا تھا کہ میں ان کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب، نارنگ صاحب، مشفق خواجہ صاحب اور حمایت صاحب سے پوچھ لوں۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب سے تو ملاقات نہیں ہوئی۔ نارنگ صاحب سے ملاقات ہوئی تو گفتگو میں اتنا وقت گزر گیا کہ افطار کا وقت ہو چلا۔ چنانچہ میں اور انور نزہت ڈاکٹر ظلِ ہما اور ڈاکٹر شاہد کے ہاں بھاگم بھاگ پہنچے۔ نارنگ صاحب سے پوچھنا بھول گئے۔

کراچی آکر میں نے حمایت صاحب سے پوچھا۔ وہ مسکرا دیے۔ مشفق خواجہ صاحب سے پوچھا۔ وہ ہنس کر بولے "پاگل ہے وہ۔" ہم ہنس دیے، ہم چپ رہے منظور تھا پردا ترا۔ اب مشتاق یوسفی صاحب سے پوچھنے کی ہمت یوں نہیں پڑی کہ کہیں وہ یہ نہ کہہ دیں۔

"ارے ساقی! وہ تو "بالکل" پاگل ہے۔"

اس "بالکل" سے ڈر کر ہم نے نگار صہبائی سے پوچھ لیا جو ساقی کے یارِ غار ہیں اور بقول مشتاق یوسفی کہ "ساقی جس کو چاہتے ہیں اس کو گالیوں سے نوازتے ہیں۔" (خواتین کو نہیں)۔ نگار صہبائی تو جیسے بھرے بیٹھے تھے کہ ساقی پر نچھاور ہو جائیں۔ کہنے لگے۔ "ارے ساقی۔۔ وہ میرا 1950ء کی دہائی کا یار ہے۔ میرے ناتے سے دوست کا لفظ اس پر نہیں سجتا۔ خود سری اس کے مزاج کا خاصہ ہے۔ شاعری میں وہ اپنے آگے کسی کو نہیں گردانتا جس زمانے میں ہم لوگ یعنی ساقی فاروقی، اطہر نفیس، قمر جمیل جمالی پانی پتی وغیرہ خوب مشاعرے پڑھتے تھے اور رات گئے گھر لوٹتے تھے۔ ہم لوگوں میں سب سے زیادہ فقرے باز اور فلک شگاف قہقہے لگانے والا شاعر ساقی فاروقی تھا۔ اس زمانے میں وہ کثرت سے نظمیں لکھتا تھا اور خوب لکھتا تھا۔ ہر مشاعرے اور ہر شعری نشست سے وہ ہمیشہ کامیاب لوٹا۔ سلیم احمد کی محبت نے اس کو ادبی کھلنڈرہ بنا دیا لیکن سب سے عجیب بات یہ ہے کہ ایک دن ساقی اپنے ہمراہ ایک نووارد شاعر کو میرے گھر لایا اور تعارف کروایا کہ یہ ہیں اسد محمد خاں۔ جنھوں نے اپنا پہلا کلام مجھے سنایا۔ نگار تم بتاؤ یہ نظم ہے یا گیت؟ میں نے فوراً تصدیق کی یہ گیت ہے اور بہت اچھا گیت ہے۔ یہ 1962ء کی بات ہے۔ اس طرح ساقی فاروقی نے اسد محمد خاں کو کراچی کے ادبی حلقوں میں متعارف کروایا۔

پچھلے سال اس کا لندن سے فون آیا کہ اُسے میرے گیتوں کا تیسرا مجموعہ "انت سے آگے" مل گیا ہے ساقی نے بتایا وہ ساری رات میرے گیت پڑھتا رہا ہے اور مجھ سے بات کرنے کا شدید خواہشمند ہے۔ میں نے اپنے کچھ "کیول گیت" بھی اسے بھجوائے تھے اور اس کی رائے مانگی تھی۔

اس نے فون پر کہا کہ میں اپنے تمام کیول گیت اسے بھیج دوں تاکہ وہ کچھ لکھ سکے۔ میں نے اپنے ایک سو بیس سے زیادہ کیول گیت اسے بھجوائے اس یقین کے ساتھ کہ وہ کچھ نہیں لکھے گا۔

ساقی نثر کیسی لکھتے ہیں۔ یہ جاننا بھی ضروری ہے۔ میں نے اُن کی کتاب "بازگشت بازیافت" پڑھی تھی۔ اب پھر پڑھی تو لطف دوبالا ہو گیا۔ اس میں محترم احمد ندیم قاسمی صاحب پر ایک مضمون بعنوان "ایک ندیم کی مدافعت میں" کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"دوسری طرف سبطِ حسن جیسے عالم اور روشن خیال لوگوں نے بھی قاسمی صاحب کی اسلام پسندی اور پاکستان دوستی کو متوحش اور مشکوک نگاہوں سے دیکھا جیسے مذہبی ہونا اور حب الوطنی کا جذبہ رکھنا سب سے بڑی گالیاں ہیں۔ جب فیض کے انتقال (حکم ہو تو وصال لکھ دوں) کے بعد ایک اردو کے اخبار میں سبطِ حسن سے ایک نہایت احمقانہ سوال کیا گیا۔ کچھ یوں تھا "اب کہ فیض صاحب چلے گئے ہیں۔ شاعری میں ان کی جگہ کون لے گا۔" اس سے قطع نظر کہ اس قسم کا سوال صرف اردو اخبار ہی میں ممکن ہے اور دوسری زبانوں کے لوگ ایسے غم زدہ سوال سن کر ہنسی سے لوٹ پوٹ اور شرم سے پانی پانی ہو جائیں گے لیکن سید سبطِ حسن کا جواب بھی ہم جیسے جاہل شعر پرستوں کے پیٹوں میں گدگدی کرنے اور ہمارے حوصلوں کو پسینہ پسینہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ کچھ یوں تھا۔ "بھئی اس خلا کو پُر کرنا آسان نہیں۔ مگر ادھر سردار جعفری ہیں اور اُدھر حبیب جالب ہیں (استغفر اللہ) پھر ادھر احمد فراز ہیں (لاحول ولا قوۃ)۔۔۔ اور ہاں اپنے احمد ندیم قاسمی بھی ہیں۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

فی الحال اسے بھول جایئے کہ قاسمی صاحب فیض کی جگہ لے سکتے ہیں کہ نہیں۔ ادب میں ایسے نازیبا سوالات کی کوئی اہمیت نہیں۔ فوج کا جنرل مر جاتا ہے تو دوسرا آجاتا ہے۔ وزیر اعظم کا انتقال ہو جاتا ہے تو دوسرے وزیر اعظم کے ہاتھوں بیعت کر لی جاتی ہے مگر ادب میں ایسا نہیں ہوتا۔ ساری عمر کے اکلِ حلال سے شاعر کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ آخر یہ معتوبِ زمانہ "اکلِ حلال" بلا کیا ہے؟ اور شعر و ادب میں اس کا حوالہ کیوں؟ عرض کرتا ہوں۔ اس کے معانی بہت معمولی ہیں اور ادب میں یوں ہوں گے۔ اپنا لکھنا، اپنا سوچنا، گھڑے گھڑائے استعارے اور تشبیہوں پر قناعت نہ کرنا، چبائے ہوئے نوالوں کو ہضم نہ کرنا، ایک الگ نظام ہاضمہ بنانا، تمام عمر ایک ہی صبح، ایک ہی مقتل، ایک ہی قاتل پر عمر ضائع نہ کرنا اور اگر کسی نے عمر ضائع کردی تو اس کا تتبع نہ کرنا، پرانے لفظوں کو نئے زاویے سے قطع کرنا، علم حاصل کرنے کے لیے چین تک پہنچنے کی تمنا دل میں رکھنا، کم از کم جہالت پر ناز نہ کرنا، اپنی ادبی ترکیبِ نحوی ایجاد کرنا وغیرہ وغیرہ۔"

ساقی کا ہر خط میں اصرار تھا کہ میں ان کی کتابیں پڑھ لوں۔ کم از کم زندہ پانی سچا اور ہدایت نامہ

شاعر تو پڑھ ہی لوں۔ چنانچہ میں نے ان کتابوں کے ساتھ ساقی کی نظم "حاجی بھائی پانی والا اور دوسری نظمیں بھی پڑھیں۔ مجھے "حاجی بھائی پانی والا" قطعی پسند نہیں آئی۔ ساقی نے جو بات اس میں کہنا چاہی تھی اگر آج ساقی اس نظم کو دوبارہ پڑھیں تو بہت بہتر انداز میں بلکہ Sofisticated انداز میں اپنی بات کہہ سکتے ہیں۔ میری رائے میں وہ شاعری فن پارہ ہرگز نہیں ہو سکتی جسے پڑھ کر طبیعت مکدر ہو جائے۔۔۔ ہاں اسی کتاب میں ساقی کی نظم "بندۂ مومن کا ہاتھ" لاجواب نظم ہے۔ پست ذہنیت اور غیر مہذب مرد کی جبلت اور فطری کمینگی کی (سب مردوں کی نہیں) تشریح اس نظم میں جس سلیقے سے ساقی نے کی ہے وہ ساقی کا ہی حصہ ہے۔(یہ نظم آپ آخری صفحے پر پڑھ لیں)

اب ذرا آپ ساقی فاروقی نے شاعر ساقی فاروقی پر جو مضمون لکھا ہے وہ بھی پڑھ لیں تاکہ ساقی کی پیچیدہ اور پہلودار شخصیت کے کچھ اور رُخ بھی آپ کے سامنے آجائیں۔

(اس مضمون کی حیثیت ایک اشاریہ کی سی ہے)

"معزز خواتین و حضرات، میں تنہا ہوں اور تنہائی میں آپ سے مخاطب ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری مجبوری دوہری ہے۔ اظہار بھی اور رسائی بھی۔ یعنی دکھ اٹھانا اور لفظوں کو زنجیر کرنا تو لکھنے والے کا مقدر ہے مگر یہ احساس کہ جس استعارے کو جنم دینے کی کوشش میری شاعری میں ملتی ہے اس سے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی ذہن میں کوئی نہ کوئی ارتعاش پیدا ہوگا۔۔۔ عجب جان آفریں ہے یہ خوش خیالی مجھے خاموش نہیں ہونے دیتی ورنہ یوں ہے کہ لفظوں پر بے اعتباری بڑھتی جاتی ہے۔

میں ایک Committed Individual ہوں اور ہجوم سے میری دلچسپی کا سبب یہ ہے کہ اسے افراد بناتے ہیں۔ دس ہزار مزدوروں کے مشتعل ہجوم کے معنی ہوئے دس ہزار مختلف شخصیتوں کے دس ہزار مختلف ذہنوں کا مجموعی اشتعال، دراصل میں یہ ظلم سہتے ہوئے فرد کا طرفدار ہوں یعنی میں اس کا آدمی ہوں جو دکھ اٹھا رہا ہے۔

اب میں خیال کی اس منزل پر ہوں جہاں دولت یا غربت کے باعث انسانوں (افراد) سے نفرت یا محبت ممکن نہیں۔ ایک جاہل کسان یا ایک فوجی کمانڈر یا ایک گنوار مزدور یا ایک کروڑپتی سیٹھ میرا دوست یا ہم جلیس اس لیے نہیں بن سکتا کہ ہماری ذہنی لہریں جدا جدا ہیں اور ترسیل کا امکان نہیں مگر میں اس معاشرے کے لیے جنگ کرتا رہوں گا جس میں ہم کسی نہ کسی سطح پر کہیں نہ کہیں مل سکیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ ہمیشہ سے جاری ہے مگر تماشائی بن کر بیٹھنا اور تماشے میں شامل نہ ہونا میرے اختیار میں نہیں کہ ذہنی بیداری ایک طرح کا جبر ہے۔

یوں ہے کہ میلانِ طبع بائیں بازو کی طرف ہے مگر اس لیے نہیں کہ Left is Right بلکہ اس لیے کہ اپنے تجربے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے گفتگو عوام سے ہے۔

میں مذہبی آدمی نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ مسلمان اس لیے پیدا ہوا کہ میرے ماں باپ

مسلمان تھے۔ وہ عیسائی یا ہندو یا یہودی ہوتے تو میرا پیدائشی مذہب کچھ اور ہوتا کہ یہ فیصلہ پیدا ہونے والا نہیں پیدا کرنے والے کرتے ہیں اور میں ایسے کسی فیصلے کا پابند نہیں جو میری فلاح و بہبود کے لیے ہی سہی، میری اجازت کے بغیر کیا گیا ہو۔ یہ تو ممکن نہیں کہ نومولود سے اجازت مانگی جائے مگر یہ تو ممکن ہے کہ وہ نومولود جب آپ سوچ بچار کے قابل ہو تو دوسروں کا فیصلہ بدل سکے۔ پھر خدا کا معاملہ تو بہت ذاتی معاملہ ہے۔ یہ ایک فرد اور "نامعلوم" کا رشتہ ہے اور فرد اگر ذہن بھی رکھتا ہو تو اسے اس رشتے کا سراغ خود لگانا چاہیے۔ میرے دل میں مذہبی لوگوں کی قدر و منزلت غیر مذہبی لوگوں کی قدر و منزلت سے کم نہیں مگر میں بد قسمتی یا خوش قسمتی سے خدا کی نعمت سے محروم ہوں۔ اگر میرے ذہن کے کمپیوٹر کی پروگرامنگ میں کوئی تبدیلی ہوئی تو میری آنکھیں بیدار ہوں گی یا میرے دل میں کبھی کوئی ٹک ٹک سنائی دی تو میں اس آواز پر اپنے کان بند نہیں کروں گا۔

جوں جوں میری عمر گزرتی جاتی ہے۔ نباتات اور حیوانات سے میری محبت بڑھتی جاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ کائنات پر ان کا اتنا ہی حق ہے جتنا ہم انسانوں کا بلکہ ہم انسانوں نے اس کائنات کو بدصورت بنانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ ان بیچاروں نے تو خوبصورت ہی خوبصورتی بکھیری ہے۔ گائے، سور، مینڈک، کچھوا، وہیل، شارک، توتا، مینا، ہریل، کبوتر، فاختہ، زیبرا، شیر، ہاتھی، اونٹ، گدھا، گھوڑا، لنگور، آم، جامن، کٹھل، انار، بیلا، جوہی، موتیا، گلاب اور ایسی ہی کروڑوں چیزیں ہماری توجہ چاہتی ہیں کہ یہ عشرت نظارہ ہیں اور جان مناظر ہیں۔ ان سے محبت کرنے کے لیے یہ معنی نہیں کہ انسانوں سے محبت کم ہو جائے گی۔۔۔ میرا تو یہ عالم ہے کہ جیسے جیسے محبت بڑھتی جاتی ہے دل میں کشادگی آتی جاتی ہے۔ محبت کا دائرہ محدود ہو تو دل محدود ہو جاتا ہے۔ میں نے کچھوے کا ایک بچہ پال رکھا ہے۔ جب اس سے گفتگو کرتا ہوں تو اس کی زندہ اور دوررس آنکھوں میں ایک عجب تحریر ابھرتی ہے۔ "یہ کائنات کیا خوبصورت جگہ ہے مگر افسوس کہ یہاں انسان بہت ہیں۔" ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے آپ کو اپنے دوسرے "ہم عصروں" کی نظروں سے بھی دیکھنے کی کوشش کرتے رہا کریں۔ اس میں شاید ہمارا ہی بھلا ہو۔"

MR. SAQI FAROOQI

100 SUNNY GARDEN ROAD

NW4 IRY LONDON U.K

انتخابِ کلام

ساقی فاروقی

بندۂ مومن کا ہاتھ

بندہ مومن کا ہاتھ
وہ، سیناگوگ میں
اپنی یہودی محبوبہ کے ساتھ
توریت ہاتھ میں لیے
ربائی کی مجرب زبان سے
کسی آیت کی تلاوت سن رہا تھا،
خون کے مستقل اصرار
سے تنگ آکر اس نے
اپنی ہمراہی کا
دودھیا پستان دبا دیا۔۔۔،
اس ساحرہ کے ہونٹوں پر
آمین کی آواز
دل دوز کراہ میں بدل گئی
اور بد بخت خدا باز
ایک گنہگار کی مناجات سمجھ کر
ان کی طرف عقیدت سے دیکھنے لگے

1-Syhagogne یہودیوں کی عبادت گاہ۔ 2-Rabbi یہودیوں کا مبلغ یا مولوی

میں لہلہاتی شاخ کو سمجھا تھا زندگی
پتّا گرا تو درسِ فنا دے گیا مجھے

29-1-99

پروفیسر خادم حسین

ریاض سعودی عرب

خادم حسین المتخلص سحر اردو کے وہ شیدائی ہیں جو خاموشی سے اردو زبان وادب کی خدمت گزاری میں مصروف ہیں۔ ان کی پہلی کتاب "پھول اور تارے" جو 1976ء میں رائٹرز گلڈ کا انعام حاصل کرچکی ہے بچوں کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ 1986ء میں شائع ہونے والی کتاب "پیارے رسول" بھی سیرت النبیؐ پر بچوں کے لیے لکھی گئی اور قومی سیرت انعام یافتہ ٹھہری۔ تقدیس ان کی حمد و نعت کا مجموعہ ہے جس نے 1989ء میں صدارتی ایوارڈ حاصل کیا۔ غزلوں کا مجموعہ "تخاطب اور سلام و مناقب کا مجموعہ "تطہیر" 1990ء میں شائع ہوا۔ تنقیدی مضامین کے مجموعے "تحسین وکتب نما" 1997ء میں شائع ہوئے۔ دینی شاعری کا مجموعہ تجلی اور ان کا مرتب کردہ سعودی عرب کے اہلِ قلم کا انتخاب "صحرا میں گلاب" کے نام سے 1998ء میں اشاعت پذیر ہوئے۔

حسین سحر 10 اکتوبر 1942ء کو جلال آباد ضلع فیروز پور بھارت میں پیدا ہوئے اردو، اسلامیات اور پنجابی میں ایم اے کیا۔ پھر بی ایڈ اور ایل ایل بی کی ڈگریاں لیں۔ تیس سال تک ملازمت کرنے کے بعد بطورِ پرنسپل گورنمنٹ ولایت حسین اسلامیہ کالج ملتان سے حال ہی میں

ریٹائرمنٹ لی ہے۔ آج کل ریاض سعودی عرب میں مقیم ہیں۔

شاعری کے علاوہ تنقید ان کے پسندیدہ موضوع ہے۔ بچوں کے ادب سے انھیں خاص دلچسپی ہے۔ "ادب برائے زندگی" کے قائل ہیں۔ پاک و ہند کے معروف جرائد میں ان کا کلام شائع ہوتا ہے۔

حسین سحر اردو کے مستقبل سے قطعی مایوس نہیں۔ شاعری میں غزل اور نظم میں طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن غزل کو اپنے مزاج سے زیادہ قریب پاتے ہیں۔ ان کی غزل ملاحظہ ہو:

کہتا ہے کون انجمن آرائی چاہیے
تنہائی چاہیے مجھے تنہائی چاہیے

دشتِ خلا کی وسعتِ بے پایاں کیا کروں؟
مجھ کو تو اپنی ذات کی پہنائی چاہیے

آنکھوں سے تو دکھائی مجھی دے رہا ہے سب
لیکن مجھے شعور کی بینائی چاہیے

گھر سے نکل کے دیکھ سکوں حسنِ خامشی
اتنا تو ذوقِ بادیہ پیمائی چاہیے

پلکوں پہ کب سے تیر رہا ہے اک اشکِ غم
ایسے گہر کو سیپ کی گہرائی چاہیے

ربِ سخن! حروف کو اظہار کر عطا
گونگے لبوں کو قوتِ گویائی چاہیے

شعر و سخن کی دائمی تاثیر کے لیے
جذبوں کا حسن فکر کی رعنائی چاہیے

اس کے سوا میں کچھ بھی نہیں چاہتا سحر
اُس در پہ اپنی آہ کی شنوائی چاہیے

نثری نظم و غزل کے تجربوں کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ تجربے کی حد تک تو یہ ٹھیک ہے لیکن ان کا کوئی مستقبل نہیں کیونکہ یہ شاعری کی اصل روح سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ کہتے ہیں آج کے دور میں مشاعرے اپنی افادیت کھو بیٹھے ہیں اور وہ ادب کی تخلیق میں معاون نہیں رہے البتہ تخلیقی نشستیں اس سلسلے میں بہتر کردار ادا کر سکتی ہیں۔

ان کی رائے میں الیکٹرونک میڈیا کی وجہ سے کتابوں کے مطالعے اور اشاعت میں واقعی کمی آگئی ہے جبکہ الیکٹرونک میڈیا کے مقابلے میں پرنٹ میڈیا کی زیادہ اہمیت ہے۔ چنانچہ کتابوں اور

جرائد کی بقا کے لیے ہمیں خاص تگ ودو کرنی چاہئے۔ اس سلسلے میں حکومتی اور نجی ادبی اداروں کو مل جل کر کام کرنا چاہئے۔

حسین سحر کہتے ہیں دورِ حاضر میں اردو ادب میں تنقید واقعی برائے نام رہ گئی ہے جبکہ ادب کی ترقی کے لیے تنقید ضروری ہے۔ اس طرف اہلِ فکر و نظر کو سنجیدگی سے توجہ دینی چاہئے۔

موسم بدلتا ہے

ہوا کا سرد جھونکا کہہ رہا ہے، آخرِ شب کے دریچے سے
اٹھو! دیکھو کہ اب موسم نیا پیکر بدلتا ہے، نئی رُت کے تصور میں
رگوں میں برف بن کر منجمد جو تھا، وہ تازہ خوں پگھلتا ہے
اندھیرے چھٹنے والے ہیں، کسی رخشندہ چہرے کی طرح سورج نکلتا ہے
نئی خوشبو بتاتی ہے
کسی کے بازوؤں جیسی لچکتی سبز شاخوں پر، نئی کلیاں ہمکتی ہیں
نئے رنگوں کے استقبال کو، سینے کے اندر دل دھڑکتا ہے
نیا منظر بدلتا ہے، یہ منظر ہے گلابوں کے مہکنے کا
گیا موسم سرابوں کے چمکنے کا
نظارہ ہے یہ خوابوں کے دھڑکنے کا
یہ سارے خواب ہیں دل کی جوانی کے،
جوانی سے معطر زندگانی کے
نظر کو خیرہ کرتی روشنی کے، خوشبوؤں کو دان کرتی زندگی کے
وقت کی آنکھیں جو پتھرائی ہوئی تھیں، انتظارِ موسمِ نو میں
کسی کی سرمئی آنکھوں کی صورت جگمگاتی ہیں
لبوں پر پھول برساتی وہ آنکھیں مسکراتی ہیں
وہ آنکھیں گنگناتی ہیں
بہاروں کا حسین پیغام لے کر آنے والا ہے کوئی
روشن فضاؤں پر کوئی پھر چھانے والا ہے
کہ وقت احساس کے سانچے میں ڈھلتا ہے
نیا موسم بدلتا ہے

PROF. HUSAIN SAHER C/O SHEZAD HUSAIN
P.O.BOX 708 RIYADH, 11421 (K.S.A)

کون سا شخص ہے اخلاق کا پیکر دیکھو
صرف منظر کو نہ دیکھو پسِ منظر دیکھو

پروفیسر فرید سحر اکبر آبادی

پروفیسر فرید قریشی سحر اکبر آبادی

کیلیفورنیا

پروفیسر فرید قریشی سحر اکبر آبادی جب لاس اینجلس آئے تو انہوں نے مجھے فون کیا۔ ”باجی میں نے آپ کا فون نمبر نیر جہاں صاحبہ سے لیا ہے۔“ لیکن پروفیسر صاحب کے کویت سے لاس اینجلس آنے کی خبر کویت کے شاعر محترم اظہر کمال سے پہلے ہی مل چکی تھی۔ میں نے پروفیسر صاحب کو 'سخن ور' کا سوالنامہ بھجوایا تو انہوں نے جو معلومات فراہم کیں ان کے مطابق ۳ جمادی الثانی 1407ھ بمطابق 2 فروری 1987ء کے دن صدرِ پاکستان جناب جنرل ضیاء الحق (مرحوم) نے اپنے مکتوب میں ان کی شاعری کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا کہ :

مکرمی

اسلام علیکم میرے حالیہ دورہ کویت کے دوران اہلِ وطن کے ساتھ چند گھنٹے گزارنے کا موقع ملا۔ اس اجتماع سے میں نے بہت کچھ پایا اور بونس کے طور پر آپ کا شعری مجموعہ ”طلوعِ سحر“ بھی مطالعہ کے لیے نصیب ہوا۔ شکریہ!

میں نے جستہ جستہ آپ کے مجموعہ کلام کو پڑھا ہے اور اُسے دلچسپ پایا ہے۔ آپ کی غزلیں بڑی جاندار ہیں اور تغزل کے اشعار واقعی دل میں اُتر جاتے ہیں لیکن میری یہ

تمنا ہے کہ ہمارے شعراء اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو اسلام اور پاکستان کی خدمت کے لیے بھی بروئے کار لائیں، علامہ اقبال عظیم شاعر تھے لیکن وہ ہمارے لیے عظیم تر یوں ہیں کہ انھوں نے اپنے قلم کو اسلام کے فروغ اور مسلمانان ہند کی بیداری کے لیے استعمال کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو اپنے دین اور اپنے وطن کی خدمت کرنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ خیر اندیش محمد ضیاء الحق

آگے محترم فرید قریشی اپنے بارے میں لکھتے ہیں :

نام پروفیسر فرید قریشی سحر اکبر آبادی ہے۔ پیدائش آگرہ (یوپی) ہندوستان میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم سینٹ جونس ہائی اسکول آگرہ میں حاصل کی۔ پاکستان بننے کے بعد 1948ء میں کراچی آگیا۔ جہاں سے میں نے بی۔اے آنرز اور ایم۔اے (اردو) کراچی یونیورسٹی سے امتیازی پوزیشن میں پاس کیا۔ کراچی میں معروف شاعر نازش حیدری جانشین خیام الہند حیدر دھلوی کا شاگرد ہو گیا۔

میں نے جب آگرہ میں آنکھ کھولی تو اپنے اطراف مجھے ادبی ماحول ملا جس کی وجہ سے اسکول کے زمانے سے شعر کہنے لگا۔ میرے چچا شمس اکبر آبادی، ماموں ضیاء اکبر آبادی، بہنوئی بہار اکبر آبادی اور برادر نسبتی انجم اکبر آبادی آگرہ کے مشہور شاعر تھے وہ علامہ سیماب اکبر آبادی اور صبا اکبر آبادی کے ہم عصر تھے۔ کراچی جامعہ ادبیہ میں دس سال تک نائب پرنسپل رہا اور کراچی میونسپل کارپوریشن میں دس سال بحیثیت اسسٹنٹ کلکٹر کام کیا۔ میں کراچی میں کئی ادبی، سماجی و ثقافتی انجمنوں سے وابستہ رہا۔ 1974ء میں کویت کا رُخ کیا۔ جہاں میں چوبیس سال یعنی 1998ء تک مقیم رہا۔ کویت میں کویت بزم سخن کا صدر کویت بزم ادب کا نائب صدر اور رائٹر گلڈ کا جنرل سکریٹری رہا کویت میں تجارت کرتا تھا جس کی وجہ سے جاپان، کوریہ، تائیوان، ہانگ کانگ، تھائی لینڈ، چین، بنگلہ دیش، انڈیا، افغانستان، ایران، ترکی، مصر، شام، لبنان، عراق، بحرین، دوبئی (امارات)، قطر، سعودی عرب، مسقط، یونان، اٹلی اور اسپین کا تجارتی سفر کیا۔ سیاحت نے میری شاعری کو وسعت بخشی۔ تاجر ہونے کی وجہ سے میں نے ان گنت ادبی محفلوں کا انعقاد کیا کیونکہ ادب سے جنون کی حد تک عشق تھا اس لیے میں نے نادار شاعروں کے دیوان اپنی جیب خاص سے شائع کرائے۔ 112 کویت کے شاعروں کا ایک ایک دیوان اپنے دیوان شام و سحر کے ساتھ شائع کرایا۔ خود تو ادبی سفر کر رہا ہوں دوسروں کو بھی ساتھ لے کر چلتا رہا۔ آگرہ ہندوستان میں جوش اور ساحر کے اعزاز میں تقریب کا اہتمام کیا۔ جوش اور ساحر کا ایک ایک مصرع دے کر غزل کا مقابلہ کرایا۔ جس میں تین سو شاعروں نے حصہ لیا۔ تقریب کا اہتمام آگرہ کے سورن ہال میں کیا گیا۔ آل انڈیا مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ تقریب کی صدارت آگرہ کے سیشن جج۔ ایم۔اے خان نے کی۔ مشاعرہ میں 33 کے قریب شعراء ہند کے کونے کونے سے آئے۔ مقابلہ غزل میں چھ شاعروں کو دو ہزار نقد ڈالر انعام کے طور پر دیے گئے جو مقابلہ میں اول دوئم اور سوئم آئے تھے اس موقع پر گلدستۂ غزل شائع کی گئی۔

ہندوستان اور پاکستان میں طرحی غزلوں پر یہ پہلی کتاب تھی جو ادب کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

میرے چار شعری مجموعے ہیں طلوع سحر، شام و سحر، گلدستۂ غزل اور آبشارِ خیال، جن کی کویت میں تقریبِ رونمائی سفیرِ پاکستان سید مہدی مسعود نے کی اور سفیرِ پاکستان کرامت اللہ غوری اور سفیرِ بنگلہ دیش سید عبداللہ نے کی۔ مجھے ادبی خدمات کے سلسلے میں دس ادبی ایوارڈ مل چکے ہیں۔

شاعری کے علاوہ فنِ موسیقی سے بھی کافی دلچسپی رہی۔ میری شاعری جدید اور قدیم کی روایات کا حسین سنگم ہے۔ پاکستان ہندوستان کویت اور اب امریکہ کے موقر جریدوں اور اخبارات میں میرا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ ادبی کتابوں کا مطالعہ بڑی دلچسپی سے کرتا ہوں اور خصوصاً قدیم و جدید شعراء کا کلام توجہ سے پڑھتا ہوں۔

میری زندگی کا اہم واقعہ کویت میں پاکستان کے صدر محمد ضیاء الحق سے ملاقات ہے۔ اُن کے ساتھ قریب ایک گھنٹہ تک ادب اور شاعری کے موضوع پر دلچسپ گفتگو رہی۔ میں نے اُن کو اپنا پہلا شعری مجموعہ "طلوع سحر" تحفہ کے طور پر پیش کیا۔ صدرِ پاکستان نے اسلام آباد سے ایک خط میرے نام جاری کیا جو سفیرِ پاکستان کویت نے مجھے سفارت خانہ بلا کر دیا۔ 4 اپریل 1998ء کو میری چوتھی کتاب "آبشارِ خیال" کی رونمائی کا دن تھا۔ اس تقریب میں 8 ملکوں کے سفارت کار اور تین سفیر شریک ہوئے۔ سفیرِ پاکستان نے تقریر کرتے ہوئے کہا پروفیسر سحر اکبر آبادی ادب کا وہ درخشندہ ستارہ ہے جو دوسروں کو روشنی دیتا ہے۔ بنگلہ دیش کے سفیر نے کہا۔ پروفیسر فرید ادب کا سفیر ہے۔ نائجیریا کے سفیر نے کہا آج کی محفل اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ پاکستانی نہیں بلکہ عالمی تریب ہے جس میں ہر ملک کے اسکالر موجود ہیں۔ پروفیسر سحر واقعی عالمی شخص ہیں جن کے تعلقات دنیا کے بہت سے ملکوں سے ہیں۔ میں اُن کو اس تقریب کے انعقاد پر مبارکباد دیتا ہوں اس کے بعد انہوں نے طلائی تمغہ ادبی خدمات کے سلسلے میں پیش کیا۔ چین کے کونسلر نے کہا کہ سحر کویت کی ایک مقبول شخصیت ہے۔ اُن کو دس لٹریری ایوارڈ مل چکے ہیں۔ اُن کی ادبی خدمات ہر شخص سراہتا ہے۔ جہاں تک اُن کی شاعری کا تعلق ہے وہ ایک اچھے شاعر ہیں۔ آل پاکستان، آل انڈیا پاک و ہند اور عالمی مشاعروں میں کویت کی جانب سے حصہ لے چکے ہیں۔ یہ دن بھی میری زندگی کا اہم اور یادگاری دن ہے جو مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔

بلاشبہ اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ یہ بات ہمارے مشاہدے میں ہے کہ دن بھر کے ممالک ٹی وی اور ریڈیو پر روزانہ اردو زبان میں خبریں نشر کرتے ہیں اردو زبان فروغ پا رہی ہے اور مقبول ہو رہی ہے۔ دنیا کے کافی ملکوں میں وقتاً فوقتاً مشاعروں کا انعقاد ہوتا رہتا ہے۔ یہ بھی اردو زبان کی ترقی کا ثبوت ہے۔ انگلستان، فرانس، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، جرمنی اور روس و چین میں اردو شاعر غالب اور علامہ اقبال پر متواتر ریسرچ ہو رہی ہے۔ اچھے اردو کے اسکالر ان ملکوں سے پی۔ ایچ۔ ڈی

کر کے آتے ہیں۔ یہ حقیقت اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اردو دوسرے ملکوں میں مقبول ہو رہی ہے اور ترقی کی منازل طے کر رہی ہے۔ ہم اردو کے مستقبل کے لیے کیوں پُر امید نہ رہیں!

شاعری میں غزل اور نظم اپنا اپنا رول ادا کرتی ہیں یہ مقبول بھی ہیں اور اپنا منفرد مقام رکھتی ہیں نثری غزل اور نثری نظم کے جو تجربے ہو رہے ہیں فی الحال مقبول نہیں کیونکہ لوگوں کے ادبی ذہن ابھی ان کو قبول کرنے کو تیار نہیں۔ مقبولیت کے لیے ایک زمانہ لگے گا۔ ہو سکتا ہے کہ عوام کے ذہن جدید غزل کی طرح ان کو قبول کر لیں۔ یہ میرا خیال ہے۔ آج کے دور میں مشاعرے ادب کی تخلیق میں معاون و مددگار ہیں کیونکہ جو لوگ مشاعرہ سن کر جاتے ہیں وہ سینہ بہ سینہ اپنے ساتھ وہ اثر لے جاتے ہیں جو فوری بھی ہے اور دیرپا بھی ہے۔ جبکہ تخلیقی نشستیں ادب کی تخلیق میں کم اثر رکھتی ہیں۔

الیکٹرونک میڈیا کی وجہ سے کتابوں کے مطالعہ اور اشاعت میں بلاشبہ کمی واقع ہوئی ہے۔ میرے خیال میں اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ لوگ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ حصول کو ترجیح دیتے ہیں۔ الیکٹرونک میڈیا یہ سہولت مہیا کرتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کتابوں اور جرائد کی بقا کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ میرے خیال میں دوسرے ملکوں میں نہیں پاکستان کے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو لازمی قرار دی جائے تاکہ اس درسگاہوں سے اردو کے وہ اسکالر پیدا ہوں جو اردو زبان دلچسپی سے پڑھیں۔ فارغ التعلیم ہو کر ہمہ تن صرف اور صرف اردو ادب کے لیے کام کریں تاکہ کتابوں اور جرائد کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے۔

دورِ حاضر میں اردو ادب پر تنقید برائے نام اس لیے ہے کہ انسان کا ذہن فطری طور پر تنقید نہیں بلکہ تعریف پسند کرتا ہے۔ تعریف سن کر خوش ہوتا ہے۔ آپ غور کریں کہ یہ حقیقت بھی ہے وہ اسکالر گنے چنے ہیں جنھوں نے فنِ تنقید کو اپنایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تنقید سے اصلاح ضرور ہوتی ہے مگر بہت تھوڑے ذہن ہیں جو یہ تلخ گھونٹ پینے کو تیار نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ اردو کے فروغ کے لیے ایسے ذہن پیدا کیے جائیں جو ادب کی اشاعت کو اپنائیں اور اُس اشاعت کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائیں تو ادب کی ترقی کافی حد تک ممکن ہے۔

اردو سیمینار اور کانفرنسیں وقتاً فوقتاً ہر ملک میں جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے منعقد کی جائیں۔ وہاں پر اردو ٹی وی ڈرامے اور اردو فلمیں دکھائی جائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ذہن متاثر ہوں اور وہ اردو کی ترقی کے لیے کام کریں۔ اردو کو فروغ دینے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ جن ملکوں میں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے وہاں پر اردو اخبار، رسالے اور میگزین زیادہ سے زیادہ تعداد میں نکالے جائیں۔ زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھیں گے اور اردو زبان کے فروغ کے لیے کام کر سکیں گے۔

PROF. FARID QURESHI
904 SOUTH CATA LINA # 18 CA 90006 U.S.A

انتخابِ کلام

پروفیسر فرید سحر قریشی

کتنے سائے ہیں یہاں دست بہ خنجر دیکھو
میرے پیچھے میرے حالات کا لشکر دیکھو

کون سا شخص ہے اخلاق کا پیکر دیکھو
صرف منظر کو نہ دیکھو پسِ منظر دیکھو

مجھ کو چاہیے سورج کی شعاعوں کا علاج
اپنی زلفوں کو ذرا رُخ سے ہٹا کر دیکھو

دل پہ ہے جسم کی ساری یہ عمارت قائم
ہل نہ جائے کہیں بنیاد کا پتھر دیکھو

ہو اگر ربطِ مسلسل تو اُسے پالو گے
دیکھتے جاؤ اُسے اور برابر دیکھو

ایسا لگتا ہے کہ وہ ملنے کو آئے ہیں سحر
دے رہا ہے کوئی دستک درِ دل پر دیکھو

جس سے ہو جشنِ نیر چراغاں نگر نگر
لوحِ زماں پہ ایسے خیالوں کے نام لکھ

ابوالفیض سحر

دہلی

ابوالفیض سحر کی زندگی جدوجہد سے عبارت ہے۔ ناسازگار حالات میں نہ صرف حوصلہ قائم رکھنا بلکہ اپنی منزلِ مقصود کے حصول کا تیقن بھی ساتھ رکھ کر چلنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ ان کی زندگی کے جو واقعات انہوں نے سنائے ہیں وہی ان کے حوصلے اور مستقل مزاجی کے آئینہ دار ہیں۔ انہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابوالفیض نے زندگی کیسے طے کی اور جو طے کر لیا اپنی لگن سے اسے پا بھی لیا اور یہ کہانی نہیں ایک حقیقت ہے مگر انسانی زندگی کے یہ حقائق کہانیوں سے ہی عبارت ہیں۔ ابوالفیض کی یہ کہانی انہی کی زبانی سنیں تو جہاد کی سنگلاخ زمین پر چلنے میں بھی لطف آنے لگتا ہے۔ آیئے آج ان کی محفل میں ان کی زبانی سنتے ہیں اور ان کے جاری و ساری سفر میں شریک ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

"19 فروری 1937ء کو نارائن پٹھ، ضلع محبوب نگر، آندھرا پردیش (ہندوستان) میں پیدا ہوا۔ جب میں گیارہ سال کا تھا میرے والد محترم جناب شیخ محمد عبداللہ مرحوم (آبائی وطن حیدرآباد) کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ پسماندگان میں میرے علاوہ دو بڑی بہنیں اور والدہ محترمہ تھیں۔ بڑی پریشان حالی اور نہایت نامساعد حالات کی کڑی دھوپ میں دن گزرے لیکن حوصلے ہمیشہ بلند رہے۔

اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم بھی شامل حال رہا۔

ابتدائی تعلیم نارائن پیٹھ ہی میں ہوئی۔ میٹرک ضلع محبوب نگر سے کیا۔ اعلیٰ تعلیم عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں ہوئی۔ علم و ادب کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ اسکول کے اخبار ر میگزین کا ایڈیٹر اور اسکول اور کالجوں میں علمی و ادبی و تہذیبی سرگرمیوں کا انچارج رہا۔ بین الاقلیاتی اردو فیسٹول حیدر آباد کے بانیوں میں تھا۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، خواجہ حمید الدین شاہ، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر رفیعہ سلطانہ، پروفیسر سیدہ جعفر اور پروفیسر مسعود حسین خاں جیسے مقتدر اور نامی گرامی اساتذہ نصیب ہوئے۔ وحید اختر، عالم خوندمیری، افضل محمد، حسن عسکری، خلیل اللہ حسینی، پروفیسر مغنی تبسم جیسے دانشوروں کا ساتھ رہا۔ علاؤالدین حبیب (ملاپ) عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر (سیاست) اور محمود انصاری (منصف) جیسے ممتاز صحافیوں کا تعاون حاصل رہا۔ پروفیسر ہارون خاں شروانی، پروفیسر حبیب الرحمٰن، پروفیسر فضل الرحمٰن اور ڈاکٹر منان اور حسینی شاہد جیسی ہستیوں کی محبت اور شفقت حاصل رہی۔ اردو زبان و ادب کی سچی اور حقیقی خدمت کا جذبہ انہی کی دین ہے۔

کسبِ معاش اور حصولِ تعلیم کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ بامعنی علمی و ادبی سرگرمیوں میں ہمیشہ مصروف رہا۔ طالب علمی کے زمانے ہی میں دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے احیا کے خیال سے انجمن مصنفینِ عثمانیہ قائم کی اور اس کا بانی سکریٹری رہا۔ "فضا" پندرہ روزہ کا ایڈیٹر رہا۔ مجلّہ عثمانیہ جیسے اہم اور تاریخی میگزین کا ایڈیٹر بننے کا شوق تھا مگر اس کے تحریری مقابلے میں صرف یونیورسٹی کے ریگولر طالب علم ہی شریک ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اس مقابلے میں شریک ہونے کا اہل بننے کے لیے سرکاری ملازمت چھوڑ کر ایم۔ اے اردو میں داخلہ لیا۔ جب مقابلہ ہوا تو اوّل آیا اور چیف ایڈیٹر بنا۔ دبستانِ دکن کی تاریخ کو نئے اُجالوں کی روشنی میں مدوّن کرنے کے خیال سے پورے عہد آصفی پر محیط، مجلّہ کا خاص نمبر "حیدر آباد ادب نمبر" شائع کیا جس کو آج بھی ایک دستاویزی حیثیت حاصل ہے۔

ابتدائی ملازمت پرائمری اسکول کے ٹیچر کی حیثیت سے شروع کی اور پھر ہائی اسکول کا ٹیچر ہوا۔ کئی اسکول قائم کیے۔ پرائیوٹ کالج میں لیکچرر رہا۔ اہم سرکاری محکموں کی ملازمت۔ 1929ء میں یونین پبلک سروس کمیشن نئی دہلی سے شروع ہوئی۔ 1973ء میں ترقی اردو بیورو / بورڈ حکومت ہند (نئی دہلی) میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر پھر جائنٹ ڈائریکٹر (ڈپٹی سکریٹری) اور پھر ڈائریکٹر بھی ہوا۔ اسی اثنا میں اہم اور مشہور گجرال کمیٹی (فروغ اردو کمیٹی) کا اسپیشل افسر رہا۔ جناب گیانی ذیل سنگھ (مرحوم) صدر جمہوریہ ہند کے دور صدارت میں اردو امور کا مشیر رہا اور آخر میں 95` 96 میں وزارت داخلہ، حکومتِ ہند میں مشیر رہا۔

اس عرصۂ ملازمت کے دوران دیگر اہم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے ساتھ ساتھ،

سارے ہندوستان میں قومی سطح پر اقلیتوں اور بالخصوص اردو زبان وادب کی ترقی کے لیے ہوش مندی اور دردمندی سے شبانہ روز سخت محنت کی۔ صلے اور ستائش کی تمنا سے بلند ہو کر ٹھوس اور نتیجہ خیز اقدامات کیے۔ اہم منصوبہ سازی کے علاوہ دیگر کاموں میں، ملک کی اہم علمی ادبی وتہذیبی، انجمنوں واداروں کی امداد، عربی فارسی مدارس کی مالی اعانت سارے ملک میں پہلی سائنٹفک انداز میں خوش نویسی کے تربیتی مراکز، اردو شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ کے سنٹرس کا قیام، اردو نیوز ٹیلی پرنٹر سروس کی ابتدا، انگریزی اردو لغت (6 جلدیں)، اردو انسائیکلوپیڈیا (12 جلدیں)، اردو ادب کی تاریخ (4 جلدیں)، اردو لغت اور لگ بھگ ایک ہزار معیاری کتابیں (تراجم وتصانیف بشمول درسی وامدادی کتب) کی اشاعت اور ان کی نکاسی کا انتظام۔ اردو دنیا (ماہنامہ)، اور فکر وتحقیق (سہ ماہی) کا اجرا وغیرہ شامل ہیں۔ آزادی کے بعد پہلی بار حکومت ہند کی جانب سے خیر سگالی کے دورے پر پاکستان کو بھیجے گئے ہندوستانی ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کے وفد میں شریک رہا۔ ملک میں پہلی بار اردو کے ذریعے ناصلاجاتی نظامِ تعلیم کی اساس پر، مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل اوپن یونیورسٹی کے قیام کی تیاری اور اس کی مبسوط رپورٹ۔ خاکہ، بجٹ موضوعات / کورسز اور طریقہ کار وغیرہ کی ترتیب کی ذمہ داری نبھائی۔ اب یہ یونیورسٹی حیدر آباد (آندھرا پردیش) میں قائم ہو چکی ہے۔ مختلف انجمنوں اور اداروں سے وابستہ ہوں، بھارت رتن مولانا ابوالکلام آزاد ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کا بانی صدر ہوں۔ اسی سوسائٹی کے زیر اہتمام دہلی میں ایک کالونی "گلشنِ آزاد" کے نام سے قائم کی ہے جس کا تعمیراتی کام قریب الختم ہے۔ اسی میں ایک اسکول، یک سوپر بازار اور ایک کوآپریٹو بینک کے قیام کا سلسلہ جاری ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے ادبی یونٹ "ادبی ملاقات" کا کنوینر ہوں۔ اسی طرح مولانا آزاد نیشنل فورم فار سیکولر ڈیموکریسی کا بھی محرک اور کنوینر ہوں۔ آج کل ساری دنیا میں اردو زبان و ادب سے متعلق مواد ومعلومات اور رابطہ کے مرکزی ادارے عالمی اردو مرکز (نئی دہلی) کے قیام اور استحکام کے سلسلے میں مصروف ہوں۔

1962ء میں حیدر آباد میں ایک مہذب مذہبی گھرانے میں سراج النسا بیگم سے شادی ہوئی اور دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ 1969ء سے نئی دہلی میں سکونت پذیر ہوں۔

شاعری کے علاوہ تنقید سے بطور خاص وابستگی ہے۔ شاعر ہی کیا میں تو سارے ادب ہی میں گروہ بندی، گروہی وفاداری کا قائل نہیں ہوں ہر مکتبہ فکر کی خوبیوں کو سراہنا درست تصور کرتا ہوں اور خرابیوں سے خود کو اور اپنی تخلیقات کو دور ہی رکھتا ہوں تاکہ اردو زبان وادب کی خدمت کا حقیقی معنی میں حق ادا ہو سکے۔ اب تک شائع شدہ تصانیف تقریباً بارہ ہیں جن میں تحقیقی مقالات، تیلگو ناول کا ترجمہ، تنقیدی مضامین شعری مجموعہ اور ایک سو سے زائد دیباچے اور مقدمے شامل ہیں۔

میں مطالعہ کے حدود متعین کرنے کا قائل نہیں۔ میری رائے میں تنوع اور کثرت مطالعہ

سے ذہنی اُفق روشن ہوتا ہے تناظر اور زاویہ ہائے نگاہ وسیع ہوتے ہیں۔ ویسے میں ذاتی طور پر شاعری، تنقید اور تہذیبی ولسانی موضوعات کا مطالعہ خصوصی توجہ اور دلچسپی سے کرتا ہوں۔

اہم اور دلچسپ واقعات زندگی کا ذکر چلا ہے تو یاد آتا ہے کہ غالباً 56-1955ء کی بات ہے۔ حیدر آباد کی روایات کے مطابق، اردو ہال کی تعمیر کے لیے فنڈ جمع کرنے کے سلسلے میں ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہو رہا تھا۔ جوش صاحب مہمانِ خصوصی تھے میری حیثیت ایسی نہ تھی کہ کوئی دعوت نامہ دے کر مدعو کر سکے۔ میں ٹکٹ خرید بھی نہیں سکتا تھا۔ بے چارگی اور بے مائیگی کے عالم میں، اس بڑے مشاعرے میں جانے، جوش صاحب کو دیکھنے اور ملنے کے اشتیاق میں حفاظت کے والنٹیئرس میں بھرتی ہو کر اپنا مقصد پورا کیا۔ کچھ عرصہ بعد جب اردو ہال کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی اور میں دہلی سے حیدر آباد کسی سرکاری دورے کے سلسلے میں پہنچا تو اسی اردو ہال میں میرا خیر مقدمی جلسہ منعقد ہوا اور جوش صاحب کی نثر پر مقالہ بھی سنایا۔ اس وقت میری حالت عجیب تھی۔

بلاشبہ اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اس کا سہرا اردو والوں کی کدو کاوش سے زیادہ خود اردو زبان کی خلقی خصوصیات اور خوبیوں کے سر جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا کی اچھی سے اچھی زبان محض یوں ہی اپنی لسانی خصوصیات کی وجہ سے ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ مادی طور پر اخلاقی حمایت کے طور پر اور جذباتی اساس پر بھی اس کی ترویج واشاعت کی مناسب کوشش نہ کی جائے۔ دنیا کی تیسری بڑی زبان ہونے کے موقف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سبھی اردو والوں کو چاہئے کہ اجتماعی ڈھنگ سے بھی اردو کی بقا، اس کی ترویج واشاعت، اس کی تعلیم وتربیت نئی نسلوں سے اس کا گہرا تہذیبی وثقافتی رشتہ مقبول اور مستحکم بنانے کے لیے ہر ممکن جتن کریں۔

شاعری میں ویسے تو غزل کی صنف بھی بہتر جامع اور مکمل ہے مقامی سطح سے لے کر عالمی سطح پر بھی اس کو پسند کیا جاتا ہے حتی کہ دیگر زبانوں میں خاص کر بر صغیر ہندوپاک میں غزل ایک مقبول اور پسندیدہ وسیلہ اظہار کے طور پر کامیابی سے رواج پا چکی ہے۔ مگر بڑی اور عظیم شاعری کے لیے نظم کا پیرایہ بھی اپنی جگہ بہت اہم اور ضروری ہے میں ذاتی طور پر ہر اچھے اور ضروری تجربے کا قائل ہوں۔ نثری نظم کے بارے میں برسوں پہلے ہی میں کہہ چکا ہوں اور لکھ چکا ہوں کہ نثری نظم نئی اردو شاعری کا مقدر ہے آج بھی میری یہی رائے ہے۔ نثری غزل کے سلسلے کے مختلف تجربے شروع تو ہوئے سہی لیکن یہ زیادہ صحیح نہیں ہیں۔ ہاں اگر نثری غزل سے مراد ردیف اور قافیے کی پابندی سے گریز کرنا یا ان سے آزادی حاصل کرنا ہے تو یہ بھی ایک ہیئتی تجربہ ہو سکتا ہے۔ جہاں ہم نے ملکی اور غیر ملکی زبانوں سے مختلف ہیئتیں جیسے سانٹ، ہائیکو، فری ورس اور بلینک ورس دوہے، ماہیے وغیرہ مستعار لیے ہیں تو اس طرح کا ایک اور ہیئتی تجربہ کرنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ کہ وہ فن اور فکر کے اظہار وابلاغ کے اچھے معیارات پر پورا اترتا ہو۔

مشاعرے واقعی ایک اچھی بات اور خوش آئند علامت ہیں لیکن انہیں محض کاروباری شکل

دے دینا یا ان کو محض روزگار اور تفریح کا ذریعہ بنا لینا اور پھر خوش الحانی اور ترنم کی وساطت سے ان کا استحصال کرنا کسی بھی طرح بھی درست نہیں۔ تخلیقی نشستیں جن کا مقصد نہ تفریح محض ہوتا ہے اور نہ اکتساب زر، یقیناً ہمیشہ کی طرح آج بھی تخلیق شعر اور شعری جمالیات کے باب میں گراں قدر سوغات پیش کرتی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ الیکٹرونک میڈیا کی وجہ سے ساری دنیا میں ساری ہی زبانوں کی کتابوں کے مطالعے اور اشاعت کم ہو گئی ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ الیکٹرونک میڈیا کے مقابلے میں پرنٹڈ میڈیا کی اہمیت زیادہ ہے مگر ان کی تیکنیکی ترقیات سے روگردانی نہیں کی جا سکتی۔ ہر چند کہ ان نئی ایجادات نے مطالعہ کے مسائل کو الجھا کر رکھ دیا ہے لیکن یہ زندگی اور تہذیب کا مجموعی ارتقائی عمل ہے جو ہر دور میں کسی نہ کسی صورت سے رونما ہوتا رہا ہے۔ نئی نسل کو اس تہذیبی ورثے سے رشتہ استوار رکھنے کے لیے ہمیں طباعت و اشاعت ابلاغ و ترسیل کے جدید سے جدید تر اسالیب، طریقہ کار اور ذرائع سے استفادہ کرنا ہوگا۔ ان مسائل پر حسبِ ضرورت تبادلۂ خیال کے لیے ورکشاپ، سیمینار و مذاکرے وغیرہ منعقد کیے جا سکتے ہیں تاکہ مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے حل تلاش کیے جا سکیں۔ ساتھ ہی نئی وسعتوں اور نئے امکانات پر بھی نظر ڈالی جا سکے۔

اس بات سے میں پوری طرح متفق نہیں ہوں کہ دورِ حاضر میں اردو ادب میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے۔ ہاں مگر اس خیال سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں کہ ادب کی ترقی کے لیے تنقید ضروری ہے۔ میں نے ان موضوعات پر بارہا لکھا ہے۔ میری کتابوں میں ایسے مضامین و مقالات موجود ہیں۔ دورِ حاضر میں تنقیدیں تو بہت لکھی جا رہی ہیں لیکن ان کا معیار اور مزاج پوری طرح سے وہ نہیں ہے جو ایک صحت مند، معیاری اور بے لاگ و بصیرت افروز تنقید کا ہونا چاہئے اس کی کئی وجوہ ہیں۔ گروہ بندیاں گروہی وفاداریاں، ذاتی و نظریاتی اختلافات کی بے جا کشاکش اور مصلحت اندیشی و مفاد پرستی بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ اگر ہم ان تمام خرابیوں پر قابو پالیں تو بلاشبہ فکری و فنی تابشوں سے مرصع اچھے سے اچھا ادب تخلیق ہوتا رہے گا۔"

ABDUL FAIZ SAHER
67-G, POCKET 4,
PHASE 1, MAYUR VIHAR
DELHI- 110092 INDIA

انتخابِ کلام

عبدالفیض سحر

غزل

شیریں سخن کی نکہت، لہجہ گلاب کا سا
تپتے سے دشت و بن میں، جھونکا گلاب کا سا

شب چاندنی میں اکثر، تیرا خیال ہمدم
شبنم کی نہرجاں میں، بہتا گلاب کا سا

تہذیبِ جاں نوازی، مہکی فضا کا ہالہ
تیری رفاقتوں کا، رشتہ گلاب کا سا

حسنِ خلوصِ دل سے ملنے کا ایک لمحہ
بادِ صبا کے آنگن، کھلتا گلاب کا سا

تیری عنایتیں یہ، تیرا کرم بھی جاناں
آتش بھری زمیں پہ، رستہ گلاب کا سا

یہ دور ناسپاسی، اس میں سلوکِ احسن
اک پھول جنگلوں میں، مہکا گلاب کا سا

حرفِ دعا تو یار و رحمت کا اک شجر ہے
بہتی ہوئی تپش میں، خیمہ گلاب کا سا

شاعر کی یہ ارم تو، فکرو خیال کی ہے
ہر لفظ آبِ روشن، شیشہ گلاب کا سا

شعروں کو تیرے پھر سے کیا نام دیں سحؔر ہم
غزلیں تو شاخِ گل سی، نغمہ گلاب کا سا

سعید شر عبی

دوحہ قطر

دوحہ قطر کے بزرگ شاعر سعید شر عبی (ش۔ ر۔ ع۔ ب۔ ی) سے آپ واقف نہ ہوں، میں واقف نہ ہوں اور انہیں "غیر معروف" قرار دے دیں تو یہ ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ کیونکہ وہ مشرقِ وسطی کی بہر حال جانی پہچانی شخصیت ہیں۔

محترم حسن چشتی صاحب کی دی ہوئی خبر روزنامہ سیاست، مصنف حیدر آباد یا شمع دہلی میں پڑھ کر انہوں نے مجھے خط لکھا۔ مجھ سے بے حد شفقت کا اظہار کیا، دعائیں دیں اور لکھا کہ میں "کینیا" میں رہ کر اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہی ہوں (شر عبی صاحب میں کینیا میں نہیں کیلیفورنیا امریکا میں ہوں) انہوں نے یہ بھی لکھا کہ ان کا تعارف شائع فرما کر ان کی حوصلہ افزائی کروں وہ میرے احسان مند رہیں گے۔

شر عبی صاحب! آپ بزرگ شاعر ہیں۔ یہ آپ کا مجھ پر اور اردو زبان پر احسان ہے کہ آپ اس بزرگی میں بھی ہمت اور توانائی سے کام لے کر اردو میں شعر کہہ رہے ہیں۔ میں آپ کی ان خدمات کو سلام کرتی ہوں اور آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے توجہ فرمائی۔ آپ کی موجودگی سے تو اردو زبان کی محفلوں کی رونقیں بڑھتی ہیں۔

جناب سعید شر عبی کا تعارف بزمِ اردو قطر کے سیکرٹری جنرل محترم شمیم جے پوری نے لکھا ہے جو خود بھی ایک معروف افسانہ نگار ہیں انہوں نے بتایا سعید شربی کا تعلق حیدر آباد دکن سے ہے۔ حیدر آباد دکن وہ مرکزِ علم و ادب ہے جہاں بے شمار ادیب و شاعر پیدا ہوئے اور دکن ہی وہ سرزمین ہے جہاں اردو زبان نے پلکیں جھپکائیں اور انگڑائی لی۔ اب یہ اور بات ہے کہ خدوخال کہیں اور واضح ہوئے اور دوشیزگی کہیں اور عطا ہوئی۔ لیکن دکن کو اردو زبان کا گہوارہ ہونے کا شرف تو حاصل ہے۔ اسی سرزمین کے ایک شاعر سعید شر عبی اپنی تمام بزرگانہ پر خلوص اور مدبرانہ کیفیات کے ساتھ ادب نواز دلوں کی دھڑکن ہیں۔ محترم سعید شربی کے اجداد تو یمن کے قریب شرعب سے ہجرت کر کے نظام حیدر آباد کے دورِ حکومت میں آئے اور یہاں کی فضا، یہاں کا موسم یہاں کا ادبی ماحول اس قدر بھایا کہ یہیں کے ہو رہے۔ سعید شر عبی اسی خاندان کی نمائندہ شخصیت کا نام ہے شاعر ہیں محبت بانٹتے ہیں، پیار خریدتے نہیں منکسر المزاج رفیق القلب اور مخیّر ہیں۔ تکبر غرور، منافقت جیسے الفاظ ان کی لغت میں نہیں پائے جاتے اور جو کچھ ان کے مزاج میں شامل ہے وہی جذبات ان کے شعروں میں بادِ نسیم کی بزم روی کی طرح۔ پھولوں کی پنکھڑی کی نزاکت کی طرح۔ خوشبوؤں کے چھڑکاؤ کی طرح الفاظ بن کر زندگی پاتے ہیں۔ بزم اردو قطر میں محترم ہیں ابھی کچھ دنوں قبل قطر ریڈیو سے آپ کا تعارف آپ کی غزلیں نشر ہو کر اردو کے پرستاروں کو محظوظ کر چکی ہیں۔ بزم اور قطر نے آپ کے ساتھ ایک شام کا بھی اہتمام کیا۔ حامان خاور کے اس شعر کے ساتھ دست بہ دعا ہیں

ہر نئی داستان میں رہنا
لفظ ہے تو اذان میں رہنا

سعید شر عبی کے طالب علمی کے زمانے میں ایک مشاعرہ ہوا تھا۔ مصرعہ طرح تھا
زندگی اس کی برائے نام ہے

بس اسی زمانے سے شاعری کا شوق شروع ہوا۔ احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، قرۃالعین حیدر، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، امجد اسلام امجد، رام لال، اشفاق حیدر، منیر نیازی، اعجاز رحمانی وغیرہ ان کے پسندیدہ شاعر و افسانہ نگار ہیں۔

انہوں نے ' مانا ول نگاری میں کمی کی وجہ وقت کی کمی ہے۔ ناول نگاروں کے پاس اتنا وقت ہے اور نہ قاری کے پاس اتنا وقت کہ ناول پڑھنے میں اپنا وقت صرف کرے یہ دور افسانہ اور افسانچہ کا ہے۔

انہوں نے بتایا ادیب کا سب سے بڑا مسئلہ معاشی بحران ہے ہر ملک میں ادیبوں کے لیے انہیں کچھ نہ کچھ سہولتیں مہیا کی جائیں، غیر ممالک و مصروف جگہوں کی سیر و تفریح کرائی جائے تاکہ ذہن فروعی مسائل سے آزاد ہو سکے اور ادیب آزاد ذہن و تازہ دم ہو کر کچھ تخلیق کر سکے۔

کہتے ہیں معیاری شاعری یا معیاری نثر وہ ہے جس کی خیال میں ندرت اظہار میں صفائی جملوں

میں شگفتگی فکر میں پختگی اور تخلیق تعمیری ہو۔ بیرونی ممالک میں شاعری کا ماحول وافر ہے بہ نسبت نثر کے شاعری میں اصلاح سخن مشاعرے تنقیدی نشست شعری محافل کا اہتمام ہوتا رہتا ہے جبکہ نثری نشستیں نہیں کے برابر ہوتی ہیں۔ شرعبی صاحب، اردو کے مستقبل سے بہت پرامید ہیں۔ ان کا کہنا ہے اردو وہ سیلِ رواں ہے جو اپنا راستہ خود نکالتی آگے بڑھ رہی ہے اس کے سامنے نہ صرف انگریزی زبان بلکہ دنیا کی ہر بڑی چھوٹی زبان کے خوبصورت جملے اور الفاظ دست بستہ ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ سعید صاحب نے عرب امارات کی ایک محبوب شخصیت سلیم جعفری (مرحوم) کے لیے دو قطعات لکھے ہیں ملاحظہ ہوں:

اردو ادب کی دنیا میں تھا معتبر سلیم
شعرا و شاعرات میں سبھی کا خیال ہے
ہر شخص فرطِ غم میں ہے اب مبتلا سعید
بے وقت اس کی موت کا سب کو ملال ہے

اس کی صلاحیت کا نہیں کس کو اعتراف
وہ آدمی ذہین تھا حاضر دماغ تھا
شاعر ادیب کچھ بھی نہیں تھا مگر سعید
دنیائے اہلِ فن میں روشن چراغ تھا

ایک شعر ان کا مجھے بہت پسند آیا۔ پیش خدمت ہے
اسے بھی وقت کے ہاتھوں نے کر دیا میلا
جو شخص سب کی نظر میں گلاب جیسا تھا

SYEED SHARABI
P.O.BOX 3387
DOHA QATTAR-(AG)

ڈاکٹر شاہد الوری

کراچی

غالبؔ کے مصرعوں پر سخن طرازی کوئی آسان کام نہ تھا اور شاہد الوری چونکہ ہمیشہ مشکل کاموں میں ہاتھ ڈالتے ہیں لہٰذا انہوں نے اسد اللہ خاں غالب کے کسی ایک مصرعے کو بنیاد بنا کر متنوع موضوعات پر قطعات لکھے اور اس مجموعے کو "سخن در سخن" کے نام سے کتابی صورت عطا کی۔ اس پر محترم راغب مراد آبادی نے قطعہ تاریخ کہا۔

سخن در سخن مطلع آب رُو 1982ء
سخن در سخن لالۂ کوہ سار 1982ء
ہے شاہد کے حق میں مقرر شدہ 1403ھ
سخن در سخن کوکبِ سازگار 1982ء

اس وقت کراچی کا کون سا ایسا ادیب تھا جس نے انہیں خراجِ تحسین و محبت پیش نہ کیا ہو۔ یہ ساری تحریریں ان کے "مجلّۂ رُونمائی" میں محفوظ ہیں۔

پروفیسر مجتبیٰ حسین مرحوم نے کہا "شاہد الوری نے ایک خاص التزام کے ساتھ غالب کے مصرعوں پر اشعار کی منزلیں تعمیر کی ہیں۔" غلام عباس مرحوم لکھتے ہیں "شاہد الوری کے ان

قطعات میں طرح طرح کی جدتوں کے ساتھ شاعرانہ لطافتیں بھی موجود ہیں۔"

جناب سعید رضا سعید مرحوم کا تبصرہ تھا۔ "سنجیدہ نگاری کے لیے غالب کی زمینوں کا انتخاب بڑے حوصلے کی بات ہے۔ بہت سے لوگ پہلے بھی اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ چکے ہیں مگر الور کے میواتی نے صاحبانِ ذوق کے لیے فواکہات کے ڈھیر لگا دیے۔ ان کا یہ رنگ میرے لیے نیا سہی لیکن جو پختگی وہ اس میں حاصل کر چکے ہیں وہ قابلِ رشک ہے اور اگلی منزلوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ میر انیس اپنی زمینیں آسمان سے لائے تھے۔ غالب نے انہیں عرش سے اتارا شاہد الوری نے انہیں دوبارہ عرش پر پہنچا دیا۔"

شاہد بھائی نے شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ایک زمانے میں کراچی سے لے کر ڈھاکہ اور پھر لاہور سے اگلی سرحد ہندوستان کے کئی شہروں کے مشاعروں میں شاہد الوری کے کلام کے دیئے روشن ہوتے تھے اور قہقہوں کی پھلجڑیاں بھی چھٹتی تھیں۔ شاہد بھائی مزاح نگاری میں بھی کمال رکھتے ہیں اور سنجیدہ غزلیں بھی کہتے ہیں۔ ہندوستان کی کئی ادبی تنظیموں کے لیے اب بھی کافی کام کر رہے ہیں۔

"اردو شاعری میں اگر کوئی روایت پائیدار رہی ہے تو وہ غزل کی ہے۔ غزل ہماری شاعری کی سب سے مہتم بالشان روایت ہے اور غزل نے ابھی تک یہ تاثر نہیں دیا ہے کہ وہ نئی شعری اصناف کی وجہ سے پستہ ہو رہی ہے بلکہ غزل اتنی سخت جان صنف واقع ہوئی ہے کہ نئی اصناف کی آمد سے اس کی اہمیت اور ضرورت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔"

یہ افکار ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے ہیں جن سے شاہد الوری سو فیصد متفق ہیں۔ وہ نظم سے اختلاف نہیں کرتے مگر نثری نظم پر وقت ضائع کرنے کے قطعی حق میں نہیں۔

آیئے ہم جناب شاہد الوری سے گفتگو کریں۔ اپنے بارے میں انہوں نے بتایا کہ میرا نام نذیر محمد انصاری ہے مگر تخلص شاہد الوری ہے۔ راجستھان کی ایک ریاست الور میں 26 دسمبر 1923ء کو پیدا ہوا۔ 1939ء میں راجپوتانہ بورڈ اجمیر سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 1956ء میں امریکن میڈیکل کالج شکاگو سے ہومیوپیتھ ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کی۔ بعد ازاں حکومت پاکستان نے رجسٹرڈ ڈاکٹر تسلیم کر کے RMP 25840 نمبر عنایت کیا۔"

شاہد الوری صاحب نے زندگی میں کڑی مشقت کی ہے۔ اور یہ سب ریکارڈ پر لانے میں قطعی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ وہ کہہ رہے تھے "میں نے 1942ء سے 1945ء تک لال قلعہ دہلی میں امریکی ملٹری کیمپ میں کام کیا۔ 1945ء کے آخر میں الور میں اپنا ذاتی موٹر ورکشاپ قائم کیا جو 1947ء میں تباہ کر دیا گیا۔ 1947ء میں پاکستان پہنچا۔ کسی قسم کی بھی ملازمت نہ ملنے کے باعث بندرگاہ پر بحیثیت قلی کام کرتا رہا لیکن ایک روپیہ دو آنے روز میں گزارہ مشکل ہونے کے باعث سائیکل رکشہ چلانا شروع کر دیا جو عرصہ گیارہ ماہ پر محیط رہا۔ "1949ء میں امریکی سفارتخانہ واقع

کراچی میں بحیثیت موٹر ڈرائیور کام شروع کیا جو 1956ء تک جاری رہا پھر میری ترقی ہوئی اور مجھے ٹرانسپورٹ کنٹرولر بنادیا گیا یہ ملازمت 1961ء تک جاری رہی۔ 30 اکتوبر 1961ء میں کو پی آئی میں ملازمت اختیار کی اور 1976ء میں ریٹائر ہو گیا۔ یکم جولائی 1977ء سے 31 جولائی 1982 تک مہران پائپ انڈسٹریز لمیٹڈ میں جنرل منیجر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ 1982ء سے تادمِ تحریر بحیثیت صحافی کے کام کر رہا ہوں۔ میں نے شاعری کے علاوہ ترجمہ نگاری بھی کی ہے اور صحافت بھی۔ میری ننھیال دہلی ہے۔ اردو میں تھوڑی بہت جو ہے وہ استعداد نانی، والدہ اور بیوی کی بدولت حاصل ہوئی۔ دہلی اسکول سے تعلق ہے۔ غالب سے بے پناہ متاثر ہوں تقریباً تمام ہی بڑے ادبی پرچوں میں چھپتا رہا ہوں۔

1982ء میں پہلا مجموعہ "سخن در سخن" شائع ہوا۔ جس کا دوسرا ایڈیشن اسی سال چار ماہ بعد شائع کیا۔ اب تک پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ 1984ء میں دوسرا مجموعہ "حمد وثناء" شائع ہوا جس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ 1986ء میں تیسرا مجموعہ "چراغ سے چراغ" شائع ہوا جس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ 1988ء میں چوتھا مجموعہ ففٹی ففٹی شائع ہوا جو طنزیہ مزاحیہ قطعات پر مشتمل تھا۔ اس کے چھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ 1989ء میں اپنا ماہنامہ "شعلے" جاری کیا پھر 1993 میں ہفت روزہ "پرائم اسپورٹس" جاری کیا۔ 1998ء میں ہفت روزہ "فلمی دنیا" کا اجراء کیا۔ 1999ء میں خواتین کا پرچہ ماہنامہ "باجی" جاری کیا۔ 2000ء کے اوائل میں ماہنامہ "کاروبار" اور ماہنامہ "زراعت" جاری کیے اللہ کے فضل و کرم سے تمام پرچے تاحال باقاعدگی سے شائع ہو رہے ہیں۔

غالب سے متعلق ہر قسم کی کتب میرے زیرِ مطالعہ رہتی ہیں۔

اہم واقعات میں ایک تو 1989ء میں میرے بڑے بیٹے کے انتقال کا حادثہ ہے۔ وہ عارضہ قلب میں مبتلا تھا۔ اس کے انتقال نے مجھے تقریباً تین ماہ تک ہوش و حواس سے بیگانہ رکھا۔ دوسرا 1962ء میں ڈھاکہ کے ایک مشاعرے میں پہلی بار شرکت کی تو دیواروں پر چسپاں پوسٹر پر نظر پڑی تو اس میں اپنا نام "محترمہ شاہدا لوری" چھپا ہوا دیکھ کر کافی محظوظ ہوا۔

اردو زبان کا مستقبل نہایت تابناک ہے۔ صنفِ سخن میں تضمین نگاری اور قطعات اہمیت کے حامل ہیں۔ غزل گوئی کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ نثری نظم یادہ گوئی کے علاوہ کچھ نہیں۔ مشاعرے ادب کی ترویج واشاعت کی اہم سبب ہیں۔ تخلیقی نشستیں بھی بڑا کام کر رہی ہیں۔

میری رائے میں کتابوں کی اشاعت پر بڑا خرچ آتا ہے۔ ٹی وی اور ریڈیو جیسے ذرائع ابلاغ نے بھی کتب بینی کے رجحان کو کافی کم کر دیا ہے۔ کتابوں کی قیمتیں بھی آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ اسی طرح ادبی رسائل بھی مہنگے ترین ہو رہے ہیں۔ صرف شوبز کے رسائل نے مارکیٹ پکڑی ہوئی ہیں یا پھر موضوعاتی رسائل بھی کچھ کامیاب ہیں کتابوں کی قیمتیں کم ہو جائیں تو شاید ایک بار پھر

مطالعے کا شوق پروان چڑھے۔

آج کل تنقید کا کام (معدودے چند نقاد حضرات کو چھوڑ کر) وہ لوگ سرانجام دے رہے ہیں جن کے پاس تعلیمی ڈگریاں تو ہیں مگر وہ تنقید کے فن سے ناواقف ہیں۔ تنقید برائے تنقید کرتے نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات تو تنقید کرتے ہوئے وہ بات بھی کہہ جاتے ہیں جن کا سارے فسانے میں کہیں ذکر تک نہیں ہوتا۔

NASIR MANZIL, F/669, KORANGI TOWN
KARACHI-74900(PAKISTAN)
PH:5058804, FAX:92-21-2628201

انتخابِ کلام

مال یاد آیا نہ زر یاد آیا
اک حسینہ کا ہی گھر یاد آیا

دے گئے چوٹ رقیبانِ کرام
آج اُن کو یہ ڈفر یاد آیا

اُس کے بھائی سے بڑھائی رہ و رسم
عیب کرنا تھا ہنر یاد آیا

قرض لینے کا ارادہ تو نہیں؟
کہئے کیسے مرا گھر یاد آیا؟

نئی شادی کا ہوا شوق مجھے
جب بھی شادی کا ایئر (Year) یاد آیا

عرضِ مطلب کا نتیجہ یہ رہا
اُن کو جوتا مجھے سر یاد آیا

"ب" بشر میں کہیں زائد تو نہیں
کیوں بشر پڑھتے ہی "شر" یاد آیا

روزہ جب ہم نے رکھا اے شاہدؔ
لنچ یاد آیا ڈنر یاد آیا

زباں خنجر کی کچھ کہتی تھی لیکن
وہ دھبے آستیں کے دھو چکے تھے

شاہد ماہلی
21/9/99

شاہد ماہلی

دہلی

ایک محفل میں اردو شاعری کی اصناف اور اس میں نئے تجربات پر گفتگو ہو رہی تھی۔ کراچی کے معروف شاعر محترم شبنم رومانی اس موقعے پر ہونے والی گفتگو سے بہت برہم تھے۔ دیگر شرکائے محفل نے کیا کہا اس سے قطع نظر ہم شبنم رومانی کے خیالات سے چند باتیں یہاں قلم بند کرنا ضرور چاہیں گے۔ انھوں نے کہا تھا۔

"غزل میں ہیئت کے تجربوں کا تصور ہی مضحکہ خیز ہے۔ ڈیڑھ پونے دو مصرعوں کا شعر غزل کا شعر بن ہی نہیں سکتا۔ غضب خدا کا، سوا مصرعے کا یا ڈیڑھ مصرعے والی غزل کی مثال "امیچور بے بی" کی سی ہے یا پھر اس کی صورت ایسی ہے جیسے جرائم پیشہ لوگ چھوٹے بچوں کو اغوا کر کے اور ان کے ہاتھ پیر توڑ کر سڑک کے کنارے بھیک مانگنے کے لیے بٹھا دیتے ہیں۔ بعض لوگوں نے غزل کو پھکڑپن کے حوالے کرنے کی کوشش بھی کی ہے اور بعض نے نثری غزل اور تجریدی غزل کا کھیل بھی کھیلا۔ حقیقت یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے لاوارث سمجھ کر غزل کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ ان لوگوں پر عدالت میں مقدمہ چلنا چاہئے۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو غزل نے گزشتہ نصف صدی میں تمام "موانع" کے باوجود ایسی توانائی اور کشادگی حاصل کی ہے اور اب بھی خیال کی وسعت، اسلوب کی

ندرت اور موضوعات کے تنوع کی اس میں بڑی گنجائش ہے۔"

شاہد ماہلی کا کلام پڑھیے تو بلا شبہ اس میں غزل کی توانائی اور کشادگی کے ساتھ ساتھ خیال کی وسعت اور اسلوب کی ندرت بھی ملے گی۔ ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

باغِ امکاں میں رُکے جاتے ہیں خوشبو کے قدم
برگِ انکار نیا دشتِ وفا چاہتا ہے

تری آنکھوں میں امیدوں کی شمعیں اب بھی روشن ہیں
فسردہ آندھیوں نے یوں تو ہر لمحہ بجھایا ہے

عجب صدا تھی کہ دیکھی گئی نگاہوں سے
عجیب برق تھی کانوں سے آ کے ٹکرائی

محترم شاہد ماہلی سے میری ملاقات دہلی میں "ایوانِ غالب" میں ہوئی۔ ان کے دو شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں مگر وہ نثر نگار بھی ہیں چنانچہ ان سے "گفتنی" کے سوالنامے پر گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو سے قبل ان کی شاعری سے متعلق محترم ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کیا کہتے ہیں اس پر ضرور ایک نظر ڈالی جائے:

"میرے ذہن میں جب بھی شاہد ماہلی کا تصور آتا ہے، معیار کی ان خاص اشاعتوں کے ساتھ آتا ہے جنھوں نے نئے رجحانات کی نئی بحثوں کو قائم کرنے میں مدد دی اور ان خاص کتابوں کے ساتھ جو تازگی کی لہر کے ساتھ آتی تھیں۔ شاہد ماہلی کی شاعری کی عمر بہت سے معاصرین سے شاید زیادہ ہی ہوگی، اُن کا پہلا مجموعہ "منظر پس منظر" تقریباً اٹھارہ برس پہلے منظرِ عام پر آیا تھا لیکن ان کے یہاں اس بادہ پارینہ کی کیفیت ہے جو جتنی پختہ ہوتی ہے اتنی ہی لطیف ہو جاتی ہے۔ ان کے یہاں چکی کی مشقت کے ساتھ مشقِ سخن برابر جاری رہی اگرچہ بظاہر وہ منصبی کاموں پر بھی خونِ جگر کھپاتے رہے۔ اس زمانے میں بھی انہوں نے رومانیت کا سودا نہیں کیا جب بالعموم لوگ تتلیوں کے پر پکڑتے ہیں۔ شاید وہ نوعمری سے سیدھا پختگی اور دردمندی کی طرف بڑھے اور بڑے اطمینان سے اس فضا میں براجمان ہو گئے، ایک ٹھنڈی چنگاری، دبی دبی سی راکھ، ایک خاص طرح کی پُر سوز حسیّت جو سرد و گرم زمانہ چکھنے کے بعد پیدا ہوتی ہے، کچھ ماہل کی مٹی کا اثر، کچھ اہلِ سخن کی صحبتوں کا فیض، کچھ طبیعت کا تجسّس، کچھ سعی و جستجو کی خلش اور کچھ کاوشِ انسانی کی بے اثری، یہ باتیں اکثر ان کے اشعار سے جھانکتی ہیں۔ کلاسیکیت اور جدیدیت کا امتزاج ایک عامیانہ سی بات ہو گئی ہے۔ اصل چیز شعری حسیّت اور اندر کی جدّت ہے، اگر وہ اپنا حق منوا سکتی ہے تو اور کیا چاہیے جو شخص ایسے شعر کہہ سکتا ہو، اس کے دل میں کچھ تو کام رفو کا ہوگا۔

جنسِ گراں تھی، خوبیِ قسمت، نہیں ملی
بکنے کو ہم بھی آئے تھے، قیمت نہیں ملی

حاشیے پر کچھ حقیقت، کچھ فسانہ خواب کا
اِک اُدھورا سا ہے خاکہ زندگی کے باب کا

شہرِ کوتاہ میں سب پست نشیں پست نشاں
کس کو ہمراز کریں کس کا قرینہ سیکھیں

شاہد ماہلی کا پورا نام شاہد حسین ہے۔ یکم مارچ 1943ء کو ضلع اعظم گڑھ کے قصبہ ماہل میں پیدا ہوئے۔ اس لیے اپنا نام و تخلص شاہد ماہلی اپنایا۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ گورکھپور یونیورسٹی سے بی۔ اے کرنے کے بعد آگرہ یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کیا۔ پھر بی۔ ایل جے کالج مرزاپور میں اردو کے لکچرر ہو گئے۔ 1970ء میں دہلی آئے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نئی دہلی کے مرکزی دفتر میں شعبہ اردو سے منسلک ہو گئے جہاں سے آپ کی نگرانی میں ایک سو سے زائد پمفلٹ کتابچے اور کتابیں شائع ہوئیں۔ کانگریس کے پہلے اردو ترجمان "سب ساتھ" کی ادارت سے بھی وابستہ رہے۔ 1978ء سے غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی سے وابستہ ہیں جہاں اشاعتی، تنظیمی اور دیگر ذمے داریوں کے علاوہ ایک ادبی تحقیقی مجلّہ "غالب نامہ" کی مجلسِ ادارت میں بھی شامل ہیں۔ آج کل آپ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ہیں۔ 1976ء سے اردو کا ایک اہم مجلّہ "معیار" شائع کرتے ہیں جس نے ہندوپاک کے علاوہ دیگر ممالک کے ادبی حلقوں میں بھی ایک اہم مقام بنا لیا ہے۔ 1977ء میں آپ کا پہلا شعری مجموعہ "منظر پس منظر" شائع ہوا جس نے ادبی حلقوں میں داد و تحسین حاصل کی۔ آپ کی دیگر تالیفات میں "نئی نظم نئے دستخط" پاکستانی ادب اور کلچر کا مسئلہ، فیض احمد فیض۔ عکس اور جہتیں، اور کیفی اعظمی، عکس اور جہتیں، شامل ہیں۔ ابھی حال ہی میں اُن کا دوسرا شعری مجموعہ 'سنہری اداسیاں' شائع ہوا ہے۔ اُن کی ایک اہم تصنیف "انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ" ہے۔ اردو میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ ان کے علاوہ انگریزی اور ہندی زبانوں سے بہت سے تراجم بھی کیے ہیں۔ آپ کو دہلی اردو اکادمی اور اتر پردیش اردو اکادمی کے متعدد انعامات سے بھی نوازا گیا ہے۔ آپ نیشنل امیر خسرو سوسائٹی اور انجمن ترقی اردو دہلی کے سکریٹری بھی ہیں۔

ہمارے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔ "اقبال، پریم چند، حسرت موہانی، فانی، مولوی عبدالحق، جوش، فیض، فراق، اختر الایمان، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، کرشن چند، بیدی، منٹو، سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، عبداللہ حسین، احتشام حسین، آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری، نیاز فتح پوری، شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ کے نام بیسویں صدی کے اردو

ادب میں بلاشبہ محفوظ رہیں گے انہوں نے کہا جدیدیت نے فکشن کو مجروح کیا ہے۔

سوال نمبر 4 کے جواب میں کہتے ہیں "ناول کی طوالت موجودہ دور کے مصنف اور قاری دونوں کو گراں گزرتی ہے۔"

سوال نمبر 5 کے جواب میں عرض ہے کہ ادیب کا کام بہتر زندگی بسر کرنے کے لیے کسی نظامِ فکر کی تلاش نہیں ہے بلکہ تجزیہ کرنا ہے۔"

سوال نمبر 6 کا جواب ہے "جو قدم قدم پر سوالیہ نشانات کھڑے کریں۔"

سوال نمبر 7 کا مختصر جواب دوں گا اور وہ یہ کہ سطحی شاعری کرنا آسان ہے۔ سطحی نثر میں بھی محنت کی ضرورت پڑتی ہے۔ گہرا مطالعہ اور تجزیے کی کمی ہے۔

سوال نمبر 8 کے سلسلے میں اتنا کافی ہے کہ اردو کا دامن تمام زبانوں کے خوب صورت الفاظ کے لیے ہمیشہ کھلا رہا ہے۔ زبان وہی اچھی ہے جو سلیس اور دلکش ہو۔

9

کس قدر بے کیف تھی بے رس تھی اپنی داستاں
سب حقیقت ہی حقیقت تھی فسانہ کچھ نہ تھا

آخری سوال کے جواب میں فرمایا۔ "اردو ادب کو تنقید کی نہیں تخلیق کی ضرورت ہے۔ تنقید کی بالادستی نے تخلیق کو نقصان پہنچایا ہے۔ اچھی تخلیق ہی اچھی تنقید پیدا کر سکتی ہے۔ نظریاتی تنقید ادب کے لیے سخت مضر ہے۔ زبان اگر اپنی مٹی سے جڑی ہوئی ہے تو بہتر ادب پیدا ہوتا ہے۔ اردو میں تراجم کی سخت ضرورت ہے۔ تراجم سے زبان و ادب میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ علاقائی زبانوں کے تراجم کی زیادہ اہمیت ہے۔"

SHAHID MAHULI
GHALIB INSTITUE, AIWAN-E-GHALIB,
NEWDELH I110002 INDIA
RES:K-302 TAJ ENCLAVE GEETA COLONY,
NEWDHLI 110031 INDIA

انتخابِ کلام

شاہد ماہلی

کوئی صدا، کوئی سایہ، نہ سلسلہ کوئی
تمام راہ دھندلکوں میں ڈوب ڈوب گئی

بہت قریب سے دیکھا تو میرا سایہ تھا
جسے گلے سے لگائے ہوئے تھی تنہائی

عجب صدا تھی کہ دیکھی گئی نگاہوں سے
عجیب برق تھی کانوں سے آ کے ٹکرائی

رگوں میں پھیل گیا زہر خود پسندی کا
نمو کی دھوپ سے دیوارِ جسم ٹوٹ گئی

خیالِ ریت کا صحرا، اُمید راکھ ہی راکھ
کوئی شرر بھی نہیں دل کی آگ ایسی بجھی

ہے سفرِ زیست کا عجب شاہین
اونچے نیچے دروں سے گزری ہے
شاہین صدیقی

شاہین صدیقی

انگلینڈ

میں نے کبھی نہ سنا نہ دیکھا کہ کسی صاحب نے (میرا مطلب مرد سے ہے) بچے کو دودھ کی بوتل تھمائی اور جھٹ پٹ چولہے پر چڑھی ہانڈی کی طرف لپکے۔ گوشت بھونا، دال میں پانی ڈالا، ترکاری بگھاری اور دوسرے لمحے کچن کاؤنٹر پر رکھا قلم اٹھا کر ایک شعر پاس پڑے کاغذ پر نوٹ کر لیا۔

جی ہاں یہ آمد تھی غزل کی، نظم کی، قطعے یا رباعی کی، ہائیکو کی یا ماہیے کی۔

یہ کام کسی مرد کے بس کا نہیں مگر ایسا میں نے خاتونِ خانہ کو کرتے دیکھا ہے انھیں روزگار کی چکی بھی پیستے دیکھا اور فنونِ لطیفہ میں بھی کارگزاری دکھاتے ان کی بلائیں لیں (ان میں سے ایک خود میں ہوں اور بارہا خوش ہو کر اپنی پیٹھ خود ہی تھپکی بھی ہے)

پھر بھی مرد گرجتے ہیں کہ عورتیں کسی بھی فن میں اتنی مشہور نہیں ہوتیں جتنا کہ مرد ہوتے ہیں۔ (مرد تو آنکھ مٹکا کرنے میں بھی عورتوں سے زیادہ مشہور ہیں اس کا کیا کیا جائے؟)

لیکن ایک بات ہے کہ جنت بہر حال عورت کے پیر کے نیچے ہی ہے اور یہ سو باتوں پر اور مرد کی سو خوبیوں پر بھاری ہے۔ چلیں جناب حساب برابر۔ دراصل ہم ذکر کرنا چاہتے تھے انگلینڈ کی شاہین صدیقی کا۔ ایسی ہی خواتین کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے جو گاہے گاہے آتے جاتے اٹھتے بیٹھتے

اور سوتے جاگتے اردو کے چراغوں میں کبھی تیل ڈالتی ہیں اور کبھی باتی روشن کرتی ہیں۔ انہی میں ایک شاہین بھی ہیں۔ شاہین سے میں کیسے ملی؟ ہوا یوں کہ برطانیہ میں بسنے والی معروف افسانہ نگار صفیہ صدیقی نے ادب دوستی کے ناطے سخن ور دوم نہ صرف خریدی بلکہ اپنے احباب کو بھی مطالعہ کے لیے کتاب دی۔ انگلینڈ کی شاہین صدیقی سے مجھے صفیہ نے ہی متعارف کرایا۔ شاہین پاکستان کے نامور شاعر اور عروض داں محترم خاور امروہوی کی بھابھی ہیں۔ آیئے شاہین سے ملتے ہیں۔ انہوں نے خط لکھا۔

محترمہ سلطانہ مہر صاحبہ

السلام و علیکم!

آپ کے خط سے اور ٹیلی فون پر آپ سے تعارف کا شرف حاصل ہوا آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے صفیہ صدیقی کو شکریہ کہا بلکہ خود ان سے تفصیلی ملاقات کی۔ انہوں نے آپ کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر کیا۔ آپ کی کتاب "سخن ور دوم" بھی انہوں نے دکھائی۔ ماشاء اللہ آپ محنت لگن اور شوق سے اردو کی خدمات انجام دے رہی ہیں۔

میں بھی آپ سے فرمائش کر رہی ہوں کہ اپنی تخلیقات سے نوازیے۔ ان کا جو کچھ ہدیہ ہوگا جس طرح آپ فرمائیں گی میں آپ کو پہنچادوں گی۔

آپ کے سوالنامے کے جواب میں تاخیر پر آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ میری مصروفیت کا سبب میری ملازمت ہے۔ میں مقامی جونیئر اسکول میں انگلش کی معاون ٹیچر ہوں۔ دن کا بیشتر حصہ اسکول کی نذر ہو جاتا ہے۔ چند گھنٹے بچا کر لاتی ہوں جو گھر والوں کا حصہ ہوتے ہیں۔ گھر کے کام پورے نہیں ہوتے۔ شاعری کے لیے زیادہ وقت نہیں ملتا۔ لہٰذا کتاب شائع کرنے کے لیے ابھی نہیں سوچا ہے بلکہ اس کام کو ریٹائر منٹ کے بعد کے لیے اٹھا رکھا ہے۔

میں صرف نظمیں اور غزلیں وغیرہ کہتی ہوں۔ نثر لکھنے میں دلچسپی نہیں ہے۔ چھوٹے چھوٹے مضامین لکھنے کا کبھی اتفاق ہوا ہے مگر زیادہ نہیں۔ میری تخلیقات یہاں کے ادبی رسالوں اور اخبار جنگ وغیرہ میں چھپتی رہی ہیں۔ مقامی جرائد یعنی لندن کے شفق، صدا، اردو ادب، اتحاد لیور پور، ہفت روزہ راوی بریڈ فورڈ، اور مشرق میں میرا کلام چھپتا رہا ہے۔

علامہ اقبال میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ غالب، میر اور مومن کا کلام بھی مجھے بے حد پسند ہے۔ جب کبھی وقت ملا انہیں بڑے شوق سے پڑھا۔ اپنے گھر کی لائبریری میں بھی اپنے تمام ہم عصر شعراور شاعرات کی تخلیقات رکھتی ہوں اور انہیں پڑھتی اور داد دیتی ہوں۔ افسانہ نویسوں کے افسانے پڑھتی ہوں اور دادِ تحسین دیتی ہوں۔ سب لوگ ماشاء اللہ اردو ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

میں اردو کے مستقبل کے لیے پر امید ہوں۔ اکثر بازار میں یا کسی دکان میں یا سر راہے کسی

معصوم بچے کی زبان سے ادا کیے ہوئے اردو کے چند الفاظ میرے کانوں سے ٹکراتے ہیں تو رس گھولتے چلے جاتے ہیں۔ میں ستائش بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھتی ہوں اور مجھے اردو کے مستقبل میں روشنی کی کرن نظر آنے لگتی ہے۔ دل مسرور ہوتا ہے کہ آج کی کچھ مائیں مستقبل کو روشن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کاش کہ ان کی یہ کوششیں کامیاب ہوں۔ (آمین)۔ یہاں انگلینڈ میں جگہ جگہ ہفتہ اور اتوار کو اردو کی خدمت کے لیے اسکول کھلتے ہیں۔ اردو کی کلاسیں باقاعدہ لگتی ہیں اور کافی بچے وہاں آتے ہیں اور اردو سیکھتے ہیں لہٰذا امید رکھنی چاہیے کہ مستقبل اتنا برا نہیں ہوگا کہ جتنا یہاں کے ماحول سے آسانی سے ہو سکتا تھا۔

اب رہا سوال شاعری کا تو اس کے بارے میں یہ کہوں گی کہ جو خاص لب و لہجہ اردو زبان کا ہے وہ شاید قائم نہ رہ سکے گا۔ اس انگلش ماحول میں رہ کر اردو کا لہجہ متاثر ہو رہا ہے۔ آنے والی نسلیں اردو بولیں گی ضرور لیکن وہ انگلش اردو ہوگی۔ شعر کہیں گی تو اس میں وہ روانی اور لطافت نہ ہوگی جو اردو زبان کا حصہ ہے۔

آپ کے سوال نمبر 6 کے بارے میں عرض ہے کہ میں شاعری میں اظہارِ خیال کے لیے قافیہ اور ردیف کی پابندیوں کو پسند کرتی ہوں۔ ان حد بندیوں کی شاعری کا حصہ سمجھتی ہوں۔ نثری نظم کبھی کبھی بہت اچھی لگتی ہے مگر خود کہنے کا تجربہ نہیں رکھتی۔

ادب کی ترقی کے لیے میرے خیال میں تنقید بہت ضروری ہے۔ انسان اپنی تخلیق کو اپنی ہی نظر سے دیکھتا ہے اس لیے اپنی خامیوں کو سمجھ نہیں پاتا۔ جب دوسرے لوگ اپنا اپنا نقطہ نظر بتاتے ہیں تو انسان اپنی تخلیق کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح تنقید اس کی تخلیق کو بہتر بنانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

الیکٹرونک میڈیا تیزی سے ترقی کر رہا ہے اس کی وجہ سے پرنٹڈ میڈیا ختم ہوتا جا رہا ہے اور اس کی وجہ سے لوگ لکھنا اور پڑھنا رفتہ رفتہ چھوڑ رہے ہیں۔ میرے خیال میں والدین بچوں کی شروع سے ہی لکھنے پڑھنے کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے پر زیادہ توجہ دیں۔ حالانکہ یہ اب بہت مشکل ہے۔ ہر گھر میں اور اسکولوں میں کمپیوٹرز حکومت کر رہے ہیں اور ہر قسم کا کام کرنے میں ان سے ہی مدد لی جاتی ہے۔

اب میں آپ کے پہلے سوال کی طرف آتی ہوں۔

میرا پورا نام سلطان شاہین ہے مگر اپنے نام کے دوسرے حصے سے پہچانی جاتی ہوں اور یہی میرا تخلص بھی ہے۔

میں نے 2 دسمبر 1940ء میں امروہہ، ضلع مراد آباد، یوپی انڈیا میں آنکھ کھولی۔ ادبی ماحول تھا۔ میرے والد سید آفتاب الدین رضوی (مرحوم) کو فارسی اور عربی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ شعر و شاعری سے لگاؤ تھا اور خود بھی شعر کہتے تھے۔ پھوپیاں گھر پر عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل

کرتی تھیں۔ ایک پھوپی شعر بھی کہتی تھیں۔

میرے دادا حاجی سید محمد رضوی لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلے میں قدامت پسند تھے۔ لڑکیوں کو اسکول بھیجنا اور انگریزی تعلیم دلوانا پسند نہیں کرتے تھے۔ پردہ دار خواتین کا گھرانہ تھا۔ اس کے برعکس میرے والد مرحوم سید آفتاب الدین رضوی روشن خیال تھے اور لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے حامی تھے۔

میری ابتدائی تعلیم اردو اور عربی کی گھر پر ہو رہی تھی لیکن والد صاحب مطمئن نہیں تھے جیسے ہی پاکستان وجود میں آیا۔ وہ نئی مملکت دیکھنے کے شوق میں ہمیں لے کر کراچی آگئے اور وہیں بس گئے۔ ہم بہنوں کو اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ (بھائی نہیں ہیں)

1956ء میں، میں نے میٹرک پاس کیا اور سر سید گرلز کالج میں انٹر آرٹس کیا۔ اسی دوران شادی ہو گئی اور میں اپنوں سے جدا ہو کر 3 جنوری 1959ء کو انگلینڈ آگئی۔

شیفیلڈ میں 1963ء میں انسٹی ٹیوٹ آف لنگوئسٹ پاس کیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ پاکستان رہ کر ہم لوگ سلوں کے مقام پر میں واپس (انگلینڈ) آگئے اور 1966ء میں ایک مقامی اقینٹ اسکول میں بحیثیت (As a Language support teacher) معاون ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت کی۔

تین سال بعد اپنے بچوں کی تربیت کا سلسلہ شروع کیا اور ملازمت چھوڑ دی۔ جب بچے بڑے ہو گئے تو اپریل 1985ء میں ٹیچنگ کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا اور جب سے مستقل طور پر اسکول سے منسلک ہوں اور ایک مقامی جونیئر اسکول میں معاون انگلش ٹیچر ہوں۔ ریٹائرمنٹ کا وقت قریب آرہا ہے۔ میرے شوہر نواب صدیقی حال میں انجینئرنگ فرم سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ ہمارے 5 بچے ہیں 4 نواسے اور ایک نواسی اور دو پوتے بھی ہیں ماشاء اللہ۔

امید کرتی ہوں کہ آپ کو تمام سوالوں کے خاطر خواہ جواب مل گئے ہوں گے اگر کچھ کمی رہ گئی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔ میں نے انگلش میں بھی کچھ نظمیں لکھی ہیں جو وقتاً فوقتاً اسکول میگزین میں چھپتی رہی ہیں۔ شہزادی ڈائنا کے حادثے سے متاثر ہو کر میں نے ایک نظم انگلش اور اردو میں لکھی تھی جو مختلف جگہ شائع ہو گئی مقامی اخبار Slough observer میں اسکول میگزین میں بھی چھپی جس کی ایک کاپی آپ کو روانہ کر رہی ہوں۔ نظم کا عنوان ہے ڈایانا، دلوں کی ملکہ۔"

32 SEYNOUR RD SLOUGH, SL12NY
ENGLAND.

انتخابِ کلام

شاہین صدیقی

ڈایانا، "دِلوں کی ملکہ"

وہ پریوں کی ملکہ تخیل کی رانی
وہ دریا کی موجوں کی دلکش روانی
سمندر کی وہ تازہ ٹھنڈی ہوا
وہ پھولوں کی خوشبو وہ بادِ صبا

لبوں پہ تبسم سجائے ہوئے
خیابار پلکیں جھکائے ہوئے
ڈایانا بنی منفرد سی دلہن
پری سی لگی اپنی شادی کے دن

مخاطب وہ کرتی تھی اک شان سے
ادا لفظ کرتی تھی مسکان سے
جو الفاظ کے پھو جھڑتے رہے
ہر اک صحنِ دل میں اترتے رہے

تصور میں، میں نے اُسے جب پُھوا
نیا دوستی کا تجربہ ہوا
وہ آگے بڑھی مسکراتی ہوئی
قدم میری جانب اُٹھاتی ہوئی

دیے غم کدوں میں جلاتی رہی
محبت کے موتی لٹاتی رہی
ڈایانا دِلوں کی جو ملکہ بنی
بڑی شان سے وقتِ رخصت چلی

ہے شاہینؔ یادوں کا اب سلسلہ
جہانِ محبت میں پھیلا ہوا
وہ سب کے دلوں میں رہے گی سدا
کوئی بھی نہ اُس کو بھلا پائے گا

میرے ردِ عمل میں اے زمانے
مرا بیتا ہوا کل بولتا ہے
کئی صدیوں سے ہم شہری ہیں لیکن
لہو میں اب بھی جنگل بولتا ہے

ڈاکٹر شباب للِت

شملہ ہندوستان

وقت کی گردش کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے حالات ہی تبدیل نہیں ہوتے بلکہ اس سے انسانی فکر و اقدار بھی بدل جاتی ہیں۔ شاعری کو دیکھ لیں پچھلے پچاس پچپن برس میں اس کے لب و لہجے میں کتنی تبدیلیاں آئیں۔ اس تناظر میں جنھوں نے وقت کی رفتار اور تقاضوں کو سمجھتے ہوئے خود کو ان تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کیا ان میں شملہ ہندوستان میں رہنے والے ڈاکٹر شباب للت کا نام بھی شامل ہے۔ انہوں نے حصولِ تعلیم کے ساتھ مشقِ سخن بھی جاری رکھی۔ چکی کی مشقت اس کے سوا تھی۔ ان کے شعری مجموعوں اور نثری تصانیف کے نام ہیں۔

مضراب 1961ء۔ چتوار 1964ء، پروائی 1967ء، منزل منزل 1970ء، صحرا کی پیاس 1973ء، اُڑان 1976ء، دائروں کا سفر 1980ء، زرد موسموں کے درد 1983ء، سمندر پیاسا ہے 1986ء، آنچ برف زاروں کی 1988ء، اجنبی ہو 1996ء، یہ سب کتابیں شعبہ لسانیات پنجاب، یوپی اردو اکیڈمی، ہماچل اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویج، مغربی بنگال اردو اکیڈمی اور سی آئی آئی ایل میسور، سے ایوارڈ یافتہ ہیں۔ ہندی مجموعے، ہماچل شاعری پر لکھی کتابیں اور تنقیدی مجموعے علیحدہ ہیں۔

والدین نے ان کا نام بھگوان داس للت رکھا تھا خود انہوں نے شباب للت نام اپنایا اور ادبی دنیا میں اسی سے پہچانے جاتے ہیں۔

تاریخ پیدائش 3 اگست 933ء ہے۔ قصبہ خان گڑھ ضلع مظفر گڑھ پنجاب (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔

13 مارچ 46ء تک ڈسٹرکٹ بورڈ ماڈل اسکول خان گڑھ سے تعلیم حاصل کی۔ پھر مظفر گڑھ ہائی اسکول میں داخل ہوئے مگر تقسیم ہند کے بعد 1947ء میں جب یہ دسویں درجے میں تھے انہیں اسکول چھوڑنا پڑا۔ 1948ء میں جین ہائی اسکول پانی پت سے انہوں نے میٹرک کیا۔ ایس اے جین کالج انبالہ شہر سے انٹر میڈیٹ 50ء میں اور بی اے بطور پرائیوٹ امیدوار 1952ء میں، بیچلر آف ٹیچنگ 1954ء میں تاریخ میں ایم اے 1956ء میں اور اردو میں ایم اے 1964ء میں یونیورسٹی میں اوّل رہ کر پاس کیا اور میڈل حاصل کیا۔ دورانِ ملازمت سبھی امتحانات پنجاب یونیورسٹی سے ہی کامیاب کیے۔ ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے 1993ء میں حاصل کی۔

1964ء میں دورانِ ملازمت (Basic Course in Media Operation) انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونی کیشن نئی دلّی سے پاس کیا۔ یہ ادارہ وزارتِ اطلاعات ونشریات کے تحت ہے اور میڈیا آفیسرز کو ٹریننگ دیتا ہے۔

شاعری کے علاوہ ان کے نثری مضامین، ریڈیو کے لیے گفتگو، خاکے، میوزیکل فیچرز، فیچرز مقالے، تنقیدی مضامین وغیرہ رسائل میں شائع ہوئے اور ریڈیو سے نشر ہوئے مزاحیہ تقاریر بھی ریڈیو سے گاہے بگاہے نشر ہوتی رہی ہیں اپنی ان مزاحیہ تقاریر کو اب کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر شباب للت شاعری کے کسی خاص مکتبہ فکر سے یا شاعروں کے کسی دھڑے سے وابستہ نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ترقی پسند شعرا اور جدیدیت کی تحریک سے وابستہ شعرا نے برابر میری شاعری کو متاثر کیا ہے۔ لہٰذا میں نے اپنی شعر گوئی میں متوازن روش اختیار کی ہے۔ روایت کا احترام رکھتے ہوئے جدید اسلوب کو اپنایا ہے اور عصری مسائل پر شعری اظہارِ خیال کیا ہے۔

کلام بے شمار رسائل میں شائع ہوا۔ ان میں ہندوپاک، بنگلہ دیش، برطانیہ اور ناروے وغیرہ کے رسائل شامل ہیں۔ ہفت روزہ اور روزنامہ اخبارات میں بھی کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ سبھی نام یاد نہیں لیکن کم از کم دو سو رسائل واخبارات میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔

ان کے شعری مجموعوں اور نثری تصانیف کی فہرست آپ نے دیکھ ہی لی۔ کچھ کتابیں تالیف بھی کی ہیں۔ ہماچل اکاڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگو یجز کے لیے مندرجہ ذیل کتابیں ایڈٹ کی ہیں جو اکاڈمی نے شائع کیں۔ انہوں نے بتایا۔

وجود عدم: چاند کلوی کا مجموعہ کلام جو اکاڈمی نے موصوف کی وفات کے بعد شائع کیا۔ مرحوم لال چند پرارتھی چاند کلوی پختہ مشق شاعر تھے اور ہماچل کابینہ کے سینئر وزیر۔ وہ محکمہ السنہ و ثقافت، مالیات، صحت اور آبکاری کے وزیر بھی رہے۔ ہماچل بھاشا اکاڈمی اور ہماچل بھاشا و بھاگ کی بنیاد بھی انہوں نے رکھی تھی۔

نوید سحر: کوشل نورپوری کا مجموعۂ کلام جو اکاڈمی نے ان کے پس از مرگ شائع کیا۔

درد کوہساروں کا: ہماچل کے اٹھارہ اردو افسانہ نگاروں کا نمائندہ مجموعہ اور تذکرہ، یہ کتاب بھی مجھے ایڈٹ کرنا پڑی۔ اس میں لگ بھگ تیس صفحات کا تنقیدی مضمون "افسانے کا افسانہ" ہماچل کی افسانہ نگاری کے خصوصی حوالے سے راقم السطور نے شامل کیا۔ ان کے علاوہ کچھ مونوگراف وغیرہ بھی ہیں۔ سہ ماہی "جدید فکروفن" ہماچل سرکار کے اس اردو رسالہ کی ادارت گزشتہ چار برسوں سے کر رہا ہوں۔

چونکہ میں چودہ برس کی عمر میں مہاجر بن کر اپنے خاندان کے ہمراہ پاکستان سے بھارت میں وارد ہوا تھا اور میرے والد کو 9 افراد کے کنبے کی پرورش درپیش تھی اس لیے حصولِ تعلیم اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے مجھے جاں گسل جدوجہد سے گزرنا پڑا۔ تمام تعلیمی امتحانات انٹرمیڈیٹ کے بعد پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے پاس کرنے پڑے۔۔ والدین سے امداد ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ ٹیوشنیں کر کے کام چلانا پڑا۔ بی۔ ٹی کا امتحان پاس کرنے کے بعد سرکاری ملازمت میں آیا تو حتی الامکان اپنے والدین کی مالی امداد کرتا رہا۔ بھائی بہنوں کی شادی کے مصارف جزوی طور پر اٹھائے اور اپنی شادی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی۔ بارہ برس درس وتدریس کے پیشے سے متعلق رہا۔ یہ وابستگی 1966ء میں اس وقت ختم ہوئی جب مجھے مرکزی سرکار کی وزارتِ اطلاعات ونشریات نے فیلڈ پبلسٹی آفیسر کی حیثیت سے تقرری دی۔ پچیس برس تک اسی عہدے پر پنجاب، ہماچل، چنڈی گڑھ، جموں وکشمیر اور راجستھان کے مختلف مقامات پر فرائض سرانجام دیے اور بالآخر 31 مارچ 91ء کو اسی عہدے پر شملہ سے ریٹائر ہوا۔"

اگلے سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے کہا:

"میرا راسخ عقیدہ ہے کہ اردو زبان کو نامساعد حالات کے باوجود کوئی مٹا نہیں سکتا۔ یہ اپنے موجودہ رسم الخط کے ساتھ ہی زندہ رہے گی۔ ہندوستان میں بھی خواہ اس کے بداندیش اسے مٹانے کی لاکھ کوشش کریں حکومت کی کوئی سیاسی سازش اس کے تحفظ اور بقا سے دامن کشی نہیں کرپائے گی۔ بین الاقوامی سطح پر بھی اس کا عزو وقار قائم رہے گا۔"

ڈاکٹر للت کہتے ہیں "شاعری میں نظم سب سے موثر وسیلۂ اظہار ہے اور اس معاملے میں میں سردار جعفری کا ہم خیال ہوں۔

مشاعروں کے سلسلے میں انہوں نے بڑے دکھ سے کہا کہ "مشاعروں اور تخلیقی نشستوں کا

تخلیقی ادب میں برابر ہاتھ رہا ہے لیکن تخلیقِ عمل میں ادبی نشستیں زیادہ مفید و معاون رول ادا کر سکتی ہیں۔ مشاعروں میں تو شعرا حضرات و خواتین اپنی آزمودہ نظمیں اور غزلیں ہی پڑھتے ہیں جو ہم برسوں سے سنتے چلے آئے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ پچاسوں مشاعروں میں وہی چیزیں بار بار دہراتے ہوئے ان لوگوں کو ذرا بھی شرم محسوس نہیں ہوتی۔ مشاعرے تو خالص طور پر کمرشل ہوگئے ہیں اور شعرا کے لیے منفعت زر کا دھندہ۔ لوگ نئی چیزیں کہتے ہی نہیں۔ برسوں پہلے کی تخلیقات کو مشاعروں میں دہراتے ہوئے سامعین کو بدھو بناتے چلے جاتے ہیں۔"

ڈاکٹر شباب کا مشورہ ہے کہ کتابوں اور جرائد کی بقا کے لیے سرکار پر زور ڈالنا چاہئے کہ سرکار اپنی جانب سے کتابوں اور رسائل کی خریداری قبول کرے اور انہیں لائبریریوں کو فراہم کرے۔ سرکار نے "قومی کونسل برائے فروغِ اردو" کی تشکیل کی ہے اور پانچ کروڑ کی رقم سالانہ اردو کے فروغ کے لیے کونسل کو مہیا کر رہی ہے لیکن جو مثبت کام ہونا چاہئے ہو نہیں رہا۔ زیادہ رقم سیکرٹری کے سفر و سیاحت وغیرہ اور نشستند وگفتند وبر خاستند قسم کی میٹنگوں پر صرف ہو رہی ہے۔ اچھی کتابیں خریدی نہیں جاتی ہیں محض ذاتی مفادات (vesled Interests) کی پرورش کی جا رہی ہے۔ اردو کے یہ چند نام نہاد رکھوالے ہی اس بجٹ کو لوٹ لوٹ کر کھا رہے ہیں صوبائی اردو اکاڈمیاں بھی کتابوں اور رسائل کی خریداری میں مدد کر سکتی ہیں۔

رائٹرز گلڈ بنا کر شعرا اور ادیب حضرات و خواتین اپنی کتابیں کو آپریٹو طریقے سے شائع کر سکتے ہیں۔ امدادِ باہمی کا یہ تجربہ جنوبی ہند میں خاصا کامیاب رہا ہے۔ شاعروں اور ادیبوں کو بھی اچھے رسائل و کتب خرید کر پڑھنے چاہئیں۔"

تنقید کے سلسلے میں انہوں نے کہا۔"میں آپ کی رائے سے سو فیصد متفق ہوں۔ تنقید کے نام پر یا تو خالص توصیف لکھی جا رہی ہے یا محض ملازمت حاصل کرنے کے مقصد سے کچھ ادبا تنقیدی مضامین رسائل میں شائع کرواتے ہیں، اس کے بعد جب اردو کی لیکچرر شپ مل جاتی ہے تو یہ تنقیدی عمل آگے کم ہی بڑھتا ہے۔ چند تنقید نگار ہی اس میدان میں ہیں، انہیں بھی سیمناروں سے فرصت کم ملتی ہے۔ مطالعہ کے لیے وقت نکالا جائے تبھی تنقید کا عمل پروان چڑھ سکتا ہے۔"

Dr. SHABAB LALIT
9-Hydevale, Chaura Maidan
Shimla-171004

انتخابِ کلام

ڈاکٹر شباب للت

سیاہ و سفید

خدائے پاک ہے تو مالکِ سیاہ و سفید
تو لازوال، ترا آدانت ہے ناپید

تو ہے وہ قادرِ کل جس نے اپنی قدرت سے
طرح طرح کے ہر اک شے میں رنگ بھر ڈالے
کرشمہ یہ بھی ترا تھا کہ جسم پر میرے
سیاہ بال تھے جتنے، سفید کر ڈالے

مرے خدا، میرے معبود! ذاتِ بخشندہ
یہ معجزہ بھی دکھانا تو اپنی قدرت سے
سیاہ نامۂ اعمال میرا پیش ہو جب
سفید اس کو بھی کر دینا اپنی رحمت سے

گناہ گار کی یہ آخری تمنا ہے
سیاہ کار کی یہ آخری تمنا ہے
امیدوار کی یہ آخری تمنا ہے

کئی صدیوں کی کشمکش کے بعد آخر وہ دن آیا
میں گھر کی چار دیواری کے باہر دیکھ سکتی ہوں

شہلا نکہت فیضی

شہلا فیضی

لاس اینجلس

ڈیڑھ سال قبل لاس اینجلس کی شعری فضا میں ایک نئی آواز گونجی۔ لہجے میں اعتماد تھا اور کلام میں توانا جذبوں کی جھلک، یہ شہلا نکہت فیضی تھیں جن کی پذیرائی کی گئی۔

پھر کچھ دنوں بعد ایک مشاعرے میں شہلا کی تازہ غزل سامنے آئی۔

ان ہواؤں میں نئے دیپ جلاؤں کیسے
راستہ، بھولنے والوں کو دکھاؤں کیسے
مجھ کو احساسِ ندامت ہے خطاؤں پہ مگر
ہے انا دِل میں تو پھر سر کو جھکاؤں کیسے
الٹے سیدھے ہوں اگر کام تو تدبیر کروں
ہاتھ کی ٹیڑھی لکیروں کو مٹاؤں کیسے
ہنسنے والوں کو ہنسانے کی ضرورت کیا ہے
رونے والے ہیں بہت ان کو ہنساؤں کیسے
ڈوب جانے کا بھی ہے خطرۂ پیہم شہلا

ناؤ کاغذ کی ہے، دریا میں چلاؤں کیسے

گو میدانِ ادب میں شہلا نووارد ہیں مگر ان کی ترقی کی رفتار سست نہیں۔ مجھے محترم ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا کہنا یاد ہے کہ دیارِ غیر میں جو اردو زبان سے محبت کا اظہار کر رہے ہیں ان کی محبتوں کو سمیٹنا چاہئے۔ چنانچہ میں نے ان تک چڑھے شعرا، ادیب اور نقادوں کی پرواہ نہ کی جو سخن ور دوم اور سوم دیکھ کر کہتے ہیں 'اوھ اس میں نامور تو دس فیصد ہیں باقی سب تو.....''

باقی کو کچرا کہنے کی ان کی ہمت نہیں مگر میں جانتی ہوں انہی میں سے کبھی کوئی گوہر نایاب بن کر بھی جگمگائے گا۔ بس وقت کی اور محنت کی کاری گری کی ضرورت ہے۔

چنانچہ جب ایک دن میں اور شہلا یکجا ہو گئے تو شہلا سے چند سوالات کیے۔ شہلا نے کہا۔ ''میں 30 اپریل 1977 کو ہندوستان کے شہر بنگلور میں پیدا ہوئی۔ میرے والدین کو شاید میری آنکھیں اچھی لگیں اور اسی لیے انہوں نے میرا نام شہلا نکہت رکھا۔ آگے چل کر میں نے شہلا ہی کو تخلص کے طور پر اختیار کر لیا۔

میری پیدائش کے کچھ ہی دن بعد ملازمت کے سلسلے میں میرے والد محترم فیض بیگ صاحب کو امریکن کمپنی میں سعودی عرب جانا پڑا۔ میری ابتدائی تعلیم سعودی عرب کے عرب مدارس میں اسلامی طرز پر شروع ہوئی۔ اس کے بعد ہندوستانی سفارت خانہ کے اسکول میں داخلہ حاصل کیا۔ وہاں ابھی زیرِ تعلیم ہی تھی کہ میرے والد کا تبادلہ کیلیفورنیا (شمالی امریکہ) میں ہو گیا۔ اسی لیے میں نے ہائی اسکول ڈپلوما یہیں سے حاصل کیا۔ اس وقت میں اے ایس کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کمپیوٹر انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہی ہوں اور اس کے ساتھ اپنے والد صاحب کے پریس ''پرنٹنگ ٹوڈے'' میں گرافک ڈیزائنر کی حیثیت سے کام بھی کرتی ہوں۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے میں اس دنیا میں بالکل نووارد ہوں۔ اگرچہ کم سنی ہی سے مجھے شعر گوئی پسند رہی لیکن اس میدان میں کوئی ڈیڑھ دو سال پہلے میں نے پہلا قدم اٹھایا اور بڑی محنت اور خاصے مطالعہ کے بعد ایک مشفق و محترم کی رہبری میں کچھ اشعار کہنے لگی ہوں اور خدا کے فضل اور یہاں کے شاعروں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے باعث یہاں کے مشاعروں میں بھی اپنا کلام سنا رہی ہوں۔ یہ میرے لیے بہت ہمت افزا بات ہے۔ میرا کلام لاس اینجلس کے مقامی ہفتہ وار اخبار ''پاکستان ٹوڈے'' اور ''پاکستان لنک'' میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ نیویارک کے ہفت روزہ 'اردو ٹائمز' میں بھی میرا کلام شائع ہوتا ہے۔ پذیرائی ہو رہی ہے جس کو میں اپنی ترقی کے لیے ممد و معاون سمجھتی ہوں۔ اس کے علاوہ دوسرے اور مجلوں میں بھی میرا کلام شائع ہوتا ہے۔ یہ ایک حسنِ اتفاق ہے کہ شاعری کے بعد مجھے فنونِ لطیفہ کی دوسری شاخ یعنی نقاشی اور مصوری سے بھی غیر معمولی دلچسپی ہے اور یہ بھی میرا محبوب مشغلہ ہے۔ میں خود کو ایک اچھی آرٹسٹ کہہ سکتی ہوں۔ فنونِ لطیفہ کی ایک شاخ یعنی موسیقی سے بھی مجھے کافی حد تک دلچسپی ہے مگر صرف سننے کی حد تک اور اس لیے

یہاں موسیقی کی محفلوں میں پابندی سے شریک ہوتی رہتی ہوں۔

میں جدید طرزِ سخن سے متاثر ہوں۔ آگے چل کر میں یہی کوشش کرتی رہوں گی کہ میری شاعری جدید طرزِ سخن میں جگہ حاصل کرے۔ اگرچہ کہ غزل شاعری کی سب سے اچھی اور دلکش صنف مانی جاتی ہے لیکن جدید طرزِ سخن اور خصوصاً نظم عاری (Blank Verse) میں اظہارِ خیالات و جذبات و احساسات کے لیے غیر معمولی وسعت موجود دکھائی دیتی ہے جہاں ایک مفکر اپنے فکری نتائج کو نہایت آزادی کے ساتھ متوازن اور غیر متوازن الفاظ اور جملوں میں پیش کر سکتا ہے۔

میرے ذوقِ شعر فہمی و شعر گوئی نے مجھے قدیم اور جدید زمانہ کے شاعروں اور ان کے کلام کی دنیا میں ڈھکیل دیا ہے جہاں میں غالبؔ، اقبالؔ، فیض احمد فیضؔ، ساحر لدھیانوی، خمار بارہ بنکوی، قتیل شفائی، کیفی اعظمی، فرازؔ وغیرہ جیسے شاعروں کے کلام کا بہت غور اور دلچسپی سے مطالعہ کرتی ہوں اور ان سے اپنی فکرِ سخن کے لیے رہنمائی حاصل کرتی رہتی ہوں۔ تنقید و تبصروں سے بھی کافی دلچسپی ہے جو نظم و نثر کی اصلاح اور رہبری کے لیے نہایت ضروری ہے مغربی مفکرین میں مجھے ورڈس ورتھ، ملٹن، ایلس واکر، ولیم بلیک، ٹینیسن وغیرہ جیسے لوگ پسند ہیں۔ مختلف افسانہ نگاروں کے افسانے بھی میرے زیرِ مطالعہ رہتے ہیں۔

میری تعلیمی مصروفیات اور نقل مقام کے سوا میری زندگی کے کوئی اور واقعات قابلِ تذکرہ نہیں البتہ شعر گوئی کے حوالے سے ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ شمالی امریکہ کے ایک مشہور طنز و مزاح کے شاعر سے مجھے رہنمائی حاصل ہوئی جن سے نظم و غزل گوئی کے ابتدائی اور ضروری اصول و قواعد کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے بعد میں نے شعر کہنا شروع کیا اور انہی سے اپنے کلام کی اصلاح لے رہی ہوں۔ ان کا نام ہے محترم اسد اللہ حسینی چکرؔ

اس میں کوئی شک نہیں اور یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ اگر اردو داں طبقہ اس زبان کو صرف شعر و شاعری کی حد تک محدود نہ کرتے ہوئے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں استعمال میں لے آئیں اور اس کے ساتھ ساتھ اور شانہ بشانہ اس کی ترویج اور ترقی میں عملی اور مخلصانہ کوشش اور جدوجہد کرتے رہیں تو وہ دن دور نہیں کہ یہ اردو زبان دنیا کی زبانوں میں پہلا نہیں تو دوسرا مقام تو ضرور حاصل کرلے گی۔ اس کے لیے صرف متحدہ و متفقہ تگ و دو کی ضرورت ہے۔

شاعری کی کونسی صنف اظہار خیال کے لیے مناسب اور بہتر ہے، اس کا ذکر میں کر چکی ہوں یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ دورِ حاضر میں اردو ادب کو صرف مشاعروں تک محدود کرنے کے بجائے اس کے ساتھ ساتھ تخلیق ادب کی کاوشیں بھی چلتی رہیں تو یہ اردو کے ایک صحت مند ادب کی پیدائش اور اس کے نشو و نما کا ضامن ہو سکتا ہے۔ شاعروں کے علاوہ شاعرات بھی اس

سلسلہ اور مرحلہ میں اپنا بھرپور حصہ ادا کر سکتی ہیں جنہیں دور جدید میں ایک نمایاں مقام حاصل ہو گیا ہے اور مزید حاصل ہو گا۔

تخلیقی نشستیں بھی بدرجہ اتم ضروری ہیں جن کے ذریعے نثری یعنی تصنیفی و تالیفی صلاحیتوں کو اُجاگر کیا جاسکتا ہے۔ ان میں ایسی تنقیدیں اور تبصرے بھی ضرور شامل ہونا چاہئے جو ادب کو پروان چڑھانے میں مفید و معاون ہوں۔

اس میں شک نہیں الیکٹرونک میڈیا نے لکھائی یا تحریری کام کو بہت بڑی حد تک آسان اور سہل بنادیا ہے لیکن اس سے ہر کس و نا کس مستفید نہیں ہو سکتا۔ اس سے صرف وہی لوگ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جو اس میڈیا سے واقفیت دلچسپی رکھتے ہیں اور اس کے اہل ہیں یعنی اس میڈیا کو فی الحال صدائے عام کا مقام حاصل نہیں۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ پیدا شدہ ادب کی حفاظت اور بقا کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ اسی لیے پرنٹڈ میڈیا ہی ہمارے ادب کی بقا کے لیے ازبس ضروری ہے کہ ہمارے بعد آنے والی نسلیں اس سے مستفید ہو سکیں جس طرح ہم اپنے اسلاف اور پیش رفتگاں کے شائع کردہ یا خود نوشتہ ادبی خزانوں سے مالا مال ہو رہے ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ دنیا کی کسی بھی لسانی اور ادبی ترقی و ترویج کے لیے تنقید و تبصرہ ایسا ہی ضروری ہے جیسا حیات انسانی کے لیے ہوا اور پانی! لیکن بد قسمتی سے لوگ اس کو ذاتی مخالفت و مخاصمت کے لیے استعمال کر رہے ہیں جس سے ادب کا کوئی تعلق یا واسطہ نہیں، جس کو تنقید برائے تنقید کہا جاسکے۔ جس میں اصلاح یا کوئی تعمیری پہلو نظر نہیں آتا، ایسی تنقید یا تبصرہ ادبی تعمیر کا تو نہیں بلکہ اس کی تخریب کا باعث ضرور ہو سکتا ہے، جو لفظ تنقید کے معنی و مقصد کے بالکل برعکس اور مغائر ہے۔ پس ایسی تنقید کی ہر طرح ہمت شکنی ازبس ضروری ہے۔ اگر تنقید برائے اصلاح ہو اور نیک نیتی اور ایماندارانہ کاوش پر مبنی ہو تو یہ حقیقت میں ایک بار آور تنقید ہو گی اور ایک صحت مند ادب کی ضامن بھی اور یہ ہر ادیب یا ناقد کا ایک اخلاقی اور انسانی فرض بھی ہو گا جس کی ہمت افزائی اور پذیرائی نہایت ضروری اور لازمی ہے۔

SHELA FAIZI
1615 Redlands Blvd Ste A & B
Redlands, Ca 92373
Tel: Bus# (909) 307 - 3200

انتخابِ کلام

شہلا فیضی

غزل

خود شناسی کا سبق سکھلا رہا ہے آئینہ
میری صورت ہی مجھے دکھلا رہا ہے آئینہ

"دیکھتا رہتا ہوں، سب کچھ منہ سے کچھ کہتا نہیں
یہ زبانِ حال سے فرما رہا ہے آئینہ

جب سے اس میں جرأتِ نظارہ پیدا ہوگئی
میری آنکھوں میں کھٹکتا جارہا ہے آئینہ

وہ گھٹا دیتا تو ہے احساس تنہائی مگر
زعم یکتائی کو بھی جھٹلا رہا ہے آئینہ

اک زمانہ تھا کہ جس کو دیکھنے پر ناز تھا
اب وہ چہرہ دیکھ کر شرما رہا ہے آئینہ

جب رہا کرتا تھا میرے روبرو صبح و مسا
سامنے آنے سے اب کترا رہا ہے آئینہ

کوئی شہلاؔ کے سوا اب آنکھ کو بھاتا نہیں
تجھ سے نظریں پھیر کر پچھتا رہا ہے آئینہ

ڈاکٹر شہلا نقوی

نیویارک

کوئی یہ کہے کہ میں نے بحیثیت شاعر کسی کا اثر قبول نہیں کیا تو مجھے یہ بات نری بوگس لگتی ہے۔ یوں کہ تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد کہنے والا یا کہنے والی کی گفتگو سے یہ بات ظاہر ہو ہی جاتی ہے کہ نوعمری میں جس کسی کو بھی پڑھا ہو، خاندان میں کوئی کردار یا گھر کا ماحول ایسا ہو جو محرک بھی بنتا ہے اور کسی نہ کسی صورت اثر انداز بھی ہوتا ہے لیکن یہ قطعی ضروری نہیں کہ اس کے اثرات پوری زندگی طاری رہتے ہیں یا ساتھ چلتے ہیں۔ پھر آج کل نوے فیصد لوگوں کے لیے شاعری، افسانہ نگاری یا ادب سے کسی بھی قسم کا تعلق کل وقتی ممکن بھی نہیں۔ اس صنعتی عہد میں ہر انسان کسی نہ کسی پیشے سے وابستہ ہے لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ اچھی شاعری جز وقتی توجہ تو برداشت کر سکتی ہے مگر غیر سنجیدہ رویہ قطعی برداشت نہیں کر سکتی۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ شاعر یا شاعرہ کا اگر قبلہ درست نہیں ہے تو اس کی شاعری بھی سطحی ہوگی۔

شہلا نقوی کے کلام کی تعریف میں نیویارک کے سنجیدہ ادبی حلقوں کی جانب سے سن چکی تھی۔ پھر انہیں میں نے نیوجرسی کی ایک شعری محفل میں سنا جسے سخن فہم محترم وسیم رضا اور میمونہ رضا نے اپنے گھر دوسرے سخن فہم جناب یٰسین اور زرمین یٰسین کے تعاون سے منعقد کی تھی اس

وقت جی چاہا کہ شہلا کو گلے سے لگا لوں۔ شہلا سے تھوڑی سی گفتگو چائے کے وقفے اور کھانے کے دوران ہوئی۔ میں نے سوالنامہ (جو اتفاق سے میرے پرس میں تھا) شہلا کو تھمایا اور جلد جواب دینے کی تاکید کی۔ مجھے معلوم تھا کہ بحیثیت ڈاکٹر شہلا کو مریضوں سے فرصت بہت کم ہی ملے گی مگر شہلا نے فرصت بہر حال نکال ہی لی اور ادب دوستی کا ثبوت اس طرح دیا کہ ان کے جوابات پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شہلا نے جو کہا ہے اس میں سطر سطر معلومات کا خزانہ چھپا ہوا ہے۔

خواجہ احمد عباس شہلا کے ماموں تھے۔ شہلا نے ان کے ساتھ گزارے ہوئے جن دنوں کا ذکر کیا ہے وہ ہمیں بتاتی ہیں کہ گھر میں یا خاندان میں ایک تعلیم یافتہ اور باشعور شخص کی ذہنی قربت مشعل بن کر ہماری تمام راہوں کو روشن رکھتی ہے اور یہ روشنی قدم قدم رہنمائی بھی کرتی ہے۔ اس روشنی کو سخن ور کے قارئین تک پہنچانے کے لیے میں نے شہلا کو اپنے سامنے بٹھا لیا اور اس سے فرمائش کی کہ وہ اپنی بہت خوبصورت نظم "نقش" سنائے جس میں ایک عورت ہی اپنے دلنشیں طرزِ فکر کا ایک اچھوتا پیکر تراش سکتی ہے۔ (یہ نظم آپ اگلے صفحات پر ملاحظہ فرمائیں)

شہلا دھیمے انداز میں اپنے بارے میں بتا رہی تھیں۔

"میرا پورا نام فاطمہ شہلا حسنین ہے مگر شادی کے بعد شہلا حسنین نقوی ہوا اور یہی ادبی نام ٹھیرا یوں تو ہر شخص اپنے بارے میں گفتگو کر کے اور اپنی رائے کا اظہار کر کے خوش ہوتا ہے لیکن انٹرویو دینا قدرے مشکل کام ہے کیونکہ آپ کی کہی ہوئی ہر بات ایک دستاویز بن جاتی ہے۔ لیکن آپ کی خواہش کا احترام بھی ملحوظ ہے۔" وہ لمحے بھر کو رکیں اور پھر گویا ہوئیں "سو بات یوں ہے کہ گردشِ ماہ و سال کے ساتھ انسان کو زندگی کے نئے نئے رخ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہی تجربات اور مشاہدات انسان کی سوچ اور رویہ میں تبدیلی لاتے ہیں اور اس کے اثرات نہ صرف ہمارے چہروں پر بلکہ پوری شخصیت پر مرتب ہوتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہاں وہ معصوم چہرہ جس کی آنکھوں سے بلند حوصلے جھانکتے تھے اور کہاں یہ گردِ ایام سے اٹا چہرہ جس کی آنکھوں میں دکھ کے سائے بے موقع بھی لہرا جاتے ہیں لیکن جمود کی قائل نہیں مجھے تو اپنے چہرے پر وہ لکیریں بھی عزیز ہیں جو ہنستے ہوئے بنی ہیں یا میرے کسی مریض کی پریشانی نے نقش کی ہیں۔

میں کراچی میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی۔ میرے والد صاحب ڈاکٹر سید ذوالفقار الحسنین جامعہ کراچی کے شعبہ نباتیات میں معلم تھے۔ والد صاحب درس و تدریس کے شعبہ میں بیرونی ممالک میں بھی خدمات انجام دیتے رہے۔ اسی دوران ہم بہن بھائیوں کو مصر، لیبیا، تیونس، فرانس اور انگلینڈ کی سیر کا موقع ملا۔ میں نے میٹرک اور انٹر پی ای سی ایچ ایس اسکول سے کیا جو بیگم مجید ملک کا قائم کردہ اسکول ہے اس انگلش میڈیم اسکول کی اور دوسری لڑکیوں کی نسبت میری اردو کافی اچھی تھی جو یقیناً گھر کی تعلیم کا اثر تھا جہاں چھٹیوں میں ابا غالب، میر، اقبال اور انیس پڑھانے بیٹھ جاتے تھے، مشکل الفاظ کا مطلب اشعار کی تشریح، اندازِ بیان کی فصاحت شاعری کی نزاکتوں سے آگہی اور

رموزِ فن سے واقفیت اسی خاص توجہ کی مرہونِ منت ہے۔ ہمارے گھر میں ہر سال محرم کی گھما گھمی ہوتی تھی جس میں ہم لوگوں کو مرثیے، سلام اور نوحے پڑھنے کا موقع ملتا رہتا تھا۔ میری ذہنی تربیت میں ان محافل کا بہت اہم کردار ہے۔ والدِ محترم کی خواہش تھی کہ ان کے بچے بلکہ قوم کے بچے سائنس کی طرف توجہ دیں اور میرا خیال ہے کہ انہیں اپنی اولاد کی شاعرانہ افتاد کا اندازہ تھا اس لیے وہ اس ضمن میں کسی قسم کی کوئی حوصلہ افزائی سے محروم نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر سید خورشید حسنین جو اسلام آباد میں (فزکس) طبعیات کے پروفیسر ہیں ایک سنجیدہ شاعر بھی ہیں۔ ڈاؤ میڈیکل کالج میں طالب علمی کا زمانہ سرگرمیوں سے بھرپور تھا اور مہدی صاحب کے ریڈیو پروگرام، ٹی وی میں "فروزاں" پروگرام اور جنگ میں طلبہ کے صفحہ پر "فریاد کچھ تو ہو" یہ سب والد صاحب کی اہمت افزائی کے ساتھ جاری رہے۔ انہوں نے ہمیشہ انسانی دوست کرنے اور پیسے کو مطمع نظر نہ بنانے کا سبق دیا۔

معروف افسانہ نگار خواجہ احمد عباس میری امی کے لاڈلے اور چھوٹے بھائی جان تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم لوگ جب بھی ممکن ہوتا ان کے پاس بمبئی جایا کرتے تھے۔ ماموں جان دور ہو کر بھی میرے لیے اپنے اصولوں پر زندگی بسر کرنے کے لیے ایک نمونہ رہے۔ جس دن ماموں جان کام سے فارغ ہوتے تھے وہ نوکروں کو چھٹی دے دیتے اور اس دن کو اچھی طرح گزارنے کے لیے انہیں پیسے دے کر رخصت کرتے۔ بہنوں سے کہتے "آج تم دونوں کی چھٹی ہے میں اور بچے کھانا پکائیں گے۔ ان کا کہنا تھا کہ جس سالن کو مزیدار بنانا ہو اس میں یا تو ٹماٹر ڈال دو یا دہی۔ امی ہنسی دبائے آکر جھانک جاتی اور کہتیں "میرا بھائی کس مشکل میں پڑ گیا ہے۔" ہم لوگ آٹا گوندھ رہے ہیں بچی بچی روٹیاں پکا رہے ہیں پھر دھوم دھام سے کھانا میز پر لگایا جاتا اور بے تحاشہ تعریفوں کے ساتھ کھایا جاتا۔ مزدور کی عظمت اور کام کو عار نہ سمجھنا میرے بزرگوں نے مجھے زبانی نہیں بلکہ کر کے دکھایا۔

میں کالج میں این ایس ایف کی ممبر تھی میرے مذہبی پن کو دیکھتے ہوئے اس ممبر شپ سے ماموں جان کو ایک گونا اطمینان سا ہو گیا تھا۔ پھر ماموں جان کے ساتھ وہ وقت گزرا جب وہ علاج کے سلسلے میں نیویارک آکر ہمارے چھوٹے سے فلیٹ میں ٹھہرے تھے۔ اس زمانے میں ماموں جان نے بار بار مجھے لکھتے رہنے کی تاکید کی تھی۔

کچھ عرصے بعد ماموں جان اور ابا دونوں دنیا سے رخصت ہوئے لیکن میں اپنے دو بچوں اور گھر اور کلام کی ذمہ داری کے ساتھ لکھتی رہی۔ میں نظم اور غزل کے علاوہ افسانے انشائیے اور تبصرے بھی لکھتی ہوں۔ میرا ایک طویل انشائیہ کراچی میں وعدہ کتاب گھر سے شائع ہو چکا ہے۔ کتاب کا عنوان ہے "کھوئی ہوئی عورت"

میں حمیرا رحمٰن کی کتاب "انتساب" اور ریحانہ قمر کی کتاب "سوچ کی دہلیز پر" تبصرے لکھ چکی ہوں۔ جناب جوش ملیح آبادی کے بارے میں لندن میں ہونے والے سیمینار میں، میں نے ایک

مقالہ "شاعرِ انقلاب کا انقلابی رہنما" پیش کیا تھا۔

نیویارک 1999ء میں منعقد ہونے والے غالب یادگاری مشاعرے میں مقالہ "غالب آج کا شاعر" پیش کیا۔

میں وطن سے دور سائنس اور میڈیسن کی دنیا میں کامیابی سے گزارا کر رہی ہوں اور میرے کام کو دونوں میں قابل قدر گردانا گیا ہے۔ (میرا نام Marquis Whos` Who in Scinecne میں شامل کیا گیا ہے اور Marqius Whos` Who in Medicine میں بھی)

یہ میرے ملک میں دی گئی تعلیم اور میرے گھر میں دی ہوئی تربیت کا نتیجہ ہے۔ میں اس کو اپنا ذاتی کارنامہ نہیں سمجھتی۔ اس کا ذکر بھی میں نے صرف اس لیے کیا ہے کہ یہ سب کرتے ہوئے بھی اپنے وطن، زبان اور لوگوں سے ہم آہنگ رہنا ممکن بھی ہے، آسان بھی اور ضروری بھی۔ ہمیں بہر حال اپنی شناخت برقرار رکھنا ہے۔ شاعری کو میں ایک ایسا بے ساختہ امر سمجھتی ہوں جو تجربات اور احساسات کے نچوڑ سے پیش آتا ہے۔ لہٰذا اس میں ذات کے کرب کے علاوہ معاشرے کے دکھ کی جھلک بھی ہونی چاہیے۔"

شہلا کا کلام "فنون، نیا سفر" عبارت ارتقا، بیاض، صدا، اور آواز میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ ان کا مجموعہ کلام "نخلِ مریم" اشاعت کے مراحل میں ہے۔

شہلا بتا رہی تھیں کہ وہ اردو اور انگریزی ادب کے علاوہ سائنسی تاریخی اور محققانہ کتب کا مطالعہ کرتی ہیں۔ نیویارک میں رہائش کا بڑا فائدہ انھیں یہاں کے کتب خانوں تک رسائی محسوس ہوتا ہے۔

شہلا نے اگلے سوال کے جواب میں کہا "میں نثری نظم کو ایک خوبصورت مختصر نثر پارہ سمجھ کر اس سے لطف اندوز ہو سکتی ہوں لیکن اسے شاعری کے طور پر نہیں پڑھ سکتی۔ اور مشاعروں کے سلسلے میں میری رائے ہے کہ مشاعرے ادبی نشستوں کی جگہ نہیں لے سکتے۔ ادبی نشست میں یا شاعر آتے ہیں یا وہ لوگ جن کو ادب سے گہرا لگاؤ ہوتا ہے۔ یہ لوگ شعر کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مشاعرے اصل میں performing art ہیں۔ ان کی کامیابی کا انحصار مجمع پر ہوتا ہے اور اس میں زیادہ تر وہ لوگ ہوتے ہیں جو کسی مغنی کی آواز کے ساتھ ہی غزل کی خوبصورتی کو سمجھ سکتے ہیں۔ اسی طرح مشاعرے کے ماحول میں صرف وہی نپی تلی شاعری کامیاب ہوتی ہے جو عام ڈگر سے ہٹ کر نہ ہو۔ جو غم جاناں میں غم دوراں کا خفیف سا پرتو ڈال کر کی گئی ہو اور اگر ترنم اسے جلا بخش دے تو بات بن جاتی ہے۔

اردو کی کتابیں پہلے ہی کم اور کم تعداد میں چھپتی تھیں۔ ان کی بقا کے لیے آج بھی وہی ضروری ہے جو کل تھا کہ ہم لوگ کتب خرید کر پڑھیں۔ تحفے میں کتابیں دیں۔ رسالوں کے مستقل خریدار بنیں۔ میرے لیے اچھی کتاب ایک گہری سوچ رکھنے والی سہیلی ہے اور ٹی وی ایک باتونی پڑوسن۔

تنقید لکھی جا رہی ہے لیکن برداشت کا مادہ لوگوں میں کم ہو گیا ہے اور تنقید کو ذاتی حملہ تصور

کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف کچھ لوگ ذاتی حملے کرنا ہی اپنا کام سمجھتے ہیں۔ ان وجوہات سے گروہ بندیاں ہو جاتی ہیں۔ کسی ایک مکتبہ فکر سے وابستہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ دوسروں کے کلام کو پرکھنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جائے۔

اردو کا مستقبل پاکستان کے عوام کے مستقبل سے وابستہ تھا ہے۔ پاکستان میں ہر روز وہ بچے پیدا ہو رہے ہیں جو اردو بولیں گے اور جن کی خواہش ہو گی کہ وہ اردو پڑھ سکیں اردو لکھ سکیں۔ اردو ان کے دم سے زندہ رہے گی۔ اگر ہم اردو کے خیر خواہ ہیں تو ہمیں اس زبان کو پاکستان میں خواندگی کی شرح بڑھانے کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ پاکستان میں اردو کے ذریعے سائنس کی تعلیم عام کرنی چاہیے۔ ان مضامین کو اپنی زبان میں بخوبی سمجھنا غیر زبان میں رٹنے سے مختلف ہے۔ ہماری قوم کے ذہن اپنی صلاحیتوں کو مکمل طور پر بروئے کار لا کر ہی ملک کو ترقی کی دوڑ میں شامل کر سکیں گے۔ یہ محبت کی زبان ہی عوام کے مختلف گروہوں میں ہم آہنگی پیدا کر کے تعصب اور تنگ نظری کو دور کر سکتی ہے۔"

DR. SHELA NAQVI
DEPARTMENT OF PEDIATRICS
1335 LINDEN BLVD.
SUITE 114 BROOKLYN NY 11212

انتخابِ کلام

ڈاکٹر شہلا نقوی

نقش

پورن ماشی رات کے بعد
میری ذات مدو جزر سے وقت کے جیسے بھیگی ریت
اس بے سلوٹ ریت پہ اپنے پنجوں سے
وقت کے پنچھی، چھوڑ گئے ہیں کتنے نشاں

ہنسی کی چڑیا، ان آنکھوں کے گوشوں پر
نازک نازک کتنی خراشیں چھوڑ گئی
اور پریشانی کی چیلیں ماتھے پر، کیسے کھرونچے ڈال گئیں

وقت کی لامحسوس پلٹتی موجیں یوں
ساحل جسم سے ریت بہائے جاتی ہیں
بہتے پانی کی دھاروں سے کھنچ جائے
چہرے پر تحریر گزرتے لمحوں کی

میں اپنے آئینے کی پیشی میں کھڑی
دیکھ رہی ہوں اپنی اجڑتی صورت کو
میری طرح سے یہ لمحہ ہر عورت پر
آیا ہے یا آئے گا، آئینے کے کڑوے بول کو سننے پر
میری جیسی اک عورت، امیدوں کو مول خرید کے لائی ہے
کریم ملو شکنیں چہرے سے دور رکھو
وقت کے نقش کو نشتر سے تبدیل کرو

اپنے عکس کو دیکھ کے میں یہ سوچتی ہوں
میں خوش قسمت ہوں کہ مرے ہمراہی کو
اپنی پیاری حسن پرست نگاہوں سے، ڈوبتے سورج کے رنگین کرشمے کا
عکس مرے چہرے میں دکھائی دیتا ہے

صفوت علی صفوت

کنٹی کٹ امریکہ

کسی نے کہا ہے کہ "فن کی تخلیق کی طرح فن کی پہچان کا مسئلہ بھی دو اور دو چار کی مانند سیدھا سادا نہیں ہے کافی پیچیدہ ہے۔ ایک ہی عہد میں اس کی پہچان کے زاویے بھی الگ الگ ہوتے ہیں اور عہد بہ عہد بھی ان میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے ادب میں تنقید کی سرپرستی فنکار کے لیے گمراہ کن ہوتی ہے۔ کبیر اور نظیر کی مثالیں ادبی تاریخ کی زندہ شہادتیں ہیں۔

صفوت علی صفوت نے بھی کسی ناقد کی سرپرستی حاصل نہیں کی۔ انہیں اپنے آپ پر اور اپنے فن پر کلی اعتماد ہے۔ اتنا گہرا اعتماد ہی ایسے اشعار کہلواتا ہے۔

غلط ہے یہ کہ پہنچی ہی نہیں آہ و فغاں میری
وہ میرے رنگ میں کہتا ہے خود بن کے زباں میری
یہ آنا اور جانا بیچ کی کاوش یہاں میری
وہ مجھ سے پوچھ کر تقدیر لکھتا ہے وہاں میری

صفوت کے نثری مضامین کی پہلی کتاب "فکرِ فردا" جولائی 1998ء میں شائع ہوئی۔ یہ

مضامین ان کے کالم ہیں اور پاکستان کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ مضامین انتہائی دلچسپ ہی نہیں اس میں کئی تجاویز اور معلومات بھی ہیں اور پاکستان کی بیورو کریسی کے لیے آئینہ بھی ہیں (اگر انہیں آئینہ دیکھنا آتا ہو تو) صفوت علی نیویارک کے ہفت روزہ اردو ٹائمز میں "فکرِ فردا" کے عنوان سے باقاعدہ کالم لکھتے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام "مثنوی وقت" جنوری 1994ء میں شائع ہوا ہے۔ دوسرا مجموعہ "مثنوی رسولؐ" زیرِ طبع ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی زبان میں لکھی گئی کتاب BIOLOGICAL CLOCK TICKING IN ISLAM بھی زیرِ طبع ہے۔

صفوت علی 3 نومبر 1949ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ریڈیو پاکستان لاہور میں ڈرامہ آرٹسٹ کے طور پر کام کیا۔ وہاں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، مصطفیٰ علی ہمدانی اور احمد دین مارہروی جیسے شعراء اور مفکرین سے ملاقاتوں نے ان کے اندر نو عمری سے ہی ادب سے تعلق اور دلچسپی کے جذبات پیدا کر دیے مگر سائنسی تعلیم کے حصول کی وجہ سے یہ شوق پروان نہ چڑھ سکا۔ چنانچہ شعر و سخن کا آغاز ستمبر 92ء سے کیا اور اپنی محنت اور لگن کے بل بوتے پر ترقی کی منزلیں طے کرتے چلے گئے۔

نیویارک کے معروف شاعر اور ماہر لسانیات محترم مامون ایمن صفوت کی کتاب "مثنوی وقت" میں فرماتے ہیں۔

"شمالی امریکا کی اردو ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے ایک نام اچانک ممتاز ہوا ہے۔ یہ نام اپنے بے باک فنی تیور اور مثنوی ایسی مخصوص صنف میں نمایاں کاوش کے باعث اربابِ نقد و نظر کو متوجہ بھی کرتا ہے اور چونکاتا بھی ہے..... یہ نام ہے، صفوت علی المعروف بہ صفوت علی صفوت۔

امریکا کی ایک شمالی مشرقی ریاست، کنے ٹی کٹ، میں رہنے والا جواں سال شاعر، صفوت علی، نیویارک شہر کی مشہور ٹیلی فون کمپنی، بل ایٹلانٹک کے شعبہ مواصلات میں کمپیوٹر کے ماہر کی حیثیت سے ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہے۔

مثنوی وقت، صفوت کی پہلی شعری کاوش ہے۔ کتابی صورت پانے سے پہلے، یہ مثنوی ایک مقتدر اردو رسالے چہار سو، راول پنڈی، پاکستان میں قسطوں میں چھپ کر پاک و ہند اور دیگر اُردو داں ممالک سے اپنا تعارف کرا چکی ہے۔ (ممتاز شاعر، ادیب اور دانشور سیّد ضمیر جعفری صاحب چہار سو کے مدیرِ اعلیٰ تھے اور معروف افسانہ نگار حضرت گل زار جاوید، مدیر)

صفوت کی مثنوی، زندگی اور ماحول کے گرد گھومنے کے باوجود کوئی ذاتی داستان نہیں سناتی۔ اس میں شعری معاملہ بندی تو ہے لیکن ایک نئے زاویے کے ساتھ۔ اس میں نام کا دائرہ، پیام کی راہ ہے۔ اس کے مزاج میں ایک نئی جہت ہے کہ اس کا اسلوب عام روش سے ہٹ کر ہے۔ یہ اسلوب حالی کی آواز سے آواز ملانے کا حق ادا کرتا ہے۔ "مثنوی اصناف سخن میں سب سے زیادہ مفید اور بہ کار آمد صنف ہے۔ "صفوت الفاظ.... "مفید اور بہ کار آمد" کے معانی سے بھی آگاہ ہے اور مفاہیم سے

بھی کہ وہ حال کا شاعر ہے۔ لہٰذا وہ روایت کے ہم راہ چل کر بھی اپنے لیے جدید منزل تلاش کرنے میں کامیاب ہے۔ اس کے تجربات کے خرمن میں پلنے والی ہر چنگاری، شعلے کی ہم سر ہے۔ اس کے عزم میں راہ کی نشان دہی، منزل کی نشان دہی ہے۔ اس کا سوال، جواب کا آئینہ ہے۔ یہ کہیے کہ صفوت صنف مثنوی کا فنی احترام تو کرتا ہے لیکن ابلاغ کے ضمن میں خود کو پابندیوں کا ہدف نہیں بننے دیتا۔ وہ اس صنف میں زندگی اور ماحول کو فرضی قصوں، عشق، تاریخ اور اخلاق کی منازل سے آگے بھی سفر کی دعوت دیتا ہے اور یہ بھی کہیے کہ وہ حُسن شعر کو تخلیق اور تخلیق کو حیات کا محور کہتے ہوئے، فہم کے انسلاکی عناصر میں تمیز اور ترجیح کے درجات متعین کرتا ہے تاکہ انھیں تاویل اور تشکیل سے تول سکے، ماپ سکے، پرکھ سکے، کیوں؟ تاکہ اس کا مستقبل، حیات انسانی کا مستقبل، ماضی سے بہتر ہو۔ بہتری کے لیے دعا بھی درکار ہے اور وسیلہ بھی۔ وسیلہ، علم بھی مانگتا ہے اور ادراک بھی۔ علم اور ادراک باہم نہ ہوں تو وسیلہ بے اثر رہتا ہے۔ مثنوی وقت کا پہلا شعر ہی علم اور ادراک کا آہنگ ہے۔

ہے ازل سے پہلے کا واقعہ جو میں آج نوک زباں کروں
ہے ابد کے بعد کی داستاں جو ابد سے پہلے بیاں کروں

ازل سے پہلے کا واقعہ اور ابد کے بعد کی داستاں وہی بیان کر سکتا ہے جو خود پر اعتماد کر کے رب العزت کو معتمد مانتا ہو، تخلیق اور ارتقاء کی تاریخ جاننے کا متمنی ہو، جو اپنی رگوں میں رسولوں کے خون کی حدّت محسوس کرتا ہو جو بھیڑ میں خود کو تنہا پاتا ہو کہ یہ ژاف نگاہی کی پہلی شرط ہے۔"

اب ہم صفوت سے سخن ور چہارم کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں مگر پہلے ان سے ایک واقعہ سن لیں۔ حضرت کو اپنے وطن پاکستان سے محبت ہے اور جب وہ اپنے وطن کے حوالے سے نازیبا واقعات سنتے ہیں یا اپنے ہم وطنوں کے "بونا قد سلوک" دیکھتے ہیں تو صفوت دنوں اپنا دُکھ نہیں بھول پاتے۔ وہ اس قصے کے حوالے سے ارباب حل و عقد سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ یہ قصہ پاکستان سے واپسی پر پیش آیا۔ کہتے ہیں "امریکا آنے کے لیے کراچی ایئرپورٹ پر رات کے ڈیڑھ بجے پہنچا۔ جہاز تین گھنٹے لیٹ تھا اور نہ جہاز کی اڑان کا اصل وقت رات کے سوا بجے تھا۔ سب سے پہلے تو کسٹم ہوا۔ میں بیس سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک کا سفر کر چکا ہوں۔ آتے جاتے دونوں طرف کسٹم ہوتے نہیں دیکھا مگر ہماری تو دنیا ہی نرالی ہے کوئی قانون، پالیسی اور پریکٹس ایسی نہیں جہاں لوگوں کو تنگ کرنے کا سامان نہ ہو۔ آگے بڑھے تو پی آئی اے کی لائن تھی۔ وہاں ہم سے آگے ایک نوجوان تھا۔ اس کی بدقسمتی کہ وہ پہلی بار امریکا جا رہا تھا مگر اس کے پاس کوئی صندوق چیک کرنے کو نہیں تھا۔ پی آئی اے والے نے سوال کیا کہ پہلی بار امریکہ جا رہے ہو تو اس نے اثبات میں جواب دیا۔ اس پر پی آئی اے

والے نے اس کو غور سے دیکھا اور کہا کہ تمہارے پاس سامان کیوں نہیں ہے اور فوراً ایک اور صاحب کو بلوایا کہ مرغا پھنسا ہے۔ اس کو لائن سے علیحدہ کر دیا۔ بعد میں جہاز چلنے سے پہلے یہ صاحب پھر نظر آئے تو میں نے پوچھا کہ کیا بات تھی کیونکہ ہماری نظر میں زیادہ سامان نہ ہونا کوئی جرم تو نہیں ہے۔ میرے سوال پر اس نوجوان کے آنسو نکل آئے اور کہا کہ پاسپورٹ کنٹرول اور پی آئی اے والوں نے بہت تنگ کیا۔ دھمکی دی کہ تمہارا ویزا جعلی ہے۔ تم نے امریکن ایمبیسی کو رشوت دے کر ویزا حاصل کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایسا لگتا تھا کہ جانے نہ دیں گے۔ مگر میرے تمام کاغذات صحیح تھے ایک گھنٹہ تنگ کرنے کے بعد آنے دیا ہے۔ اس کی داستان سُن کر مجھے بھی دکھ ہوا۔ میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ امریکہ میں اسے کوئی دقت نہ ہوگی۔ اس کے آنسو دیکھ کر مجھے ہمت نہ ہوئی کہ مزید تفصیل پوچھتا۔ مجھے ہمدرد سمجھ کر وہ جوان ہمارے ساتھ ہو لیا اور ہم سب جہاز کی طرف جانے والی لائن میں لگ گئے۔

پُل صراط کے آخری مرحلے میں پہنچے تو سیکورٹی کے عملے نے اس نوجوان سے کہا کہ اپنا پاسپورٹ ہمارے حوالے کر دو اور پی آئی اے کے ملازم کی طرف دیکھ کر کہا کہ یہ سامان کے بغیر ہی امریکہ جا رہا ہے اور پاسپورٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اس موقع پر ہمیں ایک حدیث یاد آئی کہ اگر بُرائی ہوتے دیکھو تو ہاتھ سے روکو اگر یہ نہیں کر سکتے تو زبان سے روکو اور اگر ایسا بھی نہیں کر سکتے تو دل سے بُرا جانو مگر یہ سب سے نچلے درجے کا ایمان ہے لہٰذا ہم نے دھیمے لہجے میں اس تین پھولوں والے "افسر" سے کہا کہ یہ نوجوان میرے ساتھ ہے اور مجھے سب معلوم ہے جو زیادتی اس کے ساتھ ہو رہی ہے۔ انسپکٹر نے ہم پر آواز بلند کی اور کہا کہ ہماری اس سے دشمنی ہے؟ میں نے اتنی ہی بلند آواز میں جب انگریزی میں کہا کہ میں تم سب کی شکایت کروں گا۔ تمہیں یہ جرأت کیسے ہوتی ہے کہ مدد کرنے کے بجائے لوگوں کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرو۔ میرا دل اندر سے دھک دھک کر رہا تھا مگر میری شستہ انگریزی اپنا کام کر گئی۔ اس تین پھولوں والے نے مجھ سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا "سر" آپ اس کو ساتھ لے جائیے اور اس کا پاسپورٹ نیویارک پہنچنے سے پہلے اس کو دیا جائے گا۔ پی آئی اے والے کی مسکراہٹ بھی غائب تھی اور اس نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ میں نے جوان کو اشارہ کیا اور اس کے پیچھے ہو لیا۔

جہاز کے اندر پہنچ کر سینئر افسر کو بلایا اور کہا کہ اس نوجوان کے ساتھ یہ بہت زیادتی ہے اس کا پاسپورٹ فوراً واپس کیا جانا چاہیے۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ اس کا پاسپورٹ نیویارک سے پہلے ہی مل جائے گا۔ آپ سیکورٹی والوں کی لاج رکھ لیجیے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوگا۔ نیویارک پہنچ کر میں نے اس کو پاسپورٹ اور کسٹم کے مراحل میں اپنے ساتھ رکھا وہ شخص امریکی افسروں کے رویے پر حیرت زدہ تھا۔ مجھے اور ان کو بہت سی دعائیں دیتا ہوا رخصت ہوا۔

صفوت کہتے ہیں "اردو مختلف زبانوں کے لیے ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا کی تقریباً ہر

زبان انسانی ہونے کے ناطے دوسری زبانوں سے متاثر ہوتی ہے۔ تاہم اردو کے اندر یہ لچک اپنے عروج پر پہنچی ہوئی ہے۔وہ دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر اس خوبصورتی سے سمو لیتی ہے کہ کچھ ہی دنوں میں دوسری زبانوں کے الفاظ اردو کا ہی حصہ نظر آنے لگتے ہیں۔ اس خاصیت کی بنا پر میں اردو کے مستقبل کے بارے میں بالکل فکر مند نہیں۔"

صنف سخن میں صفوت نے مثنوی کو اپنایا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ "شاعری میں میرا پہلا مجموعہ مثنوی کی صورت میں چھپا ہے۔دوسرا مجموعہ بھی مثنوی کی ہی صورت میں انشاء اللہ جلد ہی قارئین کے سامنے حاضر ہوگا۔ جبکہ عام روش نظم و غزل کی جانب ہے۔ میرے خیال میں جب تک خاطر خواہ ریاض نہ کیا جائے۔ غزل لکھنا بہت مشکل ہے اسی لیے میں خود اس وقت کے انتظار میں ہوں کہ جب میں اپنی دانست میں غزل کے لکھنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ مثنوی میں ہر شعر ایک مطالعے کی صورت ہوتا ہے اور یوں یہ ایک ایسی صنف شاعری ہے جس میں طریقت اور شاعری دونوں ہی شامل ہیں۔ میں نے آزاد نظمیں بھی تحریر کی ہیں مگر ایک آدھ ہی۔ غزل کا نمونہ بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہے مگر میں مطمئن نہیں۔"

سوال نمبر 7 کے جواب میں صفوت نے کہا"ہم آپ کے اس سوال کے مفروضے سے ہی متفق نہیں۔اب کتابیں بھی الیکٹرانک انداز میں چھپنے لگی ہیں۔ اس طریقہ کتب کو انگریزی میں POD یا (Print on Demand) کہتے ہیں۔ کتابوں اور جرائد کی بقا کو اس سے فائدہ ہوگا نقصان نہیں۔ہاں تنقید کے سلسلے میں آپ کے سوال سے میں متفق ہوں۔ میں نے خود ایک آدھ مضمون اس سلسلے میں تحریر کیا ہے۔دیکھئے چہار سو کی دسمبر 1979ء کی اشاعت بعنوان "الفاظ کا سوپ"

Sifwat Ali
14 Woods Row
Monroe, CT. 06468
U.S.A

شہدائے امریکہ کی یاد میں

صفوت علی صفوت

پرانی وضع کی بنتی ہے خاص و عام لاتے ہیں
مئے توحید پینے کے لیے اک جام لاتے ہیں

بصیرت ہو اگر تو پھر وہی اولیٰ کے دن دیکھیں
محمدؐ ابنِ عبداللہ پھر پیغام لاتے ہیں

مساجد بنتی جاتی ہیں، مساجد بھرتی جاتی ہیں
فرشتے مژدۂ قم روز صبح و شام لاتے ہیں

محبت، شوق، دیکھیں، اُستواری ان کے ایماں کی
بدل دیتے ہیں اپنے نام جب اسلام لاتے ہیں

نظر آتے ہیں پھر سے مجتہد پھر فقہ کے بانی
کہ جو قرآن و سنّت سے نئے احکام لاتے ہیں

شہادت مل گئی ان کو جو تھے تبلیغ میں آگے
اُنہیں کے خون سے تحریر یہ ارقام لاتے ہیں

فلک حیراں ہوئے جاتے ہیں شوقِ دیدِ یزداں پر،
کہ یہ عرشِ بریں پر بھی نشستِ بام لاتے ہیں

مشن جاری ہے صفوت تا ابد یہ اپنے مرسلؑ کا
سو تازہ دم مسلماں بہجتِ گل نام لاتے ہیں
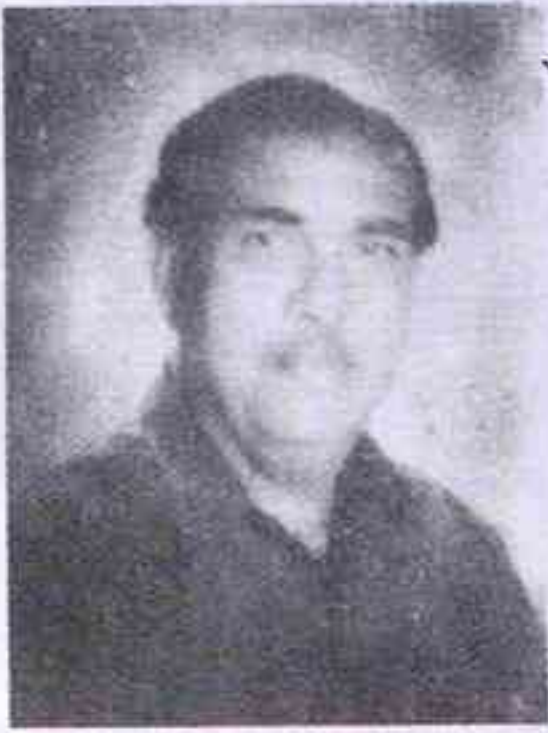
ڈاکٹر صابر آفاقی

مظفر آباد کشمیر

ڈاکٹر صابر آفاقی کا کلام پڑھئے تو ادراک ہوتا ہے کہ یہ ان شاعروں میں سے نہیں ہیں جو الفاظ اور محاوروں سے ریت کے وہ گھروندے تیار کرتے ہیں جن کی بنیاد ہی کمزور ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صابر آفاقی کے کلام میں بجلی کی سی لپک ہے۔ وہ شعر ہی اس وقت کہتے ہیں جب کوئی خیال اپنے اظہار پر ان کو مجبور کرتا ہے۔ پھر انہیں اس کی ضرورت نہیں ہوتی کہ اس خیال کو سخن کا کونسا لباس پہنایا جائے۔ ان کا کلام خود اپنے لیے لباس کا انتخاب کر لیتا ہے چاہے وہ دوہے کا لباس ہو، ماہیے کا پیرہن ہو یا غزل کا سرسراتا لچکتا ملبوس۔

ان کے دوہوں میں زبان کی گھل گھل جانے والی مٹھاس ہے اور الفاظ کا ایسا رچاؤ کہ فکر کی پرتیں اور جہتیں آپ ہی آپ معانی کے دَر وا کرتی چلی جاتی ہیں۔ چند دوہے ملاحظہ ہوں:

ساجن ہے یا بیری ہے اس کی باتیں مبہم
پہلے دل میں چھید کرے، پیچھے رکھے مرہم

کس کی خاطر جاؤں میں گوہاڑی کے گاؤں
کب کی مجھ سے روٹھ گئی ماں کی ٹھنڈی چھاؤں

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کو یتا کہنا چھوڑوں
اک قطرہ بھی نکلے نہیں جتنا ذہن نچوڑوں

پروفیسر ڈاکٹر صابر آفاقی علم و تحقیق اور شعر و ادب کے حوالے سے نہ صرف برِ صغیر پاک و ہند کی معروف و محترم شخصیت ہیں بلکہ آپ کے قدردانوں کا سلسلہ ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔
مارچ 1933ء کو ڈاکٹر صاحب سابقہ ریاست جموں و کشمیر کے ایک چھوٹے سے گاؤں گوہاڑی (مظفر آباد) کے ایک سفید پوش خاندان میں پیدا ہوئے۔ بے حد نامساعد حالات میں تعلیم پائی۔ 1952ء میں محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کرنے کے بعد پرائیوٹ طور پر مزید تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ آزاد کشمیر کے محکمہ تعلیم کی طرف سے ان کے لیے ہمیشہ مشکلات پیدا کی گئیں۔ تاہم آپ نے ہمت نہ ہاری اور فارسی اور اردو میں ایم اے کیا۔ بی ایڈ، منشی فاضل اور مولوی فاضل کی اعلیٰ ڈگریاں لینے کے بعد رخصت بلا تنخواہ پر ایران چلے گئے۔ جہاں سے فارسی زبان و ادبیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ واپس آکر کچھ عرصہ آزاد کشمیر یونیورسٹی میں خدمات انجام دینے کے بعد 16 جنوری 1986ء میں قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔ آپ نے آج کل اپنی زندگی کو تصنیف و تالیف کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے آزاد کشمیر میں علم و ادب کو فروغ دیا اور کئی سماجی کاموں میں بھی مصروف رہے۔ شعر و ادب میں پاکستان کی معروف شخصیات میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کئی زبانوں کے شاعر و ادیب ہیں۔ آپ مجلّات میں سب سے زیادہ چھپنے والے ریاستی شاعر ہیں۔ آپ کی تمیں سے زیادہ تصانیف شائع ہو چکی ہیں اور بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر آفاقی ریاست جموں و کشمیر کے سب سے بڑے کثیر التصانیف اہل قلم ہیں۔
آپ نے کشمیریات پر آدھ درجن سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں اور اس وجہ سے ڈاکٹر جاوید اقبال نے آپ کو محمد دین فوق کے بعد دوسرے "مجدد کشامرہ" کا لقب دیا ہے۔ علاوہ ازیں آپ نے گوجر تاریخ و ادب شاعری اور ثقافت پر بھی بہت کام کیا ہے جس کا اعتراف ریاست کے دونوں حصوں کے گوجر مشاہیر نے کیا ہے، دینی کلچر کے فروغ کے لیے بھی آپ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔
ہندوستان و پاکستان کے کئی نامور اور جید ادیبوں اور اہل قلم نے ان کے فن و شخصیت پر مضامین لکھے ہیں۔ ہندو پاک کے تقریباً تمام جرائد میں ان کے افکار شائع ہوتے رہتے ہیں۔ کئی ممالک کے انہوں نے علمی و مطالعاتی دورے کیے جہاں کی نشر گاہوں نے ان کے انٹرویوز نشر کیے، ان کی شخصیت پر مقالے لکھے اور ڈاکومینٹری فلم بنائی گئی جو خورشید ملت پبلک لائبریری مظفر آباد میں محفوظ ہے۔ انہیں کئی اعزازات سے نوازا گیا ہے۔

ڈاکٹر صابر آفاقی کی مطبوعہ تصانیف درج ذیل ہیں :

(۱) تحقیق :

فارسی

1۔ راج ترنگنی (1974ء)

اردو

2۔ اقبال اور کشمیر (1977ء) 3۔ بشاراتِ ظہور (1985ء) 4۔ نجوم ہدایت (1987ء)
5۔ جلوۂ کشمیر (1988ء) 6۔ برما میں اُردو (1989ء) 7۔ عکسِ کشمیر (1988ء)
8۔ اقبال اور آزادی کشمیر (1992ء) 9۔ خاتونِ عجم (1995ء)۔ 10۔ رشحات ابر (1997ء)۔

پنجابی

12 گوجری ادب (1985ء)

انگریزی

13۔ دلائل قرانی (1993ء)

(2) شاعری :

اردو :

14۔ شہر تمنا (1980ء) 15۔ طلوعِ سحر (1985ء) 16۔ ثنا (1992ء) 17۔ زمزمۂ رُوح (1992ء) 18۔ خندہ ہائے بیجا (مزاحیہ شاعری) (1994ء) 19۔ گلہائے کشمیر (1974ء)
20۔ در جستجو سیارہ ای دیگر (1988ء)

گوجری

21۔ پھل پھیلی (1974ء) 22۔ سانجھو کھلاڑو (1985ء) 23۔ پیغام انقلاب (1997ء)

سفر نامہ

24۔ کثرتِ نظارہ (1994ء)

3۔ ترجمہ اردو میں

25۔ نجم دری (فارسی سے) (1964ء) 26۔ قوسِ زندگی حسین بن منصور حلاج (فارسی سے) (1975ء) 27۔ عہد و میثاق (عربی سے) (1975ء) 28۔ قرۃالعین طاہرہ (فارسی سے) 29۔ تاریخ کشمیر (اسلامی عہد میں) (انگریزی سے) (1988) 30۔ فرمانِ میثاق (فارسی سے) (1993ء) 31۔ سوانح سید علی محمد باب (انگریزی سے) (1997ء) 32۔ قرۃالعین طاہر (انگریزی سے) (1998ء)

زیر ترتیب :

1۔ ظہور مہدی و مسیح -2 دانش شمال (ضرب الامثال) 3۔ پاکستان کے کشمیری الاصل اہل قلم

4۔ نئے موسموں کی بشارت (مجموعۂ کلام) 5۔ سفرنامۂ ایران 6۔ سفرنامہ عرب امارات 7۔ خودنوشت سوانح۔

ڈاکٹر صابر شاعری، تنقید، تاریخ، سفرنامہ، فلسفہ، آثار قدیمہ اور ادیان کی کتابوں کا بصد شوق مطالعہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں "میں خود ساز آدمی ہوں، سیاست دانوں اور سیاست سے نفرت ہے۔ مذہبی تشدد پسندوں سے بھی مجھے بے پناہ نفرت ہے۔"

اردو کے سلسلے میں ان کی رائے میں اردو کا مستقبل تابناک ہے مگر وہ اردو نہیں جو اہلِ لکھنو اور دہلی نے متعارف کروائی۔ اب تو علاقائی زبانوں کے زیرِ اثر ہی اردو ترقی کرے گی۔

ان کے خیال میں غزل، نظم، دوھا اور ماہیا بہتر ہیں۔ نثری نظم نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اسے ہم عمدہ نثر کہتے ہیں، نثری غزل کا تجربہ ناکام رہا ہے۔ مشاعرے شاعری کے فروغ کا بڑا ذریعہ ہیں بشرطیکہ اس میں مخصوص لابی اور گروہ بندی نہ ہو۔ پاکستان کے علاوہ آزاد کشمیر کے شعرا کو بھی بیرون ملک مدعو کرنا چاہیے۔ جنوئن شاعروں کا انتخاب ضروری ہے۔ مزاح گوؤں کے ساتھ ساتھ سنجیدہ شعرا کو نظر میں رکھنا چاہیے۔ ملک کے اندر اور باہر اردو کے فروغ میں مشاعروں کا اہم رول رہا ہے اور رہے گا۔ وہ پاکستانی مبارک باد کے مستحق ہیں جو خطیر رقمیں خرچ کر کے مشاعروں کا اہتمام کرتے ہیں۔

انہوں نے بڑی خوبصورت بات کہی کہ "اردو دان طبقہ سے کہنا ہوگا کہ وہ بچوں کو اردو پڑھنا لکھنا سکھائیں اور بالغ لوگوں میں مطالعہ کتاب کے حلقے قائم کریں۔ کتاب سستی ہو۔ تخلیق کار اور ناشر کے ساتھ ساتھ قاری کو بھی انعامات دیے جائیں۔ گھروں میں اردو لائبریریاں قائم کی جائیں۔ مفت خوری کی عادت چھوڑ کر لوگ ادبی جرائد کا خریدار بنیں۔

تنقید کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے "کل تک تنقید تنقیص و تحسین نہیں تھی۔ تنقید تخلیق کار کی رہنمائی کرتی تھی مگر آج صورتِ حال مختلف ہے۔ آج نہ کوئی بڑا نقاد رہا اور نہ تنقیدی روایات برقرار رہیں۔ آج دوست تحسین و آفرین کے علاوہ کچھ نہیں لکھتا اور مخالف تنقیص و توہین کے علاوہ کچھ نہیں جانتا۔ غیر جانب دار شفیق، کھرا نقاد کہاں رہا!

P.O.Box # 9, Muzaffarabad (A.K) 13100
Pakistan- Phone:092 - 0581 - 3159

انتخابِ کلام

صابر آفاقی

غزل (نذر غالب)

یوں شہر میں ہے پرچمِ جور و جفا بلند
سر پر ہر اک شخص کے ہے ایک عصا بلند

خلقِ خدا کے بس میں نہیں، پست کر سکے
رکھتا ہے جس کو دہر میں میرا خدا بلند

ٹیلوں کو دیکھنے میں جھکانی پڑی نظر
ہوتا کوئی پہاڑ تو میں دیکھتا بلند

میں نام بھی نہ لوں گا کبھی اُس سماج کا
انسان جس میں پست رہا، دیوتا بلند

بازو گرے جو کٹ کے مصافِ نبرد میں
دانتوں میں تھام لوں گا علَمِ وفا بلند

گو آج دب رہا ہے مرا حرفِ مدعا
ہونے کو ایک روز ہے میری صدا بلند

دونوں جہاں کے شاہ سے ہے التجا کہ ہو
دونوں جہاں میں مرتبۂ آشنا بلند

اپنے قبولنے میں تردّد زمیں کو ہے
اور آسماں رہا، سو وہ نارسا، بلند

یا رب ہمیشہ لشکرِ اخلاص کی ہو جیت
یا رب نہ ہو جہان میں نامِ ریا بلند

صابرؔ کو ہے یقیں کہ دعا مستجاب ہے
کرتا نہیں ہے اس لیے دستِ دعا بلند

وہ سارے رنگ و گُل کو خدا نے بخشے ہیں
انہیں نے مل کے بہاراں کا رنگ دھارا ہے
ضیاء نے کی ہے شب و روز خدمتِ اُردو
ضیاء جہانِ ادب کا یہی اک ستارا ہے
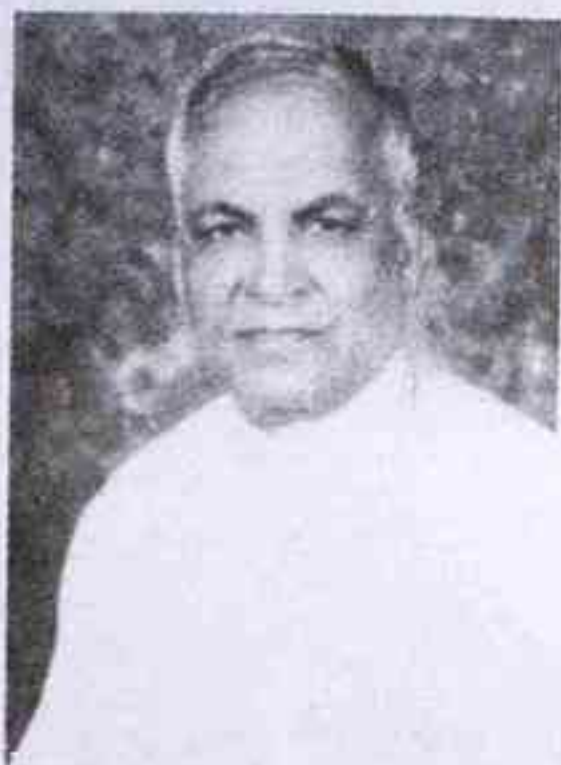
ضیاء جلالپوری
(لندن)
28/9/1999

ضیاء جلال پوری

لندن

نذیر احمد بٹ اپنے بارے میں بتا رہے تھے کہ ان کا تخلص ضیاء جلال پوری ہے۔ ان کی پیدائش الہ آباد ہندوستان کی ہے۔ تعلیم منشی فاضل تک حاصل کی۔ ناساز گار حالات کی وجہ سے گریجویٹ نہ ہو سکے۔ درجہ سوم تک تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فری یونین اسکول میں حاصل کی۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں 1947ء میں والد صاحب کے ساتھ پنجاب آئے اور قتل و غارت گری کے سبب واپس نہ جا سکے۔ بقیہ تعلیم میٹرک تک اسلامیہ ہائی اسکول جلال پور جٹاں ضلع گجرات میں مکمل کی۔ منشی فاضل، ایف اے۔ بی اے کے امتحان میں دو دفعہ بیٹھے مگر یہ ہمارے ملک کے طالب علموں کی بد قسمتی تھی کہ پرچوں کے آؤٹ ہونے کے سبب امتحانات ملتوی ہوتے رہے چونکہ ضیاء ملازمت میں تھے اس لیے دوبارہ امتحان میں بیٹھنے کا موقع نہ مل سکا۔

ضیاء کسی خاص مکتبۂ فکر کے حلقے سے وابستہ نہیں ہیں۔ نثر نگاری سے بھی دلچسپی ہے بچپن میں سیف الملوک اور اقبال کا کلام پڑھتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ دیگر شعراء کا کلام پڑھنے کو ملا۔ یہ 52-1951 کی بات ہے۔ جب ضیاء ساتویں میں آٹھویں جماعت میں تھے۔

ان کا کلام جنگ لندن، نیشن لندن، منشور کراچی، راوی بریڈ فورڈ اور جذبہ گجرات کے علاوہ

دیگر رسالوں میں بھی شائع ہوتا ہے۔ ان کی تخلیقات یہ ہیں :شب تار۔ حبِ وطن۔ جھلکیاں۔ ہوائے تازہ۔ کچھ کچھ ہوتا ہے۔ اور 2000ء میں چھپنے والی کتاب۔ بہت کچھ ہوتا ہے۔ سب کچھ ہوتا ہے۔ اور کلیات ضیاء جلال پوری۔ شاعری سے متعلق پاکستان کی سیاست اور سیاستدانوں کے حالات وواقعات پر مبنی کتابیں ان کے مطالعہ میں رہتی ہیں۔

1955ء سے 1965ء تک محکمہ بجلی میں ملازم رہے جہاں راشی افراد سے ہمیشہ جنگ جاری رہتی تھی۔ اسی سبب 1965ء کی جنگ کے دوران ان کا قصور میں ٹرانسفر کر دیا گیا۔ اس محکمہ میں قلیل تعداد میں نیک لوگ تھے Operation سائڈ میں تو نیک افراد کا ہونا مشکل تھا۔ کہتے ہیں "لائن مین سے لے کر اوپر تک رشوت چلتی تھی۔ اب تو پورے کا پورا نظام درہم برہم ہے۔ فوج کے باوجود رشوت کا طریقہ کار بدل دیا گیا ہے کیونکہ پیسے نہ دیے جائیں تو طرح طرح کی رکاوٹیں ہیں۔ اس محکمہ کو چھوڑا تو کویت بھائی کے پاس چلا گیا اور وہاں سے سیدھا لندن پہنچ گیا۔ "اردو کی بقاء کے لیے ان کا مشورہ ہے کہ والدین بچوں کو گھر میں اردو سکھائیں۔ ان کے ساتھ اردو میں گفتگو کریں ورنہ جتنی اردو آج ہم جانتے ہیں ہمارے بچے اتنی اردو سے بھی واقف نہ ہوں گے۔

ان کا کہنا ہے "اظہار خیال کے لیے نظم بہتر ہے۔ نثری غزل کے لیے عرض ہے کہ میں اسے باقاعدہ اور باضابطہ شاعری کے خلاف ایک سازش سمجھتا ہوں کیونکہ مروّجہ شاعری کے تسلیم شدہ نام نثر کی شاعری میں استعمال نہیں کرنا چاہئیں۔ اس میں دیگر نئے نام ہوں۔ مشاعرے شاعروں کے حق میں نہیں کیونکہ وہ اپنی تخلیقات پیش نہیں کر سکتے۔ اکثر اوقات اچھے شعراء کو صرف تین یا چار اشعار پڑھنے پر پابند کر دیا جاتا ہے جن کا تخلیقی عمل پر غور وخوض کا رجحان ختم ہو جاتا ہے۔ تخلیقی نشستیں بہتر کردار ادا کر سکتی ہیں۔

حق بات لکھنے والے بہت کم رہ گئے ہیں۔ تنقیدی نشستیں شعر اور شاعرات کے مفاد میں نہیں کیونکہ بے شمار شعرا وشاعرات بنی بنائی تخلیقات لے لیتے ہیں یا اصلاح لیتے ہوں تو استاد کا نام ظاہر کرنے سے قاصر یا پھر چوری کے اشعار پڑھنا تو کہیں نہیں گیا۔ تنقیدی نشستوں میں تو برداشت، تحمل مزاجی اور وسعت القلبی کی ضرورت ہوتی ہے۔ برطانیہ میں اچھے اچھے شعرا وشاعرات ہیں مگر تنقیدی نشستوں کا اجراء ممکن نہیں کیونکہ گروہ بندی کبھی بھی ختم نہیں ہو سکتی۔ جو کہ مخصوص لوگوں کے سبب موجود ہے اور اردو ادب کے لیے خطرہ ہے۔ جو اپنی ذاتی تشہیر پر نظر جمائے بیٹھے ہیں اور جمع تفریق کا عمل جاری رکھے ہوئے ہیں اور اسی سبب اردو ادب میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے۔ ہر مسلمان بچے بچیوں کی قرآن کی تعلیم دلوائی جائے تو اس کے بعد اردو کی طرف رغبت سہل اور جلدی ہوتی ہے۔ نیز ادبی تنظیموں کو چاہئے کہ نئی نسل کے بچوں کو اردو پڑھنے کی طرف راغب کریں۔ اسلامک سینٹر میں اردو کی کلاسوں کا اجراء کیا جائے۔

NAZIR ZIA JALAL PURI
109- Millais Road ,Leytonstone,London E11-4EZ U.K

انتخابِ کلام

ضیاء جلال پوری

آرزوئے دل

میرے جذبوں کو پھر ذوقِ یقیں دے
محبت کی وفاؤں کا امیں دے

دکھا وہ راستہ جو بے خطر ہو
جہاں امن و سکوں ہو وہ زمین دے

تکبر سے نہ ہو کوئی تعلق
جھکے جو تیرے در پر وہ جبیں دے

کدورت سے دلوں کو پاک کر دے
ترا جو ہے پسندیدہ وہ دیں دے

عطا کر مجھ کو لطفِ بے نیازی
مجھے اسلاف کا صدق و یقیں دے

میرا دل واقفِ طرزِ کہن کر
مجھے اب تو دلِ گوشہ نشیں دے

شریکِ غم بنے جو دوسروں کا
میرے دل کو تو اب ایسا مکیں دے

نشہ جس کا رہے تا حشر قائم
مجھے ایسی شراب انگبیں دے

ضیاء کو بھی ادب سے بہرہ ور کر
اسے بھی علم کا خوابِ حسیں دے

یہ جو لمحے باقی ہیں عمر کے انہیں وقفِ حمدِ خدا کروں
اسی جستجو میں اجل ملے اسی آرزو میں جیا کروں

طاہر سلطانی
۲۳ مارچ ۲۰۰۵ء

طاہر سلطانی

کراچی

طاہر حسین کا ادبی نام طاہر سلطانی اور تخلص طاہرؔ ہے۔ فروری 1954ء کو شہر اٹاوہ۔ یوپی، بھارت میں پیدا ہوئے۔ ناگزیر وجوہ کی بنا پر اعلیٰ تعلیم سے محروم رہے۔

اصنافِ شاعری میں حمد و نعت کی طرف زیادہ میلان ہے۔ کچھ حضرات حمد و نعت کو صنفِ شاعری تسلیم نہیں کرتے ہیں، مگر طاہر کہتے ہیں حمد و نعت کو بہترین شاعری سے کسی طرح بھی خارج نہیں کیا جاسکتا اور پھر میرا تو مسلک یہ ہے کہ ......"

"حمد و نعت نہ صرف صنفِ سخن ہے بلکہ عبادت ہے۔" اب میرا یہی مشن ہے کہ زندگی کی آخری سانس تک حمد کا پرچم اٹھائے ہوئے فروغِ حمد و نعت کے لیے کوشاں رہوں، اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کے صدقے میں میری مدد فرمائے آمین۔

مجھے شاعری کی تمام سنجیدہ اصناف سے دلچسپی ہے مگر، میں شاعری کے اُس مکتبہ فکر سے متاثر ہوں جس نے حمد و نعت کو اپنا وظیفہ حیات بنالیا ہے، میرا قطعی اور کوئی تعلق ایسے حمد نعت گو شعراء اور نعت خوانوں سے نہیں جنھوں نے اپنے فن کو جسے میں عبادت سمجھتا ہوں، تجارت بنالیا ہے۔

میرا پہلا مجموعہ حمد و نعت "مدینے کی مہک" 1989ء میں منظر عام پر آیا، "نعت میری زندگی"

دوسرا مجموعہ حمد و نعت کا ہے جو، 1997ء میں شائع ہوا۔ نعت میری زندگی، کو خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔ میرا تیسرا شعری مجموعہ زیرِ طبع ہے جو حمدیہ کلام سے مزین ہے۔ اس مجموعے کا نام میں نے تجویز کیا ہے "حمد میری بندگی" انشاء اللہ میرا یہ مجموعہ جلد ہی منظرِ عام پر آئے گا۔ اس کے علاوہ "خزینۂ حمد" میں نے 1996ء میں مرتب کیا۔ اس میں چودہ سو سال کے دوران کہی گئی حمدوں کا انتخاب ہے۔ چار سو چار، شعراء و شاعرات کے حمدیہ کلام کا یہ ایک جامع اور نادر انتخاب ہے جو دس مختلف زبانوں میں، اردو ترجمے کے ساتھ موجود ہے۔

"اذانِ دیر" کے عنوان سے غیر مسلم شعراء کا اوّلین حمدیہ انتخاب بھی میں نے کیا ہے جو 1997ء میں شائع ہو کر پذیرائی حاصل کر چکا۔ "جہانِ حمد" کے نام سے اردو میں حمد کے موضوع پر اوّلین کتابی سلسلہ میں نے شروع کیا ہے۔ اب تک تین شمارے شائع ہو کر اہلِ علم و ادب سے پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ "جہانِ حمد" کا چوتھا شمارہ خواتین نمبر ہو گا یہ شمارہ مارچ 2000ء میں شائع ہو رہا ہے۔

"جہانِ حمد" موضوعی رسالہ ہے عصرِ حاضر میں اس قسم کے رسالوں کو شائع کرنا بہت مشکل بلکہ مشکل ترین مسئلہ ہے۔ "حریم ناز میں صدائے اللہ اکبر" کے عنوان سے 99 شاعرات کے حمدیہ کلام پر مشتمل "شاعرات کے کوائف کے ساتھ" یہ حمدیہ انتخاب اپنی نوعیت کا نقشِ اوّل ہے جو 1999ء میں، میں نے شائع کیا۔ "خزینہ حمد و نعت دوسرا حصہ اور ہر سانس پکارے صلِ علیٰ" (مجموعہ نعت) زیرِ طبع ہیں۔

میری زندگی کا اہم واقعہ ماہِ ربیع الاوّل 1998ء کی بارہویں شب کو پیش آیا۔ میں آرام باغ کی جامع مسجد میں منعقدہ محفلِ حمد و نعت میں شریک تھا۔ اپنی باری آنے پر میں بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں ہدیہ نعت پیش کر رہا تھا۔ اُسی دوران میرے کرم فرما محمد ابراہیم صاحب نے میرے لیے عمرہ کے ٹکٹ کا اعلان فرمایا۔ اس پر مسرت موقع پر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں نے اللہ تبارک تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ میری دیرینہ تمنا پوری ہوئی۔ میری زندگی کے اہم لمحات وہ تھے جب مجھ گنہگار کی پہلی حاضری حرم شریف اور روضۂ رسول اکرم میں ہوئی یہ غالباً 13 اگست اور 21 اگست 1998ء کی بات ہے۔ اب یہ خواہش ہے کہ والدہ ماجدہ جو اس وقت تقریباً 95 برس کی ہیں اور اپنی شریکِ حیات کے ہمراہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کروں۔

یہ جو لمحے باقی ہیں عمر کے انہیں وقفِ حمدِ خدا کروں
اسی جستجو میں اجل ملے اسی آرزو میں جیا کروں

اردو زبان لفظ و بیاں کا کشادہ دامن رکھتی ہے، کئی زبانوں کا ذائقہ اس میں موجود ہے اور مجھے یقین ہے کہ اردو جلد ہی دنیا کی اوّلین زبان بن جائے گی۔ آپ جیسی ہستیاں بیرون ملک اردو زبان و ادب کی بھرپور سفارت کار ہوں تو اردو کی ہمہ گیر مقبولیت میں کیا شک رہ جاتا ہے۔

سوال نمبر 5 کا جواب ہے کہ شعراء و شاعرات کو صنفِ حمد و نعت میں شاعری کرنی چاہئے۔

شاعری کا مرکزی خیال صرف اور صرف اللہ تبارک تعالیٰ اور حضرت محمد مصطفیٰ ؐ کی ذات گرامی ہونی چاہیئے۔ یہی اللہ رب العزت کا حکم ہے یہی فرمان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ یہی ہماری منزل ہے۔ یہی ہماری نجات کا راستہ ہے۔ یاد رکھیئے حمد و نعت سب سے بہترین صنف ہے، اگر کوئی شخص حمد و نعت کو صنف تسلیم نہیں کرتا ہے تو ہم اس کی عقل پر ماتم ہی کر سکتے ہیں۔

جی ہاں آج ادب کے نام پر جتنی بے ادبی ہو رہی ہے اس کی مثال نہیں ملتی ہے۔ مجھے غالب کا وہ شعر یاد آ رہا ہے

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

حقیقت تو یہی ہے کہ آج ہم صرف زبانی گفتگو تک محدود ہیں، منافقت آخری حدود کو چھو رہی ہے، جھوٹ قدم قوم پر بولا جا رہا ہے، اگر ادب اسی کو کہتے ہیں تو پھر مجھے کہنے دیجئے کہ قاری کا ادب سے رشتہ مزید کمزور ہو گا اس لیے کہ منافقت اور جھوٹ ایسی بیماریاں ہیں جو ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑیں گی، حد تو یہ ہے کہ اسی شہر قائد میں ایسی ادبی شخصیات بھی ہیں جو ہیرا پھیری میں ملوث ہیں۔ میرا نکتۂ نظر یہ ہے کہ ہمارا ادب صرف زبانی، کلامی اور تحریری اہمیت نہیں رکھتا بلکہ یہ تو وہ گنجینۂ معنی ہے کہ ہماری عملی زندگی میں اس کا زیادہ سے زیادہ انجذاب وانعکاس ہونا چاہیے۔

محترمہ سلطانہ مہر صاحبہ! سوچنے کی بات یہ ہے کہ آج ہم مغرب کی طرف کیوں دیکھ رہے ہیں، جب کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ اہلِ مغرب، اہلِ اسلام کی جانب دیکھا کرتے تھے بلکہ اہلِ مغرب نے اہل اسلام سے ہی علم وفنون حاصل کیے۔ آج ہم ادب ہی کیا ہر معاملے میں اہلِ مغرب کے محکوم نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ میری نظر میں صرف اور صرف اتنی سی ہے کہ

"ہم نے قران وسنت پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے" ـــ میرا ایمان ہے کہ آج بھی مسلمان اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑلیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر عمل پیرا ہو جائیں تو ہم اللہ کے فضل وکرم سے مغرب سے آگے اور بہت آگے جا سکتے ہیں، بقول علامہ اقبالؒ

کی محمدؐ سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

تو جناب عرض ہے کہ آپ حضرات اپنی فکر اور اپنے قلم کو توصیفِ ربِ تعالیٰ مدحتِ رسول اکرمؐ اور خدمت خلق کے لیے وقف کردیں پھر دیکھئے آپ کامیابی کی کن منزلوں کو چھو لیتے ہیں۔

TAHIR SULTANI
26/38 B,1 AREA
LIAQATABAD, KARACHI, PAKISTAN. Ph: 49223701

انتخابِ کلام

طاہر سلطانی

بلندیوں سے یوں آقائے دو جہاںؐ گزرے
کہ ان کے نقشِ کفِ پا سے آسماں گزرے

مہک رہے ہیں وہ رستے وہ کوچہ و بازار
جہاں جہاں سے کبھی شاہِ مرسلاںؐ گزرے

درِ حضورؐ پہ اس حال میں ہیں دیوانے
کہ جیسے ان پہ کوئی وقتِ امتحاں گزرے

خدا کا قرب ملے اس کو یہ ہے ناممکن
جسے وسیلۂ شاہِ اُمم گراں گزرے

دعا یہی ہے مری کائنات کے مالک
یہ زندگی رہِ طیبہ کے درمیاں گزرے

یہ فیضِ نعت ہے طاہرؔ کہ فکرِ مدحت میں
دیارِ شوق سے لفظوں کے کارواں گزرے

تجھ میں ہم نے دیکھا ہے آر پار کا منظر
ورنہ خود شناسی کے اور بھی وسیلے تھے

ظفر گورکھپوری

۱۱ جنوری ۹۶ء

ظفر گورکھپوری

بمبئی

ظفر گورکھپوری کو میں نے جب بھی پڑھا یوں لگا سچی شاعری پڑھ لی۔ اپنے دوہوں میں بھی ظفر نے ہمیشہ اہتمام کیا ہے اور ایک نیا خیال یوں باندھا ہے کہ جانو کبیر کو زندہ کر دیا۔ یہ دوہا ملاحظہ ہو

یہ ہوتا نہ شریر میں کب کے جاتے ٹوٹ
ماں کا دودھ ہی ستیہ ہے باقی سب کچھ جھوٹ
ساجن کو جلدی سکھی، من ہے کہ امڑا آئے
کانٹا سمے کے پاؤں میں کاش کوئی چبھ جائے

مجھے جب پتہ چلا (اور بہت دیر میں پتہ چلا) کہ ظفر بمبئی میں رہتے ہیں تو میں نے انہیں خط لکھا۔ سوال نامہ بھیجا۔ انہوں نے فوراً جواب بھی دیا۔

ظفر صاحب کی طبیعت ٹھیک نہ تھی مگر انہوں نے کمال مہربانی سے کام لیتے ہوئے سارے سوالوں کے نہ صرف تفصیلی جواب دیے بلکہ اپنے بارے میں بھی بہت کچھ بتایا۔ آپ کو بھی یقیناً اس صدی کے اس بڑے شاعر سے مل کر خوشی ہوگی۔

انہوں نے مجھے لکھا۔

"میرا پورا نام ظفر الدین ہے تخلص ظفر ہے۔ 5 مئی 1935ء کو ضلع گورکھ پور کی ایک تحصیل بانس گاؤں (Bansgaon) کے ایک دیہات بیدولی بابو (Baiduli Baboo) میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں مولوی عیدو سے حاصل کی۔ میرا خاندان "جلاہا" خاندان ہے جسے انصاری بھی کہا جاتا ہے۔ کرگھے پر کپڑا بن کر دور دور تک گاؤں کے ہفتہ واری بازاروں میں بیچنا میرے اجداد کا پیشہ تھا۔ تھوڑی سی زمین تھی جس سے سال میں گیہوں اور دھان کی دو فصلیں اگائی جاتی تھیں۔ غلہ اتنا نہیں ملتا تھا کہ کنبے کی ضرورت پوری ہو سکے۔ کپڑوں کے بیوپار میں بھی کوئی خاص منافع نہیں ہوتا تھا للذا مجبوراً 28ء کے آس پاس میرے والد صاحب تلاش معاش میں گاؤں سے بمبئی آگئے۔ یہاں وہ ٹیکسٹائل انڈسٹری میں بنکر (Wearver) کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ 44ء میں والد صاحب نے مجھے بہتر تعلیم کے لیے والدہ کے ہمراہ بمبئی بلالیا۔ پرائمری تعلیم انجمن تبلیغ الاسلام کرلا (بمبئی) میں ہوئی۔ ثانوی تعلیم انجمن اسلام ہائی اسکول کرلا (بمبئی) میں ہوئی۔ آٹھویں جماعت ہی سے طبیعت شعر و ادب کی طرف مائل ہو گئی۔ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے والدین کی معاشی مشکلات کے سبب تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن بعد میں، میں نے اپنے طور پر، اپنی جدوجہد سے بساط بھر تعلیم حاصل کی۔ میٹرک کیا، انٹر میڈیٹ کیا۔ بی اے سال اول کیا اس کے بعد آگے پڑھنے کی سکت نہیں رہی کہ بہت نو عمری ہی میں کنبے کی کفالت کا بار سر پر آگیا۔ شادی 54ء میں گاؤں کی ایک لڑکی کتاب النساء سے ہوئی۔ پھر اس کے بعد بچے بھی پیدا ہوئے۔ اس طرح زندگی مسائل اور مشکلات کی اسیر ہوتی چلی گئی لیکن ہمت نہیں ہارا، اکیلے ہی ساری مہابھارت پورے حوصلے کے ساتھ لڑتا رہا۔ مشق سخن اور چکی کی مشقت دونوں ساتھ رہے۔ میں نے دونوں کو نبھایا۔ شاعری کو ذریعہ معاش نہیں بنا سکا۔ اس کی صلاحیت بھی شاید مجھ میں نہیں تھی۔ اس لیے معاش کے حصول کے لیے بمبئی میونسپل کارپوریشن کے محکمہ تعلیم میں 37 برسوں تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیے اور یکم جولائی 93ء کو ریٹائر ہو گیا۔ پڑھنا لکھنا اب تک جاری ہے اور مرتے دم تک جاری رہے گا۔ انشاء اللہ۔

اللہ نے ایک لڑکی اور سات لڑکے دیے۔ تین اس نے واپس لے لیے۔ بڑا لڑکا جاوید اختر 23 سال کی عمر میں جب وہ بی اے کے سال آخر میں تھا "یرقان" کے عارضے کا شکار ہو کر داغِ مفارقت دے گیا۔ میرا ایک شعری مجموعہ 'چراغِ چشمِ تر' (1990ء) اسی جواں مرگ بیٹے کی یادوں سے منسوب ہے۔ بمبئی میں فلم انڈسٹری ہے اس لیے یہ شاعروں کے لیے بہت پرکشش ہے۔ نہ جانے کتنے شعرا اس شہرت میں گیت لکھنے کے مقصد سے آئے۔ شکیل، مجروح، ساحر، کیفی، جاں نثار اختر، سبھی نے بمبئی کو اپنا مسکن بنایا اور نغمہ نگاری کو اپنا ذریعہ معاش، میرا مزاج کاروباری نہیں تھا اس لیے میں فلموں کے کاروباری تقاضوں پر پورا نہیں اتر سکا۔ تاہم کچھ فلموں کے گیت لکھے وہ گیت ہٹ بھی ہوئے۔ گیت کار کی حیثیت سے مقام بن سکتا تھا لیکن فلموں کی گلیمر

بھری دنیا کے نقلی شب و روز میں جی نہیں لگا۔ گھر لوٹ آیا کہ کہیں اس چکر میں شاعری سے نہ ہاتھ دھو بیٹھوں۔ اس وقت عمر کا 65واں سال چل رہا ہے۔

میں نے کئی فلموں کے گیت بھی لکھے جیسے شمع، بازیگر، خوددار، ہلچل، گنگا کی بیٹی، غنڈہ راج، ایک موسم چھوٹا سا، کھلونا، ظالم، دوری، پتلی بائی، نور الٰہی، قسمت کی ریکھا وغیرہ وغیرہ۔

طلعت محمود، سی ایچ آغا، جگجیت سنگھ اور پنکج ادھاس نے گائے۔ میں نے درجنوں غزل سنگروں کے لیے غزلیں تخلیق کیں۔ ان کے آڈیو کیسٹ تیار کیے گئے غزلوں اور نظموں کے چند البم کے نام ہیں، نایاب، سجدہ، Hope، رباعی Stolen moments، خیال، تین موسم، شگفتہ آفرین، امن اور۔

میں نے کامیاب ڈرامے بھی لکھے مثلاً عقل حیران پریشان، سمراٹ اشوک، ایک تھا کنکر ایک تھا موتی، ہماری پرچھائیاں، دو بھائی، دھرتی چاند ستاروں کی، نیا انصاف۔

میری کتابوں میں میرے مجموعۂ کلام تیشہ، وادیٔ سنگ، گھوکھرو کے پھول، چراغ چشم تر، آرپار کا منظر، ناچ ری گڑیا، (بچوں کے لیے نظمیں) خواب بجے ہیں اور سچائیاں شامل ہیں۔

کئی مجموعے زیر طبع ہیں اور کلیات و خودنوشت کی اشاعت زیرِ غور ہے۔

حکومتِ مہاراشٹر نے پرائمری اور سیکنڈری سطح کی نصابی کتب میں میری تخلیقات شامل کی ہیں اور ان رسالوں نے خصوصی اشاعتیں شائع کیں۔ 1۔ "توازن" (مالیگاؤں) کا گوشہ ظفر گورکھپوری اپریل 92ء 2۔ سہ ماہی "انتساب" سیرونج (مدھیہ پردیش)۔ سرونج (مدھیہ پردیش) کی اسکالر رفیعہ بیگم صدیقی، برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال سے میری شخصیت اور فن پر پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ رقم کر رہی ہیں ان کے نگراں ڈاکٹر محمد نعمان (صدر شعبہ اردو سیفیہ کالج بھوپال) ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی مختلف ریاستی اردو اکاڈمیوں سے میری کئی کتب پر انعامات ملے ہیں ان میں مہاراشٹر اردو اکاڈمی کا ریاستی انعام 93-1992ء۔ میر اکاڈمی لکھنو کی جانب سے "امتیاز زبیر" ایوارڈ (1992ء)۔ فراق سمان 1996ء اور یوا چیتنا گورکھپور کی جانب سے 1996ء میں

حکومت مہاراشٹر کی جانب سے مجموعی ادبی خدمات پر 1978ء میں اسپیشل ایگزیکیٹو مجسٹریٹ کا اعزاز بھی ملا ہے۔

اچھا ظفر صاحب اپنی زندگی کا کوئی دلچسپ واقعہ سنائیے۔" میں نے پوچھا۔ کہنے لگے "میری زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ یوں ہے کہ 53ء میں بمبئی میں ہونے والے "یوم اقبال" کے مشاعرے میں اپنے دوست علامہ درپن کے اصرار پر ترنم سے کلام سنانے مائک پر آگیا۔ ہر شعر، بلکہ ہر مصرعہ الگ الگ سروں اور ٹیون میں ادا ہونے لگا۔ لوگ ہنس رہے تھے، کچھ ہوٹ بھی کر رہے تھے اور میں اپنا راگ الاپے جا رہا تھا۔ جب غزل کے مقطع پر آیا تو ترنم تحت بن چکا تھا۔ پورا مقطع تحت میں پڑھا، جانتا تھا کہ لوگ بدمزہ ہوں گے لیکن بات اپنے سے ضد کی تھی۔ ترنم میں پڑھنے کا تجربہ کرنا تھا۔

بڑی شرمندگی ہوئی۔

اس محفل میں، سرور، کیفی، بیدی، جاں نثار، ساحر سبھی شریک تھے سبھی کے ہونٹوں پہ ہنسی تھی۔ مشاعرے کے اختتام پر کیفی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "اور ترنم میں پڑھو گے؟" میں نے کہا نہیں میرے جواب پر سب ہنس پڑے۔ سب سے زیادہ درپن ہنسے جنھوں مجھے ترنم سے پڑھنے پر اکسایا تھا۔

اس واقعہ کے بعد آج تک کبھی ترنم کا نام نہیں لیا۔"

دوسرا واقعہ : 1963ء کی بات ہے بمبئی کے رنگ بھون میں کبیر ڈے کے سلسلے میں ایک عظیم الشان مشاعرہ سردار جعفری کے اہتمام سے ہو رہا تھا۔ اسٹیج پر فراق، کنور مہندر سنگھ سحر، ساحر، کیفی، مجروح، شکیل اور دوسرے شعراء کے ساتھ صفِ اوّل میں شہنشاہِ جذبات دلیپ کمار اپنی دو ہیروئنوں مینا کماری اور نمی کے ساتھ موجود تھے۔ شعرا اور فلمی ستاروں کی ایک ساتھ موجودگی نے مشاعرہ کو خاصا دلچسپ بنا دیا تھا۔ دلیپ کمار نے اس مشاعرے میں نظیر اکبر آبادی کی نظم "تربوز" ترنم سے سنائی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میرا پہلا مجموعہ کلام "تیشہ" شائع ہو کر کافی مقبول ہو چکا تھا اور مجھے بڑے مشاعروں میں مواقع ملنے لگے تھے۔ میں نے اپنی غزل حسبِ عادت تحت میں سنائی۔

بہت داد ملی، اسٹیج سے بھی اور سامعین کی صفوں سے بھی۔ دوسرے دن بمبئی کے روزنامہ انقلاب میں مشاعرے کی رپورٹ شائع ہوئی تھی۔ رپورٹ میں ایک ذیلی سرخی "لڑکا شاعر" کے تحت یہ تحریر شائع ہوئی تھی کہ جب ظفر گورکھپوری مائک پر اپنی غزل سنا رہے تھے اور وہ جب اس شعر پر پہنچے۔

جب تلک خونِ دل رنگ بھرتا نہیں، کوئی پہلو جنوں کا نکھرتا نہیں
قتل گاہوں سے جب تک گزرتا نہیں شوق ہوتا نہیں سرخرو دوستو

فراق صاحب نے بے ساختہ یہ کہتے ہوئے داد دی "یہ لڑکا بڑا شاعر بنے گا۔" ہوا یوں کہ مشاعرے میں انقلاب کے ایڈیٹر خلش جعفری فراق صاحب کے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے میرے بارے میں فراق کا ریمارک سن لیا اور دوسرے دن اسے مشاعرے کی رپورٹ میں شامل کر کے شائع کر دیا۔ انقلاب کی رپورٹ میں جب میں نے اپنے بارے میں فراق صاحب کا ریمارک پڑھا تو یوں لگا جیسے مجھے کوئی بہت ہی بڑا انعام مل گیا ہو۔ میری تو کایا ہی پلٹ گئی۔ میں نے اسی دن اپنے آپ سے یہ عہد کیا کہ فراق کی توقع پر پورا اترنے کی پوری کوشش کروں گا۔

آج دنیا کے کونے کونے میں اردو پڑھی اور بولی جا رہی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ برصغیر کے باہر یورپ، امریکہ اور افریقہ تک ہر جگہ اردو بولنے پڑھنے اور سمجھنے والوں کے حلقے بن گئے ہیں۔ بالخصوص اردو شاعری کے پرستاروں کی تعداد بے شمار ہے۔ مشاعرے ہو رہے ہیں، سیمینار اور کانفرنسیں ہو رہی ہیں۔ بعض ملکوں کی یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے بھی قائم ہیں۔ بے شک یہ

سب جان کر، دیکھ کر بہت اچھا لگتا ہے لیکن مشاعرے، سیمینار اور آئے دن کی کانفرنسیں اردو کی بقا اور اس کے بنیادی مسائل کا حل نہیں ہیں۔ مجھے یہ ساری سرگرمیاں میلے کی سرگرمیوں جیسی لگتی ہیں دور دور سے لوگوں کا کسی ایک ملک یا شہر میں جمع ہونا، ملنا جلنا، عمدہ غذائیں، سیر و تفریح، کچھ بحثیں کچھ تجاویز کچھ واہ واہ، اس سے تو اردو کا بھلا ہونے سے رہا۔ ہمارے ہاں (ہندوستان میں) یہ حال ہے کہ دن بہ دن اس زبان کا دائرہ چھوٹا ہوتا جارہا ہے۔ عام بول چال کی زبان جو حقیقتاً اردو ہے، فلموں اور ٹی وی سیریلس میں اسے ہندی کا نام دیا جاتا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے آئندہ پچاس ساٹھ برسوں میں کیا عجب کہ غالب کو ہندی کا شاعر کہہ دیا جائے۔ اب ہمارے ہاں صرف غریب مسلمانوں کے بچے اردو اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ صاحبِ حیثیت طبقہ اپنے بچوں کو انگلش میڈیم کے مشنری اسکولوں میں داخل کرنے کی جدوجہد کرتا ہے اور اس کے لیے بڑے بڑے Donations بھی دیتا ہے۔ ایک تلخ حقیقت یہ ہے کہ جو اربابِ قلم اردو کی کمائی کھا رہے ہیں اور اردو کی بدولت شہرت اور دولت کے مالک بنے ہوئے ہیں ان کی اولادیں بھی اردو نہیں پڑھتیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو کی بقا اور فروغ کا مسئلہ اردو تعلیم سے براہ راست جڑا ہوا ہے۔ بیرونی ممالک ہوں یا ہندوستان، جب تک اردو کی بنیادی تعلیم کے حصول کے لیے ماحول نہیں بنتا۔ جب تک ہمارے بچے اور ہماری آنے والی نسلیں اردو تعلیم سے آراستہ نہیں ہوتیں اردو کے روشن مستقبل کا خواب خواب ہی رہے گا۔"

میرا اگلا سوال تھا شاعری کے علاوہ اصنافِ ادب میں کس صنف سے وابستگی ہے؟ انہوں نے کہا:

"اصل وابستگی تو شاعری سے ہے لیکن نثر بھی لکھی ہے بالخصوص بچوں کے لیے ڈھیر ساری چھوٹی چھوٹی کہانیاں (Short stories) لکھی ہیں۔ کہانیوں کی ایک کتاب "سچائیاں" کے عنوان سے شائع بھی ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ میری ایک حیثیت ڈراما نگار کی بھی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کے طلباء کے لیے بہت سے ڈرامے (One act play) قلمبند کیے۔ انہیں اکثر مواقع پر اسٹیج بھی کیا۔ خود ہدایات بھی دیں لیکن کبھی ایکٹنگ نہیں کی۔

شاعری میں ترقی پسندوں سے زیادہ متاثر رہا۔ ترقی پسندی اپنے وقت کی نہایت طاقتور اور ایک مقبول تحریک تھی اس لیے اس سے متاثر ہونا فطری تھا۔ میں نے جب سے شعر کہنا شروع کیا (1952) ترقی پسندوں کے ساتھ رہا۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ فراق، سجاد ظہیر، سردار جعفری، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، ظ انصاری، مہندر ناتھ، اور عزیز قیسی جیسے ممتاز اور معتبر اہلِ قلم کی صحبتوں میں رہا لیکن یہ صحیح ہے کہ میں بھی سکہ بند ترقی پسند نہیں رہا۔ میری شاعری کبھی کسی خاص "ازم" کی اسیر نہیں رہی۔ اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں بھی جب میں بہت جذباتی تھا میں نے پارٹی لائن (Party Line) کی شاعری نہیں کی۔ زندگی کی بے شمار چھوٹی چھوٹی سچائیاں جن سے مجھے سابقہ پڑا انہیں کو اپنے شعری تجربے کا حصہ بنا کر آزادانہ اور فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کرتا رہا۔ یہی میرا ہنر ہے۔ ترقی پسندی میرے نزدیک

کوئی جامع نظریہ نہیں بلکہ ایک زاویہ نگاہ ہے، عہد بہ عہد بدلتی زندگی، بدلتے معاشرے اور انسانیت کو مثبت انداز میں دیکھنے اور پرکھنے کا۔"

نثری نظم اور غزل کے تجربوں کے سلسلے میں گفتگو ہوئی تو انھوں نے کہا کہ ہر خیال اپنے لیے ایک مخصوص شعری لباس کا طالب ہوتا ہے۔ کوئی خیال یہ تقاضہ کرتا ہے کہ وہ غزل کی صنف میں بہتر طور پر ادا ہوگا۔ کوئی خیال یا موضوع یہ تقاضہ کرتا ہے کہ اس کے لیے نظم کا پیرایہ بہتر ہوگا۔ یہ وہ مقام ہے یہاں شاعری کے لیے کوئی شعوری فیصلہ ممکن نہیں، اس کا انحصار موضوع اور خیال پر ہے۔ اگر ارتکاز کے ساتھ اشاروں کنایوں میں کسی خیال کو ظاہر کرنا ہو تو اس کے لیے غزل کی صنف مناسب ہوگی اگر کوئی خیال پھیلاؤ چاہتا ہے تو اس کے لیے نظم بہتر صنفِ سخن ہوگی۔

نئے تجربوں سے زبان میں نیا رس اور نیا ذائقہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے تجربے بہر حال ہونے چاہئیں۔ نثری نظم دوسری زبانوں میں پہلے سے ہے۔ ہمارے ہاں یہ نئی ہے۔ ہر چند کہ ایک عرصے سے نثری نظمیں لکھی جا رہی ہیں لیکن یہ صنف اردو ادب میں اب تک اپنا کوئی مقام نہیں بنا سکی ہے۔ میرے خیال میں اس میں کچھ کمیاں ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ نثری نظموں میں نثر جیسی دوربست نہیں ہونی چاہیے۔ ان نظموں میں بحر چاہے نہ ہو لیکن ایک آہنگ تو ان میں ضرور ہونا چاہیے۔ نثری نظموں کی عدم مقبولیت کا ایک فنی سبب یہ بھی ہو سکتا ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بہر حال اس میں امکانات ہیں۔ یہ صنف ایک دن اپنا مقام بنا لے گی۔ رہی بات نثری غزل کی تو یہ صنف مجھے اپیل نہیں کرتی۔ میں اسے ایک ناکام تجربہ سمجھتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ غزل کا ایک مزاج ہے، اس کی ایک ہئیت ہے، اس کا Format بنا ہوا ہے۔ ردیف، قافیہ، بحروں کی پابندی، دو مصرعوں کا ہم وزن ہونا وغیرہ۔ یہ ایسی خصوصیات ہیں جن سے غزل پوری پوری طرح Establised ہو چکی ہے۔ غزل کے فارم کو تبدیل کرنا، اس کے مخصوص مزاج کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا، غزل کے لیے تباہ کن ہوگا۔ ہمارے ہاں نثری غزل کے تجربے متعدد شعرا نے کیے لیکن یہ تجربے پسند نہیں کیے گئے۔ ناکام رہے۔ ہاں میں آج کے دور کے مشاعروں کے حوالے سے یہ بات کہنا چاہوں گا کہ ان سے زبان کا تو فروغ ہوتا ہے لیکن ادب کی تخلیق میں ان مشاعروں کی حیثیت ثانوی ہے۔ مشاعروں میں مختلف عناصر کام کرتے ہیں۔ شاعر کا ترنم Performance اس کی شخصیت وغیرہ وغیرہ، شاعر شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ جب ایسے آسان وسیلوں سے اُسے داد مل جاتی ہے اور اس کا کام چل جاتا ہے تو وہ تخلیقی ریاضت کو کیوں اہمیت دے؟ اس کے برخلاف تخلیقی نشستوں میں مشاعروں جیسا ہنگامہ خیز ماحول نہیں رہتا۔ یہاں فکر و فن، بصیرت و آگہی، شعور اور وجدان کی روشنی میں تخلیقی فنکار کو اپنے محاکمے اور احتساب کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ ماضی میں ترقی پسند مصنفین کی ماہانہ تنقیدی نشستوں سے ہم جیسے تخلیقی فنکاروں کو بہت جلا ملی۔

کتابوں اور جرائد کی بقا کے لیے پہلی بات تو یہ کرنا ہو گی ہے کہ لوگوں میں مطالعے کا شوق پیدا ہو بلکہ مطالعہ ایک عادت بن جائے۔ اس طرح ان میں کتابیں اور جرائد خرید کر پڑھنے کا رجحان بڑھے گا۔ اس کے علاوہ کتابوں کی ترویج واشاعت بھی معقول طریقے سے ہونی چاہیے۔ کتابیں اور رسائل دیدہ زیب ہوں۔ اس کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ کتابوں اور رسائل کی قیمتیں قارئین کی قوتِ خرید سے بالاتر نہ ہوں۔ لائبریریوں اور بک اسٹالوں کی حالت میں بہتری آنی چاہیے اور سب سے بڑی بات یہ کہ مصنف، بکس سیلر اور قارئین میں ایک مضبوط رابطہ یا Channel ہونا چاہیے۔ اس طرح ہم کتابوں اور رسائل کی بقا کے لیے کچھ کر سکیں گے۔"

انہوں نے کہا یہ پرچے گو کہ بہت بہتر مالی وسائل نہیں رکھتے مگر ان کے مدیران و پبلشر ان قابلِ داد و تحسین ہیں کہ محنت اور جہاد کیے جا رہے ہیں۔ اب اردو پڑھنے والوں کو چاہیے کہ عملی طور پر ان کی مدد کریں اور ان پرچوں کو زندہ رکھنے کے لیے سلسلے بھرپور تعاون کریں۔

ZAFAR GORAKHPURI
A-302 "FLORIDA" SHASTRI NAGAR
ANDHERI (W). MUMBAI-400053 (INDIA)

میکدہ سب کا ہے سب ہیں پیاسے یہاں مئے برابر بٹے چار سو دوستو
چند لوگوں کی خاطر جو مخصوص ہوں توڑ دو ایسے جام و سبو دوستو
ہاں اسی آتش و برق کی راہ میں رس اچھالے گی روح نمو دوستو
آگ برسا کرے تم چھڑکتے چلو ذرے ذرے پہ دل کا لہو دوستو
جادہ شب سے تا منزلِ صبح نو، سلسلہ ہائے جہد و جنون و طلب
آرزوؤں کے سر پر موسم تلک آروز، آرزو، آرزو دوستو
وہ تو ہم رہوان رہ شوق تھے لاج باقی رہی جن سے اس عہد کی
ورنہ کس کو یہ سوغات منظور تھی، جستجو حاصل جستجو دوستو
جب تلک خونِ دل رنگ بھرتا نہیں، کوئی پہلو جنوں کا نکھرتا نہیں
قتل گاہوں سے جب تک گزرنا نہیں، شوق ہوتا نہیں سرخرو دوستو
رات تاریک ہے دل جلائے چلو، جگنوؤں کس طرح جگمگاتے چلو
رات حصہ ہے اپنا مقدر نہیں آئیں گے اپنے دن بھی کبھو دوستو

مت دیکھ مجھ کو کون ہوں میں
وہ سن کہ جو بات کہہ رہا ہوں

ابرار عابد
۳۱ جنوری ۲۰۰۰ء

ابرار عابد

پاکستان

سید ابرار حسین عابد سے مجھے جناب اعتزاز احسن نے متعارف کرایا تھا۔ ابرار عابد صاحب یکم اپریل 1942ء بنارس (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ شاعری کی ابتدا کی تو تخلص عابد اختیار کیا۔ ان کا پہلا مجموعہ "صلۂ شوق" 1987ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ "خامشی جب کلام کرتی ہے" زیرِ اشاعت ہے اس کے علاوہ ایک نعتیہ مجموعہ اور ایک مجموعہ سلام و مناقب پر مشتمل بھی تیار ہے۔

ابرار عابد 1949ء میں پاکستان آئے۔ اپنے والدین کا ہاتھ بٹانے کی خاطر کم عمری میں مزدوری کرنی پڑی۔ انہوں نے بتایا "لانڈھی میں ایک پولٹری فارم تھا۔ سورج نکلنے سے قبل جاتا تھا اور غروب آفتاب کے بعد واپس آتا تھا۔ وہاں 2 روپے روز ملتے تھے آخری اجرت 3 روپے روزانہ تھی۔ سات سال سے چودہ سال کی عمر تک پہنچنے پر جو کچھ گزری اور ہمارے والدین نے جو کچھ ہماری پرورش کے سلسلے میں جو دکھ جھیلے وہ لکھنے بیٹھوں تو ایک کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔

میری والدہ کو بہت ارمان تھا کہ میں بہت زیادہ تعلیم حاصل کروں مگر افسوس اپنی شدید علالتوں اور کسب معاش کے گورکھ دھندوں میں پڑنے کے باعث میں اپنی ماں کی تمنا تو پوری نہیں کر سکا مگر کسی حد تک اُن کے آنسو پونچھنے کی سعی ضرور کی اور پرائیوٹ طور پر میٹرک کرلیا۔ میرے

خالہ زاد بھائی نے میرا رزلٹ آنے سے قبل ہی ایک آڈٹ فرم "ریاض احمد اینڈ کمپنی" میں بربنائے رسوخ بحیثیت ٹائپسٹ ملازمت دلوادی تھی۔ ٹائپسٹ تو کیا تھا بس انگلیاں چلا لیتا تھا۔ بعد میں میرا رابطہ آڈٹ ٹیم کے ساتھ کردیا گیا تھا۔ ایک سال تک کام کیا۔ پھر رزلٹ آگیا اور میں نے اپنے ایک اور عزیز کے توسط سے حبیب انشورنس جوائن کرلی۔ یہاں میں نے تقریباً 18 سال تک کام کیا۔ 1970ء میں میری شادی ہوگئی اس سال میں نے انٹرمیڈیٹ کا پرائیویٹ امتحان دیا تھا۔ 1981ء میں بحیثیت پرسونل آفیسر میں نے ذوالفقار انڈسٹریز لمیٹڈ جوائن کی تھی اور اس نوکری کے بعد ہمارے حالات میں بہتری آنی شروع ہوئی تھی۔ یہاں میں نے بارہ سال ملازمت کی اسسٹنٹ منیجر پرسونل میرا آخری عہدہ تھا تادم تحریر پیراماؤنٹ لیزنگ لمیٹڈ میں بحیثیت آفیسر اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ پر کام کررہا ہوں اور خدا کا شکر ہے کہ زندگی بہتر طور پر گزر رہی ہے۔

14 برس کی عمر میں، میں نے باقاعدہ شاعری شروع کردی تھی۔ حد سے زیادہ حساس تھا لہٰذا جب کسی واقعہ سے متاثر ہوتا یا کسی غم سے دوچار ہوتا اُس کیفیت کو شعر میں ڈھال دیتا تھا۔ میر سے میں بہت متاثر تھا۔ انہی کے رنگ میں شعر کہنے کی کوشش کرتا تھا۔

ہے مسرت بھی رنج بھی آنسو	امتزاجِ غم و خوشی آنسو
سچ اگر پوچھیے تو انساں کی	ابتداء انتہا یہی آنسو
رو کے دل کو سکونِ ملتا ہے	غم کے ماروں کی زندگی آنسو
میں مقلد ہوں میر کا عابد	میرا عنوانِ شاعری آنسو

میری آواز بھی بہت اچھی تھی گلوکاری کا شوق جنون کی حد تک تھا اور ایک عرصے تک یہ شوق میری شاعری پر غالب رہا مگر میری منزل گلوکاری نہیں شاعری تھی۔ سو اب صرف شاعر ہوں اور خدا کا شکر ہے کہ اس فن میں مقام اعتبار رکھتا ہوں (ہرچند کہ عمومی شہرت کا حامل نہیں ہوں) مشاعروں کی نسبت شعری نشستیں زیادہ پسند کرتا ہوں کہ یہاں صرف ادب سے متعلق اور سخن فہم طبقہ آتا ہے تماشبین نہیں آتے۔ میری زندگی کے کئی اہم واقعات میں سے ایک یہ ہے۔ جب میرا مجموعہ "صلۂ شوق" چھپ رہا تھا تو میں شاعر لکھنوی صاحب کے پاس مضمون لکھوانے کی غرض سے گیا۔ انہوں نے ٹالنے کی کوشش کی (گفتگو حذف کررہا ہوں) میں نے کہا کہ شاعر صاحب میری ایک تمنا ہے فرمایا وہ کیا؟ میں نے عرض کیا میری پہلی غزل کا صرف مطلع پڑھ لیجیے انہوں نے مطلع پڑھا اور کرسی چھوڑ کے کھڑے ہوگئے حیرت سے کہنے لگے "ارے یہ آپ ہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا جی! مجھ سے بغل گیر ہوگئے اور کہنے لگے "ایسا شعر کہنے والا شاعر معمولی نہیں ہوسکتا۔" اور مضمون لکھنے کا حتمی وعدہ کرلیا۔ اب آپ ان کا مضمون بھی "صلہ شوق" میں پڑھ لیجیے اور وہ مطلع اور اس کا پس منظر بھی۔ وہ مطلع یہ ہے

ہم اک اکائی تھے جب تک تھے آسمانوں میں
زمین نے بانٹ دیا ہم کو خاندانوں میں

دراصل میں نے یہ غزل اورنگی کی ایک شعری نشست میں پڑھی تھی جس کی صدارت شاعر لکھنوی صاحب کر رہے تھے۔ وہ مجھے جانتے نہیں تھے اور پہلی بار مجھے سنا تھا۔ لوگوں سے پوچھتے پھرتے تھے کہ بھائی اس مطلع کا خالق کون ہے میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں (یہ بات مجھے ایک شاعر دوست نے بتائی تھی) کچھ عرصے بعد حنیف اسعدی صاحب نے مجھے جسارت کا ایک پرانا ادبی صفحہ دیا کہ لو تم بھی کیا یاد کرو گے۔ میں نے کہا یہ کیا ہے کہنے لگے شاعر کا انٹرویو ہے پڑھ لینا۔ میں نے گھر آکر وہ انٹرویو پڑھا تو اس میں شاعر صاحب سے ایک سوال پوچھا گیا تھا کہ جدید شاعری کا کوئی پسندیدہ شعر سنائیے۔ شاعر صاحب مرحوم نے میرا یہی مطلع سنا دیا۔ پوچھا گیا شاعر کا نام؟ فرمایا معلوم نہیں ایک نشست میں سنا تھا۔ (ہائے غیر معروف ہونا بھی کیا عذاب ہے)

عابد بتا رہے تھے کہ صنفِ سخن میں غزل سب سے موٴثر ذریعۂ اظہار ہے کہ اس میں بڑے سے بڑا مضمون نہایت اختصار کے ساتھ ایک شعر میں کہا جاسکتا ہے اگر شاعر میں بات کہنے کا سلیقہ ہوا!

نثری نظم اور نثری غزل کو میں ایک بے معنی شے سمجھتا ہوں یہ شاعری سے فرار ہے۔

میرے خیال میں پرنٹڈ میڈیا نہایت موثر ہے اور کار آمد بھی مگر مہنگائی کی وجہ سے اشاعتِ کتب نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہو گئی ہے آج کل دو وقت کی روٹی مل جائے تو غنیمت ہے اور دوسرا مسئلہ ہمارے مفت پڑھنے کی عادت ہے۔ خرید تا کوئی نہیں خصوصاً شاعری کی کتاب۔

دورِ حاضر میں تنقید ادب کی ضرورت ضرور ہے اور ہونی چاہئے مگر جانبدارانہ تنقید نے بیڑہ غرق کیا ہوا ہے۔ ہمارے نقاد "اندھا بانٹے ریوڑیاں اپنوں اپنوں کو دے۔" پر عامل ہیں۔ گدھے گھوڑے سب برابر ہیں۔ کھوٹے کھرے سب ایک صف میں ہیں۔ انہیں الگ کون کرے؟ خدا ہمارے ناقدوں کو شعور اور انصاف عطا کرے۔ آمین۔

اردو کے مستقبل کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "محترمہ آپ کے سوال کا جواب خود سوال ہی میں موجود ہے۔ اردو کا دنیا کی تیسری یا زیادہ سے زیادہ چوتھی زبان ہونا باوجودیکہ اس کی عمر دوسری زبانوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ بہر طور اس کی صلاحیت ارتقا کی دلیل ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ جو زبانیں فی الوقت اس سے زیادہ مرجوعہ رکھتی ہیں یعنی انگریزی، فرنچ اور چینی۔ یہ زبانیں اپنی ذات میں ارتقاپذیری کی کوئی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ بیساکھیوں کے سہارے یہاں پہنچی ہیں ورنہ اردو زبان ہی سب سے بڑی زبان ہوتی۔ انگریزی کو حکومت کی سیڑھی مل گئی۔ پہلے انگریزوں کی وسیع سلطنت کا سہارا ملا پھر اس کے روبہ تنزل ہونے پر امریکہ کا سپر پاور بن جانا اس زبان کے فروغ کا سبب بنا۔ دونوں ممالک کی زبان انگریزی تھی۔ لامحالہ ان کے دباؤ میں رہنے والی جتنی آبادی تھی یا ہے وہ اپنے تمام تر دفتری، معاشی اور سیاسی معاملات میں انگریزی کی محتاج تھی اور آج بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں انگریزی کا مرجوعہ زیادہ ہونا ہی تھا۔ فرنچ کا بھی کم و بیش یہی معاملہ ہے۔ فرانس یورپ کی طاقتور ترین اور انقلاب انگیز حکومت رہی ہے)۔ ماسوا ان چند

برسوں کے جب ہٹلر برسر اقتدار رہا تھا) آج بھی فرانس یورپ کی واحد ایٹمی طاقت ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں براعظم یورپ کے تمام ممالک ہمیشہ اس کے زیر اثر رہے اور فرنچ رابطہ کی زبان بن جانے کی وجہ سے آگے بڑھ گئی۔ رہ گئی چینی زبان تو وہ چین جیسے ملک کی واحد زبان ہونے کے سبب از خود ہی بڑی زبان بن گئی۔ اس ملک کی کثیر آبادی نے اس زبان کو یہ مقام بخش دیا ورنہ بہ حیثیت زبان یہ بھی بنجر ہے۔ چین کی جغرافیائی حدود سے باہر چینی زبان استعمال کرنے والے صفر ہیں۔ اب ان زبانوں کے مقابلے میں اردو کو لے لیجئے انتہائی کم سن زبان جس کی تخلیق کا ہر ایک محکوم اور بے وسیلہ قوم کے سر ہے۔ جب سے وجود میں آئی ایک طرف سے تو حاکموں کی زبان انگریزی کا مقابلہ کرنا پڑا دوسری جانب ہندوستان کی غالب آبادی ہندوؤں کی زبان ہندی سے مسلسل ٹکراؤ رہا۔ پھر جب تقسیم ہندوپاک عمل میں آئی تو اس زبان کے مرکزی علاقے بھارت سے اسے کلیتاً دیس نکالا مل گیا رہا پاکستان تو شرما حضوری میں اس نے اس زبان کو قومی زبان تسلیم تو کر لیا مگر عملاً اب تک اسے اس کا جائز مقام نہیں دیا۔ تمام کاروبار انگریزی میں ہی ہو رہا ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ہم لوگ اب تک انگریزی کی ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہو پائے ہیں دوسرا بڑا معاملہ یہ ہے کہ اس ملک کا اقتدار ابتدا ہی سے ایک مخصوص طبقے کے پاس رہا ہے یہ طبقہ انگریزوں کا تربیت یافتہ ہونے کے سبب انگریزی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں اپنے ملکی اور سیاسی معاملات سرانجام دینے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ ایک طرف تو یہ نامساعد حالات ہیں اور دوسری طرف اردو کی ارتقاپذیری کی لامحدود قوت ہے کہ نہ صرف یہ کہ کسی لمحے روبہ تنزل نہیں ہوئی۔ بلکہ روز بروز اپنا حلقہ وسیع تر کرتی چلی جا رہی ہے۔ اس کی مختلف وجوہ میں ایک عاملہ یہ بھی ہے کہ اس زبان کے علاوہ دنیا کی اور کوئی زبان ایسی نہیں جو ہر قسم کے تلفظات پر قادر ہو مثلاً انگریزی میں خ، ژ، ق اور ع کا تلفظ نہیں ملتا۔ عربی اور فارسی وغیرہ میں ٹ، ڈ اور ڑ کا تلفظ غائب ہے اور ہندی میں خ، ع، غ اور ق وغیرہ ناپید ہیں۔ یہ معذوری ایک زبان کے الفاظ کے دوسری زبان میں ادخال کی شکل بن جاتی ہے۔ مجبوراً تلفظ میں تحریف کرنا پڑتی ہے۔ اردو دنیا کی واحد زبان ہے جو ہر ممکنہ تلفظ پر قادر ہے اور دنیا کی ہر زبان کا ہر لفظ اپنے اصلی تلفظ کے ساتھ اردو میں شریک ہو سکتا ہے۔ ان حالات میں اردو کے مستقبل کے متعلق کسی اندیشے کا سوال ہی نہیں۔ میں خود سوچ رہا ہوں کہ آخر اس زبان کو دنیا کی واحد رابطہ کی زبان ہونے میں کتنا عرصہ لگے گا؟ یا کم از کم ہمارے پاکستان ہی میں رابطے کی زبان بننے میں کتنا وقت درکار ہے۔ میں بھی منتظر ہوں آپ بھی انتظار کیجئے۔

MR.ABRAR ABID
B-6 RELEX APT
BLOCK 20, F. B. AREA KARACHI. (PAKISTAN)

انتخابِ کلام

ابرار عابدؔ

خود اپنی تپش کو سہہ رہا ہوں
سورج کی مثال رہ رہا ہوں

جو یا تھا میں ساحلِ طرب کا
دریائے الم میں بہہ رہا ہوں

مت دیکھ مجھے کہ کون ہوں میں
وہ سن کہ جو بات کہہ رہا ہوں

مر جاؤں گا حسرت میں دب کر
بوسیدہ مکان میں رہ رہا ہوں

تحصیلِ ثواب کی ہوس میں
ہستی کے عذاب سہہ رہا ہوں

فطرت میں وہی قلندری ہے
ہر چند قریبِ شہ رہا ہوں

چاہے تو خوشی کہ مگر سب تمہارے پسند ہوں
لازم ہے ہم نصیب کے احسان مند ہوں

عرفان عابد
۱۱ اکتوبر

عرفان عابد

انڈیانا پولس، امریکا

خورجہ یوپی ہندوستان میں رہنے والے محترم شاعر قمر تنویر کا ایک شعر مجھے بے حد پسند آیا تھا۔ شعر ہے:

جب میں خود اپنے بھائی سے رُتبے میں گھٹ گیا
"ماں باپ" کا خلوص بھی "خانوں" میں بٹ گیا

ان کا تعارف ادھورا موصول ہوا تھا۔ میں نے سوالنامہ بھجوایا تو جواب آیا کہ وہ ڈپریشن کا شکار ہیں۔ طبیعت بہتر ہوتے ہی مکمل تعارف بھجوائیں گے۔ میں منتظر رہی۔ ان کا تعارف تو نہ آیا مگر ان کے ایک عزیز کا فون آیا کہ وہ تصدیق چاہتے ہیں کہ آپ کو ان کا خط مل گیا۔ ان ہی کے توسط سے مجھے عرفان عابد کا پتہ ملا اور پھر ان کا چھوٹا سا مجموعہ کلام "آئینۂ دل" بھی آیا۔ اس مخالف بادوبارانی دور میں امریکا کی ایک چھوٹی سی ریاست میں عرفان عابد کا اردو زبان وادب کے چراغ جلائے رکھنا کاروارد ہے۔

عرفان عابد کی شاعری ہی اس کا ادبی اور اخلاقی پس منظر ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

وفا کے قول سے ہم تو مکر نہیں سکتے
کہ دشمنی میں بھی حد سے گزر نہیں سکتے

اردو زبان پر اب جو وقت آنے والا ہے اس کی ایک جھلک عرفان کے مجموعہ میں ان کا اپنا اظہار "عرض و نیاز" کے عنوان سے ملاحظہ ہو:

"اس مجموعہ کی اشاعت شروع میں صرف انگریزی (رومن) میں کرنے کا ارادہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ امریکہ میں اس طرح سے اس کتاب کو زیادہ لوگوں تک پہنچایا جاسکتا تھا۔ اردو میں اشاعت کا خیال نہیں تھا کیونکہ امریکہ میں اس کے جاننے والے کم ہیں۔ بہر حال بعد میں یہ فیصلہ کیا کہ لگے ہاتھ اردو ایڈیشن بھی نکال دیا جائے۔ لہٰذا یہ کتاب پیشِ خدمت ہے۔ امید ہے یہ کوشش آپ حضرات پسند فرمائیں گے۔

میں جناب جگجیت سنگھ کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھ ناچیز کے ساتھ اپنا نام جوڑنے کی عنایت فرمائی۔ یہ ان کی خوش اخلاقی اور بڑپّن کا ثبوت ہے۔

جن حضرات کی مدد اور دعاؤں کی بدولت اس مجموعہ کی اشاعت ممکن ہو سکی ہے ان میں سر فہرست میرے استاد جناب مذاقؔ چرکھاریوی کا نام ہے۔ اس کے علاوہ جناب قمرؔ تنویر صاحب، آبادیو سنگھ صاحب، ارشد احمد صاحب، اجیش پربھاکر صاحب اور میرے عزیز دوست وشال بخشی کا بھی نام قابلِ ذکر ہے۔ میں ان تمام حضرات کا شکر گذار ہوں۔"

نیاز مند

عرفان عابد

عرفان کے لیے ہندوستانی گلوکار جگجیت سنگھ کا پیغام بھی ان کی حوصلہ افزائی کے لیے بہت اہم ہے۔ جگجیت لکھتے ہیں:

"مجھے یہ جان کر خوشی ہے کہ جناب عرفان عابدؔ اپنی غزلوں کا مجموعہ "آئینۂ دل" شائع کر رہے ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر ان سے ملنے اور ان کا کلام سننے کا موقع ملا تھا۔ مجھے امید ہے کہ قارئین ان کی شاعری پسند کریں گے۔" (جگجیت سنگھ)

عرفان کا پورا نام محمد عرفان علوی اور تخلص عابدؔ ہے۔ 30 مئی 63ء کو کانپور کے قریب چرکھاری، یوپی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ تعلیم، بی۔ ایس (سول انجینئرنگ)، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے حاصل کی۔

انہوں نے لکھا ہے "مجھے شاعری کے علاوہ افسانہ نگاری سے بھی دلچسپی ہے۔ شاعری کی تعلیم استاد مذاقؔ چرکھاریوی سے حاصل کی جو شاعرِ اعظم استاد داغؔ دہلوی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا میری خواہش تھی کہ مجھے بھی اسی سلسلے کا ایک حصہ تسلیم کیا جائے۔ شاعری کی باقاعدہ اشاعت کا ابھی تک ارادہ نہ تھا۔ سال بھر قبل نیویارک کے نوجوان غزل سنگر وشال بخشی کے سی۔ ڈی میں میری ایک غزل کی ریکارڈنگ سے ہوئی۔ اس کے بعد یار دوستوں کے کہنے پر اپنے مجموعۂ غزلیات "آئینۂ دل" کو ترتیب دے کر حال ہی میں شائع کیا۔ ماہنامہ "بیسویں صدی" دہلی

میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ اس کے علاوہ اُردو کا کوئی بھی رسالہ ہاتھ لگے اور وقت اجازت دے تو پڑھے بغیر نہیں رہتا۔

واقعات تو کئی ہیں لیکن دو خصوصاً قلم بند کر رہا ہوں۔ علی گڑھ میں طالب علمی کے زمانے میں وی۔ ایم ہال کی کلچرل اور لٹریری سوسائٹی کا میں سکریٹری بنا۔ یہ 85-1984ء کا واقعہ ہے۔ ہال کے پُروقار Provost جناب نیاز صدیقی صاحب نے فرمایا کہ سوسائٹی کا بجٹ محدود ہے لہٰذا خرچوں پر قابو رکھا جائے۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ ایک شاندار مشاعرے کا انتظام کیا جس میں طلباء اور اساتذہ دونوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پروگرام کامیاب رہا اور اس قدر کامیاب رہا کہ اس کے بعد "بجٹ" کی کوئی دقت میرے کسی پروگرام میں کبھی پیش نہیں آئی۔ دوسرا قابلِ ذکر واقعہ میری شہنشاہِ غزل جگجیت سنگھ سے ملاقات تھی۔ میرے ایک دوست سے یہ معلوم ہونے پر کہ میری شاعری میں دلچسپی ہے۔ انہوں نے کچھ سننے کی فرمائش کی۔ میں نے شروعات اپنے استاد مذاق چڑ کھاریوی صاحب کے ایک شعر سے کی۔ جگجیت صاحب کو یہ بات بہت پسند آئی اور اس کے لیے انہوں نے مجھے خاصی شاباشی دے۔ موسیقی ہو، شاعری یا پھر کوئی اور فن۔ استاد کے مقام کو ایک فن کار بخوبی سمجھتا ہے۔

مجھے اردو زبان سے محبت ہے، اس پر جان دیتا ہوں لیکن یہ تلخ حقیقت بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اردو کا مستقبل بہت روشن نظر نہیں آتا۔ جو اس کے محافظ ہونے چاہئے تھے وہ اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ دنیا کی جدوجہد میں کسی کے پاس اتنا وقت نہیں کہ اس کی تعلیم اور فروغ میں مدد کر سکے۔ بہر حال امید پر دنیا قائم ہے۔ دیکھئے شاید اردو کا ستارا ابھر بلند ہو۔

طبیعتاً آزاد خیال نہیں ہوں۔ ہر چیز ایک باقاعدہ نظام کے تحت دیکھنا چاہتا ہوں لہٰذا نثری نظم اور غزل جیسی چیزیں پسند نہیں آتیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایسے تجربے بند ہو جانے چاہئیں۔ ہر ایک کو اپنے اپنے طریقہ سے اظہارِ خیال کا حق ہے اور یہ حق کسی سے چھینا نہیں جا سکتا۔

الیکٹرونک میڈیا کو کتابوں کا مخالف ماننے کے بجائے اگر معاون سمجھا جائے تو بہتر ہے۔ اس میڈیا کی جس رفتار سے ترقی ہو رہی ہے اس سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آنے والے وقت میں گھر گھر میں اس کا استعمال ہوگا۔ اردو کو اگر فروغ دینا ہے تو الیکٹرونک میڈیا سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ اخبارات اور کتابیں اپنی جگہ ہیں اور رہیں گی۔

آپ کا خیال درست ہے۔ تنقید سے ادب نکھرتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تنقید نگار ادب اور فن کے ماہرین ہوں۔ آج کل اتنا وقت کس کے پاس ہے کہ اوّل علم حاصل کرے، دوئم ادبی حلقوں میں مسلسل سرگرم رہ کر تنقید کے فرائض انجام دے۔

M.I. Alvi
2511 vinewood Dr.
Indianapolis , In 46224 U.S.A

انتخابِ کلام

عرفان عابد

بھری دنیا سہی لیکن ٹھکانہ ہم بھی پالیں گے
جہاں دو گز زمیں ہوگی وہیں ہم گھر بنا لیں گے

مجھے ڈر کیا کہ میرے باغ میں کانٹے ہی کانٹے ہیں
خزاں کے ہاتھ مجھ سے اور لیں گے بھی تو کیا لیں گے

زمانے کے اصولوں پر اگر ہم چل نہیں پائے
پریشاں ہو کے ہم بھی خود اصول اپنے بنا لیں گے

ترے اُلفت کے دعووں پر یقیں تو کچھ نہیں لیکن
کبھی گر وقت آیا تو تجھے بھی آزما لیں گے

مقدر سے اگر خوشیاں نہیں مل پائیں بھی تو کیا
ہم اپنے دل کی محفل کو غموں سے ہی سجا لیں گے

ابھی مجبور ہیں لوگو تمہارے ظلم سہتے ہیں
مگر بدلے لیے ہم نے تو پھر بے انتہا لیں گے

جہاں والے گرائیں لاکھ ٹھوکر مار کر عابدؔ
ہمیں خود پر بھروسہ ہے کہ ہم خود کو اُٹھا لیں گے

نور کا ننھا سا شعلہ بھی ہے ظلمت پہ محیط
طاق روشن ہے وہی جس میں دیا رکھا ہے

فیاض عادل فاروقی
۲۷-۱۱-۱۴۱۹
14-3-1999

فیاض عادل فاروقی

لندن

رزق کی کمی نہیں مگر
مال و زر کی بھوک کھا گئی

ہے کہاں وقت دشمنی کے لیے
عمر بھر کم ہے دوستی کے لیے

فیاض عادل فاروقی بھی اپنے اشعار کی آسان اور پر کشش زبان کی طرح پر کشش شخصیت کے مالک ہیں۔ خطیب ہیں، سچائی پر یقین رکھتے ہیں اس لیے ان کا ظاہر باطن ایک ہے۔ آج ان کی دلچسپ اور کار آمد گفتگو سنتے ہیں کہ اس میں اردو ادب کے لیے کئی مشوراتی نکتے بھی پوشیدہ ہیں۔

عادل فاروقی اپنے بارے میں بتارہے تھے: والدین نے میرا نام محمد فیاض رکھا۔ پھر سابقے لاحقے لگتے گئے۔ اسکول سے شعر گوئی کا شوق ہوا لیکن اسے "شاعری" نہیں کہہ سکتا تاہم عادل تخلص کرلیا۔ بعد میں تاریخ اسلام کی عظیم شخصیت سیدنا عمر الفاروقؓ کے ساتھ نسبتِ مودّت کے شوق میں "فاروقی" کہلایا۔ میں نسباً نہیں نسبتاً "فاروقی" ہوں۔ اس مغالطہ کو دور کرنے کے لیے "محمد

فیاض عادل فاروق "لکھنا شروع کیا۔ لیکن یار لوگ مجھے ایک شاعر "فاروق عادل" کے کلام کا مصنف سمجھنے لگے۔ حال ہی میں فاروق عادل کا انتقال ہوا تو مجھے میری اپنی "وفات" پر تعزیت کے فون آنے لگے۔ پچھلے دنوں پاکستان کے ادبی جرائد میں عادل فاروقی کے نام سے کچھ تحریریں چھپیں تو دوستوں نے مجھ سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ تب جا کے پتہ چلا کہ کوئی اور "عادل فاروقی" بھی ہیں۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کم سے کم نام "فیاض عادل فاروقی" لکھا کروں۔ پیدائش کی اصل تاریخ 28 جنوری 1948ء ہے لیکن اصل تاریخ ایک بہی کھاتہ میں لکھی رہ گئی اور سیکر ڈہارٹ اسکول میں داخلہ کے وقت کانونٹ سکول کی سسٹر نیرینا نے اپنی سہولت کے لیے یکم جنوری 1950ء لکھ کر مجھے دو سال تاخیر سے ریٹائر ہونے کی پیش بندی کر دی۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مجھے اپنی سالگرہ منانے کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ اس دن لاکھوں لوگ "سالِ نو" کے بہانے میری سالگرہ کی خوشی منا لیتے ہیں۔ جائے پیدائش جھنگ صدر (مگھیانہ سابق) کے محلّہ ساہیوالیہ کا ایک مکان ہے۔ تعلیم ساتویں تک جھنگ کے سیکر ڈہارٹ اسکول سے اور میٹرک تک سابق لائل پور (حال فیصل آباد) کے لاسال ہائی اسکول سے حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج جھنگ سے بی اے کیا اور جامعہ محمدی شریف چنیوٹ سے دینی تعلیم حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے 1971ء میں انگلستان پہنچا لیکن جمعیت المسلمین برمنگھم نے مجھے تدریس و خطابت کے لیے ملازمت دے دی۔ 1983ء سے پوسٹ آفس کاؤنٹرز میں پوسٹل آفیسر کے طور پر ملازم ہوں۔

برطانیہ میں قیام کے دوران مطالعہ اقوام و مذاہب کا بہت موقع ملا۔ ریڈیو ٹی وی پر اسلام اور مسلمانوں کے نکتہ نظر کو پیش کرنے کی سعادت ملی۔ شاعری کی ابتداء 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے موقع پر ہوئی لیکن اس کی صحیح نشوونما قیام برطانیہ کے دوران ہی ہوئی۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ بالکل متضاد و متغائر اشغال میں مصروف رہتا ہوں۔ کام پر اکاؤنٹس (حسابیات) سے واسطہ رہتا ہے۔ تقریباً تمام تقاریر و خطابات انگریزی میں اسلام و تقابلِ ادیان کے موضوع پر کرتا ہوں۔ شاعری زیادہ تر اردو اور گھریلو بات چیت پنجابی اور اردو دونوں میں ہوتی ہے۔ پاکستان میں زمانہ طالب علمی میں انجمن فلاحِ طلبہ کی بنیاد رکھی۔ برطانیہ میں انگلش سپیکنگ مسلمز ایسوسی ایشن (ESMA) کی بنیاد رکھی۔ تحریک ادبِ اسلامی کا ڈول ڈالا۔ ادارہ الفرقان کی بنیاد ڈالی۔ اردو، عربی اور اسلامی تدریس کی بنا پر کثیر تعداد میں بچوں بچیوں اور بالغوں کے استاد ہونے کا شرف میرا سب سے بڑا اعزاز ہے۔

مصوری کے ذوق کو خطاطی کے شوق میں منتقل کر چکا ہوں۔ مجموعہ اضداد ہوں۔ شاعری کے علاوہ متفرق انشائیے، سفرنامے، سوانحی خاکے لکھے۔ زیادہ تر طبع سے محروم ہیں۔ شاعری کو بھی گمنامی میں رکھتا کہ یہاں کے چند احباب شعراء نے مشاعرہ میں پڑھنے اور اخبارات میں چھپوانے کی ترغیب دلائی جن میں سلطان الحسن فاروقی، سید الظفر اور سید اسد اللہ طارق سر فہرست ہیں۔

عادلؔ کو کون جانتا بے مہر شہر میں
ہے دردِ دل کا فیض کہ وہ نامور ہے آج

شاعری کے تمام مکاتبِ فکر سے متاثر ہوا ہوں۔ نیچرل شاعری اور "ادب برائے زندگی" کے دبستان، بلکہ ترقی پسندی تک کا معترف ہوں لیکن طبع آزاد نے کسی مکتبہِ فکر کی اندھی تقلید گوارا نہیں کی۔ میری شاعری کے چیدہ موضوعات ہیں : آفاق، انسانیت، اسلام، انصاف، الفت۔ اندازِ تکلم میں میر، حالی، اقبالؔ، حفیظ، بلکہ اخترؔ شیرانی تک سے متاثر ہوں لیکن ابھی تک شاید اس مقام تک نہیں پہنچ سکا جسے میرا اپنا اندازِ سخن کہا جا سکے۔ میری شاعری ہنوز زیرِ تعمیر ہے۔ میرا کلام زیادہ تو نہیں چھپا "جنگ لندن"، "اخبارِ وطن" اور "راوی بریڈفورڈ" میں چھپ جانا ہی بڑا کارنامہ ہے۔ پاکستان کے جید رسائل و جرائد میں بھیجنے کا موقع نہیں ملا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو ایک "شاعر" کے طور پر متعارف ہی نہیں کرا سکا۔ متنوع مصروفیات بھی ایک وجہ ہے۔ اپنی غیر مطبوعہ شاعری کے ہزاروں صفحات پر نظر ڈالتا ہوں تو طبع و اشاعت کی ہمت ہی نہیں پڑتی البتہ 35 سال کی جگر سوزی پر تھوڑا سا مرہم رکھنے کے لیے دو مجموعے ترتیب دے رہا ہوں "زنجیرِ عدل" اور "شرق و غرب"۔ میں تاریخ، مذہب، ادب، سوانح کی کتب کا مطالعہ کرتا ہوں۔ انگریزی اور اردو کے مختلف جرائد پڑھتا ہوں۔

میری زندگی کے یہ دو واقعات بڑے اہم ہیں۔ چند سال قبل افتخار اعظمی انصاری (بیگم عطیہ خلیل عرب کے خاوند محترم اور نائلہ انصاری کے والد گرامی) کے مضامین اخبار "جنگ" اور کلام "راوی" میں پڑھے تو خواب میں ان سے ملاقات کا منصوبہ بنا۔ اس وقت وہ دو سلانی (Bilinval) روزنامہ "آواز" کے مدیر مرحوم انور خالد کے ساتھ بہت اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ چنانچہ اعظمی سے ملاقاتوں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ وہ "تحریکِ ادب اسلامی" کے نقیب بن گئے۔ اس زمانے میں انہوں نے کشمیر، بوسنیا، عراق اور دیگر علاقوں کے مظلوم مسلمانوں کی حمایت میں نثر و نظم کے شاہکار رقم فرمائے۔ میرے غریب خانے پر تحریک ادب اسلامی" کی نشست میں ایک دفعہ وہ تشریف نہ لا سکے تو رات کو فون پر انہوں نے اپنا تازہ کلام اس طرح سنایا جیسے کوئی الوداع ہونے والا اپنے دل کی باتیں جلدی جلدی ساری کہہ ڈالتا ہے۔ اسی ہفتے ان کا انتقال ہو گیا۔ سوچتا ہوں کہ خواب میں ملاقات کے منصوبے کی اگر تعمیل یا تعبیر نہ ہو پاتی تو ان کے آخری ایام کے انقلاب انگیز خیالات و افکار سے ہم سب کس قدر محروم رہتے۔ آخری دنوں میں فرمایا "اگر آپ سے کچھ عرصے پہلے ملاقات ہوتی تو مجھے آپ بہت دور پاتے جہاں سے واپسی کا تصور تک نہ تھا لیکن اب میں حالات کے نتیجے میں اس قدر بدل چکا ہوں کہ اپنے آپ کو مدینہ میں رہتا محسوس کرتا ہوں۔" بعض خواب واقعی اشارہ غیبی ہوتے ہیں۔

میں نے اپنی 75 اشعار کی طویل نعت (بلکہ افتخار اعظمی مرحوم کے الفاظ میں نعتیہ قصیدہ)

روزنامہ 'جنگ' کو اشاعت کے لیے بھیجی اور پھر اخبارات کے معمول بہ ترجیحات کے پیش نظر اشاعت سے مایوس ہو کر بھول بھلا بیٹھا۔ چند ماہ بعد اچانک شعبہ ادب کے اُس وقت کے نگران اور شاعر افتخار قیصر صاحب (جن کی "سمندر میں سمندر" کی سی ڈی مرحوم نصرت فتح علی خان کی آواز میں "جنگ" نے فروخت کی ہے) کا فون آیا کہ میں اس نعت کی نقل جلد سے جلد بھیجوں۔ کیوں؟ "پہلی نعت ہم سے گم ہو گئی ہے لیکن مالک "جنگ" میر جاوید رحمٰن بن خلیل الرحمان نے دیکھی تھی اور اب حکم فرمایا ہے کہ شائع کی جائے۔" اگر جاوید صاحب کراچی سے فون کر کے یہ حکم لندن نہ بھیجتے تو یہ نعت بھی شائع نہ ہوتی لہٰذا شعر یوں ہونا چاہیے ؎

قدر گوہر شاہ داند نہ بداند جوہری

اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے لیکن اس بات کو تو اردو والے بھی شاید نہ مانیں۔ اہلِ اردو پر "احساس کمتری" یا "انگریزی نوازی" کا بھوت اس قدر طاری ہے کہ ہمارے اردو شاعر (ہمارے دوست رشید منظر صاحب خالق "آئینہ پس آئینہ") کے باقاعدہ مضامین کے ذریعے ایک مہم چلا کر 'رلوی' کو اردو ہندسوں کی جگہ انگریزی ہندسے اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اردو کے ہندسے عربی ہندسوں کے ہم شکل ہیں جن کو اختیار و ترمیم کے نتیجے میں ہی انگریزی ہندسے معرضِ وجود میں آئے ورنہ یورپ میں رومن ہندسوں کی موجودگی سے زمانۂ حال کی تمام تر ترقی خصوصاً کمپیوٹر کی ترویج تقریباً ناممکن تھی۔ اردو ہندسوں کی جگہ انگریزی ہندسے لانا ایسا ہی ہے جیسے دہلی اور جہلم کو دلہی اور جھیلم لکھنا کیونکہ انگریزی میں Delhi اور Jhelum لکھا جاتا ہے۔ اردو کے لیے رومن رسم الخط کو اختیار کرنے کی باتیں اسی "احساس کمتری" کا نتیجہ ہیں۔

اردو زبان کی تحریر اور لغت میں توسیع اور تبدیلی تو ضروری ہے لیکن اس کا حلیہ بگاڑنا اردو پر ظلم ہے۔ اردو کیا ہر زبان کو دوسری زبانوں میں لکھنے اور پیش کرنے کا یعنی Transliteration کا ایک طریقہ کار تو ہونا چاہیے لیکن کسی بھی زبان کو اس کے روایتی طرزِ تحریر و کتابت سے ہٹا کر کسی اجنبی رسم الخط میں لکھنے کا نتیجہ وہی ہو گا جو ترکی زبان کو رومن رسم الخط میں منتقل کرنے سے ہوا۔ اردو زبان میں تمام جدید علوم کی تحصیل کو ممکن بنانے سے اور اس زبان کو ہر جدید ذریعۂ ابلاغ کے ذریعہ استعمال کرنے سے یقیناً اردو کا مستقبل روشن ہو گا۔ فی الحال برطانیہ میں اردو شاعری صرف مشاعروں تک محدود ہے (یا پھر مساجد میں اردو کے خطبات تک) گھر کی بول چال کی زبان زیادہ تر انگریزی ہے۔ نئی نسل تک اب تو اسلام بھی اردو کی بجائے انگریزی زبان میں پہنچ رہا ہے۔ پاکستان کے اربابِ تعلیم و انتظام نے تمام غیر ممالک میں اردو اسکول قائم کیے ہیں (مثلاً ایران، عرب ممالک وغیرہ) لیکن یورپ یا امریکہ میں کوئی اردو میڈیم اسکول قائم کرنے کی سوچ بھی نہیں سکتا کیونکہ ہم اردو نواز لوگ انگریزی کے تسلط پر مطمئن بلکہ مسرور ہیں۔ جس طرح عرب عربی زبان میں اور جاپانی اپنی زبان میں کسی غیر ملکی سے گفتگو کرنے میں فخر محسوس کرتا، بلکہ اپنی مادری زبان

بولنے والے غیر ملکی کو اپنا ہم وطن سمجھنا شروع کر دیتا ہے اسی طرح جب اور جس وقت اردو بولنے والا شخص اپنے ملکی دوست کا اردو میں بات کرنے پر اعزاز و اکرام کرے گا تب ہی ہم اردو کے مستقبل سے مطمئن ہوں گے۔

شاعری میں غزل جیسی ہمہ رنگ اور اعلیٰ ظرف صنف کوئی اور نہیں۔ اردو، فارسی شاعری کی بقاو مقبولیت کا زیادہ تر سہرا غزل کے سر جاتا ہے۔ دوسرے نمبر پر قطعہ، دوہا، ماہیا اور رباعی ہیں۔ ہائیکو بھی دراصل ہمارے ماہئے کی ہی ایک شکل ہے جس میں دوسرے مصرعہ کو مصرعوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ہم ہر غیر ملکی چیز پر فریفتہ ہیں۔ کل کلاں کو کسی برزجمہر نے کسی یورپی، چینی، روسی زبان میں غزل کے مماثل کوئی صنف دیکھ لی تو اسی صنف کا نام مروج کر کے بے چاری غزل کو سوکن کے نام سے گھر میں بسائے گا۔ نثری نظم اور نثری غزل کے تجربے تو بہت ہوئے ہیں لیکن کمال کی چیزیں بہت کم ہیں۔ بے شک عروض و قوافی کی تنگنائیوں نے شاعری کے دریا کو پوری جولانیوں سے بہنے نہیں دیا لیکن ان پابندیوں نے اس دریا کو صحرا کی طرف بھی نہیں جانے دیا نہ ہی آباد بستیاں ویران کرنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔ تجربہ بتاتا ہے کہ دنیائے انسانیت میں نظم بھی رہے گی خالص نثر بھی رہے گی اور ان دونوں کے مابین طرز ہائے اظہار بھی۔ فطرت افراط، تفریط اور اعتدال تینوں کو قائم رکھتی ہے لیکن ترویج مقبولیت کی انتہا تک یا تو شعر کا سحر پہنچتا ہے یا پھر نثر کا اثر۔ بین بین کی چیزیں مقالات و امثال و استعارات کی صورت میں زندہ رہیں گی لیکن بہت کم۔

آج ہمیں مشاعروں کی بھی ضرورت ہے اور تنقیدی و تخلیقی نشستوں کی بھی۔ شاعری، خصوصاً اردو شاعری کو کس مپرسی سے نکالنے کے لیے جو کچھ بھی ہو سکے کیا جائے۔ فاقہ زدہ کے سامنے خشک روٹی یا پلاؤ کا اختیار پیش نہیں کیا جاتا۔ میرے خیال میں نثر و شعر کی تدریس و تعلیم کی زیادہ ضرورت ہے۔

الیکٹرونک میڈیا کلی طور پر پرنٹ میڈیا کا نعم البدل نہیں ہو سکتا جو لطف کتاب پڑھنے سے ملتا ہے وہ انٹرنیٹ کے صفحات سے نہیں ملتا۔ کتابیں بھی رہیں گی اور کمپیوٹر بھی لیکن توازن برقرار رکھنے کے لیے صرف کتابوں پر انحصار کافی نہیں۔ کتاب کو کمپیوٹر پر اور کمپیوٹر کو کتاب پر منتقل اور محفوظ کرنا دونوں عمل ضروری ہیں۔ کسی ایک سے اغماض نقصان دہ ہے۔

تنقید نگار ایک ایسا مالی ہے جو پودے اگاتا تو نہیں لیکن ان کی کاٹ چھانٹ اور چمن آرائی کا ماہر ہے۔ حالی نے مسدس لکھ کر "مقدمہ شعر و شاعری" لکھا اور آنے والے نقادوں کے لیے ایک روشن نمونہ پیش کیا۔ آج کیفیت یہ ہے کہ شاعر شاعری سے روٹی نہیں کما سکتا، افسانہ نگار اپنی تخلیق کے بل پر اپنا پیٹ نہیں پال سکتا لیکن ایک پیشہ ور نقاد صرف نثر و نظم کی کتابوں پر تبصرہ و تنقید کر کے اپنا پیٹ پال لیتا ہے۔ میرے خیال میں شاعری کے نقاد کا صرف شعر فہم ہونا ضروری نہیں بلکہ معیاری شاعر ہونا لازمی ہے۔ محمد علی صدیقی جیسے نقاد کے ہوتے ہوئے فن تنقید پر اظہار تعزیت

درست نہیں۔ البتہ نقد و جائزہ کے فن کی تدریس و تعلیم اسی طرح ضروری ہے جس طرح اصناف ادب کی تخ
طرح ضروری ہے جس طرح اصناف ادب کی تخلیق و تعلیم۔

MR.FAYAZ ADIL FAROOQI
62 ENNERDALE AVE STANMORE MIDDX
HAZ 2LD ENGLAND U.K

جو بہرِ حق و صداقت ہے دوستو
ایسے قلم میں سیف کی قوت ہے دوستو

میرا سخن خدا کی امانت ہے دوستو
میری صدا صدائے بغاوت ہے دوستو

دیکھ تو کتنی شب کی یہ ظلمت ہے دوستو
دیوار درمیانِ اخوت ہے دوستو

غیرِ خدا کی یہ بھی عبادت ہے دوستو
ہر خاکسار صاحبِ رفعت ہے دوستو

بازار میں ہر ایک کی قیمت ہے دوستو
بے سود تیرگی پہ ملامت ہے دوستو

عادلؔ
یہ دوستوں کی عنایت ہے دوستو
کہ اب خطر میں رسمِ محبت ہے دوستو

عبید الرحمٰن عارف

وسکاونسن۔ امریکا

کتنے کٹھن ہوتے ہیں وہ روز و شب جب انسان کچھ کرنا چاہے اور کر نہ سکے اور "جبر" کے عذاب سے گزرے۔

عبید الرحمٰن عارف نے وہ کٹھن عرصہ گزارا ہے اور نہ صرف سال دو سال کا بلکہ پندرہ، بیس سال کا طویل عرصہ گزارا۔ انھیں طالب علمی کے زمانے سے شعر گوئی کا شوق تھا مگر ....!

آیئے ان کی کہانی ان کی زبانی سنتے ہیں کہ انھیں اپنی محبوبہ شاعری کی منزل تک پہنچنے کے لیے کتنے کتنے پل صراط طے کرنا پڑے ہیں۔

"میں عبید الرحمٰن تخلص عارف 6 مارچ 1935ء کو بنگلور (ہندوستان) میں پیدا ہوا۔ 1956ء میں بی ایس سی کرنے کے بعد انجینئرنگ میں داخلہ لے کر 1924ء میں بی۔ ای کی ڈگری حاصل کی۔ یہ دونوں ڈگریاں مجھے میسور یونیورسٹی سے ملیں۔ ہائی اسکول کا آخری سال تھا کہ میری طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہوئی۔ میرے ہم عمر لڑکوں کو شاعری سے شوق نہ تھا للٰذا جو بھی دواوین ملے لا کر مطالعہ کرتا رہا۔ مشاعروں میں شمولیت کی جدوجہد بھی کی۔ کہنہ مشق شاعروں سے اصلاح لی اور اس طرح یہ شوق آگے بڑھتا رہا لیکن انجینئرنگ کی پڑھائی کی کٹھن تھی۔ بزرگ بھی شاعری

کو شجرِ ممنوعہ قرار دے رہے تھے لہٰذا دل مارنا پڑا۔ B.E کی ڈگری کے بعد ہی 1964ء میں شادی ہوئی اور اسی سال امریکہ آنا ہوا۔ یہاں پر انجینئرنگ کی ماسٹرس ڈگری اور زیادہ کٹھن نظر آئی۔ چھوٹی موٹی ادبی محفلیں پھر بھی مل جاتی تھیں مگر شاعری کی بساط کئی سال تک لپیٹ دینی پڑی۔ جہاں پر میں کام کرتا تھا اُن شہروں میں اردو کا ماحول دور تک نہ ملا اور شاعری کرنے کا خواب ایک بجھتی ہوئی چنگاری بن کر رہ گیا۔ بائیس، تئیس سال پرائیویٹ سیکٹر میں روزگار حاصل کرنے کے بعد شکاگو کے قریب یعنی میڈیسن وسکانسن میں فیڈرل گورنمنٹ میں نوکری ملی اور شاعری جو ایک حسین خواب بن کے رہ گئی تھی اس کی تعبیر ملتی نظر آئی۔ تاریخی اور بین الاقوامی مشاعروں میں شمولیت کا موقع ملا۔ اساتذہ اور شعراء سے ملاقاتیں ہوئیں اور اس طرح شاعری کا شعلہ پھر سے بھڑک اُٹھا۔ مطالعہ ہونے لگا۔ مشاعرے اور بیٹھکیں ہوتی رہیں اور یوں میری منزل قریب ہوتی گئی۔ اب میری خواہش ہے کہ اپنی شاعری کو بلند مقام تک پہنچاؤں اور اردو کی خدمت کروں۔

حالانکہ میں نے حمدِ باری تعالیٰ، نظم اور سونیٹ وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے مگر میرا رجحان زیادہ تر غزل کی طرف ہے۔ (میرا کمفرٹ زون غزل ہے) کالج کے زمانے میں شہر میسور میں مہاراجاس کالج میں "مخزن" نامی ایک جریدہ شائع ہوا کرتا تھا۔ میری تخلیقات اس میں شائع ہوتی تھیں۔ ہندوستان میں "پاسبان"، "سلطان" اور سالار بنگلور کے علاوہ 'سیاست' حیدر آباد دکن، اور لاس اینجلس سے شائع ہونے والے "پاکستان لنک" میں میرا کلام شائع ہوتا ہے۔ اب تک کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا لیکن رب العزت سے امید ہے کہ ایک دن یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی، آمین۔

میں اپنی شاعری میں کبھی کبھی دکنی لب ولہجہ استعمال کرنا بھی پسند کرتا ہوں ہر شاعر کی طرح میں بھی اپنا کلام سنانے کا خواہش مند رہتا ہوں چنانچہ پچھلے ایک دیڑھ سال سے میں نے انٹرنیٹ پر "ہوم پیج" سیٹ کیا ہوا ہے اُس کے ذریعے بھی بیسیوں سامعین تک میرا کلام پہنچ جاتا ہے۔
میرے ہوم پیج کا پتہ یہ ہے:

http://members.xoom.com/urdu poetry

قدیم اساتذہ سے لے کر جدید شاعروں کے دواوین اور مجموعہ کلام کا میں مطالعہ پسند کرتا ہوں۔ اس طرح سے میں نے اقبال، غالب، میر تقی میر، فیض احمد فیض، احمد فراز، چکبست، فراق، قتیل، شکیل بدایونی، جگر مراد آبادی سب کو پڑھا ہے ناول بھی کافی پڑھے ہیں۔ ایم اسلم کے ناول بہت دلچسپی سے پڑھتا تھا اور جاسوسی ناولوں میں بھی کافی دلچسپی ہے چند ایک مذہبی کتابیں بھی ہاتھ لگ جائیں تو مطالعہ کر لیتا ہوں۔

میری زندگی کا اہم واقعہ اور اہم دن وہ ہے جب میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ سگریٹ نوشی ترک کر دوں گا اس سے پہلے کئی دفعہ سگریٹ چھوڑی مگر مستقل نہ چھوڑ سکا۔ پھر دسمبر 1977ء

میں یہ ارادہ کرلیا کہ پہلی جنوری 1978ء سے سگریٹ کو چھوؤں گا تک نہیں اور میں اس میں کامیاب رہا ہوں۔ اس ارادے کے پیچھے ایک مضبوط خواہش یہ تھی کہ میں اپنے بچوں کے لیے ایک مثالی کردار بننا چاہتا تھا اور انہیں ایک اچھے راستے پر چلنے کی ہدایت دینا چاہتا تھا اور دوسری یہ کہ اپنے پھیپھڑوں کو تمباکو کے بدنما داغوں سے بچانا چاہتا تھا۔

میں اردو زبان کے مستقبل کے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں۔ بے شک اردو کے کئی محافظ موجودہ نسل میں زندہ ہیں مگر اس نسل کے بعد یقینی طور پر کہنا مشکل ہے کہ اردو کی ترقی اسی طرح سے ہوگی جیسی کہ اب ہو رہی ہے۔ ہمارے بچے یعنی نئی نسل کے لوگ اردو پڑھنا لکھنا تو دور کی بات، اردو بول بھی نہیں سکتے، کہیں کسی تقریب میں کچھ اردو میں بچوں کو کہنا بھی ہے تو بدقسمتی ہے کہ وہ انگریزی میں لکھ کر پرچہ لے آتے ہیں۔ بچوں کو انگلش اسکول میں داخلہ دلانا کئی والدین اپنا فرضِ اولین سمجھتے ہیں۔ ہمارے نوجوان اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کو اردو آتی ہی نہیں چنانچہ اردو صرف بولنے کی زبان بن کر رہ جائے گی۔ اردو دان طبقے اور محافظوں کو چاہئے کہ وہ چند کمیٹیاں قائم کریں اور اس کا حل تلاش کریں کہ اردو کا مستقبل کیسے محفوظ کریں! کوشش کرکے اسے اسکولوں میں اختیاری زبان کے طور پر منظور کرائیں۔

اظہارِ خیال کے لیے میری نظر میں صنفِ غزل سب سے مناسب اور بہتر ہے۔ ہر شعر میں ایک نیا خیال پیش کر سکتے ہیں۔ اسی طرح بہ نسبت نظم کے کئی خیالات پیش کر سکتے ہیں۔ ایک ہی قافیہ ردیف ہونے کی وجہ سے غزل دعوتِ فکر زیادہ دیتی ہے۔ نثری نظم، نثری غزل اور آزاد نظم میں، میں نے طبع آزمائی نہیں کی ہے۔ ادب کی تخلیق کے لیے مشاعرے یقیناً معاون ثابت ہو سکتے ہیں تخلیقی نشستوں کو بھی یقیناً فروغ ملنا چاہئے۔

میں یہ کہنا چاہوں گا کہ الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ علم کو اور زیادہ ترقی مل رہی ہے۔ لوگ انٹرنیٹ کے ذریعے زیادہ سے زیادہ چیزیں اپنی میز پر ہی بیٹھے دیکھ سکیں گے لیکن کتابوں کی اشاعت اور مطالعے میں کمی نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ کتابیں پڑھنا تو انسان کی فطری ضرورت ہے حالانکہ P.D.F (Portable Document format) فائل کے ذریعے ساری ساری کتاب کو اڈوبی آکروبیٹ (Adobi Acrobat) کے تحت ڈاؤن لوڈ کر کے کمپیوٹر میں دیکھا تو جا سکتا ہے مگر اس پر غور سے جانچ کرنے کے لیے اور تفصیلات حاصل کرنے کے لیے ہارڈ کاپی یعنی پرنٹڈ کاپی کی ضرورت ہوتی ہے اس صورت میں چاہے اوپر لکھے ہوئے طریقے سے ساری فائل پرنٹ کرلیں یا کتاب ہی کی ایک کاپی منگوالیں۔ کمپیوٹر کے ذریعے، پڑھنے والے اور زیادہ مل جاتے ہیں۔ سرسری نظر سے دیکھنے کے لیے الیکٹرانک میڈیا ٹھیک رہتا ہے مگر گہرے مطالعہ کے لیے مواد کا کتاب کی شکل میں ہونا ضروری ہے۔ اردو رسم الخط کے صفحات بھی اسکیننگ کے ذریعے کمپیوٹر اسکرین پر ڈالے جا سکتے ہیں اور پرنٹ بھی کیے جا سکتے ہیں۔ آج کل کئی اردو جریدے اپنا ہوم پیج بنائے ہوئے

ہیں جس کی وجہ سے ان کی شہرت میں اضافہ ہوا ہے اور اسطریقے سے ہارڈ کاپی یعنی جریدے کی یا کتاب کی مانگ اور بڑھ رہی ہے الیکٹرانک میڈیا علم کو اور فروغ دے رہا ہے، ساتھ ہی ساتھ کتابیں اور جریدے اور زیادہ تعداد میں شائع ہو رہے ہیں۔ کمپیوٹر پر صرف ایک ہی صفحہ بہ یک وقت دیکھا جاسکتا ہے جبکہ کتاب ساری کی ساری آپ کے نظروں کے سامنے رہتی ہے اور کتاب زیادہ آسانی سے اپنے بیگ اور شیلف میں رکھی جاسکتی ہے۔

دورِ حاضر میں اردو میں نقادوں کی بالکل کمی ہو گئی ہے۔ نقاد کو پہلے علم پر یا ادب پر پورا عبور حاصل کرنا چاہئے۔ تنقید واقعی ترقی ادب کے لیے ایک اہم جز ہے جیسا کہ غالب، اقبال وغیرہ کے کلام پر تنقیدوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ تبصرے یا تنقید سے لکھنے والے خود اپنی غلطیاں یا کوتاہیاں پہچان سکتے ہیں۔ گہری اور اچھی تنقید سے مصنف اور شاعر کوتاہیوں سے احتراز کر سکے گا اور ادب کی ترقی ہو گی۔ غلطیاں دور ہو جائیں گی۔ نقاد کو چاہئے کہ اس کی تنقید معنی آفریں ہو، محض موضوعاتی یا داخلی نہ ہو۔ میری نظر میں تنقید تحریر کا نکھار ثابت ہوتی ہے۔ کسی بھی چیز کو جب تک کسوٹی پر رکھ کر نہ جانچا جائے تو اس کی اصلیت کا پتہ نہیں چلتا۔

M.O. RAHMAN
2922 BRANDON RD. MADISON, WISC 53719 U.S.A

خطاب بہ جامعہ عثمانیہ

السلام اے عظمتِ ہندوستاں
السلام اے رہنمائے کارواں

گلشنِ علم و ادب کے باغباں
جانِ جانانِ دکن، قلبِ جہاں

کشورِ ارضِ وطن تیرا وجود
باعثِ فخرِ جہاں تیرا نمود

اے جہانِ علم و فن کی آبرو
تیری خوشبو ہے چمن کی آبرو

تھے ترے بانی بڑے اعلیٰ نظر
تو دلِ مسلم کا ہے پیغام بر

ہے کہ تو ہے عظمت و شانِ دکن
ہے علمبردارِ فن، رنگِ وطن

گھٹائیں یوں بھی کب برسی ہیں میری کشتِ ویراں پر
سو یوں کرتے ہیں اب بادل تمہارے، بجلیاں میری

سید عاشور کاظمی

۱۲ اپریل ۱۹۹۹ء

سید عاشور کاظمی

برمنگھم برطانیہ

آج کا دن بھی پاکستان کی تاریخ کا ایک یادگار دن ہے۔ آج 12 اکتوبر 99ء ہے۔ میں شعراء کے تعارف لکھ رہی ہوں اور درمیان میں گاہے گاہے سی این این (CNN) سے خبر بھی سن رہی ہوں۔ احباب کے فون آرہے ہیں۔ پاکستان میں نواز شریف کی حکومت ختم کردی گئی۔ میں نے ٹی وی بند کردیا۔ اب میرے سامنے سید عاشور کاظمی ہیں جن کے سامنے میں انہی کا شعر گنگنا کر پوچھتی ہوں۔

ارضِ وطن سے آنے والے دیس کا کچھ احوال سنا
خوف کی چادر اوڑھے بیٹھی قوم کی حالت کیسی ہے؟

عاشور! آپ پر یہ شعر کب اترا تھا؟ وہ
میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے مجھے ایک اور شعر سنا رہے ہیں۔

گھر کے دربانوں نے سارے گھر پہ قبضہ کرلیا
ہم نے آنکھیں کھولنے میں کس قدر تاخیر کی

پھر وہ لمحے بھر کو چپ ہوئے اور میرا سوال جو میری زبان کی نوک پر تھا گویا میرے چہرے پر لکھا گیا تھا پڑھ کر جواب میں کہنے لگے۔

"ہماری تو عمر ہی مارشل لاء کی چھت تلے گزری ہے۔ پہلے مارشل لاء کے دوران ہم لاہور سے 1958ء میں کراچی آئے تھے ویسے پہلی ہجرت مشرقی پنجاب سے مغربی پنجاب (پاکستان) کی جانب تھی۔ 1977ء میں پھر مارشل لا لگا تو ہم کراچی سے برطانیہ آگئے اور تب سے یہیں مقیم ہیں۔"

عاشور بتارہے تھے "میری شاعری کا آغاز 14 اکتوبر 1942 سے ہوا۔ میری عمر چودہ سال تھی۔ جوش کے مرثیے پڑھنے کے بعد میرے ذہن نے انقلابی کروٹ لی۔ انیس کے مرثیوں کے مطالعہ نے پہلے ہی زمین ہموار کر رکھی تھی۔ جوش نے کہا تھا:

فکر پہ سوز یہاں کاشت نہیں کر سکتی
کربلا تاج کو برداشت نہیں کر سکتی
کوئی کہہ دے یہ حکومت کے نگہبانوں سے
کربلا اک ابدی جنگ ہے سلطانوں سے

ویسے میری پہلی نظم آزادی سے متعلق تھی اس کے بعد باقاعدہ شاعری کا آغاز ہو گیا۔ ابتداء میں ایک عرصہ حکیم الامت ڈاکٹر اقبال اور جوش کا اثر غالب رہا۔ 1952ء میں شائع ہونے والا پہلا شعری مجموعہ "بربطِ احساس" اقبال کے رنگ میں تھا اور حمد و نعت و سلام دوسرے مجموعے (مطبوعہ 1953ء) "چراغِ منزل" پر جوش کا رنگ غالب تھا۔

1954 میں پاکستان میں "انجمن ترقی پسند کے لیے اظہار کے راستے مسدود ہو گئے تو 1957ء میں ایک فلم کی کہانی، مکالمے گانے بھی لکھے اور اسے "بے گناہ" کے نام سے بحیثیت فلم ساز مکمل کیا۔ طبقاتی کشمکش کے موضوع پر یہ پہلی بے باک فلم تھی۔ فلم سنسر بورڈ نے چھ بار قطع برید کی مگر ہم نے بہر حال اسے ریلیز کیا۔ 1958ء میں مکمل ہونے والی اس فلم کا ایک نغمہ جسے گلوکارہ نسیم بیگم نے گایا تھا آج بھی مقبول ہے، بول ہیں

نینوں میں جل بھر آئے، مورکھ من ترپائے، روٹھ گیا مورا پیار

عاشور لمحے بھر کو چپ ہوئے پھر بولے:

"فکری انقلاب تحریکوں کے ذریعے بھی لایا جاسکتا ہے اور انفرادی طور پر بھی۔ علامہ اقبال نے انفرادی طور پر اپنی شاعری کے ذریعے فکری انقلاب پیدا کیا۔ ان کی فکر نے لوگوں کی فکر کو ایک نیا موڑ دیا۔ ان کی شاعری میں آفاقی پیغام ہے۔ ویسے عموماً تحریکیں ادیبوں کو جنم دیتی ہیں لیکن بعض ادیب خود اتنے قد آور ہوتے ہیں کہ وہ خود ہی کسی تحریک کو جنم دیتے ہیں۔ گو آج ترقی پسند تحریک باقی نہیں لیکن اس تحریک کا کردار ترقی پسند مصنفین ادا کر رہے ہیں۔ فراق اور مجاز نے نئے خیالات کو جنم دیا اور آگے بڑھایا۔ فیض کی شاعری نے بعد میں آنے والے شعرا کی رہنمائی کی اور بہت سے ایسے نام ہیں کہ جنھوں نے شاعری اور نثری ادب کی ایک نئی تاریخ رقم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

اپنے وطن سے دور برطانیہ میں عاشور کاظمی نے بھی ادب کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ وہ خود

بھی شعری اور نثری ادب کی تخلیق میں مصروف رہے اور اپنے احباب کو اپنے دائرۂ کار میں لاکر اردو ادب کے پودے کی آبیاری کے لیے کام کرتے رہے اور کررہے ہیں۔

اب ذرا عاشور کاظمی کے ادبی وسماجی کاموں پر نظر ڈالی جائے۔

E.M.I پاکستان نے "تازہ ہوا" کے نام ان کی غزلوں کا کیسٹ ریلیز کیا ہے جو بازار میں دستیاب ہے۔ امریکہ کی ایک کمپنی Ethernal Vibs نے "گوشِ آمدید" کے نام سے عاشور کاظمی کی غزلوں کی CD ریلیز کی ہے۔ عام طور پر گائیکی کے لیے رومانی غزلیں منتخب کی جاتی ہیں لیکن EMI کی کیسٹ اور Ethernal Vibs کی CD میں عاشور کاظمی کی احتجاجی شاعری بھی مقبول ہوئی ہے، جیسے کہ :

جبر کے اندھیروں میں زندگی گزاری ہے
اب سحر جو آئے گی، وہ سحر ہماری ہے

1958ء میں لندن میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی گولڈن جوبلی کے سلسلے میں تین روزہ جشن (بین الاقوامی کانفرنس اور مشاعرہ) منعقد کیا گیا جس میں پوری دنیا سے 64 دانشوروں نے شرکت کی۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین 1935ء میں لندن میں قائم کی گئی تھی۔ گولڈن جوبلی کی ان تقاریب کے روحِ رواں عاشور کاظمی تھے۔ نہ صرف وہ ادیب جو اس جشن میں شریک ہوئے بلکہ پوری دنیا کے ادیب اور دانشور اس بات پر متفق ہیں کہ یہ کانفرنس ایک عہد ساز کارنامہ تھا۔ اس جشن کے بعد عاشور کاظمی نے بوجوہ، انجمن کے سیکریٹری جنرل کی حیثیت سے علیحدگی اختیار کرلی لیکن انہیں دوبارہ نائب صدر منتخب کیا گیا مگر اس جشن کے بعد یہ انجمن برطانیہ میں فعال نہ رہی۔

1986ء میں عاشور کاظمی نے انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹ اینڈ لٹریچر کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس نے انگلستان میں اردو کی کتابیں شائع کرنی شروع کیں۔ یہ ادارہ اب تک اردو کی 23 کتابیں شائع کرچکا ہے۔ اس کے علاوہ انجمن ترقی پسند مصنّفین کی گولڈن جوبلی کے موقع پر انگریزی زبان میں پڑھے گئے مقالوں پر مشتمل ایک کتاب "Committment" بھی شائع کی ہے اور Books for the Third World پروگرام کے تحت انگریزی اور فرانسیسی زبان میں سات کتابیں بھی شائع کی ہیں جن میں کیمرون کے بے باک صحافی Ako-Aya کی Antholgy بھی شامل ہے۔ کیمرون کا یہ (بزبانِ صاحبانِ اقتدار) "باغی" صحافی اس حد تک معتوبِ بارگاہ حکومت تھا کہ سرکاری ہسپتالوں میں اس کا علاج نہیں ہوسکتا تھا اور اپنی عمر کے آخری حصے میں وہ جادوگرنیوں کے زیرِ علاج ایڑیاں رگڑتا ہوا مرا۔

یہ انسٹی ٹیوٹ اردو کے Research Scholars سے بھی تعاون کرتا ہے جو انگلستان میں اردو پر تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ اب تک انسٹی ٹیوٹ نے ایک سے زیادہ اسکالرز کو اسپانسر کیا ہے۔

1932 میں فرید پور سدات پانی پت (ہندوستان) میں پیدا ہونے والے، عاشور نے محنت اور

لگن سے خود کو منوایا ہے لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کے بعد 1986ء میں ہندوستان اور پاکستان انجمن کی گولڈن جوبلی منائی گئی۔ ہندوستان میں جوبلی کے موقع پر دانشوروں کی کمیٹی نے تین "سجاد ظہیر ایوارڈ" منظور کیے:

(الف) سید عاشور کاظمی (برطانیہ) (ب) سید سبط حسن (پاکستان) (ج) ہندوستان سے کیفی اعظمی

(2) عالمی اردو کانفرنس نے انہیں پھر "سجاد ظہیر ایوارڈ 1988ء" دیا۔

(3) اردو مرکز انٹر نیشنل، لاس اینجلس، کیلیفورنیا کی طرف سے 1989ء میں مغرب میں اردو کی نشر و اشاعت اور ترویج کے اعتراف کے طور پر عالمی ایوارڈ دیا گیا۔

(4) جانِ گلکرسٹ میڈل 1992ء

میں مشکل میں تھی کہ عاشور کا انتخاب بحیثیت شاعر "سخن ور چہارم" کے لیے کیا جائے یا بحیثیت نثر نگار "گفتنی" میں انہیں جگہ دی جائے۔ کیونکہ عاشور بہ یک وقت محقق، ناقد اور ادیب بھی ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "راہوں کے خم" 1987ء میں شائع ہوا ہے۔ 1986ء میں "ترقی پسند ادب: پچاس سالہ سفر، پروفیسر قمر رئیس اور سید عاشور کاظمی نے مل کر مرتب کیا۔

1985ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے پچاس سال مکمل ہوئے۔ اس تحریک نے نہ صرف اردو بلکہ برصغیر کی دوسری زبانوں کے لکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کو یہ شعور دیا کہ زندگی کے حقائق سے منہ موڑ کر تخلیق کیا جانے والا ادب بے معنی ہے اور ادیبوں کو چاہیے کہ وہ خوابوں میں رہنے کی بجائے زندگی کے حقائق سے رشتے استوار کریں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ادیبوں نے اس نہج کو اپنایا اور ہر قابلِ ذکر ادیب اس تحریک سے وابستہ ہو گیا۔ "ترقی پسند ادب، پچاس سال سفر" میں گزشتہ پچاس سال میں تخلیق ہونے والے ترقی پسند ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب کا ایک ایڈیشن لندن سے، دو ایڈیشن ہندوستان سے اور چوتھا ایڈیشن پاکستان سے شائع ہو چکا ہے۔

"صراط منزل" کے عنوان سے نعت، منقبت، سلام کا مجموعہ 1987ء میں شائع ہوا اور پھر لگاتار اس کے مزید دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ 1990ء میں "سخن گسترانہ بات" شائع ہوئی جو مضامین، طنز و مزاح، انشائیے اور خاکوں پر مشتمل ہے۔

دانشوروں کا خیال ہے کہ عاشور کاظمی نے طنز و مزاح میں نئی راہیں تلاش کی ہیں۔ نثر کا یہ اسلوب ان کا اپنا ہے۔ کتاب میں مزاح کی چاشنی بھی ہے اور طنز کے نشتر بھی، انشائیے بھی اور خاکے بھی۔ وہ مضامین جو تحقیقی ہیں ان میں بھی نثر کی جداگانہ اور شگفتہ روش باقی رہتی ہے۔ اس کے چار ایڈیشن شائع ہوئے۔ دو دہلی سے ایک لندن اور ایک ماسکو سے 1991ء میں روسی زبان میں شائع ہوا۔

1993ء میں شائع ہونے والی "فسانہ کہیں جسے" افسانے پر تحقیق ہے۔ اس کتاب میں دو ہزار قبل مسیح سے حال تک، افسانے کے عروج و زوال پر بحث کی گئی ہے اور یورپی ممالک بشمول جنوبی امریکہ اور روس کے سارے عہد وساز افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے حوالے سے افسانے کے ارتقاء

کا جائزہ لیا گیا ہے نیز اردو میں افسانے کی دونوں روایتوں کے تناظر میں مغرب میں آباد اردو کے اکتالیس افسانہ نگاروں کا تعارف اور ان کے نمائندہ افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے متعلق ناقدین کی رائے ہے کہ افسانے پر بات کرتے وقت اس کتاب کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس موضوع پر اب تک اتنی معلومات کسی ایک کتاب میں شائع نہیں ہوئی۔ اس کے دو ایڈیشن لندن اور دہلی سے شائع ہوئے ہیں۔

ان کی آٹھویں کتاب ہے۔ "اس گھر کو آگ لگ گئی"۔ (1993) یہ جدوجہد آزادی کے تناظر میں غداروں کے خطوط پر مشتمل دستاویز ہے۔

مئی 1957ء میں ہندوستانیوں نے انگریزوں کے تسلط سے آزادی حاصل کرنے کی مسلح جدوجہد کی جسے انگریزوں نے (Mutiny) غدر کہا۔ یہ جنگ پانچ ماہ جاری رہی اور آخر کار انگریزوں نے دہلی پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ انگریزوں کی اس فتح کا دارومدار انگریزوں کو ان جاسوسوں اور غداروں کی فراہم کردہ اطلاعات پر تھا جو حریت پسندوں کی جنگ حکمت عملی قبل از وقت انگریزوں کو بھیج دیتے تھے۔ غداروں کے یہ خطوط برطانیہ کی لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔

محقق سلیم قریشی نے ان خطوط کی نقول کے حصول اور ترجمے کا اہم کام سرانجام دیا اور سید عاشور کاظمی نے ان خطوط کے حوالے سے جنگ آزادی بلکہ 1600ء میں انگریزوں کی ہندوستان میں بحیثیت تاجر آمد سے لے کر 1857ء کی جنگ آزادی بلکہ پوری تحریکِ آزادی اور اس دور کے اہم واقعات کو جمع کر کے ان خطوط اور سلیم قریشی کے کام کی افادیت کو اجاگر کیا ہے۔ یہ کتاب سلیم قریشی اور عاشور کاظمی کے اشتراک و عمل کا نتیجہ ہے جس سے نہ صرف صحیح تاریخ سمجھ میں آتی ہے بلکہ برصغیر کے رہنے والوں کو حریت پرستوں کا وارث ثابت کرتی ہے۔

"Committment" انگریزی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی تقاریب میں پڑھے گئے انگریزی مضامین کا انتخاب ہے۔

"مرثیہ نظم کی اصناف میں" (1996ء)

یہ جدید مرثیے کی تاریخ پر ایک تحقیقی کتاب ہے جس میں مرزا اوج، دلو رام کوثری، جوش ملیح آبادی، علامہ جمیل مظہری، نجم آفندی، ڈاکٹر وحید اختر، مصطفیٰ زیدی، نسیم امروہوی، سید آل رضا کے مرثیوں پر گفتگو اور آغا سکندر مہدی کے مرثیوں کے تناظر میں جدید مرثیے کا جائزہ، عاشور کاظمی کے شگفتہ انداز میں موجود ہے۔ کتاب میں آغا سکندر مہدی کے 15 مرثیے بھی شامل ہیں۔ اس کے دو ایڈیشن اور دہلی سے شائع ہو چکے ہیں۔

عاشور کی زیرِ طبع کتابیں یہ ہیں: "چھیڑ خوباں سے..." (طنز و مزاح، انشائیے، خاکے، سنجیدہ تنقیدی مضامین)، "حرف حرف جنوں" (سفری مجموعہ) اور "مغرب میں اردو شاعری" "فسانہ کہیں جسے" لکھ کر عاشور کاظمی نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ ان گنے چنے لوگوں میں سے

ہیں جو گروہ بندی کے اس دور میں بھی بے باکی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ مغرب میں آباد اردو شاعروں پر صحتمند تنقید نہیں ہو رہی ہے۔ یا تو قابلِ توجہ شاعروں کو نظر انداز کیا جارہا ہے یا گروہ بندی، ذاتیات اور مقاصد کو ادبی معیار پر فوقیت دی جارہی ہے۔ بہ ایں سبب مغرب میں تخلیق ہونے والے اردو شعری ادب یا مغرب میں آباد اردو والوں کے نام سے جو شعری مجموعے شائع ہو رہے ہیں ان میں کھرے کھوٹے کی پہچان باقی نہیں رہی۔

عاشور کاظمی کے مزاج اور بے لاگ تحریروں کی روشنی میں یقین کیا جاسکتا ہے کہ "مغرب میں اردو شاعری" میں مغرب میں آباد ہر شاعر اور ہر اس شخص پر "جس کے نام سے" کوئی شعری مجموعہ یا مجموعے شائع ہوئے ہیں، بے لاگ تبصرہ بھی ہوگا اور بہت سے پسِ پردہ حقائق سے پردے بھی اُٹھیں گے۔ عاشور کہتے ہیں کہ "سچ کہہ کر یا سچ لکھ کر پتھر کھانے کا حوصلہ عاشور کاظمی میں موجود ہے۔"

جوش ملیح آباد، مغربی شاعری کے تناظر میں" 4 اکتوبر 1988ء لندن میں جوش اکادمی کے زیرِ انتظام جوش بین الاقوامی سیمینار کیا جس میں بیرون ممالک سے پاکستان، ہندوستان، سعودی عرب، کینیڈا، امریکہ، یورپ سے 22 دانشوروں نے شرکت کی۔ اس سیمینار کی بازگشت بر صغیر میں بھی سنی گئی اور 15 مارچ 99ء کو دہلی میں اور 20 مارچ کو کراچی میں جوش سیمینار منعقد ہوا۔

بیسویں صدی کے اختتام پر 'بیسویں صدی میں اردو' کے زیرِ عنوان جوش اکادمی اور انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹ اینڈ لٹریچر کی طرف سے لندن میں ایک پانچ روزہ اردو کانفرنس کے انعقاد کی تیاری شروع ہو چکی ہے۔

عاشور کاظمی نے کن کن ممالک میں مشاعرے سیمینار اور کانفرنسوں میں شرکت کی، کن کن ممالک کا سفر کیا، کیا دیکھا کیا پایا اس کا احاطہ کرنا آسان کام نہیں۔ اس سے کہیں زیادہ یہ کہنا آسان ہے کہ کن کن ممالک میں سفر نہیں کیا۔ وہ جوش اکیڈمی کے سیکریٹری جنرل ہیں۔ انجمن ترقی اردو مصنفین لندن برطانیہ کے نائب صدر ہیں۔ 'سخن ور' کے لیے سوالوں کے جواب میں انہوں نے کہا میں شاعری کے علاوہ نثر سے بھی وابستہ ہوں۔ کتابوں کی فہرست سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ نثر میں طنز و مزاح، تنقید و تحقیق میرا دائرہ کار ہے۔ نثر میں اپنی راہیں تلاش کرنے کی میں نے کوشش کی ہے۔

ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوں۔ شعر و شاعری تنقید، تحقیق، تاریخ، اور افسانے کا مطالعہ کرتا ہوں۔ میں اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ خصوصاً برطانیہ میں ہم GCSC تک اردو کی تدریس کو لے آئے ہیں بلکہ اب تو A Level تک ... پڑھائی جارہی ہے۔ میں نے حال ہی میں برطانیہ کی ایک یونیورسٹی کے لیے بی۔ اے اردو کا نصاب تیار کر کے دیا جو "اگر، مگر" کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ اس وقت اس موضوع پر بحث ہو رہی ہے کہ مغرب میں آباد طلباء اردو کے لیے کتنا وقت نکال سکتے ہیں اور اردو پڑھنے کی افادیت کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بہر حال ہماری وہ نسل جو یہاں

پیدا ہوئی اس میں سے کم یا زیادہ اردو والے ضرور پیدا ہوں گے۔

شاعری میں غزل کے دامن میں زیادہ وسعت ہے بشرطیکہ شاعر اساتذہ کے کلام کی "جگالی" پر اکتفانہ کرے۔ نظم بھی اگرچہ بہت طاقتور صنف شاعری ہے مگر کم لوگ اچھی نظم کہہ پاتے ہیں۔ اگر نظم کہنے کا سلیقہ ہو تو بہت دور تک نظم کی گونج سنائی دیتی ہے۔

نثری نظم کے معاملے میں ایک بات کبھی میری سمجھ میں نہیں آئی کہ لوگ نثر کو نظم کہنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔ اگر شعری قواعد و ضوابط کسی کے بس کی بات نہیں تو نثر لکھے۔ کیا ضروری ہے کہ شاعری کو رسوا کیا جائے۔ مشاعروں کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ مغرب میں اگر مشاعرے قرینے سے کیے جائیں تو زبان کی ترویج کا مقبول ذریعہ بن سکتے ہیں جیسا کہ امریکہ میں ہورہا ہے مشکل وہاں در پیش ہوتی ہے جہاں زیادہ شعرا ایسے ہوں جن کی دو دو تین تین غزلیں سامعین کو پہلے ہی سے "منہ زبانی" یاد ہوتی ہیں۔ ان حالات میں مشاعروں کی مقبولیت ختم ہو جاتی ہے جیسا کہ آج کل لندن میں ہو رہا ہے۔ لندن کے ادبی تناظر میں ادبی نشستیں بہتر ثابت ہو رہی ہیں۔

الیکٹرانک میڈیا پر تدریسی کتب، تحقیقی مواد اور حوالہ جاتی مواد تو مقبول ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے لیکن ادب کی کتب کا مطالعہ کمپیوٹر پر بیٹھ کر نہیں کیا جاسکتا۔ ابھی نیا نیا رجحان ہے اس لیے دلچسپ معلوم ہو رہا ہے۔ کمپیوٹر، لائبریری کی ٹھنڈی چھاؤں یا خواب گاہ (Bed Room) میں مطالعہ کی آسودگی نہیں دے سکتا۔ میرا اور آپ کا تعلق اردو ادب سے ہے۔ ابھی ہمارے پاس چند سال ہیں کہ ہم اردو کتب اور جرائد کی بقا کے متعلق سوچیں اور عمل کریں۔ یہ بات طے ہے کہ اب گل و بلبل کی داستانیں نہیں سنی جائیں گی۔ اردو ادب کو وقت کے ساتھ ساتھ چلنا پڑے گا۔ یہ بات ہم لوگ گذشتہ تین چوتھائی صدی سے کہہ رہے ہیں جو اہلِ قلم یہ بات سمجھ گئے ہیں وہ کسی بحران سے پریشان نہیں ہیں۔

8۔ میں آپ کی بات سے متفق ہوں کہ دورِ حاضر میں تنقید "برائے نام" رہ گئی ہے۔ اس جملے کو اگر آپ یوں لکھیں کہ دورِ حاضر میں تنقید "برائے دام" رہ گئی ہے تو صورت حال کی صحیح عکاسی ہوتی ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ سو فیصدی اہلِ نقد و نظر ایسا کر رہے ہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے زیادہ تر ناقدین "برائے دام" کام کر رہے ہیں۔ ان کے نگاہ دور بیں یا تو نوجوان خواتین میں اعلیٰ ادب کی تخلیق کے "امکانات" دیکھ لیتی ہے اور ان امکانات پر پیشگی مضامین لکھ دیے جاتے ہیں یا پھر ہوائی جہاز کے ٹکٹ، مغرب کی رنگین راتوں کی میزبانی حمت کار دکھاتی ہے۔

برطانیہ میں تو ایک اور ادا چل نکلی ہے اور وہ ہے Frenchise Poertry کی۔ یعنی یہ کہ برصغیر کے کچھ شعرائے کرام نے ضروریات مندوں کو پورا کرنے کے لیے کچھ دکانیں کھول دی گئیں جہاں چھپے چھپائے "دیوانوں" کی فراہمی کے آرڈر book کیے جاتے ہیں۔ ان "دیوانوں" میں قصیدہ خوانی بشکل "دیباچہ" کا براہ راست تعلق "ضرورت مند کی جیب سے ہوتا ہے۔ صحت مند

تنقید جس سے اب پروان چڑھتا ہے روز بروز کم ہو رہی ہے جو ادب کے لیے نیک فال نہیں ہے۔"

عاشور رخصت ہونے کو تھے کہ میں نے ان سے ایک سوال کر لیا جو مجھے کرنا چاہئے تھا۔ کہ "انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریک آج بوقتِ ضرورت فعال نہیں ہے یا دوسرے الفاظ میں باقی نہیں رہ گئی۔ کیا آپ اس پر تبصرہ کریں گے؟

عاشور نے کہا۔ "میرا تبصرہ یہ ہے کہ انجمنیں اور ادارے کمزور بھی ہو سکتے ہیں، کم فعال بھی (حالانکہ ایسا بھی نہیں ہے) لیکن ترقی پسند تحریک نے فکر و آگہی کی جو لہر دی ہے اس سے ہر ادیب متاثر ہوا ہے۔ یہ جو خوف کی چادر اوڑھے بیٹھی قوم کی حالت کیسی ہے۔" قسم کے اشعار مقبول ہو رہے ہیں نہ صرف شاعری بلکہ قاری کو بھی یہ شعور اسی تحریک نے ہی دیا ہے۔ ثبوت کے لیے برصغیر میں 1857ء بلکہ اس سے بھی پہلے کے ادب پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہو گا کہ جبر کے تلے پنپنے والی شاعری میں محبوب قاتل تھا، جابر تھا، سفاک تھا اور عشاق بے بس و مجبور، ظلم سہنے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں۔ اسی جبر اور محرومی کی داستانوں کو 1935ء کے بعد ترقی پسند تحریک نے زبان دی، بولنے کا حوصلہ دیا۔ ادب و شعر میں انقلاب کی جستجو آئی، بے باکی آئی۔ سو مادام اگر آپ نے کہا کہ ترقی پسند تحریک باقی نہیں تو کتاب کی اشاعت کے بعد یہ اعتراضات آپ پر اُٹھیں گے اعتراضات تو آپ پر یوں بھی ہوں گے کہ آپ نے کام کیا ہے اور کام کرنے والے پر اعتراض کرنا ہم اردو والوں کو وطیرہ ہے لیکن میری رائے میں ایسے اعتراضات کی گنجائش نہیں چھوڑنی چاہئے جس کا تعلق حقائق یا تاریخ سے ہو۔" عاشور خاموش ہو گئے تو ہم نے بھی رخصت چاہی۔ فی امان اللہ۔

ASHOOR KAZMI
INSTITUTE OF THIRD WORLD
ART AND LITERATURE
12 WESTMINISTER COURT
LUNDON CLOSE BIRMINGHAM
B20 3 NN U.K.

انتخابِ کلام

سید عاشور کاظمی

جہدِ بشر نے کھولے ہیں دفتر نئے نئے
صحرائے فکر دیکھ سمندر نئے نئے

اکیسویں صدی میں خدا امن و چین دے
دیکھے ہیں اس صدی میں تو محشر نئے نئے

اے بحر حرف و لفظ، خزانے اُچھال دے
بیٹھے ہیں ساحلوں پہ شناور نئے نئے

بارود کے دہانے پہ بیٹھی ہوئی حیات
خوابوں میں رنگ بھرتی ہے اکثر نئے نئے

ہر روز مُہر لگتی ہے میثاقِ امن پر
ہر روز بھیجتا ہے وہ لشکر نئے نئے

جب سے بنی خلاؤں میں اُن کی قیام گاہ
دل میں چھپائے پھرتے ہیں ہم ڈر نئے نئے

پردیس میں بدن کو تو راحت ملی، مگر
طوفاں اٹھے ہیں روح کے اندر نئے نئے

عاشور ہوسکے تو زمانے کے ساتھ چل
ہر گام دیکھ وقت کے تیور نئے نئے

ٹوٹ جاتا ہے قلم حرف مگر رہتا ہے

پاؤں چلتے ہیں مگر نقش ٹھہر جاتا ہے

چانگ شی شوان (انتخاب عالم)

۲۳ جولائی ۱۹۹۹ء

انتخاب عالم

چین

چانگ سی شوان عرف انتخاب عالم کا پتہ مجھے لندن کے معروف شاعر جناب اکبر حیدر آبادی نے عنایت کیا تھا۔ یہ مئی یا جون 99ء کا ذکر ہے۔ خط واپس آگیا۔ پتہ تبدیل ہو چکا تھا۔ مجھے مایوسی ہوئی۔ دکھ بھی ہوا۔ اکبر صاحب کو میں نے مطلع کیا کہ پتہ غلط نکلا۔ میری مایوسی خوشی میں تبدیل ہو گئی جب اکبر صاحب نے مجھے انتخاب عالم کا موجودہ پتہ اس یقین دہانی کے ساتھ عنایت کیا کہ حال ہی میں ان کے ایک دوست جناب فاروق چین میں موجودہ پتے پر انتخاب عالم سے مل کر آئے ہیں۔ میں نے دوبارہ سوالنامہ بھیجا اور 20 جولائی 99ء کا لکھا انتخاب عالم کا خط اور تعارف معہ تصویر مجھے جولائی کے آخری ہفتے میں موصول ہوا۔ 30 جولائی کو ان کا فیکس بھی موصول ہوا کہ انہوں نے تعارف بھجوادیا ہے۔

انتخاب عالم کے ہاتھ سے لکھی تحریر دیکھ کر مجھے یقین نہ آیا کہ اتنی خوشخط تحریر کسی "چینی" کی ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنے صاحبزادے ریحان کو یہ تحریر دکھائی اور بتایا کہ یہ ایک چینی شاعر انتخاب عالم کی تحریر ہے۔ تحریر دیکھ کر ریحان نے کہا کہ یہ صاحب ہیں تو پاکستانی مگر اپنی اوائل عمری میں چین جا کر بس گئے ہوں گے۔ میں نے انہیں انتخاب عالم کی تصویر دکھائی کہ یہ چانگ سی شوان ہیں

اور اردو انہوں نے اپنے شوق اور لگن سے سیکھی ہے۔

میری معلومات کے مطابق چین میں اردو کی تعلیم کا آغاز 1954ء میں ہوا۔ 1993ء تک چین میں اردو پڑھانے والے کل تین ادارے تھے۔ ان میں پیکنگ یونیورسٹی کا شعبۂ اردو مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ 1960ء کے عشرے میں پیکنگ کے نشریاتی کالج نے بھی دو دفعہ اردو جماعت کی تدریس شروع کی اور وہاں سے 47 چینی طلبا تعلیم پاکر گریجویٹ ہوئے جن میں زیادہ تر لڑکے تھے۔ ان کے علاوہ شیانگ شان انسٹی ٹیوٹ نے بھی اردو کی تعلیم کا آغاز کیا تھا اور 1993ء تک تقریباً 170 چینی طلباء گریجویٹ ہو چکے تھے ان میں سے زیادہ تر مختلف اداروں میں ترجمہ، تدریس یا تحقیق کے کام کرتے ہیں۔ اس طرح اردو زبان کو فروغ دینے اور اسے جنوبی ایشیا کی ایک اہم زبان بنانے میں "چین" نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔

چانگ سی شوان یا انتخاب عالم نے اردو زبان سے اپنی محبت کا رشتہ کب استوار کیا؟ شاعری کب شروع کی؟ اور شاعری میں اپنی اتنی دل آویز فکر کو کس طرح سمیٹ لائے۔ ان سب سوالوں کے جواب ان کی زبانی سنتے ہیں۔ اس سے پہلے ان کی ایک غزل بھی ملاحظہ کریں جو انتخاب عالم کا زاویۂ نظر اور ان کے اسلوب کا دلکش اظہار ہے:

جہاں بھر میں کسے، کس پر، کہاں، کب رحم آتا ہے
شجر سوکھے ہوئے پتوں کو شاخوں سے گراتا ہے

ستارے دیکھتے رہتے ہیں شب بھر مہر کا رستہ
اُفق پر مہر آتے ہی مگر ان کو بجھاتا ہے

زمیں جو آسماں کو سر پہ رکھتی ہے ہمیشہ سے
ہمیشہ اس پہ الٹا آسماں بجلی گراتا ہے

اندھیرے کے مقابل حوصلہ مندوں کی یہ قلت
کہ سورج بھی دمِ شب چھپ کے اپنی جاں بچاتا ہے

مجھے اس پیڑ کی قسمت پہ آتا ہے بہت رونا
جو اپنے کاٹنے والے کو چھاؤں میں بٹھاتا ہے

ازل سے چشمِ دنیا کو فقط گُل راس آتے ہیں
میں عالم ایک پتا ہوں جو پھولوں کو سجاتا ہے

انتخاب عالم نے مجھے لکھا تھا

بیجنگ

20جولائی1999ء

محترمہ سلطانہ مہر صاحبہ

اسلام علیکم۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گی۔ گرامی نامہ اور سوالنامہ دونوں مل چکے ہیں۔ محبت اور ذرّہ نوازی کا بہت بہت شکریہ۔ کچھ فوری کاموں میں مصروف ہونے کی وجہ سے جواب دینے میں تاخیر ہوئی، جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ آپ "سخن ور" شائع کر کے اردو ادب کی جو خدمت کر رہی ہیں، وہ لائقِ صد ستائش ہے۔ آپ نے "سخن ور" میں میرا تعارف شامل کرنے کے لیے جو انتھک کوشش کی، اس کے لیے میں آپ کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ سوالوں کے جواب درج ذیل ہیں۔

دعاو سلام

آپ کا خیر اندیش اور نیاز مند چانگ شی شوان

میں نے پوچھا تھا اپنا پورا نام، تخلص، تاریخ جائے پیدائش، حصولِ تعلیم و ملازمت اور مختصر سوانح جاننا چاہوں گی۔ انہوں نے بتایا میرا چینی نام، چانگ شی شوان ہے اور اردو نام انتخاب عالم جو میرے ذاتی نام "شی شوان" کا اردو میں ترجمہ ہے، جبکہ "چانگ" میرا خاندانی نام ہے۔ میں نے تخلص عالم اختیار کیا۔ میری قومیت چینی ہے۔ تاریخ پیدائش 20 مئی 1940 اور جائے پیدائش یانگ چانگ گاؤں، ہونگ تھونگ کاؤنٹی، صوبہ شانشی، چین ہے۔ میری تعلیم بی اے صحافت (چینی میں) اور بی اے اردو، ایڈوانسڈ اردو کورس (دو سال) کا بھی میں نے کیا۔ میری ابتدائی تعلیم پہلی تا چوتھی جماعت تک۔ 1948ء سے 1952ء تک اپنے گاؤں کے پرائمری اسکول میں ہوئی۔ 1952ء سے 1954ء تک چھوٹی تھینگ قصبے کے پرائمری اسکول میں پانچویں تا چھٹی جماعت کی، 1954ء سے 1957ء تک ہونگ تھونگ کاؤنٹی کے مڈل اسکول نمبر 2 میں ساتویں تا نویں جماعت کی اور 1957ء سے 1960ء تک لین فین کاؤنٹی کے مڈل اسکول نمبر 1 میں دسویں تا بارہویں جماعت کی تعلیم حاصل کی۔ 1960ء سے 1963ء تک بیجنگ براڈکاسٹنگ انسٹی ٹیوٹ کے شعبہ صحافت میں پڑھا اور بی اے کیا اور 1963ء سے 1966ء تک اسی انسٹی ٹیوٹ کے شعبۂ زبان ہائے غیر ملکی میں اردو پڑھی اور بی اے کیا۔ اسی سال چین میں ثقافتی انقلاب "شروع ہوا جس کی وجہ سے کالجوں اور یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل طالب علموں کی پوسٹنگ سمیت بہت سے کام رک گئے۔ ستمبر 1967ء میں، میں ماہنامہ "چائنا پکٹوریل" ("چین باتصویر") سے وابستہ ہو گیا۔ دسمبر 1980ء میں مجھے ادارے کی طرف سے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد بھیجا گیا جہاں میں دسمبر 1982ء تک زیرِ تعلیم رہا۔ اس دوران میں نے ایڈوانسڈ اردو کا کورس مکمل کیا۔ دسمبر 1982ء میں، میں چین واپس آیا۔ ستمبر 1967ء سے مئی 1999ء تک میں "چین باتصویر" کے شعبہ اردو سے وابستہ رہا اور 1984ء سے 1997ء تک اس کا صدر رہا۔ 1987ء

میں، میں ایسوسی ایٹ پروفیسر لیول کا ایسوسی ایٹ ٹرانسلیشن ریویوئر اور 1995ء میں فل پروفیسر لیول کا ٹرانسلیشن ریویوئر مقرر رہوا۔ حکومت پاکستان نے مارچ 1993ء میں مجھے تمغۂ پاکستان سے نوازا۔ اکتوبر 1998ء سے مجھے حکومت چین سے قومی سطح کے ماہرین کے لیے مخصوص الاؤنس مل رہا ہے۔ مئی 1999ء میں مالی مشکلات کی وجہ سے ماہنامہ "چین باتصویر" کے اردو ایڈیشن کی اشاعت بند کر دی گئی، جس کے بعد میں چائنا پکچوریل سے منسلک اشاعت گھر میں چینی زبان کا ایڈیٹر ہوں۔

میرے دوسرے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا "گو کہ میں چینی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتا اور نثر لکھتا ہوں، لیکن میرا بیشتر وقت اپنے رسالے "چین باتصویر" کی اشاعت کے لیے صرف ہوا، چنانچہ میں نے اب تک جو کچھ لکھا، وہ فارغ وقت میں لکھا۔ اردو میں میری شعر گوئی کا آغاز 1987ء میں ہوا۔ گزشتہ سال اکادمی ادبیات پاکستان نے میرا پہلا شعری مجموعہ شائع کیا جس کا نام "گلبانگ وفا" ہے۔ اس مجموعے میں غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں۔ میری اردو شاعری کسی حد تک دبستانِ دہلی سے متاثر ہے اور میں نظریہ "ادب برائے زندگی" کا حامی ہوں۔ اردو میں شعر گوئی میں پروفیسر آفتاب اقبال شمیم نے میری رہنمائی کی۔ تاحال میری چینی نظمیں، اردو اور چینی میں لکھے گئے مضامین اور دیگر چیزیں شامل ہیں۔ میں نے راغب مراد آبادی کے شعری مجموعہ "نذرِ چین" (جس کا انگریزی نام Ovation to China) ہے رضیہ فصیح احمد کا ناول "آبلہ پا"، ڈاکٹر صفدر محمود کی کتاب "پاکستان: تاریخ اور سیاست"، "پاکستان کے قومی نغمے"، "پاکستان کے فلمی گانے" اور چینی کتاب "غیر ملکی غنائی شاعری" کے حصۂ پاکستان کا چینی میں اور چینی شاعری چی پھنگ کے شعری مجموعہ "یاسمین" کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ (نوٹ: ناول "آبلہ پا" کے نصف حصے کا ترجمہ ایک چینی دوست نے کیا۔ یہ ناول مالی مشکل اور کتاب "پاکستان: تاریخ اور سیاست" دوسری مجبوری کی وجہ سے تاحال نہیں چھپ سکی۔) علاوہ ازیں میں نے بیجنگ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے لیے اردو عروض کا نصاب بھی مرتب کیا ہے۔

میں نے پوچھا "انتخاب عالم آپ کن کتب کا دلچسپی سے مطالعہ کرتے ہیں؟

کہنے لگے، یوں تو میں نے بہت سے شعرا کو شوق سے پڑھا ہے، لیکن میر غالبؔ، اقبال اور فیض کے کلام کا مطالعہ نسبتاً گہرا ہے۔

میرا اگلا سوال تھا کہ کیا آپ اپنی زندگی کے چند اہم اور دلچسپ واقعات بتائیں گے؟

"یقیناً۔" ان کا جواب تھا۔ یہ بات ہے اس زمانے کی جب جناب اکرم ذکی چین میں پاکستانی سفیر تھے، اسی زمانے میں سرمد صاحب چین میں مقیم پاکستانی سفارت خانے میں منسٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ ایک شام سرمد صاحب نے کچھ چینی دوستوں کو ڈنر کی دعوت دی جن میں، میں بھی شامل تھا، جبکہ ذکی صاحب مہمان خصوصی تھے۔ نو سوا نو بجے جب سارے چینی حضرات نے شوقِ دہن کی

تسکین کر کے رخصت ہونے کی اجازت لی، توذکی صاحب نے مجھے روک لیا اور فرمایا: "سارے چینی چلے گئے ہیں اور صرف پاکستانی رہ گئے ہیں۔ اب کچھ دیر کے لیے شعری وشاعری ہو جائے۔" یوں میں "پاکستانی" بن گیا۔

جولائی 1995ء میں قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ کیمیا کے صدر اور شاعر پروفیسر محمد افضل چین کے دورے پر تشریف لائے اور بیجنگ کے شی یوان ہوٹل میں ٹھہرے۔ چین کے لیے روانگی سے پہلے انہوں نے کسی دوست سے میرا ٹیلی فون نمبر لیا اور بیجنگ پہنچنے کے بعد شی یوان ہوٹل سے مجھے فون کیا۔ "آپ انتخاب عالم صاحب ہیں؟ میں نے کہا: "جی، میں ہوں۔" فرمایا: "میں محمد افضل ہوں۔ پاکستان سے چین آیا ہوں اور 'شیان' ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔ اپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میرے یہاں آسکتے ہیں؟" میں نے کہا: "کیوں نہیں! لیکن کونسا 'شیان' ہوٹل ہے؟ ذرا کسی اٹینڈنٹ کو بلائیے، میں اس سے ہوٹل کا صحیح نام پوچھوں گا۔" فرمایا: "وہ تو سارے چینی ہیں اور صرف چینی بولتے ہیں۔ کیا آپ کو چینی زبان بھی آتی ہے؟" میں نے کہا "جی ہاں، تھوڑی سی آتی ہے۔" فرمایا "ارے! آپ تو پاکستانی ہیں نہ؟" میں نے کہا "جی نہیں، میں چینی ہوں بس خوش قسمتی کہیے کہ میرے پاکستانی دوست مجھے پاکستانی سمجھتے ہیں۔"

گزشتہ سال نومبر میں، میں نے چینی ادیبوں کے وفد کے ساتھ پاکستان کا دورہ کیا۔ جب وفد راولپنڈی کے پی سی ہوٹل میں ٹھہرا تو ہوٹل کے باہر ایک بہت بڑا بینر (Bannar) لگا ہوا پایا گیا جس پر چینی زبان میں یہ فقرہ لکھا ہوا تھا "چانگ شی شوان ہمارا شاعر ہے۔"

مارچ 1988ء میں، میں نے ابوظہبی میں منعقدہ احمد ندیم قاسمی عالمی سیمینار و مشاعرے میں شرکت کی۔ سیمینار و مشاعرے سے فارغ ہونے کے بعد میرے دبئی میں سکونت پذیر پاکستانی دوست جمیل اختر صاحب نے مجھے اپنے گھر میں مدعو کیا اور وہاں میں نے دو دن قیام کیا۔ ایک دفعہ ہم دونوں ٹیکسی لے کر مارکیٹ گئے۔ ڈرائیور کا تعلق بلوچستان سے تھا۔ جب اسے میرے اور جمیل صاحب کے درمیان ہونے والی گفتگو سے پتہ چلا کہ میرا تعلق چین سے ہے اور میں ندیم قاسمی صاحب کے 72ویں یوم پیدائش کے موقع پر منعقد ہونے والے عالمی سیمینار و مشاعرے میں شرکت کے لیے متحدہ عرب امارات آیا ہوں تو اس نے کرایہ لینے سے انکار کیا۔ ہر چند کہ جمیل صاحب نے اور میں نے اسے کرایہ دینے پر بہت اصرار کیا لیکن وہ تادمِ آخر کرایہ لینے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس کا کہنا تھا "چین ہمارا دوست ملک ہے اور آپ ہمارے بھائی ہیں، دوستوں اور بھائیوں سے خدمت کی قیمت نہیں لیتے۔"

انتخاب عالم کی زبانی یہ دلچسپ اور اہم واقعات سننے کے بعد میں نے پوچھا "عالم صاحب یقیناً اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ لیکن کیا آپ اس کے مستقبل کے بارے میں پُر اُمید ہیں؟ انتخاب عالم بتا رہے تھے "دورِ حاضر میں بین الاقوامی تبادلوں میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے جس کی وجہ سے

مختلف قوموں کے لوگوں کی دوسری قوموں کی زبانیں سیکھنے والوں کی تعداد میں بھی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ چونکہ اردو پاکستان کی قومی زبان ہے اس لیے آئندہ اردو پڑھنے والے غیر ملکیوں کی تعداد میں بھی تیزی سے اضافہ ہو گا، بشرطیکہ اردو کو قومی زبان کی حیثیت کے علاوہ سرکاری اور دفتری زبان کی حیثیت بھی حاصل ہو، ورنہ بہت سے غیر ملکی پاکستان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے اور پاکستان سے تبادلے کے لیے اردو کی بجائے انگریزی پڑھیں گے۔"

"آپ شاعری کی کس صنف کو اظہارِ خیال کے بہتر سمجھتے ہیں؟ میں نے پوچھا۔ "نثری نظم اور نثری غزل کے تجربے ہو رہے ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ آج کے دور میں مشاعرے ادب کی تخلیق میں معاون ہیں یا تخلیقی نشستیں بہتر کردار ادا کر سکتی ہیں؟

انتخاب عالم کہنے لگے "غزل اور نظم دونوں کی اپنی اپنی خوبی ہے۔ غزل کے مقابلے میں نظم کسی خاص موضوع پر اظہارِ خیال کے لیے زیادہ موزوں ہے، جبکہ نظم کے مقابلے میں غزل کے اشعار کو زیادہ آسانی سے حفظ کیا جا سکتا ہے، اس لیے یہ زیادہ وسیع پیمانے پر پھیل سکتے ہیں۔ نثری نظم ترجمے کے لیے ٹھیک ہے، لیکن تخلیق کے لیے ٹھیک نہیں۔ ابھی تک میری نظر سے کوئی نثری غزل نہیں گزری۔ اگر کوئی نثری غزل ہوتی تو وہ ضرور عجیب سی لگتی ہے۔ (انتخاب عالم آپ شاعر مظہر امام کا تعارف ضرور پڑھ لیں اور ان کی نثری غزل بھی جو اس کتاب میں موجود ہے)۔ چونکہ نثری نظم اور نثری غزل دونوں بحر سے عاری ہیں اس لیے دونوں شاعری کی موسیقیت ختم کرتی ہیں جبکہ وزن (بحر) اور موسیقیت شاعری کی اہم اور بنیادی پہچان ہیں۔ مشاعروں کے انعقاد سے شعراء اور شاعرات کا شوق تخلیق بڑھ سکتا ہے جبکہ تخلیقی نشستوں میں ہونے والی ادبی تنقید سے نئے لکھنے والوں کو فنی رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے۔ شاعری کی تخلیق کے لیے شوق اور فنی مہارت دونوں ضروری ہیں۔"

الیکٹرونک میڈیا کے بارے میں کیے گئے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا "اس صورت حال میں کم سے کم دو کام کیے جانے چاہئیں۔ اوّل کتابوں اور جرائد کو سستے سے سستا کر دیا جائے، تاکہ ان کی قیمتیں قارئین پر مالی بوجھ نہ بن سکیں۔ اس سے جو مالی نقصان ہو گا، اس کی تلافی کتابوں اور جرائد میں اشتہارات چھاپ کر کی جائے۔ دوم، کتابوں اور جرائد کے معیار کو بلند سے بلند تر کیا جائے، یعنی ان کے مندرجات کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور زبان و بیان و ترتیب و تزئین کو زیادہ سے زیادہ خوبصورت بنایا جائے، تاکہ ان میں قارئین کے لیے ایسی کشش پیدا ہو سکے جو الیکٹرونک میڈیا میں پائی جاتی ہے۔ سوال نمبر 8 اردو ادب میں تنقید سے متعلق تھا۔

انتخاب عالم نے کہا "جب تک نقاد راست باز نہیں ہوں گے، تب تک ان کی میزانوں میں انصاف نہیں ہو گا اور جب تک نقادوں کی میزانوں میں انصاف نہیں ہو گا، تب تک صحیح معنوں میں تنقید نہیں ہو گی۔ اس مرض کی واحد دوا نقادوں پر تنقید ہے، تاکہ ان کے قلم ادبی تخلیقات تولنے کی سچی میزانیں بن سکیں۔"

انتخاب عالم کو لوگ بلاوجہ "پاکستانی" نہیں کہتے ان کی پاکستان سے بے لوث محبت کی گرمی لوگ ان کے کلام کے ذریعے اپنے دلوں میں پاتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے ان کی ایک نظم "مینارِ پاکستان" جو ایک محبِ وطن پاکستان کے جذبات واحساسات سے کسی طرح بھی کم نہیں۔

From: Zhang Shixuan,
China Pictorial, 33, Chegong Zhuang xilu
(Haidian District, Beijing, China 100044 Post Code)
Tel: 010, 62174691 - Fax: 010, 68413023

مینارِ پاکستان

تُو قد آور مردِ آہن کی طرح
ارض پر پاؤں جمائے، عرش کو سر پر اُٹھائے
توڑ کر لایا کبھی، آسماں کے بام سے
اِک درخشندہ ستارہ، ایک تابندہ ہلال
سبز پرچم کے لیے، مثلِ فولادی قلم
تُو نے اپنی سرزمیں کے صفحۂ تقدیر پر
کردیا منسوخ حکم مرگ کو
اور اس پر زندگی لکھ دی ہمیشہ کے لیے
تو ہے اونچی حدِ فاصل نقشۂ تاریخ کی
دو زمانوں میں کھڑی اک آہنی دیوار ہے
اک طرف تاریکِ کل، اک طرف امروزِ پُر انوار ہے
تُو ہے انجامِ زمانہ، تُو ہے آغازِ زمانہ
تو کہ استقلال کی تصویر ہے، اور اک تاریخ کی تفسیر ہے

پسینہ میرے چہرے کا وہ جس سے صاف کرتی تھی
مجھے لگتا ہے اُس نے وہ دوپٹہ دھو دیا ہوگا

عرفان مرتضیٰ
10/6/99

عرفان مرتضیٰ

لاس اینجلس امریکا

عرفان مرتضیٰ کو مشاعرے میں سنئے تو لگتا ہے بڑی گھن گرج کا شاعر ہے۔ مگر یہ گھن گرج اس کی نظموں تک محدود ہے۔ جہاں اس کے پڑھنے کا لہجہ بلند ہے وہیں اس کے کلام کی معنی آفرینی کا آہنگ بھی بلند ہے۔ عرفان کی غزلیاتی شاعری کا لہجہ مدھم ہے اتنا مدھم کہ ہجر کا تمام درد جیسے اس میں سمو گیا ہو۔

عرفان کی شاعری، خصوصاً اس کی نظموں میں سماجی شاعری ملتی ہے۔ عرفان کو ادراک ہے کہ ادب ایک سماجی عمل ہے اُسے صرف ذات کے خول میں محبوس نہیں کیا جاسکتا۔ ایک مرحلے پر سماج اور اس کے افراد ادب کی سطح پر ایک دوسرے کے تجربوں میں شریک ہو جاتے ہیں اور یہ شرکت ان میں سماجی شعور بیدار کرنے کا باعث ہوتی ہے۔ عرفان کی تمام نظمیں خاص طور پر 'پرانے گھر کے موسم بچہ تین سوڈالر کا، موت کس کا نام ہے، میں تھک گیا ہوں اور اب بھی ایسا ہوتا ہوگا، ایسی منظوم کہانیاں ہیں کہ لمحے لمحے کی واقعاتی تصویریں سامنے آتی رہتی ہیں اور گزر جاتی ہیں۔

عرفان زود گو ہے۔ اشعار اس پر وارد ہوتے ہیں اور وحی کی طرح اترتے ہیں۔ وہ جب اپنی گاڑی میں بیٹھ کر روزگار کے مسائل حل کرنے نکلتا ہے تو شاعری ایک محبوبہ کی طرح اس کے گلے میں

بانہیں ڈال دیتی ہے اور وہ اشعار کے موتی پرونے لگتا ہے۔

خالصتاً غزل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

اگر جانا ہو قدموں کے نشاں بھی ساتھ لے جانا
تمہارے بعد میں تکتا رہوں گا رہ گزر کب تک!

خدا سے ناامیدی بھی تو ٹھیرا کفر اے عرفان
میں دیکھوں گا نہیں ہوتا دعاؤں میں اثر کب تک

زباں میں اتنی تلخی سوچ لو اچھی نہیں لگتی
حلاوت کا، مداحت کا ذرا تو ذائقہ رکھو

انسان زندگی بسر کرتے ہوئے بہت سے جذبوں سے گزرتا ہے اور بہت سے ادھورے تجربوں سے اُسے واسطہ پڑتا ہے۔ زندگی میں محبت، نفرت اور بغاوت کے جذبے ابھرتے ہیں لیکن یہ سب عام طور پر گونگے اور بے نام ہوتے ہیں لیکن یہی جذبے اور احساسات جب شاعری کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں تو ہمارے تجربوں کو ایک پیکر مل جاتا ہے۔ شاعری میں اگر یہ خوبی نہ ہو تو وہ کامیاب شاعری نہ ہوگی۔ اس کسوٹی پر عرفان مرتضیٰ کی شاعری کو پرکھئے تو ہم ایسے بے شمار جذبوں کو الفاظ کے روپ میں دیکھیں گے کہ جنہیں ہم اس سے پیشتر کوئی نام دینے سے قاصر تھے۔

عرفان زبان کی صحت کا خیال رکھتے ہیں مگر سادہ اور آسان زبان کے قائل ہیں، اپنے ایک مضمون "اردو کا مستقبل تاریک ہے" میں وہ لکھتے ہیں۔

"زبان لوگوں سے بنتی ہے اور لوگوں ہی سے بگڑتی ہے۔ کچھ لوگوں نے انگریزی زبان کو صفِ اوّل کی زبان بنادیا تو کچھ لوگوں نے یونانی، سنسکرت اور لاطینی زبانوں کو خاک میں ملادیا۔ چند زبانوں پر پابندی عائد کی گئی اور چند کو فروغ دیا گیا۔ وقت وقت کی بات ہے کہ کبھی وقت زبان اور تہذیب کو چار چاند لگاتا ہے تو کبھی صفِ ہستی سے مٹا دیتا ہے۔ پھر یہ ہمارے سلوک پر بھی منحصر ہے کہ ہم زبان کے ساتھ کیا برتاؤ روا رکھتے ہیں۔"

جب ہم نے سخن ور چہارم کے تعارف کے لیے ان سے گفتگو کی تو عرفان نے بتایا ان کا نام تو سید عرفان علی تھا لیکن آٹھویں جماعت سے ہی اپنے اعمال کا تجزیہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنا نام تبدیل کر لیا اور پھر وہ اپنے نام کے ساتھ اپنے والدِ محترم جناب سید مرتضیٰ علی کا نام بھی شامل کرنا چاہتے تھے اس طرح ان کا نام عرفان مرتضیٰ ہو گیا۔

مزید تفصیل بتاتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "3 نومبر 1961ء کو میری پیدائش کراچی۔ پاکستان میں ہوئی۔ میرے دو چھوٹے بھائی اور ایک بڑا بھائی بچپن میں ہی اس دنیا سے سدھار گئے تھے۔ اس طرح میں والدین کا اکلوتا بیٹا اور تین بہنوں کا ایک بھائی رہ گیا۔ ہمارے مالی حالات اچھے

نہیں تھے، اس کے باوجود والد محترم کا اصرار تھا کہ میں جب تک چاہوں اور جہاں تک چاہوں تعلیم حاصل کروں لیکن کالج کے دوسرے سال سے ہی میں نے اپنی تعلیم روک کر الیکٹریکل ڈپلومہ کورس شروع کر دیا، تاکہ جلد از جلد اپنے والد صاحب کا ہاتھ بٹا سکوں۔ اس تین سال کے کورس کے دوران ہی میں نے پرائیویٹ طور پر بی کام کیا اور ذریعہ معاش کی تگ و دو شروع ہو گئی۔

اسی زمانے میں مجھے کراٹے سیکھنے کا جنون سوار ہو گیا۔ اور میں نے والدین کے منع کرنے کے باوجود چھپ کر کراٹے اسکول میں ٹریننگ لینا شروع کر دی۔ گرینڈ ماسٹر محمد اشرف طائی کی زیرِ نگرانی بلیک بیلٹ تھرڈ ڈاؤن حاصل کیا اور پاکستان کراٹے ٹیم کی کئی مختلف ممالک میں نمائندگی بھی کی۔ اپنے استاد جناب اشرف طائی کے اصرار پر ہی پاکستان ہجرت کر کے امریکہ آ گیا۔ یہاں آکر بھی کراٹے سکھانا شروع کر دیا۔ شمالی امریکہ میں دو کراٹے اسٹوڈیوز کھولے جن کا نام بھی استادِ محترم کے نام پر طائز اکیڈمی آف مارشل آرٹس رکھا۔ چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر اس بزنس کو ترک کر کے ایک کارپٹ کی فرم میں ملازمت اختیار کر لی۔ اسی دوران Floorcovering سے متعلق مختلف کورسز اور اسکولز میں تعلیم حاصل کر کے Floorcovering Inspections کا کاروبار شروع کر دیا۔ پھر اسی فیلڈ سے متعلق دو کتابیں بھی لکھیں اور Training Videos بھی بنائیں اور Semminar کا سلسلہ بھی جاری رہا اور اب گیارہ برس سے یہی کاروبار کر رہا ہوں۔ 15 سال کی عمر میں، میں نے دو غزلیں کہیں جن میں اُس عمر کے کچے جذبات کا اظہار تھا۔ اتفاق سے یہ غزلیں والدہ محترمہ اور یسہ بیگم کے ہاتھ لگ گئیں۔ ان کی ڈانٹ ڈپٹ سے شاعری کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔

3 نومبر 1985ء، اپنی چوبیسویں سالگرہ کے دن میں امریکہ آ گیا۔ بچپن سے لے کر اب تک کتابوں کے مطالعے کا سلسلہ جاری ہے اسی دوران میں نے کچھ غزلیں اور نظمیں کہیں۔ اسے اتفاق ہی کہہ لیجئے کہ ایک دوست کے توسط سے لاس اینجلس کے مایہ ناز شاعر جناب خالد خواجہ سے ملاقات ہو گئی۔ جب اُن کو ایک غزل سنائی تو انہوں نے اس غزل میں سوائے ایک شعر کے باقی اشعار پر منہ بنایا لیکن ساتھ ساتھ ہمت افزائی بھی کی۔ پھر 1987ء میں لاس اینجلس میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس میں میں نے شرکت کی۔ اس مشاعرے میں جناب کنور مہندر سنگھ بیدی، عبید اللہ علیم مرحوم اور نصیر ترابی شامل تھے۔ یہ میری زندگی کا پہلا مشاعرہ تھا جو میں سننے گیا اور اتفاق ایسا ہوا کہ مجھے اس مشاعرے میں ایک نظم پڑھنے کا موقع ملا اور اس کے بعد تو سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا کہتے ہیں نا۔

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

میں نے نثر نگاری میں بھی ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی لیکن مصروفیات کی بنا پر زیادہ نہ لکھ سکا۔ نظموں میں زیادہ تر واقعاتی نظمیں کہتا ہوں جس میں گزرے زمانے، موسموں اور وطن سے متعلق یادیں ہوتی ہیں۔ غزلیں روایتی انداز میں بھی کہنے کی کوشش کرتا ہوں اور جدید انداز میں

بھی۔ میری غزلیں اور نظمیں امریکہ کے اخبارات اور رسائل کے علاوہ پاکستان میں بھی چھپتی رہی ہیں۔ جہاں تک تعلق ہے کتابوں کے مطالعے کا، میں نئے پرانے تمام شعرا کو ان کے اپنے مقام پر رکھ کر پڑھتا ہوں۔ غالب، اقبال، ساحر، فراز، میر، درد، قاسمی صاحب اور محسن احسان ایسے نام ہیں کہ جن کی شاعری میرے لیے ایک رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔ پرانے شعراء میں غالب اور اقبال کو پسند کرتا ہوں۔ ماضی قریب میں ساحر، ناصر کاظمی، عبید اللہ علیم اور حالیہ شعراء میں پاکستان سے محسن احسان، احمد فراز، احمد ندیم قاسمی، انڈیا سے خمار بارہ بنکوی، موج رام پوری اور انگلستان سے ڈاکٹر عاصم صباحت واسطی اور امریکہ میں خالد خواجہ میرے پسندیدہ شاعروں میں شامل ہیں۔

اردو کا مستقبل وہ نہیں کہ جو سمجھا گیا تھا جو کہ امید لگائی گئی تھی۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ ایک زمانے سے لوگ اردو بولتے، لکھتے اور پڑھتے چلے آرہے ہیں لیکن جس رفتار سے تحقیقی کام پہلے ہوتا آیا ہے وہ اب نظر نہیں آتا۔ پاکستان اور ہندوستان میں تو ایک حد تک یہ کام ہو رہا ہے لیکن ان دو ممالک سے باہر آکر صرف چند نثر پارے اور چند غزلیں یا نظمیں ہی نظر آتی ہیں۔ لوگوں کو فرصت ہی نہیں کہ اس میدان میں بھی کچھ کیا جائے۔

امریکہ میں رہتے ہوئے اگر اپنے اطراف میں نظر ڈالیں تو اردو بھی انگریزی کے رنگ میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے۔ بہر حال ناامیدی تو کفر ہے اس لیے ہم اور آپ اچھی امید ہی رکھیں تو بہتر ہو گا۔

آزاد نظمیں واقعاتی اعتبار سے اور غزلیں۔۔۔ یہی اصناف ہیں جن میں طبع آزمائی کی کوشش کرتا ہوں۔ چند ایک لمحاتی نظمیں بھی کہیں لیکن طبیعت اس طرف مائل نہ ہو سکی۔ نثری نظم یا نثری غزل کے لیے میں اپنی رائے محفوظ رکھنا بہتر سمجھتا ہوں۔ کیونکہ یہ بارڈر لائن (BORDERX) ہے کہ جسے ایک نثر نگار پار کر کے شاعری کے میدان میں اور ایک شاعر نثر کے میدان میں ہاتھ پاؤں مارتا نظر آتا ہے۔

مشاعرے اور ادبی نشستیں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ ایک مشاعرے کے ذریعے ادب ہر خاص و عام تک پہنچ جاتا ہے اور ادبی نشستوں کے ذریعے ادب اور زیادہ نکھرتا ہے۔ دونوں کی اپنی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ میری نظر میں اردو کو دونوں سہاروں کی ضرورت ہے۔ جہاں تک تعلق ہے الیکٹرونک میڈیا کا، میں اس کا زبردست حامی ہوں۔ گزشتہ سال میں نے اردو کی تاریخ میں انٹرنیٹ پر پہلا مشاعرہ کروایا تھا جس میں امریکہ، کینیڈا اور انگلستان کے شعراء نے حصہ لیا تھا۔ مشاعرہ کافی کامیاب رہا تھا۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن اردو ادب کی جس طرح اور جو کچھ بھی خدمت انجام دے رہے ہیں وہ باعثِ تحسین ہے لیکن ان سب چیزوں کے باوجود پرنٹ میڈیا کی ہمیشہ سے ضرورت رہی ہے اور رہے گی۔ پرنٹ میڈیا کی ایک بڑی اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ حوالے (Refrence) کے لیے ایک بہت بڑا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انٹرنیٹ بھی یہ فرض اچھی طرح انجام دے رہا ہے لیکن ابھی اس میدان میں بہت کام باقی ہے۔

کسی بھی چیز کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اُس پر تنقیدی اظہار ہو۔ تنقید برائے تنقید ہر ایک نئے خیال کو دفن کر دیتی ہے لیکن تنقید برائے تعمیر نئے خیالوں کو جلا بخشتی ہے۔ اردو ادب میں تنقید برائے تعمیر کی اشد ضرورت ہے اور ہمیں چاہئے کہ اس قسم کی محافل اور نشستیں منعقد کریں تاکہ یہ کام بہتر سے بہتر ہو۔

IRFAN MURTUZA

1278, ELREY PLACE GARDEN GROVE CA 92840, U.S.A

Phone:(714) 537 - 3108, E-mail: DOAST@aol.com

یہ میں نے سوچا نہیں تھا عداوتیں ہوں گی
ذرا سی بات پہ اتنی قیامتیں ہوں گی

تمہارے شہر میں جتنے بھی لوگ رہتے ہیں
تمہارے شہر میں اتنی جماعتیں ہوں گی

ہر اک سوال کے کتنے جواب ڈھونڈو گے
ہر اک جواب میں کتنی وضاحتیں ہوں گی

کہ رنگ اتنا ہی جھلکے گا پھر بلاغت کا
تمہاری بات میں جتنی صداقتیں ہوں گی

جو میرے لہجے میں یا گفتگو میں ڈھونڈو گے
تو اور کچھ نہیں ہوگا علامتیں ہوں گی

سمجھ سکو گے نہ مفہوم تم تو پڑھ کر بھی
جو کاغذوں پہ لکھی کچھ عبارتیں ہوں گی

صداقت اور شرافت کی آڑ میں میں عرفان
چھپائی جائیں گی جتنی کثافتیں ہوں گی

تجھ کو یہ زعم ہے تو باعثِ تسخیر نہیں
ہے یقیں مجھ کو تری روح میں اتر جاؤں گی میں

عروج ملک
10-10-99

عروج ملک

سان ہوزے امریکا

عروج ملک مائک کے سامنے تھی۔ نازک بدن، خوش شکل لڑکی کہہ رہی تھی۔

تجھ کو یہ زعم ہے تو باعثِ تسخیر نہیں
ہے یقیں مجھ کو، تری روح میں اتر جاؤں گی میں

اس عمر میں یہ خود اعتمادی چاہے محبت کے باب میں ہی ہو صراطِ مستقیم کی راہوں سے آشنائی کرادیتی ہے۔

"عروج تم کتنے عرصے سے شعر کہہ رہی ہو؟" میں نے مشاعرے کے بعد اس سے پوچھا۔

"بس مدت کیا بتاؤں۔" وہ حجاب سے بولی۔ "ابھی طفلِ مکتب ہوں۔ کوشش کر رہی ہوں کہ اپنی شناخت پیدا کروں۔ ایک شعر سنانے کی اجازت ہے؟" وہ باادب مسکرائی۔

"ضرور، میں ہمہ تن گوش ہوں۔" میں نے اس کی مسکراہٹ کا جواب دیا، وہ گنگنانے لگی۔

جو ہو مضمون فکر و فن سے خالی
بلاغت کا اثر جاتا رہے گا

"تم نے تو عروج میرے جی کی بات کہہ دی۔ بلاغت کا رعب جھاڑنے اور ثقیل الفاظ، لب و

لہجے میں کچھ کہنے سے ابلاغ مشکل ہوتا ہے۔ بہتر ہے کہ سادہ لہجے میں اور آسان الفاظ میں بات کی جائے۔ "اچھا تو کچھ اپنے بارے میں بتاؤ"

ہم دونوں ایک گوشے میں جا بیٹھے۔ عروج کہنے لگیں: "میں 17 جنوری 1972 کے دن راولپنڈی میں پیدا ہوئی۔ پہلی بیٹی تھی اس لیے امی نے اپنا حق استعمال کرتے ہوئے مجھے "عروج ملک" کا نام دیا جبکہ دادی جان نے اپنے پیار کا اظہار "چندا" نام دے کر کیا۔ چنانچہ گھر میں آج بھی مجھے "چندا" ہی پکارا جاتا ہے۔ والد صاحب کویت میں مقیم تھے، سو ہم بھی وہیں جا بسے اور میں نے وہیں "منقف ہائی اسکول" سے ہائی اسکول سرٹیفکیٹ لیا۔ 1991ء میں، میں پاکستان آگئی اور ڈگری کالج راولپنڈی سے بیالوجی (Biology) میں بی ایس کیا اور پھر 1994ء میں اپنے والدین اور چار بھائیوں کے ہمراہ امریکہ آگئی۔ آج کل مائیکرو بیالوجی (Microbiology) میں ماسٹر کی ڈگری لینے کے آخری مراحل میں ہوں۔"

"اور یہ شاعری کا الہام کیونکر ہوا؟"

وہ ہنس کر بولی "ایک دن یونہی بیٹھے بیٹھے اپنے خیالات کو کاغذ پر قلمبند کرنے کو جی چاہا تو وہ خیالات و احساسات ایک غزل کا روپ دھار کر سامنے آگئے۔ 1991ء میں جب میری غزل پاکستان کے اخبار "جنگ" میں شائع ہوئی تو میری کافی حوصلہ افزائی ہوئی۔ یوں اب تک شاعری کا سلسلہ جاری ہے۔"

"کن کتب کا مطالعہ کرنا پسند ہے؟"

"شاعری کی اچھی اور دلچسپ کتابوں میں غالب، پروین شاکر اور احمد فراز کو پڑھتی ہوں۔ ان کے کلام نے بہت متاثر کیا۔ ان کے علاوہ بھی اچھا کلام بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔"

"زندگی میں کوئی ایسی بات ہوئی ہے جو بھلائی نہ جائے؟"

"ہاں زندگی کا سب سے اہم واقعہ، وہ وقت جو کبھی نہیں بھولے گا۔ اگست 1991ء میں عراق و کویت کی جنگ کے دوران ہماری کویت سے براستہ واپسی ہو رہی تھی لوگوں کی کس مپرسیاں دیکھیں۔ اجڑے گھر دیکھے۔ بے شک وہ ایک افسوس ناک واقعہ تھا لیکن سفر کے دوران عراق، ترکی اور ایران دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا جو کسی حد تک دلچسپی کا باعث رہا۔ ویسے اب بھی اس خانماں بربادی کا سوچتی ہوں تو جھر جھری سی آجاتی ہے۔"

"اردو کے مستقبل سے پُرامید ہو؟"

"جہاں تک اردو زبان کے مستقبل کا سوال ہے تو اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے اور دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا علاقہ ہوگا جہاں اردو بولنے یا سمجھنے والے موجود نہ ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ دوسری زبانوں کو سیکھنے یا سمجھنے سے اردو زبان اپنی تاثیر اور مٹھاس کھو سکتی ہے۔ میں اس زبان کے روشن مستقبل سے بہت پُرامید ہوں کیونکہ کئی لوگ وطن سے دور اپنے بچوں کو اردو زبان سکھانے

میں کوشاں ہیں۔" (عروج بڑے جوش اور پر امید لہجے میں جواب دے رہی تھی۔)

"نثری شاعری کے بارے میں کیا رائے ہے؟"

"نثری شاعری کے کئی تجربات کسی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں کیونکہ کئی جذبات و احساسات ردیف اور قافیے کی قید میں نہیں رہنا چاہتے، وہ تو بس بکھر جانا چاہتے ہیں اور ایسے کئی بکھرے بکھرے سے جذبات دلوں کو چھو بھی جاتے ہیں۔ دیکھئے یہ اشعار

اور اب تو باندھ لیا ہے سفر ہی قدموں سے
نہ مل سکی مجھے منزل تو راستہ ہی سہی
چاند اترا ہے زمیں پر نہ کبھی اترے گا
ہم نے یہ سوچ کے راہوں سے ہٹالی آنکھیں

میرا اگلا سوال تھا، "مشاعروں کے بارے میں تمہارا اندازِ فکر کیا ہے؟"

"آج کل کے دور میں مشاعرے اپنا اصلی مطلب کھو چکے ہیں۔" وہ مدھم لہجے میں بولی۔ "بچپن سے جیسا مشاعروں کے ماحول کے بارے میں سنا تھا، انہیں ویسا نہیں پایا۔ کئی مشاعروں میں کچھ ادب سے نا آشنا حضرات صرف ایک سامع کی حیثیت سے موجود ہوتے ہیں اور اُن کی موجودگی کے باعث مشاعروں کا عمدہ کلام ان لوگوں پر بھی اثر انداز نہیں ہو پاتا جو شاعری کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ وہ بے ڈھنگی ہوٹنگ کرتے ہیں۔ آپ نے بھی سنا ہے نا۔" اب اس کے لہجے میں افسوس بھی تھا۔"

"کتابوں سے اب لوگوں کی دلچسپی کم ہو چلی ہے۔ تمہارے خیال میں اس کی وجہ کیا ہے؟"

"الیکٹرانک میڈیا بہت عمدہ پیمانے پر اردو زبان کی ترقی میں مدد فراہم کر رہا ہے لیکن اس میڈیا کی عمر ابھی کم ہے۔ بہت کام ہو رہا ہے اور بہت سا ہونا باقی ہے۔ جہاں تک پرنٹڈ میڈیا کی بات ہے تو اس کی آج سے نہیں بلکہ برسہا برس سے ہی ضرورت رہی ہے اور رہے گی۔ ٹھیک ہے کہ حوالوں کے لیے الیکٹرانک میڈیا بھی استعمال ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک بات ہے مکمل طور پر مطالعہ کی تو اس کے لیے ضروری ہے کہ کتابوں اور جرائد کی اشاعت کی حوصلہ افزائی کی جائے بلکہ جہاں تک ہو سکے نئے اور پرانے سب لکھنے والوں کی نمائندگی کی جائے تاکہ جو صلاحیتیں کسی مجبوری یا رکاوٹ کی وجہ سے نظروں سے نہیں گزر پاتیں اس سے لوگ روشناس ہو سکیں۔ میں الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹڈ میڈیا یا دونوں کی حمایت میں، یہ کہنا ضروری سمجھتی ہوں کہ دونوں میڈیا ہمارے ادب کا حصہ ہیں اور اردو ادب کو ان دونوں پہیوں پر چل کر آگے بڑھنا ہے۔"

"تنقیدی ادب کا مطالعہ تو تم کرتی ہوگی۔ آج کی تنقید کے بارے میں کیا رائے ہے؟"

"تنقید اگر طعنہ یا مذاق اُڑانے کے طور پر کی جائے تو اُس کا فائدہ تو خیر ہوتا ہی نہیں، ہاں نقصان یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف اس سے دل آزاری ہوتی ہے بلکہ صلاحیتیں بھی فنا ہونے لگتی ہیں۔

البتہ کسی بھی چیز کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ تعمیری تنقید ضرور ہو جس سے کامیابی کے، بہتری کے، اور آگے بڑھنے کے پہلو نکل سکیں۔ میں تو یہ دیکھ رہی ہوں کہ فی زمانہ ہر شاعر نہ صرف اپنے آپ کو ایک اعلیٰ پیمانے کا شاعر گردانتا ہے بلکہ دوسرے کسی شاعر کو شاعر تسلیم کرنے سے بھی گریز کرتا ہے کسی پر تنقید تو کر سکتا ہے لیکن اگر وہی تنقیدی الفاظ اُس کے اپنے لیے استعمال کیے جائیں تو ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ جبکہ کسی بھی چیز کی ترقی کا ایک راز تعمیری تنقید بھی ہے۔ کہ اس کے ذریعے مثبت پہلو نکلتے ہیں اور ایک عام سی تحریر بھی ایک شاہکار کی جگہ لے سکتی ہے۔"

ہماری گفتگو ختم ہو چلی تھی۔ میری کافی بھی ٹھنڈی ہو چکی تھی کہ میں عروج کی رواں گفتگو میں اس سے لطف لیتا ہی بھول گئی۔ پھر رات بھی بھیگ چلی تھی اس لیے ہم ایک دوسرے کو رخصتی پیار دے کر جدا ہو گئے۔

Urooj Malik
683 Albanese Circle
San Jose, CA95111 U.S.A

نظم

بہت پہلے
کہ میں نے جب اسے دیکھا نہیں تھا
نہ اُس کے لمس کی گرمی کبھی محسوس کی تھی
مگر اس دل کے کونے میں کہیں
اِک روشن سا لہجہ تھا،
کہ جس کی چاندنی سے، میری روح تک منور تھی
میں اپنی ذات کے اُلجھے سروں میں گم
یہیں اس بے اماں سے شہر میں، اسی کے نقشِ پا کو ڈھونڈتی تھی
کہ اُن آنکھوں کے آنگن میں خود کو ہی بسانا چاہتی تھی
وہی لہجہ۔ وہی آنکھیں، کہ جن پہ عمرِ رفتہ کے،
کبھی سپنے لٹائے ہیں کہ جن کی آرزو میں، اپنی آنکھیں تک بھی کھو دی ہیں
وہ نقشِ پا، کہ جن پہ چلتے چلتے، میں اپنی رہ گزر بھی بھول بیٹھی ہوں
اسی لہجے نے آج مجھ سے کہا ہے،
کہ تم۔۔۔۔ رستہ بدل لو!

اگر یادوں کے رشتے ٹوٹ جائیں
تو میں بھی وہم ہوں تو بھی گماں سے

عزیز الحسن عزیز
اکتوبر ۱۹۹۹ء

عزیز الحسن

نیویارک۔ امریکا

میں "سخن ور دوم" کی اشاعت کے سلسلے میں 96ء میں جب کراچی میں تھی تب حمایت علی شاعر صاحب نے مجھ سے پوچھا تھا۔ "سلطانہ تم نے عزیز الحسن صاحب کا تعارف شامل کیا ہے؟" "نہیں تو" مجھے پریشانی بھی ہوئی مگر ان کا پتہ میرے پاس نہ تھا، نہ اُس وقت مل سکتا تھا۔ بیشتر پتے مجھے ماہنامہ شاعر بمبئی اور ماہنامہ شمع دہلی سے ملے تھے یا پھر چند احباب سے۔ نیویارک سے جنہوں نے پتے دیے تھے ان میں عزیز الحسن صاحب کا نام نامی شامل نہ تھا۔ خیر میں نے سخن ور سوم کے وقت انہیں سوالنامہ بھجوادیا تھا مگر جواب نہیں ملا۔ سخن ور سوم جب عزیز الحسن صاحب کے بھانجے ضیاء خان نے دیکھی تو انہوں نے استفسار کیا۔ اب کے میں سرخرو تھی کیونکہ میں نے سوالنامہ بھجوا دیا تھا مگر جواب سے محروم رہی تھی۔ قصور میرا نہ تھا۔ ضیاء بھائی نے کہا چلیئے اگلی کتاب میں سہی۔ چنانچہ اس سال ضیاء خان نے اپنی آپا سلطانہ مہر کے اس کام کی ذمہ داری سنبھالی۔ جیسے شکاگو میں حسن چشتی صاحب اور غوثیہ سلطانہ ہیں۔ حسن صاحب نے میری بیحد معاونت کی ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ بہر حال عزیز الحسن صاحب گرفت میں آہی گئے۔

27 ستمبر 99 کے خط میں وہ لکھتے ہیں "قیل و قال اس لیے بھی رہی کہ میں کیا اور میری متاع

کیا؟ بہر حال اس امر کی داد نہیں دے سکتا کہ جس دیدہ ریزی سے آپ شعرا کے کوائف کا احاطہ کرتی ہیں اور جس لگن اور مستعدی سے آپ نے یہ کام سنبھالا ہوا ہے یہ نہایت قابلِ قدر اور قابلِ تحسین ہے اور میری داد و تحسین کی بساط سے باہر ہے۔ بڑا تاریخ ساز کام آپ نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ ماشاء اللہ۔"

جب بھائی عزیز اپنی شفقتیں نچھاور کر چکے تو ہم نے قلم سنبھالا۔ انہوں نے اپنا پہلا مجموعہ "متاعِ عزیز" مطبوعہ 1991ء بھجوایا تھا وہ سامنے رکھا۔

یہ مجموعہ تو میں پڑھ لوں گی، میں نے کہا۔ پہلے آپ اپنے بارے میں کچھ اظہارِ خیال کیجیے۔

فرمانے لگے "میرا نام سید عزیز الحسن ہے اور تخلص عزیز۔ 6 اکتوبر 1929 کو ناگپور ہندوستان کی خاک سے اُٹھا ہوں۔ بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی جامعہ کراچی سے کیا۔ ایل ایل ایم (کا۔ پوریٹ) نیویارک یونیورسٹی (امریکا) سے کیا۔ قانون و بینکاری میرے وسائلِ روزگار رہے۔ پہلی ہجرت ہندوستان سے پاکستان کی جانب اکتوبر 1950ء میں ہوئی۔ دوسری ہجرت پاکستان سے امریکا کی جانب مارچ 1973ء میں ہوئی ہے۔

"عزیز بھائی شعر گوئی کی ابتدا کیسے ہوئی؟

ہنس کر بولے۔ "ساتویں جماعت میں تھا اور عمر تھی کوئی سولہ سال، کسی نے طرحی مصرعہ سنایا اور پوچھا کہ میاں کیا تم بھی گرہ لگا سکتے ہو؟ اس جملے کو نہ معلوم کیوں میں نے چیلنج سمجھ لیا۔ ایک منٹ کے توقف کے بعد بصد احترام جواب دیا قبلہ آپ گرہ فرما رہے ہیں، میں نے تو مطلع کہہ دیا۔ سنایا تو تمام حاضرینِ مجلس نے پسند فرمایا۔ اس طرح میں شاعروں کی صف میں داخل ہو گیا۔ ایک دو سال تک غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی لیکن جیسے ہی میٹرک میں آیا۔ ایک مشفق اُستاد نے (جو خود بھی بہت اچھے شاعر تھے) ہدایت کی کہ یہ شوق اچھا ضرور ہے مگر ابھی اسے اُٹھا رکھو۔ تعلیم مقدم ہے، پہلے اسے ختم کر لو۔ لہٰذا اُن کی ہدایت پر میں نے شعر گوئی ملتوی کر دی اور نصابی تعلیم میں منہمک ہو گیا۔ یہ اور بات کہ کبھی کبھار ایک دو شعر کہہ لیا کرتا اور قریبی دوستوں کو سنا بھی دیتا مگر حوصلہ افزائی کے باوجود میں مشقِ سخن جاری نہ رکھ سکا۔

مشقِ سخن کا دوسرا دور، ہجرتِ ثانی یعنی امریکہ آنے کے بعد شروع ہوا۔ اس بار شعر گوئی کا قصد شعوری تھا، غیر اختیاری نہیں تھا۔ وجہ تحریک کچھ افتادِ طبع بھی تھی اور کچھ احساسِ بے وطنی۔ شہر ناپُرساں میں محبت کرنے والے عزیز اور دوستوں کی یاد نے بھی دل کو گداز بخشا اور اس طرح جذبوں کو زبان دینے کے لیے شعر کی آماجگاہ میں احساس نے پناہ ڈھونڈھنی شروع کر دی۔ پھر دیارِ غیر میں شمعِ اردو کے پروانوں میں روز بہ روز اضافہ بھی ہو رہا تھا جس سے شوق کو اور مہمیز لگی۔ ان کوائف کو میری شعر گوئی کے سفر کا نقطہ آغاز بھی کہا جا سکتا ہے۔ اب گذشتہ کئی سالوں سے باقاعدگی سے مشقِ سخن جاری ہے لیکن اب بھی یوں محسوس کرتا ہوں کہ اُسی نقطہ آغاز پر ہوں جہاں سے چلا تھا۔

میں خود کو بڑا خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ جہاں بھی رہا خدا نے مجھے اچھے دوست دیے۔ یہاں ان چند رفیقوں کا ذکر کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جن کی مسلسل بے لوث دوستی کے سہارے میں اس منزل تک پہنچا۔ ان میں پہلا نام تو میری اپنی شریک حیات کا ہے۔ جذبۂ عزتِ نفس اور استقلال مزاج کے علاوہ ہزار خوبیاں ہیں جو میں نے ان میں دیکھیں اور ان کی ہم سفری میں حسبِ توفیق ان سے استفادہ بھی کیا۔ شاہ حسن جیلانی (ایڈووکیٹ) میرے بچپن کے دوست اور نہایت شریف النفس انسان ہیں۔ اعتدال، ٹھہراؤ، استقلال، حلم و علم۔ سب ایک ہی شخصیت میں جمع ہو گئے ہیں۔ میری شعوری استقامت میں اُن کا بڑا حصہ ہے۔ ترغیبِ تعلیم میں جو کردار میرے دوست پروفیسر محمد فائق اور عبدالماجد صدیقی کا رہا ہے، اس کا اگر ذکر نہ کروں تو یہ میری غیر دیانتداری ہوگی۔ تعلیمی مسائل، میرے لیے بڑے مسائل تھے کیونکہ فکرِ معاش و خانہ داری کی ذمہ داریوں کے بعد اس طرف دوبارہ اور وہ بھی وقفوں وقفوں کے بعد آنا میرے لیے ناممکن تھا۔ اس محاذ پر ان تمام مہربانوں نے میرا ہاتھ بٹایا۔ ان کی پر خلوص حوصلہ افزائی سے میں نے ایل ایل بی تک تعلیم پائی۔

میرے ایک اور مخلص دوست ہیں جن کا ذکر نہ کرنا احسان فراموشی کے مترادف ہوگا۔ وہ ہیں اقبال احمد۔ بڑے حوصلے کے آدمی ہیں، جب بھی میں کسی بحران کا شکار ہوتا یہ ہمیشہ میری دستگیری کو موجود رہے۔ ان کے توسط سے کاروبارِ حیات چلانے میں بروقت امداد ملتی رہی۔ مجھ سے بے حد محبت کرتے ہیں اور بلا کسی غرض کے نہ جانے کیوں؟

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھ سے محبت کرنے والے ہر جگہ خدا نے دیے ہیں۔ میں اس نعمت پر اس کا شکر گزار ہوں۔

جناب حمایت علی شاعر نے عزیزالحسن کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "نیوٹن کو سیب کے درخت کی چھاؤں میں یکایک جس پُر مسرت آگہی کا احساس ہوا تھا، 81ء میں وہی احساس مجھے نیویارک کے ایک بین الاقوامی مشاعرے میں ہوا جب اسٹیج سے عزیزالحسن کا نام بحیثیت شاعر پکارا گیا۔ میں حیرت و مسرت کے "ملے جلے جذبات کے ساتھ کبھی اس کی طرف دیکھتا اور کبھی اُن سامعین کی طرف جو بے اختیار اُسے داد دیے جا رہے تھے۔ عزیز اور شاعر!

اور میری آنکھوں میں وہ دن رات جاگ اُٹھے جب ہم اردو کالج میں پڑھتے تھے۔ یہ 52ء کی بات ہے۔ ہم چار دوست، چہار درویش کی طرح۔ کراچی کے مولوی مسافر خانے کے ایک چھوٹے سے کمرے میں جمع ہوتے اور اپنی اپنی غربتوں کے ساتھ مشترکہ اسٹڈی کرتے ہوئے اعلیٰ زندگی کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ ان میں صرف میں تھا جو شاعری کر کے اپنا وقت ضائع کر رہا تھا مگر باقی تینوں، محمد فائق، شاہ حسن جیلانی اور عزیزالحسن دن رات پڑھائی میں مصروف رہتے۔ بزرگ کہتے ہیں کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے مگر آزمودہ محاورے کے برخلاف میری صحبت بھی اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ وہ پڑھتے رہے اور میں علامہ اقبالؒ کی ہدایت کی

بندۂ تخمین و ظن، کرم کتابی نہ بن

پر عمل پیرا رہا۔ چنانچہ میں تو اپنے تخلص کے نشے میں سرشار ریڈیو پاکستان (کراچی و حیدر آباد) میں کافی عرصے تک ایک موہوم نقطے کے طواف میں گم رہا اور میرے ہم جماعت کہیں سے کہیں نکل گئے۔ شاعری نے میرا جو بھی حشر کیا ہو، ایک عنایت ضرور کی۔ شعر سناتے سناتے میں نے ساری دنیا دیکھ لی اور جب امریکہ میں یکایک اپنے برسوں کے بچھڑے ہوئے دوست کو شاعر کے رُوپ میں دیکھا تو مجھے ویسی ہی خوشی ہوئی جیسے نیوٹن کو نئی آگہی سے ہوئی تھی۔

عزیزالحسن میں کھوئے ہوئے شاعر کی بازیافت نے مجھ پر ایک اور حقیقت کا انکشاف کیا۔ جب انسان ہجرت کرتا ہے تو شاید وقت اُس کی ذات میں ٹھہر جاتا ہے۔ آدم کو جنت سے نکلے لاکھوں سال ہو گئے مگر ابن آدم آج بھی جنت گم گشتہ کے خواب دیکھ رہا ہے۔ آج بھی اُس کے دل میں وہ غم تازہ ہے جب اس نے ترکِ وطن کیا تھا یہ اور بات کہ یہ غم بھی لذت کام و دہن کا خمیازہ ہے۔

"شجرِ ممنوعہ" کی طرف رغبت، ابلیس سے منسوب کی جائے کہ نیوٹن کی دریافت کے مطابق زمین کی کشش سے۔ نفس انسانی کا بنیادی تقاضا ہے۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

عزیزالحسن کا خمیر جس خاک سے اُٹھا تھا، اس کا سراغ عالم جوانی کے اُن لمحات سے ملتا ہے جب اس نے امتحان کے طور پر سہی، پہلا شعر کہا تھا۔ یہ اور بات کہ کسی بزرگ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اُس نے شاعری کو اپنے لیے "شجرِ ممنوعہ" سمجھ لیا اور ایک طویل عرصے تک اپنی زندگی مسلسل اعتکاف میں گزار دی، اس عرصے میں اس نے دو ہجرتیں کیں۔ ایک 1959ء میں، ہندوستان سے پاکستان اور دوسری 1973ء میں، پاکستان سے امریکہ۔ یعنی اس سرزمین پر جسے کولمبس نے ہندوستان سمجھ رکھا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہجرتوں کے آواگون میں وہ لاشعوری طور پر دوبارہ ہندوستان پہنچ گیا مگر ہجر کے ایک نئے احساس کے ساتھ، فانیؔ نے کہا تھا:

ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دُور

لیکن کولمبس کے ہندوستان میں نہ تو اس کا آبائی شہر ناگپور ہے اور نہ یوپی کا وہ خاندان جس نے ایک خاص عمر میں اس کی فکر کو شعورِ نطق عطا کیا تھا۔ چنانچہ عرصہ دراز کے بعد جب وہ اپنی خلوتِ جاں سے باہر نکلا تو اصحاب کہف کی طرح شاید وقت کو اپنی ذات میں ٹھہرا ہوا محسوس کیا۔ باہر کی دنیا بدل چکی تھی مگر اس کے اندر کی دنیا اسی محور کا طواف کر رہی تھی جسے اس کی ہری بھری عمر نے شوقِ عبادت میں اپنا کعبہ سمجھ لیا تھا۔

عزیزالحسن کے محرکاتِ شعری کا تجزیہ کرتے ہوئے جب میں اس نتیجے پر پہنچا تو مجھے اس کی شاعری قضاء نماز کی ادائیگی کے مترادف نظر آئی۔ نماز چاہے بروقت پڑھی جائے چاہے قضاء۔

محویت کا ایک ہی عالم ہوتا ہے۔ شاعری کی طرف اس کی مراجعت اور پوری محویت کے ساتھ شعر گوئی نہ صرف اس کے دیانتِ عشق کی دلیل ہے بلکہ اس کی غم کی بھی، جو ہر ہجرت نصیب دل میں تازہ رہتا ہے اور عزیز کا تو تجربہ ہی اور ہے۔ وہ ظاہری ہجرت سے بھی گزرا اور باطنی ہجرت سے بھی۔ اس نے جسم کا عذاب بھی سہا ہے اور روح کا بھی اب اگر وہ خاموش رہتا تو پتھر بن جاتا۔"

جناب ملک زادہ منظور نے عزیز الحسن کی شاعری کے سلسلے میں بڑی دل نشیں بات کہی ہے۔ کہتے ہیں عزیز الحسن کے کلام میں روایت کا وہی ورثہ ہے جسے اقلیم سخن کی ایک نسل نے دوسری نسل تک بہت ہی زیادہ چھان پھٹک کر منتقل کیا ہے۔ میں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ محض روایت کی پاسداری اور اس کا احترام کسی شاعر کو عظیم شاعر نہیں بناتا مگر اسی کے ساتھ ساتھ میں اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کر سکتا کہ روایت کو سلیقہ کے ساتھ برت کر اور تربیت یافتہ انداز میں اُسے اپنا کر کوئی بھی شاعر اپنے خوش فکر ہونے کا ثبوت فراہم کر سکتا ہے۔ عزیز الحسن عزیز کی ذہنی تربیت اور تشکیل فکر کلاسک نہج پر ہوئی ہے۔ ان کے اشعار میں تخلیقی عوامل کا جو لہو گردش کر رہا ہے وہ اپنی قدامت اور کہنگی کے باوجود تازہ دم ہے۔ شاعر نے اُسے اپنی فنی مہارت اور جذبے کی گرمی سے باسی ہونے نہیں دیا ہے۔"

عزیز الحسن دوستوں کے دوست ہونے کے باوجود اپنی دنیا میں محدود اور مگن ہیں۔ پی آر سے گھبراتے ہیں لہٰذا زیادہ وقت مطالعہ میں گزارتے ہیں تاکہ ادبی سیاسی فضا ان کے فنِ شاعری کو زنگ آلود نہ کر دے۔

Syed A Hasan
447 E 14th St Apt 9H
New Yourk NY 10009-2726 U.S.A.

انتخاب کلام

عزیزالحسن

سراغِ قتل بھی معلوم اسمِ قاتل بھی
گواہ شہر میں کوئی دکھائی دیتا نہیں

خموش رہ کے ہے ملزم کا منصفوں کو سلام
زباں بریدہ بیانِ صفائی دیتا نہیں

خون کے چھینٹوں سے مل جاتا ہے قاتل کا سراغ
سچ ہے لیکن تیرا رنگِ پیرہن دیکھے گا کون

مفتیِ دیں کا ہے شاہوں سے تقاضا کہ ہمیں
خلعت وجبہ و دستار و قبادے جاؤ

صحرا صحرا گل بوٹے ہیں جن کی آبلہ پائی کے
بستی بستی اُن لوگوں پر سنگِ ملامت آج بھی ہے

مقتل مقتل دیوانوں نے کل بھی سر قربان کیے
قریہ قریہ منصوروں کو دار کی چاہت آج بھی ہے

کس طرح قانون توڑے جا سکیں
اس کے بھی قانون بنوائے گئے

اُسے اب بھول جانے کا ارادہ کر لیا ہے
بھروسہ تھا لگا خود پہ زیادہ کر لیا ہے

عطاء الحق قاسمی

۱۹ ر فروری ۱۹۹۵ء

عطاء الحق قاسمی

لاہور

عطاء الحق قاسمی صاحب سے میری ملاقات لاس اینجلس میں ریحانہ قمر چودھری کی کتاب کی تقریب کے موقع پر ہوئی۔ اسی شام ہم دونوں ہال کے ایک گوشے میں بیٹھ گئے اور میں نے وہیں 'سخن ور چہارم' کے لیے ان سے گفتگو کی۔ ان کے لیے محترم احمد ندیم قاسمی نے لکھا ہے کہ "عطا کے کالم کے آغاز میں ایک ننھی سی بات ایک کلی کی طرح نمودار ہوتی ہے۔ پھر یہ کلی ایک صدائے بے صدا کے ساتھ، انتہائی بے ساختگی سے چٹکتی ہے اور جب عطا آخر میں اپنے موضوع کو سمیٹتا ہے تو جیسے ایک طلسمی اشارے کے ساتھ (جو دراصل ایک طلسمی جملہ ہوتا ہے) موضوع کے غنچے کو ایک پھول کی صورت دے کر الگ ہو جاتا ہے۔ اور آپ اس پھول کے رنگوں اور مہکاروں میں گھرے رہ جاتے ہیں اور سوچتے رہ جاتے ہیں اور جب آپ اس پھول سے نظریں ہٹاتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ آپ کچھ بدل گئے ہیں اور خوشگوار مثبت انداز میں بدلے ہیں یعنی ذہنی اور وجدانی لحاظ سے کچھ آگے بڑھ آئے ہیں۔ عطا کے کالموں میں بلا کا تنوع ہے، تازگی ہے اور یہ تازگی اتنی بھرپور ہے کہ اسے چھو لو تو جیسے تتلی کے پروں کی طرح رنگ اچٹ کر پوروں میں چلے آئیں گے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں صحافت اور ادب کی سرحدیں آپس میں مل جاتی ہیں اور اخبار میں درج

ہونے والے یہ کالم سالہا سال تک کے لیے صفحۂ دل پر نقش ہو جاتے ہیں۔"

ندیم قاسمی صاحب کی یہ رائے عطا قاسمی کی تحریر کے لیے ہے ان کے کالموں کے لیے ہے لیکن میں نے جب عطا کو بولتے سنا تو مجھے ندیم قاسمی صاحب کی یہ رائے عطا کی خطابت پر بھی سو فیصد پوری اترتی محسوس ہوئی۔

عطا کی گفتگو بھی شگوفے کھلاتی ہے اور مسکراہٹوں کے بعد قہقہوں کی پھوار اڑاتی ہے۔ پہلی بارش کے چند ٹھنڈے میٹھے چھینٹوں کی طرح بدن کو، ذہن کو اور روح تک کو سرشار کرتی ہے۔ جی چاہتا ہے اس کی گفتگو اسی طرح شگوفے کھلاتی رہے، لفظوں کی تتلیاں اڑتی رہیں۔ سننے والے ان تتلیوں کے تعاقب میں رہیں اور تتلیوں کے رنگ ان کی انگلیوں کے پوروں کو ہی نہیں بلکہ ان کے پور پور کو نئے رنگ بخش دیں۔

آج عطا الحق قاسمی ہماری محفل میں ہیں۔ مزے کی بات یہ ہوئی کہ سوال نامہ سخن ور کا بھی میرے پاس تھا اور گفتنی کا بھی۔ عطا نثر نگار ہیں مگر ان کی شناخت شاعر کی حیثیت سے زیادہ ہے۔ پھر بھی میں نے ان کے لیے "گفتنی" کے سوالات چنے۔ عطا کے لیے کوئی بھی سوال مشکل نہ تھا وہ میرے کام کو سراہ رہے تھے۔ "سخن ور اور گفتنی" کے حوالے سے میری محنت کی داد دے کر میرے حوصلے بڑھا رہے تھے۔ پھر انہوں نے اپنے بارے میں بتانا شروع کیا۔

"جی ہاں میرا قلمی اور پیدائشی نام عطاء الحق قاسمی ہے۔ میری پیدائش یکم فروری 1943ء کو امرتسر میں ہوئی۔ وہاں سے ہم ہجرت کر کے وزیر آباد آئے۔ پرائمری تعلیم وزیر آباد میں حاصل کی۔ اس کے بعد ماڈل ٹاؤن لاہور آگئے۔ تب سے اب تک ہم یہیں ہیں۔ بی اے کے بعد اردو ادب میں ایم۔ اے کیا۔ اس کے بعد "نوائے وقت" میں بطور سب ایڈیٹر وابستہ ہو گیا۔ وہاں سے ایم اے او کالج میں لیکچرار لگا۔ 31 سال سے نوائے وقت میں کالم لکھ رہا ہوں۔ 27 سال تک ایم۔ اے۔ او کالج میں پڑھایا۔ آج کل ناروے میں پاکستان کے سفیر کے فرائض انجام دے رہا ہوں (اس کے بعد وہ تھائی لینڈ کے سفیر رہے۔ 12 اکتوبر 99ء کے بعد سے لاہور میں ہیں)۔

بیسویں صدی کے اردو ادب میں زندہ رہ جانے والے ناموں کے حوالے سے انہوں نے کہا۔ "اقبال سے بڑا تو کوئی نام نہیں ہے۔ اقبال کے بعد فراق، جوش، فیض، ندیم، منیر نیازی، ن۔ م راشد اور مجید امجد کے نام اہم ہیں۔ انہوں نے کہا میراجی کا میں قائل نہیں ہوں۔"

سوال نمبر 3 کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا۔ بعض لوگوں نے جدیدیت کو اس انداز سے لیا کہ فرانس کے جو افسانہ نگار تھے ان کے چبائے ہوئے نوالوں کو اپنے ہاں لیا اور وہ بھی نہایت بھدے طریقے سے۔ بعض وہ ہیں جنہوں نے سمبلز اور علامتیں اپنے ہاں سے لیں۔ چنانچہ وہ کہانی کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوئیں۔ اس سلسلے میں دو مثالیں جو بہترین لگتی ہیں اور جنہوں نے علامت کو کہانی کے بڑھاوے میں استعمال کیا وہ انتظار حسین اور محمد منشا حسین یاد ہیں۔"

موجودہ صدی میں ناول کم لکھے جانے کی وجوہ بیان کرتے ہوئے وہ بولے۔

”واقعی یہ بہت ہی اہم سوال ہے۔ اس کی بہت سی وجوہ لوگ بیان کرتے ہیں مگر ابھی تک میں نہیں سمجھ پایا کہ جو وجوہ بیان کی گئی ہیں اُن میں سے کسی ٹھوس وجہ کو درست قرار دیا جاسکے۔ لیکن اس کے باوجود جتنے بھی ناول لکھے گئے ہیں اگرچہ تعداد میں وہ بہت زیادہ نہیں ہیں مگر پھر بھی وہ بہت اچھے ناول ہیں۔ میں قراۃ العین حیدر کی مثال دوں۔ اُن کا ایک ناول جو بہت نظر انداز کیا گیا وہ ان کے چوٹی کے ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی وجہ محض اُس کا نام ہے وہ نام میرے ذہن سے اس وقت نکل گیا ہے۔ وہ نام ہیروئن کے نام پر تھا اُس کی ہیروئن آدھے ناول میں آکر مرجاتی ہے اور یہاں قاری کی دلچسپی ختم ہوجاتی ہے اگر ناول کا نام ہیروئن کے نام پر نہ ہوتا تو وہ بھی اُن کے بہترین ناولوں میں سے تھا۔ اس طرح بانو قدسیہ کا نام ”راجہ گدھ“ کے حوالے سے لیا جائے گا جو کہ بلاشبہ بہت اچھا ناول قرار دیا جاسکتا ہے۔ (”راجہ گدھ“ کو 23 مارچ 2000ء میں ”پرائڈ آف پرفارمنس“ سے نوازا گیا ہے)

آپ یہ سن کر حیران ہوں گی کہ ایک شخص ہوتا تھا لاہور میں ہوتا تھا خالد فاروق۔ جھلا سا آدمی تھا۔ وہ ہالینڈ چلا گیا وہاں کمرے میں بند رہ کر اُس نے ایک ناول لکھا ”سیاہ عید“ وہ روسی روایت میں لکھا گیا ناول ہے جو کمال کا ناول ہے وہ That is Fantastic بہت سے ناول ہیں مگر یہ سوال اپنی جگہ موجود ہے کہ جتنے ناول لکھے جانے چاہئے تھے۔ اتنے ناول نہیں لکھے گئے ہیں اور اس کی وجہ معاشی ناآسودگی ہے۔“

سوال نمبر 5 کے ضمن میں ان کا جواب تھا

”میں شروع سے اس سلسلے میں ایک بات کہتا ہوں کہ ادیب جو ہے وہ کسی بھی نظام فکر کو مانتا ہو اُسکو اُس نظامِ فکر کے ساتھ مخلص ہونا چاہئے۔ دوسری بات میں یہ سمجھتا ہوں کہ ادیب کو خوفِ فسادِ خلق کی پرواہ نہیں ہونی چاہئے۔ مجھے یہ بات کہتے ہوئے دُکھ محسوس ہوتا ہے کہ آج کا ادیب کوئی بات لکھنے سے پہلے اُسے تولتا ہے۔ تولتا ان معنوں میں ہے کہ اس سے شہرت داغ دار تو نہیں ہوگی، اس سے مجھے انقلابی تو نہیں سمجھ لیا جائے گا۔ اس سے مجھے رجعت پسند تو نہیں کہا جائے گا۔ اس سے مجھے کمیونسٹ تو نہیں سمجھ لیا جائے گا۔ اس سے مجھے جماعتِ اسلامی کا بندہ تو نہیں گردانا جائے گا۔ اس جمع تفریق (Calculation) میں پڑ جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادیب جو بھی محسوس کرے یہ پرواہ کیے بغیر کہ اُس کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے گی۔ اُسے اپنے دل اور ضمیر کی آواز پر لبیک کہنا چاہئے اور یہی بہترین راستہ ہے۔ ہمیں فسادِ خلق کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ خود مجھے کرنی پڑ رہی ہے۔“

انہوں نے بتایا شاعری ہو یا نثر معیارِ ادب کے پیمانے کی کسوٹی۔ ایسا ادب ہے اور میں اُس ادب کو بڑا ادب سمجھتا ہوں جو ایک سطح پر عوام کو بھی ٹچ کرے اور خواص کو بھی اور دونوں میں یکساں

مقبول ہو۔ چنانچہ آپ اس پیمانے پر پرکھ کر دیکھیں تو جنہیں زمانے نے بڑا قرار دیا ہے رومی، سعدی، اقبال، میر، غالب، یہ سب لوگ جو ہیں انہیں خواص بھی بڑا مانتے ہیں اور کسی نہ کسی سطح تک عوام کے دلوں کو بھی ایسا ادب متاثر کرتا ہے۔ میرے خیال میں یہی معیار ہے اور معاف کیجئے گا ہمارے ہاں ایک طبقہ ایسا بد قسمتی سے موجود ہے جو مقبولیت کو ایک شجر ممنوعہ سمجھتا ہے۔ ان میں سے بیشتر وہ ہیں جو مقبولیت کے لیے تمام تر کوششیں کرنے کے باوجود مقبول نہیں ہو سکے تو لہٰذا ان کی باتوں پر بھی ہمیں زیادہ دھیان نہیں دینا چاہئے قبولیت کی خواہش ایسا گناہ نہیں ہے جس پر آپ شرمندہ ہوں۔

سوال سن کر انہوں نے کہا۔ "آپ نے بہت اچھا سوال کیا ہے کیونکہ اس کا جو جواب ہے اس پر مجھے بہت برا بھلا کہا جاتا ہے۔ آپ نے تو صرف انگریزی کا حوالہ دیا میں تو کہتا ہوں کہ تمام پاکستانی زبانیں اردو زبان میں آنی چاہئیں۔ اس کے لیے شعوری کوشش نہیں ہونی چاہئے بلکہ بے ساختہ عمل ہو۔ دیکھیں اردو جو ہے یہ ترکی کا لفظ ہے اور اس کا مطلب لشکر کے ہیں۔ یہ لشکری جو آئے تھے وہ اپنی زبانیں بولتے تھے۔ اس سے یہ ایک نئی زبان بولنے لگے تو اس کو باہر کی اور دوسری زبانوں کا قرب ملا ہے۔ میں اب بھی کہتا ہوں کہ انگریزی کا مناسب لفظ جو اردو سے بہتر ہے۔ پنجابی کا، پشتو کا، سندھی کا بلوچی کا۔ اردو کی نسبت جو زیادہ بہتر ہو جو زیادہ بلیغ ہو وہ آنا چاہئے۔ بہت سے لوگ خفا ہوتے ہیں لیکن میں اپنے ڈراموں میں اپنے کالموں میں اور دوسرے نثرپاروں میں بالکل یہ چیز استعمال کرتا ہوں۔ اس پر ایک مرتبہ ایک قاری کا خط آیا جس میں اُس نے بہت برا بھلا کہا جس پر میں نے لکھا کہ بھائی آپ مجھے برا بھلا نہ کہیں کیونکہ آنے والے زمانے میں اردو معلیٰ نہیں چلے گی بلکہ اردوئے محلہ چلے گی۔"

تنقید کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ کسی زمانے میں ہمارا نقاد کتنا Active ہوتا تھا کہ منٹو کا ایک افسانہ چھپا اور اُس پر بحثیں شروع ہو جاتی تھیں۔ اشفاق احمد کا افسانہ گڈریا شائع ہوا اور نقاد اس کو قاری تک پہنچانے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ اب صورتِ حال یہ نہیں رہی ہے۔ آج کا نقاد گروپوں اور طبقوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں۔ میرا رسالہ "معاصر" ہے اس کے پہلے تین شماروں میں قاسمی صاحب کا ایک افسانہ "بین" (بین ڈالنا) کے نام سے شائع ہوا تھا آپ یقین کریں کہ اُس افسانے کا شمار قاسمی صاحب کے بہترین افسانوں میں ہوتا ہے۔ چوٹی کے افسانوں میں ہوتا ہے جو انہوں نے ماضی میں لکھی ہیں لیکن کسی پرچے نے کسی نقاد نے کوئی لفظ اس کے بارے میں نہیں لکھا حالانکہ وہ افسانہ کئی جگہ دوبارہ چھپا ہے Reproduce ہوا ہے لیکن کسی نقاد نے کچھ نہیں لکھا۔ اسی طرح کے بہت سے فن پارے شائع ہوتے ہیں لیکن نقاد گروپ بندی کی وجہ سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ یہ رویہ بہت ہی برا ہے۔ باقی آپ نے جو تراجم والی بات کی ہے تو یہ صورتِ حال یقیناً تھی مگر اب یہ صورتِ حال کچھ تبدیل ہو گئی ہے۔ اب اکیڈمی آف لیٹرز نے بہت

سارے تراجم شائع کیے ہیں۔ اسی طرح دوسرے اداروں نے بھی بہت سارے تراجم چھاپے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام تیز کرنے والا ہے اور اس سے بھی ضروری یہ کام ہے کہ ہم اپنی دیگر اہم تخلیقات کو دنیا کی بڑی زبانوں میں چھاپیں۔ سلطانہ یہ بہت ضروری ہے۔"

"معاصر" آپ کب سے شائع کر رہے ہیں؟ کیا یہ سہ ماہی ہے؟"

"دس سال سے نکل رہا ہے یہ سہ ماہی نہیں بلکہ سال میں ایک دو شمارے اس کے آتے ہیں لیکن ضخیم ہوتے ہیں جیسے نقوش ہوتا تھا کسی زمانے میں۔"

قاسمی صاحب آپ سے بہت ہی دلچسپ اور معلوماتی گفتگو رہی۔ اب اپنی زندگی کا کوئی اہم واقعہ سنائیے۔

یہ تو سلطانہ لمبی کہانی ہے۔ میں اب 56 سال کا ہو رہا ہوں اور میں نے صحافت، ادب، تعلیم اور اب سفارت میں بھی قدم رکھا ہے۔ میری تو پوری زندگی اہم واقعات سے بھری پڑی ہے۔"

"یقیناً ہوگی۔ کوئی ایسا واقعہ جس کا ادب سے بھی تعلق ہو، ضرور سنائیں۔"

"چلیے آپ کے کہنے پر میں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ مجھے یاد آگیا ہے۔ کافی سال پہلے کی بات ہے۔

"ایک شاعر ہوتا تھا وزیر آباد میں جس کا نام تھا مقصود وزیر آبادی۔ وہ فٹ پاتھ پر صندوقچی رکھ کر چھولے بیچتا تھا۔ ایک دن میرے پاس آیا تو کہنے لگا قاسمی صاحب میں شاید نہ بچ سکوں۔ میں نے کہا اللہ خیر کرے کیا ہوا تمہیں؟ کہنے لگا مجھے ٹی بی ہوگئی ہے۔ میں نے کہا ٹی بی اب کوئی ایسا ناقابلِ علاج مرض تو نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ چلو۔ میں اُس کو ساتھ لے کر گلاب دین ہسپتال گیا اور وہاں داخل کرا دیا۔ ڈاکٹر احسان جو وہاں کے بڑے ڈاکٹر ہیں میرے اچھے جاننے والے تھے انہوں نے کہا کہ آپ فکر نہ کریں ہم ان کو اعلیٰ سے اعلیٰ دوائیاں مفت دیں گے۔ پھر میں نے کالم لکھا تو اس کے لیے چالیس ہزار کے چیک موصول ہوئے۔ میں سارے پیسے لے کر گلاب دین ہسپتال گیا اور میں نے کہا مقصود وزیر آبادی دوائیاں تو ادھر ہو جائیں گی تم ان سارے کے سارے پیسوں سے مکھن کھانا دودھ پینا اور تمہیں پھل کھانے ہیں اور سارے کا سارا پیسہ اپنی ذات پر لگانا ہے۔ سات مہینے کے علاج کے بعد انشاء اللہ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔

جس وجہ سے آپ کو یہ واقعہ سنا رہا ہوں کہ شاعر کیا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مقصود زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑا تھا مگر اُسے اپنی جان کی پرواہ نہیں تھی۔ کہنے لگا قاسمی صاحب اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں ان پیسوں سے اپنا شعری مجموعہ چھپوا لوں۔ میں نے کہا یار مقصود بات سنو میرا تم سے پختہ وعدہ ہے کہ یہ رقم تم اپنی صحت پر خرچ کرو جب تم سات مہینے کے بعد واپس آؤ گے تو تمہارا مجموعہ تمہیں تیار ملے گا۔ میں خود چھپواؤں گا یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ کہنے لگا ٹھیک ہے۔ لیکن وہ دو مہینے کے بعد میرے پاس آیا۔ جناب اس کے ہاتھ میں اُس کا شعری مجموعہ چھپا ہوا تھا اور اگلے مہینے وہ فوت ہو گیا۔"

یہ واقعہ سن کر میں بھی دکھی ہو گئی اور کہا لیکن قاسمی صاحب بہت اچھا ہوا کہ اس کی زندگی میں اس کا مجموعہ شائع ہو گیا۔ اس کی حسرت تو پوری ہو گئی۔ اپنا مجموعہ دیکھ کر اُسے جو خوشی ہوئی ہو گی اس کا اندازہ ہمیں اتنی آسانی سے نہیں ہو سکتا۔"

بے شمار تصانیف کے خالق عطاء الحق قاسمی نے پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے بھی بے شمار ڈرامے لکھے ہیں۔ 1992ء میں انہیں حسن کارکردگی پر صدارتی ایوارڈ دیا گیا۔ اے پی این ایس نے 1990ء میں بہترین کالم نویسی کا ایوارڈ انہیں دیا۔ پشاور یونیورسٹی کے ایم۔ اے اردو کے نصاب میں ان کا سفر نامہ "شوقِ آوارگی" شامل ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے اردو اختیاری بی۔ اے کے نصاب میں ان کے فن پر مضمون شامل کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے نصاب میں بھی عطاء الحق قاسمی کی کتاب "جرمِ ظریفی" شامل کی گئی ہے۔

ATAULHAQ QASMI
AL-ATA C,452 JAHANZEB BLOCK
ALLAMA IQBAL TOWN LAHORE (PAKISTAN)

انتخابِ کلام

اب تو داد طلب کرتے ہیں ہم ہر کام سے پہلے
اور آرام بہت کرتے ہیں ہم آرام سے پہلے

اچھی لگتی ہے ضد اس کی لیکن سوچ رہا ہوں
کیسے اس کا نام لکھوں میں اپنے نام سے پہلے

شام ڈھلے مصروف بہت ہوتے ہیں میرے حاکم
جو کچھ ان سے کہنا ہو وہ کہہ لو شام سے پہلے

عطاؔ ہمارا شہر ہے یا آسیب نگر ہے کوئی
شام اترنے لگتی ہے ہر گھر میں شام سے پہلے

غزالہ عالم غزل

۱۹ اگست ۱۹۹۹ء

غزالہ عالم غزل

انگلینڈ

کہا جاتا ہے کہ شاعری مسائلِ حیات کے اظہار اور اس کی ترجمانی کا نام ہے۔ اب مسائلِ حیات میں جہاں معاشرے کی ناانصافیاں ہیں اور ان کی ناانصافیوں کی وجہ سے ظلم و جبر وجود میں آتا ہے ان کا ذکر ہے اور اس کے نتیجے میں ایک عام انسان جس طرح ان جور و جبر کا شکار ہوتا ہے اس کا اظہار کرتا ہے تو بلاشبہ یہ کہنا سچ ہے کہ شاعری مسائل حیات کے اظہار اور اس کی ترجمانی کا نام ہے مگر غمِ روزگار کے علاوہ ایک اور غم، غمِ جاناں بھی ہے اور ہر شاعر کی زندگی میں وہ دور ضرور آتا ہے جب شاعری میں مسائل حیات کے اظہار سے پہلے "غمِ دل" کے مسائل کا ذکر بھی آتا ہے۔ آج کے قدما بھی اس دور سے گزر چکے ہیں۔ غالب نے بھی ایسی ہی کسی کیفیت میں کہا ہوگا۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

اب کھینچ تان کر ہم تصوف کی دنیا سے اس کے ڈانڈے ملا دیں تو پھر غزالہ عالم غزل کا یہ مطلع بھی تصوف کی ایک خوبصورت مثال پیش کرتا ہے۔

مرے دل میں ایسا وہ گھر کر گیا
مجھ ہی سے مجھے بے خبر کر گیا

غزالہ عالم پیدا ہی انگلینڈ میں ہوئی ہیں۔ انگریزی ماحول میں پلنے اور بڑھنے کے باوجود غزالہ کو اگر اردو زبان وادب سے محبت ہے تو یہ انتہائی قابلِ تحسین بات ہے۔

غزالہ سوشل سائنس میں بی۔اے کی طالب علم ہیں۔ ساتھ ہی پاسپورٹ آفس میں اڑمن افسر بھی ہیں۔

میرے پوچھنے پر غزالہ کہنے لگیں:

"شاعری کے علاوہ یوں تو مجھے ہر صنفِ ادب سے ایک قلبی لگاؤ ہے کہ ادب ادب ہوتا ہے جو ہمیں کچھ نہ کچھ دیتا ہے۔ ہمارے شعور و فکر کو جِلا دیتا ہے۔ میری شاعری کسی خاص مکتبۂ فکر سے متاثر نہیں۔ ہاں روایت کو جدید ادب کی بلند ہوتی عمارتوں کی اساس (بنیاد) تصور کرتی ہوں جس کے بغیر یہ عمارت پل میں ڈھیر ہو سکتی ہے۔

میرا کلام لندن اور ہند و پاک کے مختلف رسائل میں بھی شائع ہوتا رہتا ہے۔ پہلا شعری مجموعہ "آبِ چشم" کے عنوان سے زیرِ ترتیب ہے امید کرتی ہوں کہ سالِ رواں یا پھر سال نو کے اوائل میں منظرِ عام پر آجائے گا۔"

غزل کے مطالعہ میں یوں تو ہر صنفِ سخن کی کتابیں رہتی ہیں۔ نثر و نظم دونوں کو شوق سے پڑھتی ہیں مگر رجحان شاعری کی طرف زیادہ رہا ہے غالب، اقبال، پروین شاکر، قتیل شفائی، ساحر لدھیانوی، احمد فراز، رئیس الدین رئیس، ابن انشا اور شہزاد احمد کی شاعری زیادہ مطالعہ میں رہتی ہے۔

غزالہ کا کہنا ہے کہ "یقیناً اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے لیکن افسوس اس کا ہے ہمارا عہد اس سے دُور ہوتا جارہا ہے۔ ہم اپنے بچوں کی اردو کی طرف کوئی خاص دھیان نہیں دے رہے مگر کچھ ایسے عشاقِ اردو بھی ہیں جو ایسے ممالک میں اردو کی شمعیں جلائے ہوئے ہیں جہاں مادری زبان کی آندھیاں چل رہی ہیں۔ میری نظر میں چند نام اہم ہیں جن میں برطانیہ کے مقصود الٰہی شیخ اور منصور ملک اس پودے کو اپنے خون سے سینچ رہے ہیں اس لیے یہ خیال ہوتا ہے اور دل سے دعا بھی نکلتی ہے کہ اردو زبان رہتی دنیا تک اپنا لوہا منواتی رہے گی۔"

سوال نمبر 6 کے جواب میں انہوں نے کہا:

"شاعری کی ہر صنف میں اظہارِ خیال ممکن ہے مگر جو طاقت غزل اور پابند نظم میں ہے وہ کسی صنف میں نہیں۔ آج کل تو کئی کئی اصناف ایجاد ہو رہی ہیں جو قطعی بے تکی اور مختصر عمر والی ہیں۔ نثری نظم تو مقبول ہو رہی ہے، مگر اس کا اپنا الگ اسلوب اور الگ فورم ہے جبکہ نثری غزل ایک مضحکہ ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ادبی نشستیں ادب کی تخلیق میں معاون ہوتی تھیں۔ ہر شہر میں طرحی

غزلیں ہوتی تھیں جو فکر عطا کرتی تھیں اور مشقِ سخن میں معاون ثابت ہوتی تھیں۔ مشاعرے بھی ضروری ہیں مگر آج کل مشاعروں کا معیار بالکل گر چکا ہے۔ گروپ بازی کا چلن عام ہو گیا ہے۔ سامعین گنے چنے شاعروں کو سن کر بور ہو چکے ہیں مگر منتظمین مشاعروں کے وہی گھسے پٹے ریکارڈ بجاتے رہتے ہیں۔" نئے باصلاحیت لوگوں کو موقع ہی نہیں ملتا کہ وہ اپنی جگہ بنائیں۔

وہ کہہ رہی تھیں :

"یہ سچ ہے کہ الیکٹرونک میڈیا نے ذہنی عیاشی زیادہ فراہم کی ہوئی ہے اور قلم کو مطالعہ سے دُور کر دیا ہے جس کا اثر اشاعت پر پڑا ہے۔ جب تک ٹی وی کا زمانہ نہ تھا تو لوگوں کے پاس مطالعہ کا وقت تھا۔ اس کے برعکس لوگ اب اپنا وقت ٹی وی پر ضائع کرتے ہیں۔ بہت ہوا تو صبح اخبار اُٹھایا سُرخیاں دیکھیں اور رکھ دیا۔ اس لیے بہتر ہے ہم خود کو چند حصوں میں بانٹ لیں۔ ہمیں کچھ وقت مطالعہ کے لیے ضرور رکھنا چاہئے ہمارا مطالعہ ہی کتب و جرائد کی بقا کا ضامن بن سکتا ہے۔"

غزالہ کا کہنا ہے کہ تنقید ادب کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنی ہمیں اپنی صحت کے لیے متوازن غذا پھلوں، سبزیوں اور دواؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح ایک صحت مند جسم کو بھی پروٹین کی ضرورت ہوتی ہے یا اس کی صحت کی جب تعریف ہوتی ہے تو اس کو ایک خوشی حاصل ہوتی ہے اگر کچھ کمی کی طرف کوئی اشارہ کرتا ہے تو ہم اپنی کمی کو درست کر کے صحت مند ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح تنقید بھی ادب کی خامیوں کی نشان دہی کر کے اسے نکھار دیتی ہے۔

Ghazala Alam
55 Rassell Street Peter Borough
PEI 2BJ England U.K

میرے دل میں ایسا وہ گھر کر گیا
مجھ ہی سے مجھے بے خبر کر گیا

راہ میں چھوڑ کر جب گیا وہ مجھے
اور مشکل وہ میرا سفر کر گیا

شمع اُلفت جلا کر مسیحا مرا
کتنا ویران دل کا کھنڈر کر گیا

اُس کی یادیں غزل مرے ساتھ ہیں
کتنا آباد دل کا نگر کر گیا

ایک نہیں تو اور بہت ہیں دنیا کا دستور یہی ہے
جانے والے کو جانے دے، اس کو پلٹ کر دیکھا نہ کر

ملک فضل حسین ۔ برمنگھم
بروز ۱۵ جون ۱۹۹۹ء

ملک فضل حسین

لندن۔ برطانیہ

پروفیسر ڈاکٹر خاور امروہوی (مقیم کراچی پاکستان) کا یہ شعر کتنا دل نشین اور معنی آفریں ہے:

دامن کو کانٹوں سے بچاؤ ورنہ وہ پھٹ جائے گا
پھولوں سے یارانہ رکھو، خوشبو میں بس جاؤ گے

لندن (برطانیہ) کے شاعر ملک فضل حسین کے مجموعہ کلام "کلیاتِ امجد" میں ان کی شاعری پر پروفیسر خاور نے اجمالی نظر ڈالی ہے۔ ان کی شاعری کو سراہا ہے اور اشعار کا تجزیہ عروض کے حوالے سے بھی کیا ہے۔ ایک جگہ فضل حسین کے مطلع پر انہوں نے لکھا ہے

طبیعت میں میری سکون آ گیا
مجھے یاد لاتحزنون آ گیا

"جب کسی شعر میں ایسا لفظ یا جملہ پایا جائے کہ جسے دیکھنے یا سننے سے کوئی تاریخی واقعہ یاد آجائے تو اسے "تلمیح" کہتے ہیں۔ اس شعر میں "لاتحزنون" سے حضور اکرم کی ہجرت کا واقعہ یاد آگیا کہ غارِ ثور میں داخل ہونے کے بعد حضور اکرم نے اپنے یارِ غار حضرت ابو بکر صدیقؓ سے فرمایا تھا "لاتحزن ان اللہ معنا" ان الفاظ نے اس مطلع کو "صنعت تلمیح" عطا کی۔"

15 جنوری 1935 کو موضع لنگاہ تحصیل و ضلع چکوال (پاکستان) میں پیدا ہونے والے ملک فضل حسین نے ایس ایم لا کالج اور ایڈورڈ کالج پشاور سے اور برمنگھم یونیورسٹی انگلینڈ سے بی۔ اے، ایل ایل بی، اور ایم فل تک تعلیم حاصل کی۔ 1964 میں برمنگھم برطانیہ تشریف لائے۔ اس سے قبل راولپنڈی پاکستان میں وکالت کرتے تھے۔

برطانیہ میں انہوں نے اردو زبان و ادب کے لیے بہت کام کیا ہے۔ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"1973ء میں راجہ محمد امیر خاں راجہ آف محمود آباد تشریف لائے۔ وہ اُن دنوں پاکستان میں انجمن ترقی اُردو کے چیئرمین تھے۔ اُن کے ہمراہ فرنگی محل والے میاں عبدالباری بھی تھے۔ ان کے ایما پر برمنگھم میں ہم نے انجمن ترقی اُردو کی داغ بیل ڈالی۔ میرے ساتھ میرے دوسرے دو دوست راجہ لطیف کلیم اور بشیر اعوان مرحومین تھے۔ مجھے پہلے سال انجمن کا صدر مقرر کیا گیا اور اس کے بعد متعدد پانچ سال انجمن کا جنرل سیکرٹری کا عہدہ میرے ذمہ رہا۔ اس دوران انجمن کے اسٹیج سے جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری، جناب فیض احمد فیض، جناب احمد فراز، جناب ماہر القادری، جناب جمیل الدین عالی اور جناب قتیل شفائی جیسے نابغہ روزگار شعراء کرام نے مشاعرے پڑھے۔

1948ء میں یوم اقبال ڈے اور یوم آزادی کے انعقاد کے سلسلے میں اراکین انجمن کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے تو میں نے علیحدگی اختیار کر کے اُردو فورم (یو۔ کے) برمنگھم کی تشکیل کی اور تب سے اب تک ماشاء اللہ اس کی ماہانہ محافل باقاعدگی سے منعقد ہو رہی ہیں۔ سالانہ پروگراموں میں نعتیہ مشاعرہ، یوم اقبال اور اگست میں یوم آزادی کے موقع پر ایک عوامی مشاعرہ منعقد کیا جاتا ہے۔

راقم الحروف کے دو شعری مجموعے "ابیاتِ ابجد اور کلیات ابجد" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ برمنگھم یونیورسٹی سے "مسلم فیملی لا ان یو۔ کے" پر ریسرچ ورک اسی نام سے کتابی صورت میں چھپ چکا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ایک ماہانہ مجلّہ "نظام اسلام" کے نام سے شروع کیا تھا۔ جو وسائل کی کمی کی وجہ سے جاری نہ رہ سکا۔ دیگر کئی چھوٹے چھوٹے کتابچے انگریزی اور اُردو زبان میں شائع کیے ہیں۔ جب دس سال قبل ملعون و مرتد سلمان رشدی نے سیٹانک ورسز لکھی تھی تب راقم الحروف نے اس کے جواب میں ایک مفصل کتابچہ انگریزی زبان میں چھاپ کر ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیا تھا۔

ملک فضل نے شاعری کی سبھی اصناف میں اشعار کہے ہیں۔ نثر بھی لکھی ہے جو اشعار سے زیادہ مقبول ہوئی ہے۔ علامہ اقبالؒ اور مولانا حالی کے مکتبۂ فکر سے متاثر ہیں۔ حمد و نعت کہنے کی جانب طبیعت زیادہ مائل رہتی ہے۔ دو شعری مجموعے "ابیاتِ ابجد" اور "کلیاتِ ابجد" شائع ہو چکے ہیں اور تیسرا شعری مجموعہ "ابیات اکمل" زیر ترتیب ہے۔

ان کے مطالعہ میں زیادہ تر فلسفہ اور دینیات اور تاریخی کتب رہتی ہیں مگر چند سالوں سے ساری توجہ قرآنِ حکیم کے مطالعہ پر صرف ہو رہی ہے۔ اس مقصد کے لیے عربی زبان پوری شد مد سے سیکھی ہے۔

ان کے خیال میں چونکہ اردو وطن عزیز کی قومی زبان ہے لہٰذا اس کے ساتھ جذباتی وابستگی بہت گہری ہے لیکن یہ قومی زبان صرف دستور میں ہے۔ ہندوستان میں یہ شدید تعصب کا شکار ہے اور برطانیہ اور مغربی ممالک میں اجنبی ہے۔ زندہ قوموں کی زبانیں اور بولی جانے والی زبانیں زندہ رہتی ہیں۔ افسوس کہ اردو زبان کے یہ دونوں رشتے خاصے کمزور دکھائی دیتے ہیں۔

فضل کہتے ہیں "شاعری جذبات کے اظہارِ خیال کا ہمیشہ مؤثر ذریعہ رہی ہے۔ غزل مشاعروں کی جان ہوتی ہے تو نظم، ادب کی مشامِ جان۔ شعر کا منظوم ہونا ضروری ہے۔ نثر کا اپنا ایک مقام ہے۔ افسانہ، ناول اور تاریخ نظم میں بھی لکھی گئی ہے مگر اُسے تسلیم نہیں کیا گیا بعینہ نثری نظم وغزل کوئی شے نہیں ہے چونکہ اس دور میں مرد اور عورت تک کی تمیز گڈمڈ ہوتی جا رہی ہے۔ نظم ونثر اس دور کی چیرہ دستیوں سے کب تک محفوظ رہے گی۔ تجربات سے نئی راہیں کھلتی ہیں مگر بنیادوں کا انہدام تخریب کاری کہلاتا ہے۔ جس میں موجودہ دور کا سہل پسند ادیب مصروف نظر آتا ہے۔ تحقیق اور تخلیق بھی روبہ زوال ہے۔ مشاعرے اور تحقیق ہر دور میں تخلیق میں معاون ہوتے ہیں البتہ سخت کوشی اور اخلاص شرط ہے۔"

کتاب سے قاری کی عدم دلچسپی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

"ہمارے ہاں کتب بینی کا رواج پہلے ہی کم تھا۔ جو الیکٹرونک میڈیا سے اور بھی کم ہوتا جائے گا۔ آج کل کتاب وہ پڑھی جاتی ہے جو اپنے وقت سے اُٹھ کر دلچسپی کے مقام تک پہنچ جائے ورنہ اسے کوئی مفت بھی لینے کو تیار نہیں ہوتا۔ جرائد مسابقت کی بجائے گروہ بندی کا شکار ہو رہے ہیں اور حاشیہ برداری کا رواج عام ہوتا جا رہا ہے اور ان کی رسائی اپنے طرفداروں تک ہی محدود ہوتی جا رہی ہے۔ اگر نفسا نفسی کا یہی عالم رہا تو ان کے دنوں کی گنتی بھی تیز تر ہو جائے گی۔ ہمیں یہ جاننے کی شدید ضرورت ہے کہ ادب اپنے ماضی کی روایات سے کٹ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ سائنس اور ادب میں یہی فرق ہے۔"

فضل کی رائے ہے کہ فی زمانہ تو تنقید نے تنقیص کا رُوپ دھار رکھا ہے اور حُبِ علیؓ کی بجائے بغضِ معاویہ زیادہ کارفرما رہتا ہے اور تنقید کا ہدف ادب نہیں بلکہ ادیب بن رہے ہیں اسی لیے دورِ حاضر ادبی انحطاط کا شکار ہے۔"

503 Yardley Green Road, Stechford,

Birmingham, B33 8TG, England: U.K.

انتخابِ کلام

ملک فضل حسین

مدحتِ مصطفیٰؐ جانِ جاں ہوگئی
بے زبانی مری بھی زباں ہوگئی
جب زباں پہ محمدؐ کا نام آگیا
گنگنانے لگی شادماں ہوگئی

سارے عالم میں وہ معتبر ہوگئی
اپنے آقاؐ کی جو نعت خواں ہوگئی

جب زباں پہ درود و سلام آگیا
تو خدا کی زباں ہم زباں ہوگئی

مجھ پہ اسرارِ کون و مکاں کھل گئے
حُبِ احمدؐ مری رازداں ہوگئی

چھڑ گیا ذکر مولاؐ کی معراج کا
فکر محدود تھی لامکاں ہوگئی

نعت گوئی سے فن کو ملی پختگی
جس زمیں میں کہی آسماں ہوگئی

مجھ کو فضلِ خدا سے خدا مل گیا
معرفت آپؐ کی رازداں ہوگئی

زمانے مجھ کو جلادے کہ روشنی ہو جائے
مرے وطن کا اندھیرا چراغ مانگتا ہے

عارف فرہاد
6.1.99

عارف فرہاد

راولپنڈی پاکستان

محب وطن عارف فرہاد چھٹی جماعت کے طالب علم تھے تب سے شعر کہنے کی ابتدا کی تھی۔ مگر انہوں نے شعور حاصل کرنے کے بعد شاعری کو مشغلہ کے طور پر جاری نہیں رکھا بلکہ غور و فکر کی راہوں پر آبلہ پا ہونے کے باوجود آگہی کے چراغ روشن کر کے اپنی منزل کی تلاش کا سفر جاری رکھا جو آج بھی جاری و ساری ہے۔ کہتے ہیں

ساحل پہ پڑے ایک بھی گوہر میں نہیں تھا
جو چاہیے تھا مجھ کو سمندر میں نہیں تھا

اور

جس میں یہ جان جلے اور اندھیرا مٹ جائے
اس وطن کے لیے ہم ایسا دیا مانگتے ہیں

ان کا گھریلو نام محمد عارف ہے اور تخلص فرہاد، یوں عارف فرہاد کہلاتے ہیں۔ جائے پیدائش نوشہرہ (NWFP پاکستان) ہے مگر ان دنوں راولپنڈی میں قیام ہے۔ عارف کہتے ہیں میں نے

میٹرک گورنمنٹ ڈینز ہائر سیکنڈری اسکول صدر راولپنڈی سے پاس کیا جبکہ ایف ایس سی اور بی ایس سی کا عرصۂ تعلیم گورنمنٹ کالج اصغر مال سید پور روڈ راولپنڈی میں گزارا۔ بعد ازاں ایم اے اردو پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پاس کیا۔ تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کے لیے بچپن سے ہی محنت و مشقت کرتا رہا۔ کیونکہ جب میرے والد مرحوم فالج کی وجہ سے دونوں ٹانگوں سے معذور ہوئے تو میں چوتھی جماعت کا طالب علم تھا۔ ذہن پر شدید پریشانی کے اثر نے میری طبیعت اور زیادہ حساس کر دی۔ چھٹی جماعت میں اپنے ایک استاد کے حوالے سے چھوٹی سی نظم لکھی اور آٹھویں جماعت کے زمانے سے شعر و شاعری سے لگاؤ خاصہ بڑھ گیا تھا۔ 22 اگست 1997ء کو میری شادی ہوئی مگر شادی کے باوجود میری تنہائی دور نہ ہو سکی۔ 30 ستمبر 1997ء کی صبح والدِ محترم محمد اسلم رضا جو کہ سلسلہ چشتیہ کے پیروکار تھے طویل علالت کے بعد انتقال فرما گئے۔ ان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد زندگی کے دیگر کٹھن تجربات کی وجہ سے میری شاعری میں مزید نکھار پیدا ہوا۔ آج کل اپنا کاروبار کر رہا ہوں۔

شاعری کے علاوہ تنقید سے بھی میری وابستگی ہے۔ شاعری کے ابتدائی زمانے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے میری راہنمائی فرمائی اور میں سمجھتا ہوں کہ آغا جی کی عہد ساز شخصیت میرے لیے ایک اہم مکتبۂ فکر ثابت ہوئی۔ میری نظمیں گزشتہ کئی برسوں سے مسلسل "اوراق" لاہور میں شائع ہو رہی ہیں۔ علاوہ ازیں ماہیے، ہائیکو، نظمیں اور غزلیں ارتکاز اور صریر کراچی، فنون، تجدید نو، اور تخلیق، لاہور۔ گلبن اور کوہسار، انڈیا۔ نیرنگِ خیال، راولپنڈی، ابلاغ، پشاور اور دیگر کئی موقر اور جید ادبی پرچوں میں شائع ہوتی رہی ہیں مزید کہ P.T.V اسلام آباد مرکز سے "کشمیر میگزین" پروگرام میں میری کئی نظمیں کشمیر کے حوالے سے خصوصی طور پر نشر کی جا چکی ہیں۔ "اردو ماہیے کے خدوخال" کے نام سے تحقیق و تنقید کی ایک کتاب زیرِ طبع ہے جبکہ غزلوں اور نظموں کے مجموعے بھی منتظرِ اشاعت ہیں۔

میں شاعری اور تنقید کی کتب بہ صد شوق پڑھتا ہوں۔ آپ نے میری زندگی کے اہم اور دلچسپ واقعات پوچھے ہیں۔ دکھ انسانی ذہن میں زندگی کو پرکھنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے اس صلاحیت نے مجھ پر زندگی عجیب شکل میں منکشف کی ہوئی ہے جو سراپا مصائب پر مشتمل ہے اس لیے میں اپنی زندگی کو عذاب سے کم نہیں سمجھتا۔ ایسا عذاب جس میں ہر دن کا سورج اور ہر شب کی تاریکی ایک نئے اور تازہ دکھ کے لباس میں سامنے آتی ہے۔ ایسے میں کیا زندگی اور کیا اہم اور دلچسپ واقعات! میری آنکھ میں ماضی کے تمام لمحات آنسو علیحدہ کرنے پر شبنم کے قطرے کی طرح ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں اور ان کی رنگینیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اردو چونکہ لشکری زبان کا نام ہے لہٰذا اس میں فارسی، عربی، ہندی، اور پنجابی زبانوں کا امتزاج اس کا اثاثہ اور حسن ہیں۔ اردو میں مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کی بھرپور

صلاحیت موجود ہے اور اس کا مستقبل درخشاں ہے۔

شاعری میں غزل اور نظم دونوں کو بہتر سمجھتا ہوں مگر میں نے محسوس کیا ہے کہ نظم لکھنے کے بعد تخلیق کار کو جو راحت محسوس ہوتی ہے وہ غزل کے تخلیقی مراحل میں ناممکن ہے۔ غزل ایک منتشر ذہن کی پیداوار ہے جبکہ نظم مکمل یکسوئی اور توجہ چاہتی ہے۔ نظم تخلیق کرتے وقت ہم کسی فریم کے پابند نہیں ہوتے، ایک وسیع کینوس پر اپنی تخلیقی کاوشیں ابھار سکتے ہیں جبکہ غزل میں ہم زندگی کے مختلف پہلو چھوٹی چھوٹی تصویروں کی صورت میں پیش کرتے ہیں لیکن نثری نظم اور نثری غزل کے تجربے سے مجھے اتفاق نہیں۔ اگر ایک شاعر کے لہجے میں روانی اور موسیقیت موجود ہے تو اسے کیا ضرورت ہے کہ وہ نثری غزل یا نثری نظم لکھے۔ یہ محض تجربات ہیں اور دیگر کئی تجربات کی طرح ناکام ہو جائیں گے۔

آج کے دور میں مشاعرے اور تنقیدی نشستیں دونوں اپنا انفرادی مقام رکھتی ہیں۔ اگر معیاری مشاعرے سنے جائیں تو عہدِ حاضر کے شعراء کے انداز بیان اور اسلوب سے آگاہی ہو سکتی ہے۔ تخلیقی ذہن اچھے اشعار سننے کے بعد متحرک بھی ہو سکتا ہے اور اس کی استعداد (Vocabulary) میں اضافہ بھی ممکن ہے جہاں تک تنقیدی نشستوں کا تعلق ہے تو تنقید ادب میں نئی راہیں پیدا کرتی ہے نئے زاویے سامنے آتے ہیں، ذہن کے نہاں خانوں میں زندگی کے نئے روشندان کھلتے ہیں۔ ہم تخلیقی فن پاروں کا تجزیہ کر کے ان کا معیار مقرر کر سکتے ہیں لیکن بشرطیکہ تنقیدی نشستیں معیاری ہوں اور نقاد تخلیق کو دیکھ کر تنقید کرے، تخلیق کار کا نام پڑھ کر نہیں۔

سوال نمبر 7 کے سلسلے میں عرض ہے کہ کتابوں اور جرائد کی بقا کے لیے ہمیں ایسے ادارے قائم کرنے چاہئیں جو شعرا اور ادبا کے ساتھ تعاون کریں ان کی کتب کی اشاعت کے لیے حکومت وقت سے مدد حاصل کریں اور "رفتگاں" کے مجموعے محفوظ کر کے ان کے نئے ایڈیشن شائع کریں۔

میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ ادب کی ترقی کے لیے تنقید ضروری ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اچھا اور معیاری ادب تخلیق کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم گزرے ہوئے اساتذہ کی نگارشات کا مطالعہ کریں اور بناوٹ یا تصنع سے پرہیز کرتے ہوئے زندگی کے تمام تجربات ایسے ہی پیش کریں جیسے ہم ان کا اپنی آنکھ سے مشاہدہ کرتے ہیں اور ایسا جب ہی ممکن ہے کہ شاعر، ادیب یا نقاد حقیقی معنوں میں لکھاری ہو اور اس کا نصب العین ادب کی تعمیر ہو۔"

MR. ARIF FERHAD
TIME HOUSE SAEED MARKET, KAMAL ABAD NO.3
RAWALPINDI, PAKISTAN.

انتخابِ کلام

عارف فرہاد

محبت کچھ نہیں ہوتی
فقط اک دشت ہوتا ہے اندھیرے کا
کہ جس میں، اک جنوں انگیز موسم
اپنی آنکھوں میں کسی کا عکس بھرنے کے لیے
چند اجنبی رستوں پہ دستک دے کر اپنے آپ کو بیدار کرتا ہے
ہوا سے پیار کرتا ہے

چند ماہیے

چنپا بھی چنبیلی بھی
دل مرا لے نکلی
دلہن کی سہیلی بھی

☆

موجوں کے کٹاؤ میں
عمر گزاری ہے
ہم نے ترے چاؤ میں

☆

آنسو ہیں کہ تارے ہیں
ہجر کی راتوں میں
سب روگ تمہارے ہیں

☆

دونوں ہی خدا ہوتے
شہر میں ہم تم سے
مل کر نہ جدا ہوتے

☆

مطلب ہو تو ملتے ہیں
زخم جدائی کے
ایسے کب سلتے ہیں

کون کسی کا دامن تھامے کون کسی کا میت
سنبندھ ایسے کچے رشتے بادل ایسی پریت
پل بھر برسیں نین رسیلے پل بھر کا سنگیت

قمر نقوی
۱۰ رمئی ۱۹۹۹ء
ٹلسا ـ اوکلاہوما

قمر نقوی

امریکہ

اس مصرعہ میں اگر تھوڑا سا تصرف کر کے یوں کہا جائے:

؎ ہر درد کی دوا ہیں نقوی قمر ہمارے

تو کچھ ایسا غلط بھی نہ ہوگا۔ شاید بھوپال کی مٹی کا اثر ہو کیونکہ قمر نقوی نے 1932ء میں اسی مٹی سے جنم لیا تھا جبکہ اجداد کا وطن لاہور ہے۔ پھر لاہور تو لاہور ہی ہے۔ اس کا اثر بھی آنا لازمی ہے۔ تاریخ میں ایم اے کیا۔ ایم بی اے کیا اور ادیب فاضل کی ڈگری بھی لی۔ مطالعہ کے دیوانے ہیں۔ شاہنامہ فردوسی، مثنوی مولانا روم، دیوانِ حافظ کلیاتِ نظیر، الف لیلیٰ طلسم ہوشربا۔ انگریزی زبان کے ناول انگریزی عربی اور فارسی شعراء کا کلام احادیث کی کتابیں۔ قرآن پاک کی تفسیر، تصوف کی کتابیں۔ کیا کیا گنوایا جائے۔ انہوں نے "علامہ قمر نقوی" کا خطاب یوں ہی تو نہیں پالیا۔ ان کے تین مجموعہ کلام "نیم سوز، ریشہ حنا اور میری نیندیں ان کے خواب" کے علاوہ بیس ناول، تین عظیم فلسفی (سقراط، افلاطون اور ارسطو کے بارے میں) پانچ ضخیم انگریزی کے ناولوں کے اردو تراجم اور شکاریات پر اتنی کتابیں لکھ ڈالیں کہ ان کی تعدد خود انہیں بھی یاد نہیں۔ یہ کتابیں فنِ شکار کی باریکیوں کو زیرِ بحث لانے کے علاوہ خوفناک جنگلوں وادیوں اور صحراؤں میں پیش آنے والے

واقعات اور پھر قمر نقوی کا اسلوب اور اندازِ بیان کہ نثر میں شاعری ہو رہی ہے۔ قمر امریکا کے پہلے پاکستانی ہیں جو دائرۂ قطبِ شمالی کے تیس میل اندر تک ریچھ اور کیریبو کا شکار کھیل چکے ہیں۔

قمر نے پاکستان میں سات سال امریکہ ادارہ ترقیاتِ بین الاقوامی (USAID) میں بطورِ افسر تعلیم کام کیا ہے۔ نو سال تک ایران میں شہنشاہ ایران کے چھوٹے بھائی پرنس عبدالرضا کے ذاتی مشیر کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے ہیں۔ انقلابِ ایران کے بعد امریکہ آئے اور اوکلاہاما ریاست میں مقیم ہوئے۔

مشہور شاعر جان نثار اختر سے انہیں شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ اب خود استادی کے درجے پر فائز ہیں۔ میر کی بانی بولتے ہیں اور محمد حسین آزاد کا سا اندازِ بیان ہے۔

آیئے انہیں سامنے بٹھا کر گفتگو کرتے ہیں:

علامہ قمر بتا رہے تھے۔

"میرا نام ہی کیا۔ نام تو اس پروردگارِ عالم کا ہے جس نے سارا جہاں بنایا۔ زمین بھی بنائی اور آسمان بنایا۔ نام سید حسن قمر نقوی بخاری نقشبندی مجددی بھوپالی ثم آسیونی فی الحال امریکی ایک تخلص قمر نقوی لیکن حقیقت ہے کہ "قمر" کے لفظ میں اللہ تعالیٰ نے جو ایک حسن اور کشش بھر دی ہے اس کے پیش نظر اس تخلص کے بیشمار شاعر ہندوستان اور پاکستان کے گوشے گوشے میں پائے جاتے ہیں۔ میں نے کئی بار سوچا کہ تخلص بدل دوں۔ آخر غالب بھی اپنا شعر سن کر اپنا تخلص بدلنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

یہ نہیں معلوم کہ آپ کے سوالات کے جوابات دینے سے ثواب ہو گا یا نہیں لیکن آپ نے جس محبت سے میرا پتہ حاصل کرنے میں مجاہدانہ "صف شکنی" سے کام لیا اس کے پیش نظر چند جوابات حاضر ہیں۔

وابستہ تو میں صرف اپنی رفیقہ حیات سے ہی ہوں اور کسی سے وابستگی کا تذکرہ آپ اس طرح علی الاعلان تو نہ پوچھیں۔ میں بتاؤں گا بھی نہیں۔ ویسے میں اس عمر کی عجیب منزل پر پہنچ کر کئی بار سوچنے پر مجبور ہوتا ہوں کہ کیا میں شاعر ہوں؟ شاعر تو ہوں لیکن صرف گزارے موافق ادیب ہوں۔ اتنی بہت سی کتابیں لکھنے اور ایک نرم دل اور فرشتہ صفت ناشر کی عنایت سے شائع ہو جانے کے بعد اگر میں ادیب نہیں بھی ہوں تو لوگ میری طرف سے یہی گمان کرنے لگے ہوں گے۔

"شکار" پر اتنی کتابیں لکھیں اور شائع ہوتیں کہ میں ان کے نام اور تعداد سے بھی ناواقف ہوں۔ البتہ میں نے اس موضوع کو ادب کا مقام عطا کیا ہے اور اس میدان میں واحد شہسوار ہوں۔

مکتب میں تو میں عہد طفلی میں گیا جب قرآن پاک حفظ کرنا شروع کیا اور نہ کر سکا اس لیے کہ بھوپال واحد کانونٹ اسکول جس کا نام تھا کیمبرج اسکول۔ میرے آنے کا منتظر تھا۔ اس میں بھوپال کے سارے امراء و روٴسا کے بچے انگریز دوشیزاؤں سے سبق سیکھتے تھے اب رہا مکتبۂ فکر۔۔۔ تو ہمشیرہ

عزیزہ۔ میں تو خود ہی مکتبہ ہوں اور خود ہی مجسم فکر۔ میری شاعری کون سی ایسی شاعری ہے جس کو میں "متاثر" کرنے یا ہونے کے بارے میں سوچوں۔ حکیم یوسف نے اپنے رسالے نیرنگ خیال کی گلقند مجھے کھلائی اور میرے افسانے اور غزلیں شائع کرنے لگے۔ ہر غزل اور افسانے کے معاوضے میں وہ مجھے خمیرۂ مروارید حکیم ارشد والا عطا کرتے تھے۔ یہ خمیرہ ذہن کی تقویت کے لیے مفید تھا۔

اب رہی تفصیل مجموعات کلام کی اور تخلیقات کی۔ تو بس یہ نہ پوچھیں۔ ان میں ایسی کوئی بات مجھے معلوم نہیں ہوتی جس کا خصوصی تذکرہ کروں۔ ہاں اردو کے مستقبل کے بارے میں عرض کروں گا کہ خادم نے اردو کے بارے میں فی الحال ایک کتاب "اردو ادب میں بے ادبی کی تاریخ" تالیف کی ہے۔ اب اس کا مسودہ زیر صفائی ہے۔ تب کہیں ناشر کو جائے گا۔ میں کہتا ہوں اردو زندہ ہے اردو زندہ رہے گی۔ اس زیرِ تالیف کتاب میں ان تمام تحریکوں کا تذکرہ ہے جو اردو زبان کے خلاف رواں رہیں۔ اور سب اپنی موت آپ مر گئیں۔ اردو کی سخت جانی کے سلسلے میں کیا عرض کروں کہ کراچی میں تو خون انسانی کی ارزانی اور انسانی زندگی کی بے قیمتی کے باوجود صرف گلشن اقبال میں شاعروں اور ادیبوں کی تعداد کہکشاں کے ستاروں سے سو تین گنا زیادہ ہے۔

اب تو وہ وقت آگیا ہے کہ کراچی کے "قصاب" اپنا کاروبار ترک کرنے کو ہوگئے ہیں۔ صرف اس خوف سے کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ ایک گلشن اقبالی یا ناظم آبادی شاعر یا ادیب کو قتل کریں اور اس کے خون کے ہر قطرے سے ایک سو پچانوے شاعر اور ادیب پیدا ہو جائیں۔ پھر وہ کس کس کا "کلام" سنیں گے۔ تجھ سے تو کچھ "کلام" نہیں ہے مگر ندیم۔۔۔!

اردو کی تقویت کا باعث تو وہ ادیب اور شاعر ہیں۔ جن کی تعداد میں اللہ نے بڑی برکت دی ہے۔ صرف کرشن نگر لاہور میں شعراء اور ادباء کی تعداد برازیل کی آبادی سے دو انچ کم ہے! جس سرعت فکری کے نتیجے میں "مجموعات" کلام شائع ہوتے ہیں اس کو دیکھ کر "ٹاک ٹو" کیا "ٹاک فائیو" کا تصور پیدا ہوتا ہے اردو رسائل کی سخت جانی قابلِ تعریف ہے کہ جو شخص بھی ان کو زر سالانہ عطا کردے یہ رسائل اس کا کلام۔ یا رشحات قلم۔ بصد اہتمام شائع کرنے کا بیڑا اٹھا ہی نہیں لیتے بلکہ کھا لیتے ہیں اور وہ بھی چبا کر۔ بعض رسائل میں اردو کے نایاب اشعار بھی ملتے ہیں جیسے :

سو جس کسی کے بھی ہو لیں وہی دے ہر ہر شئے
کہ نام اس کے جو سارے ہمیں نہال کریں

یہ شعر لاہور کے ماہنامہ "تخلیق" میں شائع شدہ ایک غزل سے مفت لے لیا گیا ہے۔ مجموعوں کی تعداد کا یہ عالم ہے کہ اگر سارے مجموعے دریائے راوی یا چناب یا جہلم میں ڈال دیے جائیں کالاباغ ڈیم کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ ایسی حالت میں کہ اردو کے شعراء کرام اور ادبائے عظام کی تعداد میں اس قدر برکت ہے۔ بھلا اردو کو کیا خطرہ لاحق ہوگا؟ اب تو سنا ہے کہ حکومت پاکستان "شاعر" ایکسپورٹ کرنے کے بارے میں غور کر رہی ہے اس لیے کہ اس جنس کی پیداوار

امر بیل کی طرح روز افزوں ہے لہٰذا اردو زندہ باد۔"

سوال نمبر 6 کا جواب کچھ یوں ہو سکتا ہے:

الف: اصنافِ سخن میں صنفِ نازک کو بہترین خیال کرتا ہوں۔ اظہار خیال کا یہ میدان سب سے افضل اور ارفع ہے۔ ساری دنیا اس ایک "صنف" کے پیچھے پڑی ہے۔ بابا آدم نے تو حد کر دی تھی۔ اسی صنف کے پیچھے جنت کو تج دیا۔ اردو میں ہمیشہ سے غزل ہی مقبول رہی۔ اس کی بڑی وجہ مطالب و مفاہیم کا وہ تنوع اور مضامین کی وہ آزادی ہے جو غزل کا طرۂ امتیاز ہے۔ اردو غزل خالص ادب کی ساختہ و پرورده ہے۔ اس کا خاص انداز ہے اور غزل کا جوہر اسی کے طرز و اسلوب میں کھلتا ہے۔ اس کی آب و تاب اسی طرح قائم ہے جس طرح پہلے تھی۔

اب رہی نثری نظم تو نجانے اس شئے کو "نظم" کا نام کس نے دے دیا۔ غالباً کسی نے تمسخر یا تفننِ طبع کے لیے اس کو نظم کہہ دیا ہو گا ورنہ اس کو یہ لقب دینا محض خواب و خیال ہے اور خواب کی حقیقت کچھ نہیں۔ کیا ان نثر کے ٹکڑوں سے ذہن، بصارت، سماعت وغیرہ کوئی فائدہ ہوا؟

ساری وہ شاعری جس کو آپ "نظم" بصورت نثر کہیے اس میں نہ تو ادب ہے۔ نہ کوئی ایسا روحانی تخیلاتی، جذباتی یا احساساتی پیام جس کو سن کر یا پڑھ کر دل تڑپ اٹھے۔ اب رہے مشاعرے اور نشستیں پاکستان میں تو اب صرف نشستیں ہی سننے میں آئی ہیں۔ مشاعرے کہاں ہوتے ہیں۔ ایسے ادب کی تخلیق نہ مشاعروں کی پابند ہے نہ نشستوں کی البتہ اگر مشاعرے نہ رہے تو پھر شاعر بھی اپنے کاروبار سے توبہ کر لے گا کہ مشاعرہ ہی شاعر کے فن کو ترقی اور تقویت دیتا ہے۔ تنقید کے بارے میں مجھ سے کیا پوچھو ہو بس آپ کو تو خود تنقید کی حالت معلوم ہو گی۔ فی زمانہ تنقید کے معنی ہیں دوسروں پر کیچڑ اچھالنا اور حوصلہ شکنی کرنا۔ میں نے اپنی زیر تالیف کتاب "اردو ادب میں بے ادبی کی تاریخ" میں ایسی بے شمار مثالیں شامل کی ہیں جو تنقید برائے تضحیک کو واضح کرتی ہیں جبکہ غیر جانبدارانہ اور منصفانہ تنقید کا مقصد خامیوں اور کوتاہیوں کی معقول نشاندہی اور حوصلہ افزائی ہوتا ہے اور اس سے بہت زیادہ مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یاد رہے کہ کوئی پودا پروان نہیں چڑھتا۔ کوئی بیل منڈھے نہیں چڑھتی جب تک اس کی خراش و تراش قرینے اور سلیقے سے نہ کی جائے۔ تنقید ادب کی ترقی اور تقویت میں یہ کام بہ احسن وجوہ انجام دے سکتی ہے اور اس دور میں ناقدانِ کرام کتنے ہیں؟ اپنے منہ میاں مٹھو بننے سے کوئی ناقد نہیں ہو جاتا۔"

QAMAR NAQVI
6207 S.INDIANA POLIS,
TULSA OK 74136
U.S.A

انتخابِ کلام

قمر نقوی

کرے گا اس پہ کوئی کس طرح تنقید سائیں
بیاں دیتے ہی کر دیتا ہے جو تردید سائیں

انہوں نے اس بنا پر آئینے کو توڑ ڈالا
کہ اصلی شکل کی کرتا تھا یہ تائید سائیں

بس اک 'شب خون' پڑنے سے مجھے پسپا نہ سمجھو
کہ ہونا ہے ابھی پیکار کی تجدید سائیں

یہی سب مل کے بہکاتے رہے ہیں کارواں کو
انہیں کی اب کروں میں کس طرح تقلید سائیں

ہوا کے ایک ہی جھونکے سے وہ دیوار ٹوٹی
تھی جس سے گھر کو سائے کی بڑی امید سائیں

خلیجیں جب ہمارے درمیاں اتنی بڑھی ہیں
تو پھر عہد وفا کی کیسے ہو تجدید سائیں

یقیں کیا آئینے کا، یہ تو جانبدار ہوگا
ہر اک صورت کی کر دیتا ہے یہ تائید سائیں

علی کمیل قزلباش

کوئٹہ پاکستان

میں علی کمیل قزلباش کی نظمیں پڑھ رہی تھی۔ ایک کا عنوان ہے "جشنِ طلائی"

کیا نہ بدلا پچاس سالوں میں
خوب، بد، کچھ نہ کچھ بدل تو گیا
مگر یہ عادت، بھیگ مانگنے کی

ہمیں پاکستان حاصل کیے پچاس سال گزر چکے ہیں اور ہم نے جشنِ طلائی بھی منالیا مگر کیا ہم اپنے عوام کو وہ بنیادی ضروریات ہی فراہم کر سکے جس کے لیے ہم نے یہ ملک ہزاروں جانوں کی قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا؟ علی کمیل کی نظم پڑھ کر یہ سوالیہ نشان ابھی میرے سامنے تھا کہ آج 12 اکتوبر 99ء بروز منگل سی این این (CNN) نے خبر نشر کی کہ "پاکستان کے وزیر اعظم جناب نواز شریف کو ڈس مس کر دیا گیا اور فوج نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی ہے۔"

ہم پاکستان سے کوسوں دُور بیٹھ کر یہ دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اب جو حکومت آئے وہ اپنی تجوریاں بھرنے کی بجائے عوام کی بہبود کے لیے اقدامات کرے اور ہمارے تخلیق کاروں کو بھی زندگی کرنے کا موقع ملے۔

علی کمیل قزلباش شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔ بڑی خوبصورت کہانیاں لکھتے ہیں۔ ان کا ایک مختصر افسانہ میری نظر سے گزرا۔ عنوان ہے "کافر نمازی"

وہ تمام شب آنے جانے والی گاڑیوں کے مسافروں اور عملے کے مال وزر کا صفایا کرتے رہے۔ اگر کوئی ذرا مزاحمت کرتا تو اس کو اپنے طور پر واصلِ جہنم کر دیتے۔ میری بھی شامت آئی تھی کہ رات بھر بغیر آرام کیے اپنے ساتھی کی مدد سے ٹرک چلاتا رہا تاکہ جلد از جلد منڈی پہنچ سکوں، کیونکہ بروقت پہنچ جانے والی گاڑیوں کو انعام دیا جاتا ہے۔ سو اس لالچ نے ہمیں صبح کی اذانوں کے قریب اس علاقے میں پہنچا دیا۔ جہاں انہوں نے رکاوٹ کھڑی کر رکھی تھی، ہماری تلاشی لیتے لیتے صبح کی نماز کا وقت آ پہنچا، تو ایک لٹیرے نے آواز دی، جو اس گروہ کا سرغنہ معلوم ہوتا تھا۔ "بس کرو بھائی بس کرو! نماز قضا ہو جائے گی۔"

دوسرے نے کہا "نماز پڑھ ہی لیں گے۔ ایک آدھ شکار اور مار لیتے ہیں اور پھر چلے بھی جاتے ہیں۔" اس پر پہلا غصے میں چلایا "کیا بکتے ہو؟ نماز چھوڑوا کر کافر بنانا چاہتے ہو ہمیں!"

وسیع النظر اور وسیع القلب غلام علی کا تخلص کمیل ہے (جبکہ مئی 1996ء تک "دیپک" تخلص رہا) اور قلمی نام علی کمیل قزلباش ہے۔ 1968ء میں کلی سگھر، لورالائی بلوچستان، پاکستان میں پیدا ہوئے۔ جامعہ بلوچستان سے اردو پشتو میں ایم۔اے کیا۔ ان کی مادری زبان فارسی ہے۔ اندون گورنمنٹ ڈگری کالج کوئٹہ میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اس سے قبل کچھ عرصہ کلرکی کی۔ پی ٹی وی کوئٹہ مرکز میں عارضی طور پر معاون پروڈیوسر کے طور پر کام کیا اور خانہ فرہنگ اسلامی جمہوریہ ایران کوئٹہ میں بطور آفیسر تعلقات عامہ تقریباً دو سال مصروف رہے۔ جہاں انہیں علمی و فکری طور پر بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ فارسی ادب سے استفادہ کیا اور فارسی سے اردو میں تراجم کرنے کی فرصت بھی ملی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے کئی سال تک طالب علمی کے دور میں جوتے بنانے کا کام بھی کیا۔ جس میں اپنی مہارت کے طفیل اچھے استادوں میں ان کا شمار ہوا۔ بعد میں اس کام کو چھوڑ کر فوٹوگرافی سیکھی۔ مختلف اخبارات سے بطور کالم نگار اور انچارج ادبی صفحہ منسلک رہے ہیں۔ ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے بطور پروگرام میزبان اور سکرپٹ رائٹر منسلک رہے جبکہ پی ٹی وی سے بطور شاعر میزبان شعبہ حالاتِ حاضرہ اور رپورٹر کے فرائض انجام دیتے۔

کمیل بتاتے ہیں "ایک وقت ایسا بھی تھا کہ سیاست میں سرگرمی دکھائی اور اچھے اچھے عہدوں پر فائز رہا، جیل بھی گیا، وزیروں و مشیروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، لیکن اس میدان میں جھوٹ اور منافقت کے سوا کچھ نہ پا کر، دوری اختیار کر لی ویسے میں بچپن سے خود انحصار رہا ہوں اور محنت مزدوری کرتا رہا جس نے مجھے خود اعتمادی کی دولت اور زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع دیا۔

میں دو زبانوں، اردو اور پشتو میں شعر و نثر لکھتا ہوں ازدواجی حیثیت ایک عدد بیوی اور ایک بیٹی پر مشتمل ہے۔

شاعری کے علاوہ۔ ان کا افسانہ، انشائیہ اور تحقیق و تنقید سے بھی تعلق ہے۔ کسی خاص مکتب فکر سے تعلق نہیں، فکری و مقصدی شاعری و ادب کے قائل ہیں۔ پشتو کے مختلف افسانہ نگاروں کے اردو تراجم پر مشتمل ان کا ایک مجموعہ ہے جسے "شاہکار پشتو افسانے" کے نام سے "کلاسک" لاہور نے شائع کیا اس سے قبل یہی افسانے انہی کے ماہنامہ "سپوتنک" میں اکھٹے شائع ہوئے تھے۔

پشتو زبان میں ایک کتابی سلسلہ 'تماس" کے نام سے شائع کرتے ہیں۔

ایک کتاب ایران کے سفر نامہ پر مشتمل ہے۔ جو انشاء اللہ عنقریب شائع ہو گی۔ ان کے علاوہ اردو شاعری، پشتو شاعری، پشتو افسانے، مضامین و مقالات موجود ہیں جبکہ انہوں نے فلسطینی، ایرانی، تاجکستانی اور بوسنی شاعری کے تراجم بھی کیے ہیں۔

پاکستان و ہندوستان کے علاوہ انگلستان کے بھی موقر جرائد میں ان کا کلام گاہے گاہے شائع ہوتا ہے۔ انہوں نے بطورِ خاص کہا کہ ان کی پہلی تخلیق سہ ماہی ابلاغ، پشاور میں شائع ہوئی تھی۔ جسے سیدہ حنا شائع کرتی ہیں۔ (سیدہ حنا کا تعارف "گفتنی" میں ملاحظہ کریں۔) ادب کے علاوہ، فلسفہ، تاریخ، اسلام اور دیگر فکری موضوعات کی کتابیں ان کے مطالعہ کا حصہ ہیں۔

کمیل نے بتایا "زندگی میں کئی اہم واقعات پیش آئے کئی خصوصی موڑ آئے جو یادگار ہیں مثلاً ایک اچھے کاریگر ہونے کے مغالطے میں پڑ گیا لیکن یہ شاعری کا فیض تھا جس نے مجھے مزید تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ جب میری پہلی غزل اور پھر ہائیکو ابلاغ میں شائع ہوئے تو بہت سے خطوط ملے جن میں ہر ایک کی پیشانی پر لکھنے والے کی تعلیمی قابلیت درج تھی جس سے مجھے اپنی تعلیمی کمی کا احساس ہوا اور میں نے جوتوں کا کام چھوڑ کر قدرے آسان پیشہ فوٹو گرافری اپنایا اور ساتھ ساتھ پرائیویٹ ایف۔ اے اور بی اے کیا۔"

کمیل یقین سے کہتے ہیں کہ اردو کا مستقبل روشن ہے جس کی دلیل آئے دن ادبی پیش رفت ہے لیکن بدقسمتی سے ہماری انگریزی زدگی نے اردو کی اصلیت کو آلودہ کر دیا ہے جس کو دیکھو وہ اردو میں الفاظ تو کیا جملوں کے جملے بول کر فخر سے اتراتا ہے کہ وہ مہذب لوگوں میں شامل ہو گیا۔ پاکستان میں تو آجکل ہماری اس بیماری نے اردو کے مستقبل کو مخدوش کر دیا ہے کیونکہ عام لوگوں کے علاوہ آج کا ادیب و شاعر جن کو اردو ہی کے طفیل عزت، دولت اور شہرت ملی ہے۔ اس طرح کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہے اور اپنی گفتگو میں انگریزی کی آلودگی پر فخر کرتا ہے، جب زبان کے محافظوں کی یہ حالت ہو جائے تو پھر اچھے دنوں کی کیا امید رکھی جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے آج کا ادیب و شاعر بھی احساس ذمہ داری سے عاری ہو گیا ہے میں ان الفاظ کے استعمال پر معترض نہیں ہوں جو اب اردو کا حصہ بن چکے ہیں۔ کیونکہ زبانیں ایک دوسرے سے الفاظ لیتی ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ہندوستان کے شاعر بشیر بدر فخر سے کہتے ہیں کہ انگریزی کے الفاظ اردو شاعری میں پہلی مرتبہ انہوں نے داخل کیے۔

میں شاعری میں نظم کو اظہارِ خیال کا بہتر ذریعہ محسوس کرتا ہوں۔ نثری نظم اور آزاد غزل کے تجربے فقط کسی نہ کسی صنف کے بانی ہونے کے شوق میں کیے جا رہے ہیں، ورنہ ان سے اردو شاعری کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔

مشاعرے میرے نزدیک شاعروں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا اہم ذریعہ ہیں کیونکہ ادھر کی واہ واہ کے پیچھے شعر کا اعلیٰ معیار یا سامع کی شعر فہمی نہیں ہوتی بلکہ ادھر منافقت کا عنصر زیادہ ملتا ہے جو ویسے بھی ہمارے آج کے ادیب برادری میں سرایت کر چکی ہے۔ جبکہ تخلیقی و تنقیدی نشستیں واقعی اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ وہ قومیں جو زندہ ہیں اپنے ادب، ثقافت اور زبان سے آگاہ ہیں۔ ان کے ہاں اب بھی کتاب کی طرف رجحان ہے لاکھوں کی تعداد میں اشاعتیں ہوتی ہیں اور جو ہماری طرح دوسروں کے چمک دمک اور چکا چوند پر مر مٹتے ہیں وہ کتاب سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے ہاں اس سے پہلے کب کتاب دوستی پائی گئی ہے۔ وہ ایک آدھ جو کوئی دوسری راہ نہ پا کر تفریح کا سامان کتاب کو بناتے تھے۔ اب میڈیا کے ذریعے جنسی بھول بھلیوں کو مقصد حیات بنا بیٹھے ہیں۔ چنانچہ جرائد اور کتابوں کی بقاء کے لیے ہمیں سب سے پہلے اپنے اندر ایک قوم کے جواہر پیدا کرنے ہوں گے، جب یہ چیز در آئے گی تب ایسا کوئی خدشہ ایسی کوئی پریشانی لاحق نہیں ہو گی۔

تنقید اب بھی موجود ہے۔ صرف اچھے تنقید نگاروں کو قبول کرنے کی دیر ہے۔ آج کا اردو ادیب گروہ بندیوں کا شکار ہے۔ سو جو جس گروہ کا ہے اسے ساری خوبیاں اسی گروہ میں اور ساری خرابیاں مخالف گروہ میں نظر آئیں گی۔ ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر انور سدید جیسے آج کے نقاد بھی ہیں جن کا قلم اچھی سے اچھی تحریر میں بھی مخالف کے منہ پر کالک ملنے سے نہیں رکتا۔ دوسری طرف خوشامدی قسم کے دیباچوں کے رواج نے تباہی مچا رکھی ہے۔ جس کتاب کے دیباچے کو پڑھو صاحب کتاب کو اس کے عہد کا ممتاز اور عظیم شاعر یا ادیب قرار دیتا ہے۔ میں نے پہلے عرض کیا کہ آج کے ادیبوں میں منافقانہ رویوں کا زہر زیادہ اثر پذیر ہو چکا ہے اور نقاد بھی انہی ادیبوں میں سے ہیں۔

یہاں کمیل کی ایک نظم ملاحظہ ہو۔

کہاں تم اور کہاں اکیسویں صدی

ٹھہر جاؤ!
کہاں۔ جانے کی ضد کرنے لگے ہو!
کہاں تم ور کہاں اکیسویں صدی،
کہ تم پر تو ابھی تک قرض باقی ہیں
اسی دم توڑتی بوڑھی صدی کے بھی
ابھی تک ہو جہالت کے شکنجے میں

تعصبات کی دیوارِ بے روزن کے قیدی ہو
کہ پھل جس پیڑ کا کھاتے رہے ہو
جڑیں بھی کھوکھلی کرنے لگے ہو تم اسی ہی کی
ابھی ٹھہرو!
ابھی ٹھہرو! کہ ہاتھوں میں تمہارے تار ہیں
پارہ گریبانوں کے دامن کے
ابھی تک دین الجھا ہے
تمہاری داڑھیوں میں، جبہ و دستار میں بے بس
ہاں تم کہلا رہے ہو جوہری قوت
مگر جوہر سے خالی ہو
جو بے بہرہ ہوں خود ہی باغ سے تم ایسے مالی ہو
کہ تم قاتل ہو خود اپنی ہی تہذیب و ثقافت کے
تمہارے پاس اب چہرہ کوئی باقی نہیں ایسا
کہ جو پہچان ٹھہرے دوسروں سے مختلف تھوڑی
کہاں تم اور کہاں اکیسویں صدی
کہ تم پر قرض باقی ہیں اسی دم توڑتی بوڑھی صدی کے بھی
ابھی تو تم کو دینے ہیں
بقایاجات کچھ پچھلی صدی کے بھی
ٹھہر جاؤ! ٹھہر جاؤ!
کہاں تم کس طرف بھاگے نکلتے ہو
کہاں تک خود فریبی کا ارادہ ہے
کہ خود سے دشمنی یہ بھی زیادہ ہے

ALI KAMAIL QAZLIBASH
P.O.BOX 531 QUETA (PAKISTAN)

جہاں سے قدم ہم رہِ الفت میں رکھا
وہیں فکرِ سود و زیاں چھوڑ آئے
مخفی امروہوی 10.2.1999

مخفی امروہوی

شکاگو

صدر شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی کے محترم پروفیسر نثار احمد فاروقی نے درج ذیل مضمون میں رؤف امروہوی مرحوم کا ذکر بڑی عقیدت سے کیا ہے۔ ہماری نعت گو شاعرہ مخفی امروہوی انہیں کی بہو ہیں۔ خوش قسمت ہیں حامد بھائی کہ انہیں ایسی بابرکت شریکِ حیات ملیں۔

نثار احمد فاروقی صاحب لکھتے ہیں: "حضرت حافظ عبدالرؤف رؤف امروہوی خاصانِ خدا میں سے تھے۔ امروہہ میں اُن کی ذاتِ بابرکات اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھی۔ ان سب خوبیوں کو آب و رنگ دیا تھا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نے جس کا ایک اثر یہ تھا کہ ستر سال یا اس سے بھی زیادہ مدت تک ان کے مکان پر نماز جمعہ کے بعد عصر کے وقت تک نعت خوانی کا جلسہ ہوتا تھا جس میں کسی بھی حال میں کبھی ایک ناغہ بھی نہیں ہوا۔ حضرت رؤف خود بھی شاعر تھے اور اُن کا کلام اُن کی زندگی اور شخصیت کی منہ بولتی تصویر تھا۔ انہوں نے غزلیں تو برائے نام ہی کہیں ساری عمر نعت و منقبت ہی لکھتے رہے اور اُن پر مشتمل کئی مجموعے شائع ہوئے جو انہوں نے قدر دانوں میں بلا قیمت تقسیم کر دیے۔ ان پر اللہ کا فضل و کرم یہ بھی ہوا کہ اُن کی اولاد ماشاء اللہ ان کے دنقشِ قدم پر اُٹھی وہ محفل نعت آج بھی اسی التزام سے ہو رہی ہے۔ ان کے فرزندِ اکبر جناب مرزا

احمد حسین سیفی، دوسرے فرزند جناب مرزا حامد حسین حامد امروہوی، تیسرے بیٹے جناب مرزا ساجد حسین ساجد امروہوی، سیفی صاحب کے فرزند زبیر ابن سیفی، حامد صاحب کی بیگم مخفی امروہوی سب شعر و سخن کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ نعت و منقبت لکھتے ہیں اور پُر اثر الحان کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ سیفی امروہوی اور ساجد امروہوی کا ایک ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اب حامد امروہوی نے بھی اشاعت کلام کی طرف التفات کیا ہے۔

ایسا بہت نادر ہوتا ہے کہ کسی خاندان میں کسی فن کی روایت کئی نسلوں تک رہے۔ عربی کے شاعر زہیر بن ابی سلمیٰ کے لیے کہا جاتا ہے کہ اس کا باپ بھی شاعر تھا، وہ خود شاعر تھا اور اس کا ماموں بھی شعر کہتا تھا، دونوں بہنیں سلمیٰ اور الخنساء شاعرات تھیں۔ دونوں بیٹے کعب بن زہیر اور بجیر بن زہیر شاعر تھے اسی طرح اس کی نسل میں عقبہ بن کعب اور العوام بن عقبہ شاعر تھے۔ یہ فہرس اور بھی طویل ہے۔ اردو میں اس کی مثال میر ضاحک کا خاندان ہے جس میں میر حسن، میر خلیق، میر انیس، میر انس، میر مونس وغیرہ ہوئے۔ حضرت رؤف کے خاندان کو بھی یہ امتیاز حاصل ہے۔

نعت گوئی ادب اسلامی کا نمایاں وصف ہے جن زبانوں سے مسلمانوں کا سابقہ گزشتہ تقریباً ڈیڑھ ہزار برسوں میں رہا ہے ان سب میں نعتِ نبوی کا ذخیرہ موجود ہے خصوصاً عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں شعراء نے ہر دور میں طبع آزمائی کی ہے۔ ابتدائی دور میں قلی قطب شاہ، ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی، وغیرہ کے کلام میں اس کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ عہد متوسطین میں سودا، میر، درد، مصحفی، مومن، ذوق، غالب، کرامت علی شہدی، غلام امام شہید، کفایت علی کافی مراد آبادی، امیر مینائی، محسن کاکوری، بیدم وارثی، بے نظیر شاہ، مولانا حالی، اقبال، شبلی، ظفر علی خاں، حفیظ جالندھری، ماہر القادری، اقبال سہیل، امجد حیدر آبادی، عزیز لکھنوی وغیرہ سیکڑوں نام سامنے آتے ہیں۔ عہدِ حاضر میں پاکستانی شعراء میں نعت گوئی کا رجحان بڑھا ہے اور بہت سے شعراء نے نعتیں لکھی ہیں۔ درجنوں نئے مجموعے بھی سامنے آئے ہیں۔ نعت کا معاملہ یہ ہے کہ اس میں رسمیات سے کام نہیں چلتا جب تک محبت رسول کی چنگاری موجود نہ ہو نری شاعرانہ مہارت کوئی تاثیر پیدا نہیں کر سکتی۔ محترم مخفی کا دل بھی آماجگاہِ محبت و عقیدت ہے۔ میں نے انہیں محترم سید شمیم رجز کی طرحی نعتیہ محفل میں انہیں سنا۔ ان کے ہر شعر نے حاضرین سے داد حاصل کی۔

گو نعت گو خواتین کم ہیں لیکن جو ہیں وہ اپنی جگہ خاصی محنت کر رہی ہیں۔ انہیں شاعری کے علاوہ نہ صرف خانہ داری کی ذمہ داریاں بھی پوری کرنی ہوتی ہیں بلکہ حالاتِ حاضرہ کے تقاضوں کے مطابق روزی روٹی کے لیے باہر بھی نکلنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے مخفی امروہوی خوش قسمت ہیں کہ ان کی دنیا گھر تک محدود ہے اور وہ نعتیہ شاعری کے لیے وقت نکال پاتی ہیں۔ ان کا نام سردار خانم یوسف زئی ہے اور تخلص مخفی ہے۔ 15 جنوری 1941ء کو امروہہ یوپی ہندوستان میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد صاحب

سردار احمد خاں امروہہ میونسپل بورڈ میں سکریٹری تھے۔ انہوں نے جامعہ اردو سے ادیب، ادیب ماہر اور ادیب کامل کے امتحان پاس کیے۔ ان کی شادی 1959ء میں محترم حامد امروہوی سے ہوئی۔

سردار خانم کو سوشل ورک سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ علی گڑھ میں ذاکر حسین ماڈل ہائی اسکول میں کچھ عرصے ٹیچر رہیں۔ پھر بچوں کی تعلیم و تربیت میں بہت مشغول ہو گئیں اور ملازمت چھوڑ دی۔

1991ء سے اپنے شوہر کے ہمراہ شکاگو امریکہ میں مقیم ہیں۔ بچپن سے شاعری کا شوق تھا اور چھٹی جماعت سے اپنا تخلص انہوں نے مخفی رکھا تھا مگر کلام محفوظ نہ رہ سکا۔ شمع میں ان کا کلام شائع ہوتا ہے اور امریکہ میں پاکستان لنک، میں کلام شائع ہوتا ہے۔

مخفی غزل کو ادب کی سب سے اچھی صنف سمجھتی ہیں۔ اردو کے مستقبل سے موجودہ حالات اور روش دیکھ کر بہت زیادہ پر امید نہیں مگر انہیں یقین ہے کہ اگر والدین اپنے بچوں کو اردو بولنے اور پڑھنے کی ترغیب دیں تو کوئی اس زبان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔

Sardar Kahanum Yusufzai Makhfi
Natkada 1555 Amy ave, Glendale Heights I -60139 U.S.A

نعت

جس پہ ان کی چشم رحمت ہو گئی
اس کی دنیا ہی میں جنت ہو گئی

زندگانی اس قدر آساں نہ تھی
میرے آقاؐ کی بدولت ہو گئی

میرا ہونا وجہ زحمت تھا جہاں
اب وہاں میں وجہ رحمت ہو گئی

بزم ہستی میں ہوں وجہ افتخار
کیسی اچھی میری قسمت ہو گئی

پہلے زندہ دفن کر دیتے تھے لوگ
اب میرے قدموں میں جنت ہو گی

ماں بہن بیٹی بہو کے روپ میں
آج مخفی گھر کی زینت ہو گئی

یہ زندگی خواب کی ہے درد غم نہیں
دیکھو گے اک دن تم بھی تم میں سمجھی ہو گی

فریدہ ہاشمی مخفی

۲۲ ر ۶ ر ۹۹ء

سلیمہ سلامت علی عرف فریدہ ہاشمی مخفی

سان فرانسسکو

فریدہ ہاشمی مخفی کا تعارف پڑھیے تو زندگی کے ایسے مراحل بھی سامنے آتے ہیں کہ جن کے سچ سے نہ تو منہ موڑا جاسکتا ہے نہ انہیں جھٹلایا جاسکتا ہے۔ ان میں سابق مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کی ایک مختصر سی جھلک بھی ہے جس پر غور کیا جائے تو بڑی تلخ حقیقتیں سامنے آتی ہیں۔

عورت کی زندگی کے ایک نہایت اہم پہلو کی تصویر بھی اس تعارف میں ملتی ہے جس کی طرف مخفی نے اشارہ کیا ہے کہ اگر اُس کی زندگی کا ساتھی سمجھ دار اور دیانت دار ہے تو پورے خاندان کی زندگیاں باغ و بہار بنی رہتی ہیں۔ ان کی اولاد چاہے مغرب میں رہے یا مشرق میں انہیں اپنی قدروں کا پاس رہتا ہے۔

فریدہ مخفی کے ماشاء اللہ پانچ بیٹے ہیں۔ سبھی لائق اور ایسے تعلیم یافتہ کہ جنہوں نے ڈگریاں حاصل کر کے طاق پر نہیں سجائیں بلکہ اپنے علم کو اپنی زندگی کا جوہر بنالیا۔ شاہد علی خان، شاکر علی خان، اظہر علی خان اور انور علی خان میں اطہر علی خان نے کرکٹ میں بڑا نام کمایا۔ وہ اب بھی ڈھاکہ بنگلہ دیش کی نیشنل کرکٹ ٹیم میں ہیں۔

آیئے ہم آپ کو فریدہ مخفی سے ملادیں۔

ان کا نام سلیمہ ہے۔ سلیمہ بانو شادی کے بعد شوہر کی مناسبت سے سلیمہ سلامت خان لکھنے لگیں لیکن قلمی نام فریدہ ہاشمی ہے۔ حفی تخلص کرتی ہیں۔ تاریخ پیدائش 4 دسمبر 1936ء اور ہندوستان میں یوپی یعنی اتر پردیش کی ریاست رامپور سے تعلق ہے۔ 1958ء میں آگرہ یونی ورسٹی سے بی۔اے کیا۔ شادی سے پہلے بچوں کے ایک اسکول میں کچھ دنوں تک پڑھایا۔ پھر شادی ہو گئی۔ ادھر کوئی چار پانچ سال پہلے کلفٹن گرامر اسکول کراچی میں اردو اور اسلامیات کی تعلیم دو سال تک دی پھر چھوڑ دیا۔

سلیمہ بتاتی ہیں ان کے والد صاحب مرحوم سید فریدالدین صاحب عرف اچھے میاں شہر کے مشہور لوگوں میں سے تھے جو اپنے علم، اخلاق اور سخاوت کے لیے رامپور میں مشہور تھے۔ والدہ مرحومہ پڑھی لکھی تو نہ تھیں لیکن بہت باذوق خاتون تھیں۔ اُن کو بہت سے اردو فارسی کے اشعار اور بہت سی کہاوتیں یاد تھیں جو اپنی گفتگو میں بے تکلف استعمال کرتی تھیں۔ سلیمہ سمیت تین بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ بہنوں میں یہ دوسرے نمبر پر ہیں۔ سب سے چھوٹے بھائی پانچ پہلے جوانی ہی میں انتقال ہو گیا۔ 1959ء میں ان کی شادی ہو گئی اور ڈھاکہ چلی گئیں۔ ان کے شوہر سلامت علی خاں مرحوم بھی رامپور کے رہنے والے تھے ڈھاکے میں جوٹ یعنی پٹ سن کا کاروبار کرتے تھے اور شہر کے مشہور آدمی تھے۔ 1965ء میں ان کے شوہر کی بائیں آنکھ میں ہیمرج ہو گیا تھا۔ علاج کے سلسلے میں ان کے ساتھ لندن گئیں۔ اور یوں جنوبی مشرقی یورپ دیکھ کر واپس آئیں۔

سلیمہ کہتی ہیں "ہندو پاک کی پہلی جنگ جو ستمبر 1995ء میں ہوئی تھی اُس سے تھوڑے ہی دن پہلے کی بات ہے۔ اس وقت تک ڈھاکہ، مشرقی پاکستان کہلاتا تھا۔ اس وقت ہم ڈھاکے کے قریبی شہر نرائن گنج میں رہتے تھے جو جوٹ کے کاروبار کا مرکز تھا۔ جنگ کا اثر تھوڑے دنوں تک رہا۔ اس کے بعد حالات معمول پر آگئے۔ نہ دلوں میں نفرت کا احساس تھا اور نہ ملک کے ٹوٹنے کا۔ لیکن 71ء میں حالات بہت خراب ہو گئے۔ لوگوں کے دلوں میں پاکستان اور ایوب خان کے خلاف نفرت کا احساس بڑھنے لگا۔ ڈھاکے میں لوگوں کا عام تاثر یہ تھا کہ چائے اور جوٹ کے بزنس سے پورا پاکستان چلتا ہے اگر بنگلہ دیش الگ ہو جائے تو پاکستان کے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا۔ اگرچہ یہ بات سراسر غلط ثابت ہوئی لیکن سیاست دانوں کے پوشیدہ گٹھ جوڑ نے دلوں میں نفرتوں کی آگ بھر دی تھی۔ مکتی باہنی نے ہر غیر بنگالی کو اپنا دشمن سمجھ لیا تھا۔ ان لوگوں کو وہ بہاری کہتے تھے۔ اسی نتیجے میں ہم لوگوں کو پریشان ہو کر کراچی آنا پڑا۔ میں شاید فروری 71ء میں ایک سوٹ کیس لے کر بچوں کے ساتھ آگئی تھی اور میرے شوہر دو چار مہینے بعد آئے۔

دسمبر میں جب سقوط ڈھاکہ کا اعلان ہوا اور جنرل نیازی کے ہتھیار ڈالنے کا منظر ٹی وی پر دکھایا گیا تو عوام کو بے حد صدمہ پہنچا۔ غم اور غصے کی وجہ اور یہ منظر دیکھ میں اور میرے شوہر رو پڑے۔

71ء کی جنگ نے مالی اور جذباتی طور سے بے حد نقصان پہنچایا۔ اگرچہ میرے شوہر 77ء میں

پھر ڈھاکہ چلے گئے۔ کیونکہ اتنی عرصے تک کراچی میں کوئی کام نہ جم سکا۔ تھوڑے عرصے بعد میں بھی ان کے پاس چلی گئی۔ بہت پریشان کن حالات تھے۔ بچے یہاں پڑھ رہے تھے۔ مالی حالات ٹھیک نہیں تھے۔ میرے شوہر پھر سے ڈھاکہ میں رہنا چاہتے تھے تاکہ جوٹ کا کام دوبارہ شروع کردیں۔ غرض آٹھ دس سال تک کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا دو گھر تھے ایک کراچی میں اور ایک ڈھاکے میں۔ کچھ عرصے وہاں رہتے اور کچھ عرصے کراچی میں۔

ڈھاکے میں نئے اور پرانے دوست احباب سے ملاقات رہتی تھی۔ بہت سے بنگالی دوست بہت پر خلوص تھے۔ اکثر لوگوں نے میرے شوہر سے کہا کہ آپ بالکل پریشان نہ ہوں آپ کو یہاں سب اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ کی ساری جائداد مل جائے گی مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ نہ مکان واپس ملا نہ زمین۔ نہ لٹے ہوئے اثاثوں کا پتہ چلا اور نہ بینک کے پیسوں کا۔ کرائے کے مکان میں رہتے رہے۔

84ء میں ڈھاکے میں ہی میرے شوہر کا انتقال ہوا یعنی وہ مٹی انہیں اتنی پیاری تھی کہ ہمیشہ کے لیے اسی کے ہوگئے۔ میں کراچی میں بڑے بیٹے کے پاس آگئی۔ اس کی بیوی نے بے حد خیال رکھا۔ اب اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہے بچوں کی شادیاں ہوگئی ہیں۔ سب اپنی اپنی جگہ خوش و خرم ہیں۔ میرے بیٹے ماشاء اللہ بہت اچھے نیک فطرت انسان ہیں بالکل اپنے والد کی طرح محبت کرنے والے۔ دوسروں کے کام آنے والے۔

میں شاعری کے علاوہ نثر بھی لکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ پہلے افسانے اور کہانیاں بھی لکھیں لیکن اب صرف اپنی سرگزشت لکھنا شروع کی ہے۔ کسی خاص مکتبہ فکر سے میرا تعلق نہیں ہے۔ ادب برائے زندگی کی قائل ہوں۔ ایسی شاعری سے متاثر ہوتی ہوں جو براہ راست دل پر اثر انداز ہو۔ زندگی میں خوبصورتیوں کو پسند کرتی ہوں۔ شاعری میں خطابت بالکل پسند نہیں۔ آج کل لاس اینجلس کے "اردو لنک" میں اکثر میرا کلام شائع ہوتا ہے جس کے لیے اس کے ایڈیٹر جناب عبدالرحمٰن صدیقی صاحب کی مشکور ہوں۔

مطالعہ کا بہت شوق ہے۔ خاص طور سے دو موضوع میرے پسندیدہ ہیں۔ دین اور ادب و شاعری۔ غالب اور فانی پسندیدہ شاعر ہیں۔ فیض کی شاعری بھی بہت خوبصورت ہے۔ امجد اسلام امجد، منیر نیازی، حمایت علی شاعر، پروین شاکر، عبدالرحمٰن صدیقی بہترین شعراء ہیں۔ قرآن کا ترجمہ اور تفسیر، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ اور مختلف لوگوں کی سوانح حیات پڑھنا پسند ہیں۔ صالحہ عابد حسین کا ناول "آتشِ خاموش" ایک عرصہ پہلے پڑھا تھا۔ آج تک اس کا پلاٹ یاد ہے۔ بشریٰ رحمٰن کے ناول آنگن نے بہت متاثر کیا۔ سلطانہ مہر کا ایک افسانہ پڑھا تھا بہت متاثر کن تھا۔ ادب کے آسمان پر اب بھی بے حد و بے شمار چاند تارے ہیں۔ سب روشنی دے رہے ہیں۔ کاروانِ اردو کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ یہ ان سب کا ہم پر احسان ہے۔ خود آپ سلطانہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں جو اتنا اہم کام کر رہی ہیں۔ اور ہم سب کے شکریہ کی مستحق بھی ہیں۔

اہم واقعات میں سب سے بڑا واقعہ میری شادی کا ہے جو ہر عورت کی زندگی پر اچھا یا بُرا اثر ڈالتا ہے۔ اس کی زندگی کا اہم موڑ ہوتا ہے۔ میں اس لحاظ سے خود کو ایک خوش قسمت عورت سمجھتی ہوں کیونکہ صرف میرے شوہر ہی بہترین ساتھی نہیں تھے بلکہ میری پوری سسرال والے بہت ہی پر خلوص اور عمدہ لوگ ہیں جن سے بہترین تعلقات ہیں۔ چھوٹی نند کی بیٹی میرے بیٹے اظہر کی بیوی ہے۔ رامپور سے بھی برابر فون اور خطوط کے ذریعے تعلق قائم ہے۔ اس اہم موڑ نے میری زندگی پر بہت اچھا اثر ڈالا۔ میرے شوہر کو ادب و شاعری سے بھی دلچسپی تھی چنانچہ سے ڈھاکہ کے مشاعرے میں شرکت کرنے والے اکثر شعراء حضرات خاص کر جوش صاحب اکثر ہمارے ہی گھر ٹھہرتے تھے۔ شعر و سخن کی محفلیں، مشاعرے اور دعوتیں ہوتی تھیں یعنی شوہر کے ساتھ خوش حالی، محبت اور سکون کی بہترین زندگی گزاری۔

دلچسپ واقعات کے سلسلے میں جوش صاحب کی نسبت سے ایک واقعہ یاد آیا۔ ویسے تو ہر محفل سخن میں اپنے شوہر کے ساتھ ہوتی تھی مگر شاید اس واقعے کے وقت میں موجود نہ تھی کیونکہ یہ واقعہ مجھے میرے شوہر نے سنایا۔

جوش صاحب سے اکثر و بیشتر گفتگو رہتی تھی۔ رومان پسند طبیعت کے مالک تھے۔ خوبصورت اور باذوق خواتین سے مل کر خوش ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ سے بہت ناراض رہتے تھے کہ اب چہرہ بٹوے کی طرح بالکل جھریوں سے بھر دیا ہے۔ ساری خوبصورت خواتین چچا میاں کہتی ہیں تو اللہ تعالیٰ پر بڑا غصہ آتا ہے۔ میرے شوہر نے ہنس کر کہا۔ "اچھا جوش صاحب اگر آپ اللہ تعالیٰ ہوتے تو کیا کرتے؟ کہنے لگے زندگی کو لافانی کر دیتا اور جوانی کو لازوال۔ کہا کہ پھر تو سب یکسانیت کا شکار ہو جاتے۔ جواب دیا۔ آپ بات کس سے کر رہے ہیں۔ خدا سے نا! میں ایسا دماغ ہی نہ دیتا۔" اچھی بات کہی۔ ہم سب خوب ہنسے۔ پھر میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ یہ سب تو جنت میں ہوگا ہی۔ قرآن اور احادیث سے ثابت ہے کہ ہمیشہ رہنے والی زندگی ہوگی اور ہم عمر نوجوان ساتھی ہوں گے۔ (واللہ علم)

"امید تو زندگی ہے اس لیے اردو کے مستقبل کے بارے میں بھی خاصی پر امید ہوں۔ خاص کر پاکستان سے باہر اردو کے لیے جو کام ہو رہا ہے وہ بہت متاثر کن ہے۔ پاکستان میں بھی بہترین شاعر، مصنف اور صحافی حضرات اپنی تمام تر کوششوں میں مصروف ہیں اور شمع اردو روشن سے روشن تر ہوتی جا رہی ہے لیکن ملک کے حالات اتنے دگرگوں ہیں کہ بہت سے کام ادھورے رہ جاتے ہیں۔ یہاں کے رہنے والوں کا اہم فریضہ یہ ہونا چاہئے گھروں میں اردو بولیں اور بچوں کو عربی کے ساتھ اردو لکھنا پڑھنا ضرور سکھائیں تاکہ نئی نسل بھی آئندہ اردو ادب کے کام میں ممد و معاون ہو۔ صرف بولنے کی حد تک ہی اگر اردو کا نام رہا تو ایک دن یہ بھی مٹ جائے گا۔ اردو ہمارا ورثہ ہے۔ اردو ادب و شاعری دنیا کی بہترین ادبیات میں جگہ پا سکتے ہیں۔ اس پر کام کرنا بہت زیادہ ضروری ہے۔

میں نظم اور غزل کو اظہار کا بہترین ذریعہ سمجھتی ہوں غزل میں حسن و عشق کی زبان میں یعنی

پردے پردے میں بات کہی جاسکتی ہے جبکہ نظم خاص کر آزاد نظم میں موضوع پر کھل کر اظہارِ خیال ہو سکتا ہے۔ نثری نظم ہو یا نثری غزل اظہار کے لیے سب مناسب ہیں۔ صرف اپنے مزاج کی بات ہے کہ کون کس طرح اظہارِ خیال کرتا ہے اور بہتر طریقے سے اپنے مفہوم کو ادا کر سکتا ہے۔ یہی بات میرے خیال سے مشاعروں اور تخلیقی نشستوں کے لیے کہی جاسکتی ہے۔ مقصد دونوں کا ایک ہی ہے۔

میرے خیال سے یہ بات درست نہیں ہے کہ الیکٹرونک میڈیا کی وجہ سے کتابوں کی اشاعت کم ہوگئی ہے۔ اس کی وجہ کچھ اور ہے۔ یہاں امریکہ میں دیکھئے ٹی وی کتنا عام ہے۔ بے شمار چینل ہیں جن پر طرح طرح کے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ لوگوں کی مصروفیات بھی بہت ہیں۔ اس کے علاوہ ناچ گانوں کے بھی بہت سے شو ہوتے ہیں۔ کھیلوں اور طرح طرح کی دوسری دلچسپیوں کے بھی بہت سے ذریعے ہیں مگر پھر بھی یہاں بے حد کتابیں چھپتی ہیں بے حد بکتی ہیں۔ لوگ خوب لکھتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں۔ کتابوں کے علاوہ لاکھوں قسم کے اخبار اور رسالے بھی چھپتے اور پڑھے جاتے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ میں سمجھتی ہوں سب سے ضروری بات ہے علم کا ہونا یعنی عوام میں پڑھنے کا شوق ہو۔ ہر ایک پڑھ سکتا ہو۔ شاعری تو شاید بہت سے لوگ نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ لطف اُٹھا سکتے ہیں لیکن زندگی کے مختلف موضوعات پر عام فہم زبان میں کتابیں اگر موجود ہوں تو ضرور پڑھی جائیں گی۔ کتابوں اور اخباروں کی قیمت کا بھی اس میں بڑا دخل ہے۔ یہاں کتابیں بہت سستی ہیں جبکہ لکھنے والے لکھ پتی بن گئے ہیں۔ پاکستان میں اس کا اُلٹ معاملہ ہے۔

ایک کام یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ پرخلوص اور دیانت دار لوگوں کی نگرانی میں ڈونیشن یعنی چندے کا سلسلہ شروع کیا جائے تاکہ مختلف ادارے کتابوں اور رسالوں کی اشاعت کا کام کریں اور ان کو کم سے کم زرِ خرید کے ساتھ پیش کیا جائے جو لکھ سکتے ہیں وہ اپنے وقت کا کچھ حصہ اعزازی طور پر اس کام میں لگائیں۔ مگر ان سب باتوں کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ ملک میں امن وامان ہو۔ پُرسکون زندگی ہو۔ خوش حالی کا ساتھ ہو اگر یہ سب باتیں ہوں تو امید ہے کہ کتابیں چھپیں گی بھی بکیں گی اور پڑھی بھی جائیں گی۔

تنقید اردو ادب کی ترقی کے لیے بہت ضروری ہے۔ گزشتہ زمانے میں جس طرح شاعر اپنی شاعری کے لیے اور مصنف اپنی تصنیف کے لیے مشہور تھے اسی طرح تنقید نگار اپنی تنقید کے لیے مشہور تھے۔ کلیم احمد اور مجنوں گورکھپوری کا نام اس سلسلے میں لیا جاسکتا ہے۔ ضروری ہے کہ یہ سلسلہ پھر شروع کیا جائے تاکہ جن کی شاعری یا تحریر میں کوئی کمی رہ گئی ہے وہ اسے درست کریں اور آئندہ نسل کسی غلط روی کی طرف مائل نہ ہو۔"

SALIMA SALAMAT KHAN
SHAKIR A. KHAN, 311 WASHBURN DRIVE
FREMOUNT, CA 94536

انتخابِ کلام

سلیمہ سلامت علی

میرے گلشن میں آخر کیوں خزاں ہے
بتا رنگِ بہاراں تو کہاں ہے

کسی جانب میں رکھوں بال و پر یہ
نشانِ برق میرا آشیاں ہے

تمہاری بے رُخی مہمیز ہے اب
چراغِ راہ گردِ کارواں ہے

محبت روشنی ہے جان و دل کی
محبت شاہراہِ دوستاں ہے

لو ہم نے دیا خود کو مٹا کر
برائے رنگ و خوشبو جہاں ہے

اسی کے پیرہن کی ساری زینت
پُر افشاں جس کے دم سے گلستاں ہے

فروغِ مہر و الفت ہے نظر میں
بہت اونچا مقامِ دوستاں ہے

مظفر حنفی

کلکتہ بھارت

1999ء کے اوائل میں بھائی مقصود الٰہی شیخ نے اپنے ہفت روزہ جریدے "راوی" میں ایک خبر شائع کی کہ سلطانہ مہر سخن ور چہارم اور نثر نگاروں کے تذکرے "گفتنی" پر کام کر رہی ہیں۔ کچھ لوگوں نے سخن ور دوئم، سوئم منگوائی ان میں ایک صاحب پرویز مظفر بھی تھے۔ مظفر حنفی کے بیٹے۔ انہوں نے چیک بھیج کر نہ صرف میری دونوں کتابیں منگوائیں بلکہ مظفر حنفی صاحب کی دو کتابیں بھی بھجوادیں۔ شعری مجموعہ "یا اخی" مطبوعہ 1996ء اور سفر نامہ برطانیہ بعنوان "چل چنبیلی باغ میں" مطبوعہ 1998ء۔ اپنے ابو کے ادبی کاموں سے پرویز کی یہ محبت میرے دل کی شریانوں میں اُتر گئی۔ میں نے اُس کی اس محبت کو سراہا اور کہا کہ تم نے اپنے ابو کی لاعلمی اور غیر موجودگی میں ان کی کتابیں بھجوا کر مجھ پر احسان کیا ہے۔ اس محبت کا اجر تمہیں یقیناً اللہ تعالیٰ کی جانب سے ملے گا۔ میں نے پرویز کو مظفر صاحب کے لیے سوالنامہ بھیجا اور پھر ان کا دہلی کا یا کلکتہ کا پتہ حاصل کر کے سوالنامہ انہیں بھی بھجوادیا۔ ایک طویل انتظار کے بعد مجھے مظفر صاحب کا خط ملا۔ انہوں نے ان پر لکھا ہوا پریم گوپال متل کا مطبوعہ تعارف اور سوالنامہ کے مختصر ترین جواب کے ہمراہ اپنا آٹھ سطری خط بھیجا جس میں لکھا کہ "اختصار کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ آج کل طبیعت خراب چل رہی ہے۔ موڈ

بھی خراب ہے، خط بھی خراب ہے اور موسم بھی خراب ہے۔"
میں ایسے خط جب بھی پڑھتی ہوں میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں اور میں اپنے اللہ سے شکوہ کرنے لگتی ہوں کہ اے ربِ جلیل تو نے ہم لوگوں کے ہاتھوں میں قلم تھما کر ہمارے دلوں میں درد اور آنکھوں میں آنسوؤں کے کنکر کیوں بھر دیے؟

مظفر صاحب اپنے بیٹے پرویز سے دُور ہیں۔ جانے دوسرے بیٹے بیٹی کہاں ہوں گے۔ بچے تو پرندوں کی مانند ہوتے ہیں۔ انہیں پالو پوسو پھر جب ان کے پر لگ جاتے ہیں تو یہ اپنے اپنے آشیانوں کی جانب پرواز کر جاتے ہیں۔ ماں باپ تنہا کے تنہا رہ جاتے ہیں اور یہ تنہائی، بھری انجمن کی تنہائی دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے۔

مظفر حنفی کا مجموعہ کلام میرے ہاتھ میں ہے۔ اس کے فلیپ پر ساقی فاروقی نے لکھا ہے:
"مظفر حنفی کے مطالعے اور مشاہدے نے ان کے مصرعوں اور شعروں کو ایسی نشتریت عطا کی ہے جس کے ابعاد شاد عارفی سے مختلف ہیں۔ ان کی ہر غزل میں ایک دو مصرعے یا ایک دو اشعار ایسے ہوتے ہیں کہ مجھ جیسا کٹر شاعر بھی (شاید پارٹ ٹائم نقاد بھی) ان کی ہنر مندی کی داد دیے بغیر نہیں رہتا۔ زبان و بیان پر ان کی گرفت اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ اچھے اچھے شاعروں کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتی ہے۔"

مظفر حنفی 1997ء میں جب بیٹے پرویز کی شادی کے سلسلے میں برطانیہ آئے اس وقت ان سے روزنامہ جنگ لندن کے فیضان عارف، ہفت روزہ 'دی نیشن' (The Nation) لندن کے اختر گلفام اور بی بی سی لندن کے رضا علی عابدی نے ان سے انٹرویوز کیے۔ کچھ سوالات تقریباً وہی تھے جو میں نے سخن ور چہارم اور گفتنی کے لیے ترتیب دیے تھے۔ یوں مجھے حنفی صاحب کا تعارف لکھنے میں مدد ملی کہ میں اپنے سوالنامے کے جواب کو وضاحت سے لکھ سکوں۔

فیضان عارف نے اپنے انٹرویو کی ابتدا یوں کی ہے:
"برصغیر کے منفرد اسلوب رکھنے والے شاعروں میں مظفر حنفی کا نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ ان کی غزل عہدِ حاضر کے آشوب کی ایک ایسی تصویر ہے جسے احساس اور فکر کے رنگوں سے تخلیق کیا گیا ہے انہوں نے موجودہ دور کے تلخ حقائق کو جس شاعرانہ انداز سے اپنی غزل میں سمویا ہے وہ ہر سخن ور کے بس کی بات نہیں۔ ان کے درج ذیل اشعار اس بات کی گواہی دیں گے۔"

ہمیں لوح و قلم تقدیر نے بخشے تو ہیں لیکن
ہمارا آب و دانہ لکھ دیا ہے چور ہاتھوں میں
عظیم المرتبت ماضی تھا شہزادوں کی قسمت کا
مرار نگین مستقبل ہے رشوت خور ہاتھوں میں

مظفر حنفی کی پہچان کا بنیادی حوالہ ان کی شاعری ہے لیکن ایک نقاد اور اقبال شناس کے طور پر

بھی ان کی شناخت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یکم اپریل 1936ء کو کھنڈوا (مدھیہ پردیش ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ ابوالمظفر ان کا نام رکھا گیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انہوں نے بی۔اے اور بھوپال یونیورسٹی سے ایم۔اے ایل ایل بی اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ڈاکٹریٹ کے لیے ان کی تحقیق کا موضوع تھا" شاد عارفی کی شاعری" سرکاری ملازمت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کر کے 1976ء میں جامعہ کے شعبہ اردو سے وابستہ ہوئے۔ 1989ء میں انہیں کلکتہ یونیورسٹی نے اقبال چیئر پر پروفیسر کی حیثیت سے فائز کیا۔ وہ تا حال اسی عہدے پر کام کر رہے ہیں۔ ان کے دس شعری مجموعے تین افسانوی مجموعے، پانچ تنقیدی مجموعے سات تحقیقی کتب اور تیس دوسری تصانیف موجود ہیں۔ بے شمار اعزازات سے انہیں نوازا گیا ہے۔ محبوب راہی نے ان کے فن و شخصیت پر تحقیقی کام کر کے ناگپور یونیورسٹی سے 1984ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ محبوب راہی کا یہ مقالہ کتابی شکل میں چھپ چکا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ محبوب راہی کو انہوں نے تین سال تک اپنی شخصیت پر تحقیقی کام کرنے کی اجازت نہیں دی۔ تب انہوں نے بھوپال جا کر حنفی صاحب کے استاد سے شکایت کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ جن ادیبوں نے اپنا ادبی سفر مکمل کر لیا ہو ان پر تحقیق ہونی چاہئے نہ کہ مظفر حنفی پر۔ جیسے کہ فیض ہیں فراق ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ زندہ شخصیات پر پی ایچ ڈی کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔"

اردو کے مستقبل کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ "ہندوستان میں تو اردو کا مستقبل تاریک نہیں۔ فلمیں اردو زبان میں بن رہی ہیں۔ لوگ اردو غزلوں اور گیتوں کو بڑے شوق سے سنتے ہیں لیکن برطانیہ، یوروپ اور امریکہ میں بسنے والے باشندوں کو اس کے لیے بے شک کام کرنا چاہئے ورنہ ان کے بچے اردو سے نابلد رہ جائیں گے اور اگلی صدی میں وہاں اردو بولنے والے کم کم ہی رہ جائیں گے۔"

معیاری ادب کے پیمانے کیا ہیں اور اچھی شاعری کی بنیادی صفات بیان کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ لکھنے والا جس طرح محسوس کرے اُسے مختصر الفاظ میں ایسے بیان کر دے کہ پڑھنے والا بھی ویسے ہی محسوس کرنے لگے۔ اچھی شاعری میں نیا خیال اور نیا اندازِ بیان بنیادی اور اہم صفات ہیں۔

مظفر حنفی شاعری میں اظہارِ خیال کے لیے غزل کو پسند کرتے ہیں۔ ویسے انہوں نے پابند اور آزاد نظمیں بھی کہی ہیں۔ نثری غزل کے قائل نہیں۔ رضا علی عابدی نے ان سے پوچھا تھا کہ ہندو پاک میں غزل گوئی کا چلن کیوں ہے جبکہ دوسرے معاشروں میں نہیں۔ انہوں نے جواب میں کہا "ستیہ پال آنند نے پچھلے دنوں یہ تحریک چلائی کہ عالمی ادب سے آنکھ ملا کر بات کرنے والی اردو میں جو اکیلی صنف ہے وہ نظم ہے۔ غزل وغیرہ کی کوئی حیثیت نہیں۔ میں اسے دوسرے زاویے سے دیکھتا ہوں اور اس لیے نہیں کہ میں غزل گو ہوں۔

میں نے تنقید بھی لکھی ہے میں افسانہ نگار بھی ہوں۔ میں نے تحقیق بھی کی ہے اور نظمیں بھی کہی ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ اگر کوئی چیز دوسرے معاشرے میں نہیں ہے تو صرف ہمارے سسٹم یا معاشرے میں ہونے کی وجہ سے کم تر درجہ کی نہیں ہے مثلاً تاج محل اگر دنیا میں کہیں اور نہیں پایا جاتا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تاج محل کم تر درجے کی تخلیق ہے۔ دنیا کی کسی بھی زبان یا ادب کی کسی بھی صنف میں ایسی کوئی مثال نہیں کہ دو مصرعوں میں ایسی پُر تاثیر بات کہی جا رہی ہو جو 25 30 صفحوں میں کہی جائے پھر بھی اتنا تاثر منتقل نہ ہو۔ اب تو ہر تیسرا آدمی بھی غزل کہنے لگا ہے تو اس میں غزل کا کیا قصور۔ میر تقی میر نے کہا ہے

؎ غزل کہنی نہ آتی تھی تو سو سو شعر کہتے تھے
مگر اک شعر بھی اے میر اب مشکل سے ہوتا ہے

تو جناب جب غزل کہنی آجاتی ہے تب پتہ چلتا ہے کہ یہ کتنی مشکل صنفِ سخن ہے۔"

مظفر حنفی صاحب کی رائے میں کتابوں اور رسالوں کی اشاعت بڑھانے کے لیے الیکٹرونک میڈیا سے تال میل پیدا کرنا چاہئے۔ تنقید کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ تنقید ہندوستان میں تو ہو رہی ہے اور زندہ ہے۔ ترجمہ بھی ہو رہا ہے خود میں نے تقریباً گیارہ کتابیں دوسری زبانوں سے ترجمہ کی ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج کل نقادوں نے یہ رویہ اختیار کر رکھا ہے کہ تخلیق کار کو اپنے پیچھے رکھیں حالانکہ ناقد کو تخلیق کار کے پیچھے رہنا چاہئے لیکن جن شاعروں کو اپنے لکھے ہوئے پر اعتبار نہیں ہوتا وہ نقادوں سے سند لینے کے لیے ان کے آگے پیچھے گھومتے ہیں۔ اس لیے نقاد حضرات اچھے اور سچے شاعروں سے بھی یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کے آگے پیچھے پھریں۔ بڑا شاعر چونکہ نقاد کی خوشامد نہیں کرتا اس لیے وہ ان کی نظر میں معتوب رہتا ہے۔ بڑے شاعر کو کبھی اس کے ہم عصر نقادوں نے تسلیم نہیں کیا۔ اس کی بڑائی کو ہمیشہ آنے والا وقت تسلیم کرتا ہے۔ بڑا تخلیق کار کسی سہارے کا محتاج نہیں ہوتا۔ بیشتر نقاد وہ ہیں جو شاعری اور افسانہ نگاری کے میدان میں ناکام ہونے کے بعد تنقید کی طرف آئے ہیں۔"

مظفر حنفی صاحب اپنی زندگی سے کوئی اہم واقعہ یا واقعات جنہیں آپ یاد رکھے ہوئے ہوں بتانا چاہیں گے؟

انہوں نے کچھ دیر سوچا اور کہا "زندگی رنگا رنگ اور مہماتی واقعات سے بھری پڑی ہے۔ پلٹ کر گزشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو ہر چند کہ اس اعتبار سے بے اطمینانی کا احساس ہوتا ہے کہ بہت سے ایسے بڑے ادبی کام کرنے سے رہ گئے جنہیں موجودہ بڑھتی ہوئی مصروفیات اور خانگی ذمہ داریوں کے پیشِ نظر اب مکمل کرنا مشکل ہوگا لیکن یہ سوچ کر قدرے تسکین ہوتی ہے کہ زندگی بھر پڑھنے لکھنے اور پڑھانے کے علاوہ کوئی اور کار فضول نہیں کیا۔ کبھی اہلِ اقتدار کے آگے سر نہیں جھکایا، کسی قسم کی سفارش کو آگے بڑھنے کا زینہ نہیں بنایا۔ قرض لینے سے ہمیشہ دامن بچایا اور لوگوں کے احسانات

قبول نہیں کیے۔ حتی المقدور والدین کی خدمت کی۔ نادار اعزا و احباب اور باصلاحیت شاگردوں کی حتی الوسع اعانت کی۔ چھوٹی بہن، بھانجے، بھانجی اور بیٹیوں کی شادیاں کیں۔ بچوں کو اچھی تعلیم دلائی۔ ان کے لیے دہلی میں دو مکان محنت کی کمائی سے تعمیر کیے۔ بیرونی ممالک سے ادبی تقریبات میں شرکت کے لیے کئی دعوت نامے ملے لیکن وطن عزیز کو ایک دن کے لیے بھی چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ ہندوستان بھر کے سیمیناروں اور مشاعروں میں خالص ادبی تخلیقات کے وسیلے سے مقبولیت حاصل کی اور مقام شکر ہے کہ اپنی صاف گوئی اور حق بیانی کے وصف ماننے اور چاہنے والوں کا ایک بڑا حلقہ رکھتا ہوں۔ ریڈیو اور ٹی وی پر بھی طلب کیا جاتا ہوں۔ مسلسل لکھتا پڑھتا ہوں اور خداوند کریم سے دعا کرتا ہوں کہ زندگی کی آخری سانس تک مجھے علمی اور ادبی کام کرتے رہنے کی توفیق و استطاعت عطا فرمائے۔ آمین۔"

حنفی صاحب نے بتایا کہ "مختلف ریاستوں کی اردو اکیڈمیوں نے وقتاً فوقتاً میری بیس کتابوں کو انعامات سے نوازا ہے اور مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے اردو ادب کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں کل ہند پرویز شاہدی ایوارڈ مرحمت کیا۔ علاوہ ازیں نیشنل کونسل آف چائلڈ ایجوکیشن (نئی دہلی) کلچرل اکیڈمی (گیا) آل انڈیا میر اکاڈمی (لکھنؤ) غالب کلچرل سوسائٹی (بنگلور) وغیرہ نے اپنے انعامات کا مستحق سمجھا ہے۔ حال ہی میں "افتخار میر" اعزاز سے بھی اس خاکسار کو نوازا جا چکا ہے۔ کلکتہ کے ماہنامہ انشاء نے گوشہ مظفر حنفی شائع کیا ہے۔ میری تصنیفات حسب ذیل ہیں:

شعری مجموعے: تیکھی غزلیں، صریر خامہ، عکس ریز، پانی کی زبان، دیپک راگ، طلسم حرف، کھل جا سم سم، یم بہ یم، جگ جگ تارا، غزلیات، پردہ سخن کا۔

افسانوی مجموعے: اینٹ کا جواب، دو غنڈے۔ دیدۂ حیراں۔

تالیف و تدوین: ماہنامہ نئے چراغ (دس شمارے) ایک تھا شاعر۔ شوخی تحریر، نثر و غزل دستہ۔ شاد عارفی کی غزلیں۔ کلیات شاد عارفی۔ شاد عارفی ایک مطالعہ۔ دہلی میں اردو طنز و مزاح۔ جدیدیت: تفہیم و تجزیہ۔ روح غزل۔

ترجمے: پانچ ناول، گلاگ مجمع الجزائر (تین دفتر) گجراتی کے ایک بابی ڈرامے اڑیا افسانے۔ بیداری، بنکم چندر چٹرجی۔ بھارتیندو ہریش چندر۔

تحقیق: شاد عارفی: شخصیت اور فن۔ وضاحتی کتابیات (نو جلدیں) حسرت موہانی، انتخاب غزلیات۔

تنقید: نقد ریزے، جہات و جستجو۔ تنقیدی ابعاد۔ جائزے۔ ادبی فیچر۔ باتیں ادب کی۔

بچوں کا ادب: نیلا ہیرا۔ بندروں کا مشاعرہ۔

MUZAFFER HANAFI

2/A UNIVERSITY TEACHRS' QUARTERS KONGERGACHI

P-7/1 I.T.SCHEME VII M CALCATTA 700054 INDIA-

انتخابِ کلام

مظفر حنفی

کرتا کون ہمیں غرقاب
نکلے دل دریا پایاب

بستی دُھو دھو جلتی ہے
گھر میں سوتا ہے سیلاب

شوق نہیں تھا مرنے کا
لیکن کچھ مخلص احباب

آنکھوں میں ریت اُڑتی ہے
دیکھے ہیں کچھ ایسے خواب

دل پیہم سجدے میں ہے
کیسا منبر، کیا محراب

اردو پانچ منٹ کی تھی
خبریں ختم ہوئیں آداب

پڑھیو شعر مظفؔر کے
جب جینا ہو جائے عذاب

یوں نہ مُرجھا، کہ مجھے خود پہ بھروسہ نہ رہے
پچھلے موسم میں ترے ساتھ کھلا ہوں میں بھی

مظہر امام

یکم اکتوبر ۱۹۹۹ء

مظہر امام

دہلی

96ء کی بات ہے۔ میں مارچ میں دہلی میں تھی۔ جناب رفعت سروش نے میرے لیے اعزازی شعری محفل منعقد کی تھی۔ وہیں محترم بلراج کومل، مشرف عالم ذوقی، ڈاکٹر شبانہ نذیر، ابوالفیض سحر اور مظہر امام سے ملاقات ہوئی۔ مجھے ہماری افسانہ نگار دوست انور نزہت ہمراہ لے گئی تھیں اور بھی صاحبِ ذوق حضرات شریک تھے جن کے نام اس وقت یاد نہیں۔ نثری نظم کے حوالے سے بڑی گرماگرم بحث چھڑی تھی۔ پھر آزاد نظم کے حوالے سے بھی گفتگو ہوئی۔ مظہر امام نے بتایا تھا کہ پابند نظم کا رواج اب ختم ہو رہا ہے چنانچہ مرثیہ اور مسدس اب کم لکھے جا رہے ہیں زیادہ تر اب آزاد نظم لکھی جا رہی ہے۔

بلراج کومل نے کہا تھا "حلقہ ارباب ذوق نے آزاد نظم کو رواج دیا۔ قیوم نظر، یوسف ظفر، ظہور نظر اور میرا جی نے اسے ترقی دی۔ اپنی ذات کے اظہار کے لیے میں نے نثری نظمیں کہیں جس طرح بارش میں کئی بار میں چھاتے کے بغیر نکلتا ہوں۔ کچی سڑک پر چلتا ہوں کہ اس کا لطف ہی کچھ اور ہے۔"

میں نے جن حضرات کو اس وقت سخن ور دوم کا سوالنامہ دیا تھا ان میں سے جناب بلراج کومل

ڈاکٹر شبانہ نذیر اور رفعت سروش صاحب نے تعارف ارسال کر دیا جو سخن ور دوم میں شامل کر لیا گیا۔ سخن ور چہارم کے موقع پر مجھے جو پتے ہاتھ لگے ان میں ابوالفیض سحر اور مظہر امام بھی شامل تھے۔ میرے 18 جون کے خط کا جواب مظہر امام نے اکتوبر میں دیا۔ تاخیر کی وجہ ان کی علالت تھی۔ اور بقول ان کے سوالنامہ ہمیشہ انہیں پریشان کرتا ہے لیکن میں شکر گزر ہوں کہ انہوں نے میری خاطر یہ پریشانی مول لے لی اور اپنے قارئین کی محفل میں کشاں کشاں سہی، چلے تو آئے۔

دہلی سے امریکا کا سفر بھی آسان تو نہیں۔ پھر وہ علالت سے ہنوز سنبھلے نہیں۔ ہم نے دہلی کے جو شاندے کے بجائے امریکا کی گرم گرم کافی سے ان کی پذیرائی کی اور چونکہ سوالنامہ سے گھبراتے ہیں، پریشان ہوتے ہیں لہٰذا ان سے گفتگو شروع کی اور وہ بھی مزیدار باتوں سے۔

کافی پی کر مظہر امام تازہ اور شگفتہ نظر آرہے تھے۔ میں انہیں باتوں باتوں میں لے گئی قصے کہانیوں کی طرف۔ میں نے پوچھا: آپ کے خاکے بعنوان "جو اکثر یاد آتے ہیں" میں آپ نے کچھ دلچسپ واقعات بیان کیے ہیں اور اپنی خود نوشت میں بھی لکھ رہے ہیں۔ کچھ ہمیں بھی سنایئے۔

انہوں نے کافی کا گھونٹ بھر کر ایک لمبی 'ہوں' کی اور پوچھا۔ مجاز کا واقعہ سناؤں؟

"بسم اللہ۔" میں ہمہ تن گوش تھی اور داستان گو مظہر امام بتا رہے تھے:

"یہ بات ہے اپریل 1952ء کی۔ کلکتے میں ایک بہت بڑی کل ہند، سہ روزہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ مختلف زبانوں اور علاقوں کے بڑے بڑے ادیب، شاعر، فن کار، اداکار شریک ہوئے۔ اردو کی اہم شخصیتوں میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، مجاز، مخدوم محی الدین، سردار جعفری، پروین شاہدی، کیفی اعظمی، وامق جونپوری، رضیہ سجاد ظہیر اور انور عظیم کے نام فوری طور پر ذہن میں آرہے ہیں۔ اس کانفرنس کی بہت سی باتیں ذہن سے محو نہیں ہوتیں۔ کسی سب کمیٹی کے اجلاس میں اسرار الحق مجاز نے جوش میں آکر انگریزی میں ایک تقریر کی۔ اُن دنوں اُن پر جنوں کا اثر تھا۔ نہ جانے انہوں نے کیا کچھ کہا۔ وہ اپنی تقریر ختم کرنے کے کچھ دیر بعد باہر آئے تو میں نے ان سے عرض کیا: "مجاز صاحب! ابھی ابھی سنا ہے آپ نے بڑی ولولہ انگیز تقریر کی"

مجاز نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "آپ نے نہیں سنی؟"

"معاف کیجئے، میں ذرا دیر سے پہنچا۔" میں نے معذرت کی۔

"Then I must commit suicide" (تب تو مجھے خودکشی کر لینی چاہیے)۔ مجاز چہک کر بولے۔ ان کی طبعی حسِ ظرافت جاگی ہوئی تھی۔ انہیں پتہ نہیں تھا کہ انہوں نے قسطوں میں کب سے خودکشی شروع کر رکھی ہے! اسی وقت سردار جعفری بھی آگئے اور چٹخارے لے لے کر مجاز کی تعریف کرنے لگے:

"تم نے بڑی کھری کھری باتیں کہیں۔ سچ ہے، اللہ کے بندوں کو آتی نہیں روباہی"

مجاز کی رگ ظرافت پھر پھڑکی۔ بولے "روباہی تخلص ہے کیا؟"

سردار جعفری نے اس وار کی چوٹ محسوس کی اور مسکراتے ہوئے وہاں سے چل دیے۔ مجاز نے پیچھے سے داغا "آداب عرض ہے۔" ان دنوں مجاز کوئی مزاحیہ یا طنزیہ فقرہ کہنے کے بعد "آداب عرض ہے۔" کہنے کے عادی تھے!

اس کانفرنس کے ساتھ ہی ایک آل انڈیا مشاعرہ بھی منعقد ہوا تھا۔ کلکتہ کی تاریخ میں شاید اتنا شاندار مشاعرہ کبھی نہیں ہوا۔ لگ بھگ بیس پچیس ہزار سامعین تھے۔ کرشن چندر نے صدارت کی تھی۔ فیض اور سجاد ظہیر، راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں پاکستان کی جیلوں میں قید تھے۔ اس مشاعرے میں فیض کی غزل مجروح نے اور سجاد ظہیر کی وامق جونپوری نے اپنے اپنے مخصوص ترنم میں سنائی تھی۔ جہاں تک عوامی داد کا تعلق ہے، اس مشاعرے کے کامیاب ترین شعراء کیفی اعظمی، پروین شاہدی اور نیاز حیدر رہے تھے۔ اسی مشاعرے کا واقعہ ہے کہ جب مجاز مائک پر آئے تو انہوں نے اپنا کلام سنانے سے پہلے کہا "یہ امن کانفرنس کا مشاعرہ ہے۔ میرے دوست کرشن چندر نے فرمائش کی ہے کہ میں PEACE پر کوئی نظم پڑھوں تو میں اپنا کلام Cut-Piece (کٹ پیس) میں سنا رہا ہوں۔" اور اس کے بعد انہوں نے کچھ متفرق اشعار اور قطعات سنائے۔ اُن میں سے ایک یہ تھا:

نطق رسوا، دہن دریدہ ہے
رندِ برباد کو نصیحت ہے
یہ شنیدہ نہیں ہے، دیدہ ہے
شیخ کی شان میں قصیدہ ہے

اُن دنوں مجاز، شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی سے بہت برہم نظر آتے تھے۔ کچھ ہی دنوں پہلے جوش نے ایک طویل نظم مجاز کی نصیحت میں لکھی تھی، جس میں انہیں ان کی بلانوشی ترک کرنے کی تلقین کی گئی تھی اور کم و بیش انہی دنوں جوش کی ایک نظم شیخ محمد عبداللہ، اس وقت کے وزیر اعظم جموں و کشمیر کی ستائش میں شائع ہوئی تھی۔ مجاز نے اپنا یہ شعر بھی پڑھا تھا:

سینۂ انقلاب چھلنی ہے
شاعرِ انقلاب کیا جانے

اس مشاعرے کا ایک المیہ پہلو یہ ہے کہ جب مجاز نے اپنی معرکہ آرا نظم "اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو۔" پڑھنی شروع کی تو مجمع نے جو انقلابی اور ہنگامہ خیز نظمیں سننے کا مشتاق تھا، بے طرح شور مچایا اور مجاز تین بند پڑھ کر بیٹھ گئے۔ مجھے یاد ہے جب وہ اس مصرعے پر پہنچے تھے:

شہریاروں سے رقابت کا جنوں طاری تھا

تو انہوں نے بطور وضاحت بڑی نفرت، حقارت اور غصے سے کہا تھا:

"Those I.C.S. Beurocrats!"

سردار جعفری، مجروح وغیرہ کے پیہم اصرار کے باوجود مجاز دوبارہ کلام سنانے پر رضامند نہ

ہوئے۔"

"اب کچھ اپنے بارے میں بھی بتایئے جناب!" میں نے ان کا موڈ خوشگوار دیکھا اور پوچھ لیا۔ وہ بتانے لگے۔

"میرا نام مظہر امام ہے اور پیدائش دربھنگہ (بہار) کی ہے۔ تاریخ 5 مارچ 1930ء تھی۔ اردو اور فارسی میں ایم اے کیا اور دونوں یونیورسٹی میں اول رہا۔ پراگیا (ہندی)۔ امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی پروگرام پیشکش اور تیکنیکی امور کی تربیت حاصل کی۔ اکتوبر 1951ء میں روزنامہ "کارواں" میں ملازمت کی۔ جنوری 1952ء سے دسمبر 1958ء تک ایم او ہائی اسکول کلکتہ میں درس و تدریس سے اور دسمبر 1958ء سے نومبر 1975ء تک دوردرشن سے وابستہ رہا پھر بحیثیت ڈائریکٹر دوردرشن سری نگر کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔

میری تصانیف میں زخم تمنا اور رشتہ گونگے سفر کا (شعری مجموعہ) 1974ء پھر آتی جاتی لہریں (تنقیدی مضامین) 1981ء، پچھلے موسم کا پھول (غزلیں) 1988ء، آزاد غزل کا منظر نامہ (تحقیقی اشاریہ) 1988ء، جمیل مظہری (مونوگراف) 1992ء، بند ہوتا ہوا بازار (نظموں کا انتخاب) 1992ء، اکثر یاد آتے ہیں (خاکے) 1993ء، ایک لہر آتی ہوئی (تنقیدی مضامین) 1997ء، پچھلے موسم کا پھول (ہندی) 1999ء، اور مظہر امام کے نام آئے ہوئے 47 مرحوم مشاہیر ادب کے خطوط کا مجموعہ "نصف ملاقات" بھی شائع ہو چکا ہے۔

میرا توجہ طلب کام ہے: ایک نئی صنفِ سخن "آزاد غزل" کی ایجاد۔

مجھے اعزازات ملے ہیں: ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ 1994ء غالب ایوارڈ 1998ء، مغربی بنگال، بہار اردو اکاڈمی سے امتیازی انعامات، کئی بار، کلچرل اکاڈمی جموں و کشمیر کا سب سے بڑا انعام۔ دوبار۔ کریٹک سرکل آف انڈیا ایوارڈ، امتیاز میر ایوارڈ، نجمی اکاڈمی اڑیسہ کا نجمی ایوارڈ۔ مجموعی خدمات پر بہار اردو اکاڈمی کا سب سے بڑا انعام۔ علاوہ اس کے متھلا، رانچی اور بہار یونیورسٹیوں سے میری شخصیت اور فن پر مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ جموں یونیورسٹی اور مگدھ یونی ورسٹی میں تحقیقی مقالے پیش کیے جا چکے ہیں۔ میرے فن و شخصیت پر تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں: 1۔ مظہر امام کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ۔۔۔ ڈاکٹر امام اعظم، 2۔ مظہر امام کی تنقید نگاری۔۔ پروفیسر محمد رضا کاظمی، 3۔ مظہر امام۔ ایک تعارف۔۔۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی۔

میری تخلیقات کے ترجمے انگریزی، روسی اور عربی کے علاوہ ہندی، بنگالی، آسامی، میتھلی، سندھی، گجراتی، مراٹھی، پنجابی، کشمیری، ڈوگری وغیرہ زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ کئی مقتدر ادبی رسالوں مثلاً "شاعر" بمبئی، "لمحے لمحے" بدایوں، "جدید ادب" پاکستان، "شاہکار" الہ آباد، "گلبن" احمد آباد، "تجدید" موتی ہاری، بہار، "چنگاری" دہلی نے میرے کاموں کے حوالے سے خصوصی گوشے شائع کیے۔ "رابطہ" دہلی کا ضخیم "مظہر امام فن اور شخصیت نمبر" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

وہ کہہ رہے تھے "مجھے شاعری کے علاوہ تنقید نگاری اور خاکہ نگاری سے دلچسپی ہے۔ ادبی زندگی کے آغاز میں افسانے بھی لکھے ہیں۔ پہلے ترقی پسند ادبی تحریک سے بہت متاثر تھا۔ کلکتہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی اردو اور ہندی کی مشترکہ انجمن کا چھ سال تک سکریٹری رہا۔ تحریک کے رہنماؤں کی ادعائیت اور سیاسی شدت پسندی کے باعث اس سے انحراف کا مرحلہ آیا۔ جدیدیت کے رجحان کو فروغ دینے میں میرا بھی عملی تعاون رہا ہے لیکن میں ادب کو کسی تحریک یا رجحان کے حصار میں قید کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ ادب کو کھلی فضا میں سانس لینا چاہیے۔

میرا کلام ہندوستان اور پاکستان کے مقتدر ترین اور ممتاز ترین ادبی رسائل میں 50ء سے باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ابتدا "نقوش" لاہور سے ہوئی تھی۔ میں فکشن، شاعری، تنقید، خودنوشت، یادداشتیں، ان سب اصناف اور موضوعات سے متعلق کتابیں دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ سیاسی اور سماجی، تاریخ اور ادبیات عالم کا مطالعہ بھی میری ترجیحات میں شامل ہے۔

اردو دنیا کی بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔ میں اس کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ حالات بہت خوش آئند نہیں ہیں مگر اس زبان میں بذات خود مشکل اور نامساعد حالات سے اپنے آپ کو زندہ اور ثابت و سالم بچالانے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ اردو والے اگر صرف زبانی جمع خرچ سے کام نہ لیں اور تھوڑے سے خلوص سے کام لیں، تو اردو زبان کی تعلیم اور ترویج کی مناسب صورتیں پیدا کی جاسکتی ہیں۔

ہر صنف اظہار خیال کے لیے موزوں ہے۔ یہ فیصلہ تو شاعر کرتا ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کس وقت کس صنف میں کرے۔ شاعر کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کسی ایک یا دو صنف میں محدود ہو جائے۔ کم و بیش چالیس سال سے اردو میں نثری نظم لکھی جارہی ہے اور اب یہ تجربے کے مرحلے سے آگے بڑھ آئی ہے۔ ذاتی طور پر میں نثری نظم کا زیادہ قائل نہیں ہوں، کیوں کہ میرے خیال میں آہنگ اور موزونیت کے بغیر شاعری نہیں ہو سکتی، کم از کم مشرقی مزاج اسے آسانی سے قبول نہیں کر سکتا لیکن اتنے سارے لوگ نثری نظم کہہ رہے ہیں اور خیالات کے اعتبار سے، امیجری کے لحاظ سے بعض نثری نظمیں مجھے بھی اچھی لگتی ہیں۔ نثری غزل کوئی نہیں لکھ رہا ہے۔ بشیر بدر نے کم و بیش پچیس سال پہلے چند ایک نثری غزلیں کہی تھیں، ان کی تقلید ایک دو شاعروں نے انھیں دنوں کی۔ غالباً اردو کی نثری غزلوں کی مجموعی تعداد پندرہ بیس سے زیادہ نہ ہوگی۔ اب نثری غزل کا کوئی وجود نہیں ہے۔ دراصل لوگ آزاد غزل اور نثری غزل کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ آزاد غزل سب سے پہلے میں نے سترہ سال کی عمر میں 1945ء میں کہی تھی، چھپی پہلی بار 1962ء میں۔ 1968ء سے شاعروں نے اس کی طرف توجہ دینی شروع کی۔ کم و بیش تین سو شاعروں نے آزاد غزلیں کہی ہیں جن میں قتیل شفائی، رفعت سروش، زیب غوری، کرشن موہن جیسے معتبر شاعر بھی شامل ہیں۔ ایک آزاد غزل فیض سے بھی منسوب ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ آزاد غزلیں

مسلسل لکھی جا رہی ہیں اور اس کا ذکر ادبی جائزوں میں برابر آتا رہتا ہے۔" میں نے فوراً کہا۔ "مظہر امام صاحب جب آزاد غزل کی بات چلی ہے تو اپنی کوئی ایک "آزاد غزل" سنائیے گا؟"

"یقیناً کیوں نہیں!" پھر انھوں نے لمحے بھر کو سوچا اور یہ غزل عنایت کی۔

آزاد غزل

جن کے دل میں رخشندہ ہیں الہامی آیات
وقت کے بھاری شانوں پر وہ رکھ کر دیکھیں اپنا ہات
بیج نمک کے بونے والے، کھیتی میں مصروف
اب کے جانے کب تک ٹھہرے زخموں کی برسات!
ہم کیا ان کی نذر کریں اب، چہرے پر آنکھیں ہی نہیں
پہلے دے کر خوش ہوتے تھے اشکوں کی سوغات
صبح کا تڑکا ہوتے ہوتے اڑ جاتے تھے لفظوں کے سب رنگ
جاگ کے تجھ کو خط لکھتے تھے آدھی آدھی رات
"آج ہوا سو ہونا تھا (میں اونچے گھر کی بیٹی ہوں!)
دیکھو پھر مت کرنا ایسی ویسی بات!"
کتنا گرم لہو ہے اپنا، دنیا کو بھی دیکھنے دیں
رکھنا ہونٹ پہ ہونٹ اور دینا ہات میں ہات!

غزل اختتام کو پہنچی تو وہ کہنے لگے۔ "آپ نے مشاعروں کے سلسلے میں بھی سوال کیا ہے تو میری رائے میں آج کے دور میں مشاعرے ہرگز اچھی شاعری کی تخلیق میں معاون نہیں ہیں بلکہ مشاعروں کا چسکا اچھے شاعروں کو بھی برباد کر رہا ہے۔ ادبی نشستوں میں اگر پڑھی جانے والی تخلیقات پر تنقید و تبصرہ بھی ہو، تو اچھے نتائج نکل سکتے ہیں۔

کتابوں کی اشاعت اور کتابوں کے مطالعے میں شوق کی کمی کی وجہ صرف الیکٹرانک میڈیا نہیں ہے اس کے لیے ہمارے معاشی اور معاشرتی حالات زیادہ ذمہ دار ہیں۔ سائنس اور انسانی علوم سے رغبت میں اضافہ ہوا ہے یہ اور بات یہ ہے کہ یہ رغبت اکثر زبردستی پیدا کرنی پڑی ہے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے کتابوں کی اہمیت اور کم کر دی ہے لیکن کتابیں ہماری تہذیبِ نفس کے لیے، ہماری اندرونی کتھارسس کے لیے، ہمارے جذبات کی تطہیر کے لیے نہایت ضروری ہیں، اس لیے کتابوں خصوصاً ادبی کتابوں کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی۔ ہمیں کتابوں اور جرائد کے تحفظ اور بقا کے لیے دامے درمے سخنے اپنا بیش از بیش تعاون پیش کرتے رہنا چاہیے۔

میں اسے متفق نہیں ہوں کہ اردو ادب میں تنقید برائے نام رہ گئی ہے بلکہ دکھ یہ ہے کہ

ہمارے یہاں تنقید اتنی زیادہ کیوں لکھی جا رہی ہے۔ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کر رکھی ہے۔ ہمارے یہاں ادب کی تنقید کم کم ہے، البتہ تنقید کی تنقید خوب ہو رہی ہے۔ ادب فہمی سے زیادہ تنقید فہمی پر زور ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ادب کی ترقی کے لیے تنقید ضروری ہے۔ میں تو یہی جانتا ہوں کہ جب ہمارے یہاں تنقید نہیں تھی تو میر، سودا غالب اور مومن پیدا ہوتے تھے۔ اقبال نے "کاشف الحقائق" اور "مقدمہ شعر و شاعری" پڑھ کر شعر کہنا نہیں سیکھا تھا۔ جوش تو خیر بہت پہلے کے ہیں، فیض، راشد، مجاز، جذبی، میراجی اورہ آل احمد سرور، کلیم الدین احمد، احتشام حسین، محمد حسن عسکری وغیرہ کی تنقید نگاری سے پہلے ادب میں اپنی جگہ بنا چکے تھے۔"

Mazhar Imam
176-B, Pocket I,
Mayur Vihar, Phase I
Delhi- 110091 (INDIA)

اشتراک

خیر، اچھا ہوا، تم بھی میرے قبیلے میں آ ہی گئے
اس قبیلے میں کوئی کسی کا نہیں
ایک غم سوا
چہرہ اترا ہوا
بال بکھرے ہوئے
نیند اچٹی ہوئی
خیر، اچھا ہوا، تم بھی میرے قبیلے میں آ ہی گئے
آؤ ہم لوگ جینے کی کوشش کریں!

☆

بے ادب ستاروں نے

بے ادب ستاروں نے
نیند میں مخل ہو کر
تم سے کچھ کہا ہوگا
لیکن ان کی باتوں کا
تم یقین مت کرنا
آؤ آ کے خود دیکھو
مضطرب کہاں ہوں میں

سوت کاتے جا رہی ہے چاند پر بیٹھی ہوئی
آج تک صدیوں پرانی بڑھیا تھک پائی نہیں

یکم فروری 1999ء

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

بھاگل پور بھارت

ڈاکٹر مناظر عاشق نے شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ہائیکو، ماہیے، ترویني، غزل، نظم، نعت اور کہہ مکرنی۔ کہہ مکرنیاں ملاحظہ ہوں :

تن سے لپٹے من سے لپٹے
بانہہ پکڑ کر ہولے ہولے
چومے گورا گال
کا سکھی ساجن!
نا سکھی بالک

میں جو ہنسوں تو وہ مسکائے
میں روؤں تو روتا جائے
تنہائی کا سچا ساتھی
کا سکھی ساجن!

نا سکھی درپن!

ویسے ان کا نام مناظر حسن ہے۔ ادبی نام مناظر عاشق ہرگانوی اور تخلص عاشق۔ یکم جولائی 1948ء کو چترا ضلع ہزاری باغ (بہار ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ وطن ہرگانوری ضلع نالند بہار ہے۔ تعلیم بی اے آنرز ایم۔ اے اردو اور فارسی میں کیا اور پھر پی ایچ ڈی۔

مختلف اصناف پر ان کی تقریباً پچاس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں تنقید و تحقیق کی بیس کتابیں ہیں۔ آٹھ عدد کتابیں بچوں کے لیے ہیں۔ آٹھ عدد منتخب افسانے، منتخب غزلیں اور ہائیکو پر ہیں۔ ایک تذکرہ "اردو کی کہانی شعراء کی زبانی" کے عنوان سے ہے۔ منظوم خطوط کا مجموعہ "حرفِ سخن" کے نام سے ہے۔ ان کی اپنی شاعری کا مجموعہ "کلامِ نرم و نازک" نظموں کا مجموعہ "آنکھوں دیکھی" افسانوں کا مجموعہ "قوس و قزح" ماہیوں کا مجموعہ "رم جھم" طنز و مزاح پر "ادب میں گھوسٹ ازم" اور شکاریات ڈرامے وانٹرویوز علیحدہ ہیں۔ گویا کہ 1970ء سے 1998ء کے عرصے پر محیط یعنی 28 سال میں ڈاکٹر مناظر نے جس تیز رفتاری سے اردو ادب کو جو سرمایہ مہیا کیا ہے وہ بغیر منصوبہ بندی یا وقت کی پابندی اور علم کی قوت کے مفہوم کو سمجھ کر اور اس پر عمل کیے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ انہیں ان کی کارکردگی پر آل انڈیا میر اکیڈمی لکھنؤ کی طرف امتیازِ میر ایوارڈ۔ بھارتیہ ساہتیہ کار سنسار کی طرف سے الطاف حسین حالی ایوارڈ۔ راج بھاشا پریشد، بہار سرکار (بھاگلپور) کی جانب سے ایوارڈ اور ساہتیہ سیوا سنگھ میرٹھ (یوپی) کی طرف سے 'ساہتیہ وشارد' کی اپادھی اور بہار اردو اکاڈمی ایوارڈ دیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر مناظر اردو، ہندی، انگیکا اور انگریزی زبانوں میں لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر مناظر عاشق بھاگل پور سے ایک جریدہ "کوہسار" بھی شائع کرتے ہیں۔ ٹی ایم بھاگلپور یونیورسٹی کے پوسٹ گریجویٹ کے شعبہ اردو سے بھی وابستہ ہیں اور ڈھیروں کتابیں لکھنے اور مرتب کر ڈالتے ہیں۔ گھریلو ذمہ داریوں سے بھی ڈاکٹر مناظر عہدہ برآ ہوتے ہیں اور سماجی کاموں میں بھی حصہ لیتے ہیں پھر یہ اتنا ڈھیر سارا ادبی کام؟ ڈاکٹر مناظر میٹھی مسکراہٹ کے درمیان گویا ہیں کہ "پابندیٔ وقت کی افادیت اسی وقت سمجھ میں آتی ہے جب وقت کی قدر کی جائے جو لوگ ایک وقت میں گھنٹوں لکھتے ہیں اور پھر ہفتوں قلم نہیں اٹھاتے تو ان کے کام میں باقاعدگی نہیں آسکتی اور نہ ہی کام میں تنوع پیدا ہو سکتا ہے۔"

ڈاکٹر مناظر نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ وہ شاعری میں کسی بھی مکتبہ فکر سے متاثر نہیں، دوسرے الفاظ میں ترقی پسندی اور جدیدیت کی لہریں ان کی شاعری میں ملیں گی۔ کچھ ناقدروں نے مابعد جدیدیت تک اس کا سلسلہ ملا دیا ہے۔

ڈاکٹر مناظر کا کلام اردو کے بیشتر رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے ہر طرح کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں لیکن انہیں تنقید اور شاعری کی کتابیں زیادہ مرغوب ہیں۔

اگلے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا۔ "اہم اور دلچسپ واقعات سے زندگی بھری پڑی ہے۔

پیدائش اور شادی کا واقعہ کیا کم دلچسپ ہے؟

ڈاکٹر مناظر کا کہنا ہے کہ "میں اردو کی جادوگری سے متاثر ہوں اور روز افزوں اس کی ترقی دیکھتا رہا ہوں اس لیے مستقبل سے نا امید نہیں ہوں۔ میں شاعری میں غزل، نظم، آزاد غزل، ماہیے، ہائیکو اور کہہ مکرنیوں کو اپنے اظہار کے لیے بہتر اور مناسب سمجھتا ہوں۔ آج نثری نظم کے تجربے عام ہو چکے ہیں اور یہ صنف استحکام پا چکی ہے۔ لیکن نثری غزل کے دو چار تجربے ہی ہوئے ہیں اور ناکام ثابت ہوئے۔ آج کے دور میں مشاعرے ادب کی تخلیق میں معاون نہیں ہیں بلکہ زبان کو مقبولیت بخشنے کا ذریعہ ہیں، ہاں تخلیقی نشستیں ادب کی تخلیق میں معاون ہوتی رہتی ہیں۔"

ان کا کہنا ہے، یہ درست ہے کہ الیکٹرونک میڈیا کی وجہ سے پرنٹ میڈیا متاثر ہوا ہے حالانکہ جرائد اور کتابیں ذی شعور ہونے کی سند ہوتی ہیں۔ کتب اور رسائل صحیح سمت اور رفتار کا تعین ہی نہیں کرتے بلکہ ذہنی و حسی تہذیب و تشکیل اور فن کی بنیادی اقدار کی تلاش اور ترویج و اشاعت کا بار گراں بھی سنبھالے رہتے ہیں لیکن آج کے حالات کے پیش نظر سب سے پہلے بہتر اور بھرپور مواد کی پیش کش ہونی چاہئے۔ نیز محدود ذہنیت اور تنگ نظری کو راہ نہیں دینی ہوگی۔ ساتھ ہی خرید کر پڑھنے کی طرف راغب کرنا ہوگا۔ علاوہ اس کے کتابوں اور رسالوں کی اہمیت پر سیمینار کر کے لوگوں کو متوجہ کرنا ہوگا۔ کتاب میلہ کا انعقاد کرنا ہوگا۔ بجٹ اجازت دے تو انعام کا اعلان کرنا ہوگا۔ اور سب سے بڑھ کر مادری زبان کی بقا کا احساس دلانا ہوگا۔

ڈاکٹر مناظر خود نقاد ہیں کہتے ہیں۔ "آج تنقید برائے نام نہیں رہی ہے بلکہ عینک کا زاویہ بدل گیا ہے، ناقد، تخلیق سے زیادہ تخلیق کار کو دیکھنے لگے ہیں اور تعلقات کو راہ دینے لگے ہیں جبکہ ادبی تنقید کو ادب کے علاوہ اور کسی چیز سے واسطہ نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ ادب سے سنجیدہ اور ناقدانہ دلچسپی محض ادبی نہیں رہتی سماجی انصاف اور تنظیم و کلچر کی صحت کے احساس اور ان میں انہماک سے یہ وابستہ ہو جاتی ہے چونکہ نئے امکانات کے دروازے وا کرتی ہے، کسی فن پارے کی بنت میں اترنے کا راستہ ہموار کرتی ہے۔ یہ ادب کا رفتار پیا ہے اس لیے پرکھ، کسوٹی اور استدلال سے تنقید کو الگ نہیں ہونا چاہئے۔

Dr. MANAZIR ASHIQ
Kohsaar
Barah pura, Bhagalpur Bihar (INDIA)

انتخابِ کلام

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

سمندر کی کہانی جانتا ہوں
بہت پیاسا ہے، پانی جانتا ہوں

محبت، پیار، خوشبو، دوستی، دل
سبھی لفظوں کے معنی جانتا ہوں

وہ چپ رہ کر بھی کیا کیا کچھ کہے گا
میں اس کی بے زبانی جانتا ہوں

مجھے نیلام کردے گی کسی دن
تجھے اے زندگانی جانتا ہوں

بہت نزدیک سے دیکھا ہے تجھ کو
ترے شہروں کی وانی جانتا ہوں

تری گنگا سے واقف ہوں میں عاشق
میں موجوں کی روانی جانتا ہوں

یہ سچ ہے زیست سے بیزار تو ہوئے لیکن
شکستگی میں بھی جینے کا حوصلہ نہ گیا۔

رشید منظر
4/6/99

رشید منظر

مڈایکس۔ برطانیہ

اس میں دورائے ہو ہی نہیں سکتیں کہ شاعری میں شاعر کی ذات مرکزی نقطے کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ شاعر کے ذاتی احساسات، اس کی جذباتی زندگی اور زندگی گزارنے کا انداز اس کے فن پر پڑنا ناگزیر ہے اور یہی وہ سطح ہے جہاں ایک ہی عہد کے شعراء اپنی الگ الگ پہچان کراتے ہیں۔

رشید منظر کی شاعری میں ہجرت کا موضوع ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ ہی برِ صغیر میں ہجرتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے اور پچھلی نصف صدی میں ہر کس و ناکس کو اس سے دوچار ہونا پڑا، گو رشید منظر مظفرپور ہندوستان میں 4 نومبر 1941ء میں پیدا ہوئے۔ ایم اے اور بی ایل تک تعلیم حاصل کی۔ بینکاری اور وکالت کو ذریعۂ روزگار بنایا لیکن 1964ء میں ہندوستان سے انہیں مشرقی پاکستان کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔ پھر ہجرتوں کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد چند سال مغربی پاکستان میں رہے پھر وہاں سے دوسری ہجرت متحدہ عرب امارات کی طرف ہوئی جہاں زندگی کے دس سال گزارنے کے بعد بہ سلسلۂ روزگار 1986ء میں لندن منتقل ہوئے اور مستقل طور پر وہیں مقیم ہیں۔

سیّد رشید حسن جو اب رشید منظر کے نام سے پہچانے جاتے ہیں معروف علمی اور ادبی گھرانے

سے تعلق ہونے کی بنا پر اسکول کے زمانے سے ہی ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ جدامجد نصیر الدین نصیر عظیم آبادی ایک معروف ادبی شخصیت تھے جن کی تالیف "حقیقت شاعری" 1931ء میں اعظم گڑھ سے شائع ہوئی تھی جس کا دیباچہ علامہ سیّد سلیمان ندوی نے لکھا تھا۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن 1987ء میں لندن سے سیّد عاشور کاظمی کی زیرِ نگرانی شائع ہوا۔ حضرت نصیر کی اردو اور فارسی کی شاعری کی طرح جو نہایت وقیع اور دل آفریں ہے، ان کی یہ مثنوی ایک عہد ساز کارنامہ ہے اور اپنے نوع کی واحد کتاب ہے جس میں مختلف زبانوں کی شاعری، ادب اور وصف شاعری کے ساتھ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کے شعراء کا تنقیدی نقطۂ نگاہ سے منظوم جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ حضرت احمد ندیم قاسمی اپنے مضمون "حقیقت شاعری۔۔ ایک منظوم تذکرہ" میں رقم طراز ہیں، "شعراء کے تذکرے تو بہت پڑھے ہیں مگر اب تک منظوم تذکرۂ شعراء نظر سے نہیں گزرا تھا۔ شاعری کے تذکرے کو اشعار میں لکھنا بالکل نیا تجربہ تھا۔ اس تذکرے کے بعض مقامات پر اعلیٰ درجے کی شاعری تخلیق ہوئی تھی۔ شاعری کی ماہیت اور خصوصیات فن کے بارے میں نہایت سچی اور بے ساختہ تنقید پڑھنے کو ملی۔ یہ بہت سنگین نوعیت کا کام تھا مگر نصیر الدین نصیر نے اسے پانی کر ڈالا۔"

اسی علمی اور ادبی پس منظر میں رشید منظر نے شعر کہنا شروع کیا۔ پہلی غزل 'بیسویں صدی' میں شائع ہوئی جس کا مطلع اور مقطع یہ تھا

نہ برے ہم نہ تیری ہی خطا ہے اے دوست
درحقیقت یہ زمانہ ہی برا ہے اے دوست
میرے اشعار میں ہے سوز تغزل منظر
یہ میرے سازِ شکستہ کی صدا ہے اے دوست

شعری مجموعہ 'آئینہ پس آئینہ' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ مضامین کا مجموعہ 'جائزے' کے عنوان سے طباعت کے مرحلے میں ہے۔ اردو کے ایک مخلص خادم کی حیثیت سے اس کے چمن کی آبیاری میں ہمہ وقت مصروف کار رہے۔ خاص طور پر متحدہ عرب امارات میں اردو کی ترویج میں نمایاں حصہ لیا۔ ادبی تقریبات کے انعقاد کے علاوہ متحدہ عرب امارات کے دارالحکومت ابوظہبی میں پہلے عالمی مشاعرے کے قیام میں نمایاں حصہ لیا۔ یہ پہلا بین الاقوامی مشاعرہ ابوظہبی کے نو تعمیر شدہ انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کے خوبصورت ہال میں ہونے والا، ایک انتہائی کامیاب مشاعرہ تھا جس میں برصغیر کے تقریباً تیس شعراء نے شرکت کی تھی۔ سامعین کی کثیر تعداد نے یہ مشاعرہ تمام شب بڑے انہماک سے سنا۔ اس وقت سے عالمی مشاعروں کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ چار دانگ عالم میں اردو کی جو نئی بستیاں آباد ہوئی ہیں اس میں اس حوالے سے متحدہ عرب امارات کا نام بہت نمایاں ہے۔ اردو کے لیے کی جانے والی ان گراں قدر خدمات کے اعتراف کے طور پر

انھیں Life time achievement award کی شیلڈ پیش کی گئی اور ابو ظہبی سے لندن منتقل ہونے کے موقع پر خلوص اور محبت کے اظہار کے لیے اعزاز کے طور پر ایک عالمی مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔

لندن کے قیام کے دوران اردو زبان اور رسم الخط کے فروغ کے لیے موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے روزنامہ 'جنگ' اور ہفت روزہ 'راوی' میں گرانقدر مضامین لکھے اور عملی طور پر سرگرم رہے۔ خاص طور پر جس کے نتیجہ میں لندن کی مقامی لائبریریوں میں اردو کتابوں کی طلب پر کام کا آغاز ہو سکا۔

رشید منظر اردو کی بقاء کے لیے جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ ان دنوں انہوں نے 'اردو' کے لیے چند تجاویز پیش کرتے ہوئے یہ سرکلر جاری کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

مکرمی! سلام و نیاز

اکیسویں صدی کی آمد اردو کے لیے اپنے دامن میں نئے امکانات کے ساتھ ساتھ کچھ خدشات بھی رکھتی ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ یہ برصغیر میں بولی جانے والی تمام زبانوں میں سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اس کے بولنے اور سمجھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل چکے ہیں۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں اس کے مراکز قائم ہو چکے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد میں اضافے کے قوی امکانات موجود ہیں لیکن اس زبان میں تخلیق ہونے والے ادب کو سخت خطرہ لاحق ہے جس کی وجہ نئی نسل کی اردو رسم الخط سے بیگانگی ہے۔ اب ہمارے گھروں میں اردو صرف بولی جاتی ہے۔ اس میں لکھنے اور پڑھنے کا سلسلہ ختم ہوتا جارہا ہے۔ اس کی جگہ انگریزی نے لے لی ہے۔

ای میل (e-mail) کی ایجاد نے اردو میں خط و کتابت کے سلسلہ کو اور بھی کم کر دیا ہے۔ مشاہدہ میں یہ بات ضرور آئی ہے کہ ای میل کے ذریعہ اردو کا خط اب رومن میں لکھ کر بھیجا جانے لگا ہے۔ نئی صدی ای میل اور انٹرنیٹ کی صدی ہوگی اور ای میل کے مزید عام ہونے کے ساتھ یہ تحریک زور پکڑتی جائے گی۔ جدید دور کے ان تقاضوں کے پیشِ نظر کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم نئی نسل کو اردو لکھنے اور پڑھنے کے لیے عربی رسم خط کے ساتھ ساتھ رومن میں ایک متبادل رسم خط بھی مہیا کر دیں تاکہ اس زبان میں ہونے والی تخلیقات کے پڑھنے اور لکھنے والوں کا سلسلہ جاری رہ سکے۔

سہ ماہی "نئی صدی" کا اجراء ان ہی باتوں کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہے تاکہ تمام تخلیقات ایک ساتھ دونوں رسم خط میں پیش کی جاسکیں اور اس کی ترسیل نئی نسل تک ہو سکے۔ اس کا پہلا شمارہ نئے سال کے اوائل میں پیش کرنے کی پوری کوشش کی جارہی ہے۔ کوئی بھی کوشش اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب اس میں لوگوں کا تعاون شامل ہو۔ اسی خیال کے پیش نظر یہ خط آپ کی خدمت میں بھیجا جارہا ہے۔

اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ ہمیں جلد از جلد اپنے مشوروں سے نوازیے۔ (اس تعارف کے آخر میں دیے گئے پتے پر آپ رشید منظر کو اپنی رائے لکھ سکتے ہیں۔ س م)

رشید منظر کہہ رہے تھے "میں شاعری کی آفاقیت پر یقین رکھتا ہوں اور وہی کہنا چاہتا ہوں جو اپنے اندر معیار رکھتا ہو۔ میرا شعر ہے ؂

حرمت لفظ کو ہر طرح بچائے رکھا
جو نہ معیار پہ اُترا، نہیں لکھا میں نے

3۔ شاعری اور ادبی مضامین کی کتابیں میری دلچسپی کا مرکز ہیں لیکن عہد حاضر کو روشنی عطا کرنے والی دیگر کتابوں کا مطالعہ بھی خاصی دلچسپی سے کرتا ہوں۔

5۔ اردو کے مستقبل سے میں قطعاً مایوس نہیں۔ جہاں تک اردو بولنے والوں کا تعلق ہے، اس کی تعداد میں وسعت کے قوی امکانات موجود ہیں لیکن پاکستان سے باہر اردو لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ نئی نسل اردو سے صرف بولنے کی حد تک واقف ہے۔ سہ ماہی "نئی صدی" کا اجراء اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس حوالے سے ایک خط آپ کی خدمت میں بھی ارسال ہے۔ آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

6۔ اردو شاعری میں غزل کی اہمیت مسلم ہے اور اس سے انکار کفرانِ نعمت ہے۔ جہاں تک نظموں کا تعلق ہے اس کی ہیئت تسلسل کے ساتھ اظہارِ خیال کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ نثری نظم اور نثری غزل کا تجربہ اردو شاعری کے مزاج سے متصادم ہے۔ ابھی اسے شرف قبولیت حاصل کرنے میں وقت لگے گا۔ مشاعرے ہماری ادبی روایت کا حصہ ہیں اور اردو کی مقبولیت کا ایک احسن ذریعہ، لیکن اچھے ادب کی تخلیق اور فروغ کے لیے خصوصی نشستیں بہتر کردار ادا کر سکتی ہیں۔

7۔ الیکٹرونک میڈیا کی یلغار سے دنیا کی تمام زبانیں متاثر ہو رہی ہیں۔ اہل اردو کا حال کچھ اور جدا ہے، اس کی وجہ نئی نسل کی رسم خط سے بے گانگی بھی ہے۔ ہمارے یہاں، عام طور پر اردو سے زیادہ انگریزی کی کتابیں پڑھی جاتی ہیں اور ان پر مصارف بھی زیادہ ہوتے ہیں، اس کے بعد جو بچ جاتا ہے وہ اردو کے حصہ میں آتا ہے۔ اردو سے ہماری محبت اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم اردو جرائد اور کتابوں پر بھی پیسہ صرف کریں اور اسے نئی نسل سے قریب کریں۔ اس کی کوشش بھی ضرور ہونی چاہئے کہ اردو کتابوں کی قیمت عام آدمیوں کی پہنچ تک ہو۔

8۔ ادب کی ترقی کے لیے صحت مند تنقید از حد ضروری ہے جسے عصبیت اور عناد دونوں سے پاک ہونا چاہئے۔ ہمارے یہاں مطالعہ کی کمی اور سہل انگاری دونوں اچھی تنقید کی راہ میں حائل ہیں۔

Rasheed Manzar
174-Whittington way Pinner, Middx HA5 5JY (JK)

انتخابِ کلام

رشید منظر

شکست خوردہ ہیں لیکن اسیر شوق ہیں ہم
ہوئی کہاں ہے ابھی حوصلے کی لو مدھم

تمام عمر ہی مانوس حادثوں سے رہے
ذرا سکوں جو ملا آنکھ ہوگئی پُرنم

سمندروں سے گیا بن کے بھاپ تا بہ فلک
وہیں پھر آ کے گرا اور ہوگیا مدغم

ادا نہ ان سے ہوا حق بھی ترجمانی کا
وہ بات سادہ تھی لیکن بنا دیا مبہم

زباں پہ حرف حقیقت کا میرے کیا آیا
مزاج اہلِ جہاں مجھ سے ہوگیا برہم

ہے وقت شام، سحر کا ہے انتظار طویل
ابھی سے ہونے لگی لو چراغ کی مدھم

زمیں جب تک نہ اپنا حصہ ادا کرے گی
گلاب کھلتے نہیں ہوا کی سفارشوں سے
حکیم منظور ۱۳/۱/۹۹

حکیم منظور

سری نگر کشمیر

حکیم منظور کی یہ رباعی ملاحظہ ہو:

ہر آنکھ پہ حسرت کا سماں کھولے گی
اک آن میں اسرارِ جہاں کھولے گی
سب لوگ تکلم کی ادا بھولیں گے
اک دن یہ زمیں اپنی زباں کھولے گی

حکیم منظور کا لہجہ منفرد نہ ہو مگر انداز بیاں پُر تاثیر ہے۔ اشعار اپنی کیفیت کے آئینہ دار ہیں۔ اب تک ان کے سات شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔ 1۔ ناتمام (1977ء)، 2۔ لہو لمس خبار (1982ء)، 3۔ برف رتوں کی آگ (1988ء)، 4۔ خوشبو کا نام نیا (1992ء)، 5۔ پھول شفق آنگن کے (1993ء)، 6۔ شعر آسمان (1996ء)، 7۔ صبح، شفق، تلاوت 1998ء)

ان کا کلام ہندوستان کے تمام صفِ اول کے جرائد میں شائع ہوتا ہے جیسے تحریک، آج کل، عصری آگہی، شیرازہ، کتاب، ایوانِ اردو، شاعر، سوغات، نفی واثبات، نطق، حیات، اعظمش وغیرہ۔

حکیم محمد منظور 17 جنوری 1937ء کو سری نگر شہر کے محلّہ آخون صاحب میں پیدا ہوئے۔ بی۔اے آنرز تک تعلیم حاصل کی۔ ڈپٹی کمشنر، کلکٹر، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، اور ڈسٹرکٹ ڈولپمنٹ کمشنر کے عہدوں پر خدمات انجام دے کر ریٹائر ہوئے ہیں۔

ان کے والد جناب الحاج حکیم علی محمد (مرحوم) وادیٔ کشمیر کے ایک مشہور اور کامیاب طبیب تھے۔ ان کے دادا اور پردادا بھی اپنے وقت کے مشہور اطباء تھے۔ سارا خاندان اسی پیشہ سے منسلک تھا۔ جناب محمد دین فوق نے ان کے خاندان کو "حکیم خاندان نوہٹہ" کے عنوان کے تحت تاریخ اقوام کشمیر میں جگہ دی ہے۔ حکیم خاندان نوہٹہ میں سب سے پہلے حکیم منظور کے دو بڑے بھائیوں اور پھر انہوں نے سرکاری ملازمت اختیار کی۔

منظور تنقیدی اور مذہبی مضامین لکھتے ہیں۔ پچھلے تین چار سال سے "صحافت" کا شغل بھی اختیار کیا ہے اور ہفت روزہ "خبر و نظر" کے ایڈیٹر پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر ہیں۔ شاعری کو کیفیت کا معاملہ سمجھتے ہیں اور صرف خالص شاعری کے مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسے جدید، قدیم اور ترقی پسندی کے خانوں میں بانٹنا انہیں پسند نہیں۔ شاعری سے ان کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ دفتری مصروفیات کے دوران بھی شعر کی آمد ہوئی تو شعر نوٹ کرلیا۔ دفتری اور گھریلو ذمہ داریاں بھی پوری کیں اور شاعری کے تقاضے بھی پورے کرتے رہے۔

حکیم منظور اردو کے مستقبل سے کوئی زیادہ پر امید نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "اردو زبان پر چند پیران تسمہ پا جو سوار ہیں اگر وہ اس کی گردن سے اترنے پر راضی ہوئے اور دوسری طرف اردو زبان کی روزی روٹی کھانے والے نصاب سے الگ اس زبان کی بے لوث خدمت کرنے کی حامی بھریں تو شاید یہ زبان فروغ پائے گی اور زندہ رہے گی ورنہ تو اس کا موجودہ منظر نامہ بے حد مایوس کن ہے۔"

شاعری کی صنفِ سخن پر گفتگو ہوئی تو فرمایا "غزل اور پابند نظم مجھے بے حد پسند ہیں۔ نثری نظم اور نثری یا آزاد غزل محض تماشہ والی بات ہے۔ کسی نثری ٹکڑے کو غزل کی طرح لکھنے یا پڑھنے سے وہ غزل تھوڑے ہی بن سکتا ہے۔ یہی حال نظم کا بھی ہے۔ اگر کوئی نظم یا غزل لکھنے پر قادر نہیں اور نہ ذوق رکھتا ہے نہ صلاحیت، اس کے لیے کیا ضروری ہے کہ وہ انہی دو اصناف کی روایتوں کو مسخ کر کے تختہ مشق بنائے۔ وہ شوق سے نثر لکھیں، کیا حرج ہے۔ ہمارے جیسے اہل سخن کے ذوق کو تو تاراج نہ کریں۔ اُن کا عجزِ طبیعت یا عدم دلچسپی، ہمارا آپ کا بوجھ کیوں بنے؟

دورِ حاضر میں مشاعرے اردو ادب کی کیا خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس سوال کے جواب میں ان کا کہنا ہے کہ "مشاعرے ہماری شاعری کے معیار کو مسمار کر رہے ہیں۔ ہر چھوٹا بڑا مشاعرے باز شاعر اب قارئین کو نہیں بلکہ چھوٹی سے چھوٹی سطح کے سامع کو نظر میں رکھ کر شعر کہتا ہے تاکہ 'واہ واہ' کی آوازوں سے مسرور ہو۔ شعری و ادبی نشستیں بلاشک شعر و ادب کو فروغ دینے کا بہترین وسیلہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ یہ میرے ذاتی تجربے کی بات ہے کیوں کہ مجھے شعر کہنے

لی تحریک و تشویق جموں کی 'بزمِ فروغ اردو' کی ہفتہ وار شعری نشستوں میں ملی۔ میں اس بزم کے ساتھ سولہ برس تک وابستہ رہا۔ میرے کئی اور معروف ہم عصر قلم کار بھی اسی بزم کے پروردہ ہیں۔"

کیا ریڈیو اور ٹی وی کتابوں کی مقبولیت پر اثرانداز ہوئے ہیں؟ اس ضمن میں ان کا کہنا ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں میں جب تک معیاری ادب پڑھنے کا ذوق و شوق پیدا نہ ہو، رسائل اور کتابوں کے حوالے سے موجودہ منظر نامہ بدل جانے کی امید موہوم ہے۔ اس سمت میں سنجیدہ کوشش کرنے کی ضرورت ہے جن کا آغاز اسکولوں کی سطح سے ہو سکتا ہے۔ جہاں لائبریری سے (نصاب سے الگ) کتابوں کے استفادہ پر ہر طالب علم کو کچھ مخصوص نمبر دیے جائیں جو اُس کی ڈویژن پر اثرانداز ہو سکیں۔ یہی طالب علم ہمارے آئندہ کے قاری بنیں گے اور الیکٹرانک میڈیا کے باوجود کتابیں اور جرائد پڑھے جائیں گے۔"

تنقید کے سلسلے میں فرماتے ہیں۔ "اردو میں تنقید 'صوبہ جاتی' اور 'محلّہ جاتی' ہوتی جا رہی ہے۔ یہ ایک منصوبے کے تحت کیا جا رہا ہے تا کہ اردو کا حقیقی قلم کار اردو سے ہی الگ ہو جائے۔ اس زبان کو مارنے کا یہ آسان طریقہ ہے۔ تنقید اور پذیرائی ذاتی، دوستانہ، افسرانہ، رشتہ دارانہ اور مسلکی اعتبار سے فروغ پا رہی ہے۔ یہ رویہ زبان اور تنقید دونوں کی ترویج میں مزاحم ہے۔ اس کے خلاف منظم آواز اُٹھنی ہی چاہئے۔

اگر میرا سچ تلخ ہے تو اس تلخ نوائی کے لیے معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ حقیقت بہر حال یہی ہے اور ہمیں اسے کھلے دل سے تسلیم کرنا چاہئے۔"

آخر میں ایک اہم بات کہ حکیم منظور کا کشمیری زبان میں پہلا شعری مجموعہ اور ساتھ ہی نظموں کا مجموعہ طباعت کے مراحل طے کر رہا ہے۔

HAKEEM MANZOOR
10- PARTAP PARK,
(PRESS ENDANE)
SRINAGAR - 190001 (KASHMIR) INDIA

انتخاب کلام

حکیم منظور احمد

رباعیات

قطرہ ہوں تو ارزاں ہو روانی مجھ پر
کھل جائے سمندر کی کہانی مجھ پر
اشرح لی صدری کی دعا ہے مولا
منکشف ہوں خود میرے معانی مجھ پر

بازیچۂ اطفال نہیں ہے دنیا
اک حال ہے بے حال نہیں ہے دنیا
جینا اسے آسان، پرکھنا مشکل
تقویم مہ و سال نہیں ہے دنیا

اک آب سمندر ہے مگر پیاس ہی پیاس
اور اس پہ کڑے کوس سفر، پیاس ہی پیاس
اس ابر سے رشتہ نہ بنا ہے میرا
ہر رنگ مری، چشم خبر پیاس ہی پیاس

آئینہ ہوں سوچو مجھے میں خوش ہو جاؤں
خوشبو ہوں تو سونگھو مجھے میں خوش ہو جاؤں
دیکھو ہی نہیں صرف مجھے اے منظور
ایک رنگ سا سوچو مجھے میں خوش ہو جاؤں

بے لطف ہوا، برگ کی پیاسی رُبا
ہر پھول پہ لکھی ہے اداسی رُبا
اور اس پہ قیامت کہ مصور ہوں
بخشی ہے مجھے رنگ شناسی، رُبا

ہر زاویۂ تصویر تراوش دنیا
اک تازہ تڑپ اک نئی تابش دنیا
کاغذ میں حرارت وہ، کہ پیکر بولے
اُس آنکھ کی خوشبوؤں کو گردش دنیا

ہر آنکھ پہ حسرت کا سماں کھولے گی
اک آن میں اسرارِ جہاں کھولے گی
سب لوگ تکلم کی ادا بھولیں گے
اک دن یہ زمیں اپنی زباں کھولے گی

گھر سے دفتر سارا قصہ اتنا
مجھ پر سکڑا ہے ہر رستا اتنا
بولوں، لگتا ہے جیسے میں چپ ہوں
میں اپنے اندر بھی تنہا اتنا

ہر عہد میں بھی یہ آشفتہ حال لوگوں کو
علاجِ تیرگیِ دوراں تلاش کرنا ہے
منیر حیدر
۲۲ دسمبر ۹۹ء

منیر حیدر

کویت

ماہنامہ "شاعر بمبئی" کے شمارہ مارچ 98ء میں جناب منیر حیدر مقیم کویت کی غزل نظر سے گزری اور پسند آئی تو میں نے انہیں سخن ور چہارم کا سوالنامہ بھجوایا۔ منیر نے بڑے سلیقے سے جواب لکھا ہے۔ بعض جگہ منیر کی رائے سے مجھے اتفاق نہیں لیکن انہیں اظہار کا حق ہے چنانچہ ان کا لکھا قطع و برید کے بغیر شائع کیا جا رہا ہے:

محترمہ سلطانہ مہر صاحبہ

السلام علیکم

دو دن قبل آپ کا خط موصول ہوا۔ یاد آوری کے لیے شکریہ۔ اس سال کے اوائل میں لاہور سے جناب باقی احمد پوری کی مرتبہ کتاب "بین الاقوامی اردو شاعری" منظر عام پر آئی۔ جس میں پچاس سے زائد اردو شعراء و شاعرات کا کلام موجود ہے۔ چونکہ باقی صاحب میرے اچھے دوستوں میں سے اور کویت میں ہی مقیم ہیں چنانچہ دوستوں کی محفل میں جب بھی باقی صاحب کی کتاب پر بات ہوئی ساتھ ہی آپ کا ذکر بھی ہوا کیونکہ اس میدان میں آپ کا کام باقی سے پرانا اور زیادہ ہے۔ اس لیے بارہا آپ کے کام کو سراہا گیا۔

خط میں کوشش کروں گا کہ اپنے مختصر تعارف کے ساتھ ساتھ آپ کے سوالنامے کے جوابات بھی لکھوں۔ سوالات کے جواب تو یقیناً تفصیل طلب ہیں تاہم مختصر جواب لکھنے کی کوشش کروں گا کیونکہ آپ نے جلد جواب بھیجنے کی تاکید کی ہے۔

میرا پورا نام راجہ منیر حیدر ہے۔ منیر تخلص کرتا ہوں۔ پیدائش 22 مارچ 66ء کو پاکستان کے خوبصورت شہر ایبٹ آباد میں ہوئی۔ میٹرک تک تعلیم ایبٹ آباد کے مختلف اسکولوں سے حاصل کی۔ بعد میں گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں داخلہ لے لیا۔ انٹر اور بی اے کے بعد یہاں ہی ایم اے کرنے کی خاطر اردو ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ لے لیا اور 91ء میں پشاور یونیورسٹی سے ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کی۔ دوران تعلیم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیتا رہا۔ کالج میگزین کا ایڈیٹر بھی رہا اور اس دوران اخبار میں کالم بھی لکھتا رہا۔

ایم اے کے بعد ایبٹ آباد کالج آف کامرس میں بطور اردو لیکچرر، پڑھانا شروع کیا۔ جنوری 94ء میں کویت آ گیا۔ یہاں آکر حسبِ منشا روزگار تو نہ مل سکا۔ تاہم چھوٹی موٹی نوکریاں مختلف کمپنیوں میں کرتا رہا۔ Gulf کے حالات خاصے ابتر رہے ہیں اور ان کے اثرات سے ہم جیسے لوگ بھی شدید متاثر ہوئے ہیں۔ بس یہاں رہنے کا ایک فائدہ ہوا کہ گزشتہ پانچ سالوں میں مجھے پانچ بار دیارِ رسول اور خانۂ خدا دیکھنے کی توفیق ہوئی۔

شاعری کا ذوق تو بچپن سے تھا۔ تاہم شعر کہنے اس وقت شروع کیے جب میں میٹرک میں پڑھتا تھا۔ میرے والد جناب حیدر زمان حیدر ہندکو زبان کے شاعر ادیب، نقاد اور محقق ہیں۔ ہندکو گڑھ ہزارہ میں انہیں بابائے ہندکو کہا جاتا ہے۔ ان کی بدولت بچپن سے ہی ادبی ماحول میسر رہا۔ بذاتِ خود میں اردو کے علاوہ ہندکو زبان میں بھی شاعری کرتا ہوں۔ ایبٹ آباد کالج میں تعلیم کے دوران جو ادبی ماحول میسر آیا اس نے میری شعری صلاحیتوں کو خاصا مہمیز کیا۔ اسی زمانہ میں بزم اہل سخن ہزارہ، حلقۂ اربابِ ذوق، ہندکو ادبی جرگہ، ہندکو ادبی سنگت وغیرہ کے مشاعروں میں شرکت رہا کرتی تھی۔ ان دنوں ایبٹ آباد کی علمی اور ادبی فضا خاصا خوشگوار تھی، نیاز سواتی مرحوم بزم اہلِ سخن کے جنرل سیکرٹری ہوا کرتے تھے۔ ہر ہفتے باقاعدگی سے مشاعرہ منعقد کرواتے تھے۔ شعرا کے ساتھ ساتھ سامعین بھی اچھی خاصی تعداد میں شریک ہوتے تھے۔

ابتداء میں میرا رجحان غزل کی طرف زیادہ تھا۔ البتہ بعد میں نظمیں بھی کہنا شروع کیں۔ ایم اے میں تعلیم کے دوران ایک مثنوی "زخمِ بہار" کے عنوان سے لکھی۔ دوستوں میں اسے خاصی پذیرائی ملی۔ تاہم کبھی اسے شائع نہیں کرائی۔ 1990ء کی عراق کویت جنگ اور پھر عراق، امریکہ جنگ پر میں نے ایک طویل نظم "خلیج کی جنگ" ہندکو

زبان میں لکھی۔ سنجیدہ شاعری کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی مزاحیہ شعر بھی کہتا ہوں۔ شاعر کے علاوہ ادب کی کسی دوسری صنف سے میری باقاعدہ تو وابستگی نہیں، البتہ کبھی موقع ملے تو تنقیدی مضامین لکھتا رہتا ہوں اور چند ایک ادھورے افسانے بھی لکھے۔
میری شاعری کس مکتبۂ فکر سے متاثر ہے؟ اس کا فیصلہ تو دوسرے نقاد ہی کر سکتے ہیں۔ معروف نقاد منیر فراز نے میری کتاب "دشمن آسماں اپنا" کی اشاعت کے بعد ایک مضمون میں بالواسطہ طور پر مجھے ترقی پسندوں کے قریب کرنے کی کوشش کی تھی۔ تاہم ذاتی طور پر میری رائے یہ ہے کہ میں کسی مخصوص گروہ سے متاثر نہیں ہوں۔ مطالعہ کی حد تک تو میں قدیم وجدید سبھی کو پڑھتا ہوں۔ البتہ شعراء میں چند ہستیاں ایسی ہیں جنھوں نے مجھے متاثر ضرور کیا، ان میں غالب، اقبال، حفیظ، فیض مجید امجد اور فراز شامل ہیں۔
میر اکلام پاکستان و ہندوستان کے اہم جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ سفیر اردو لندن میں بھی کلام شائع ہوا ہے۔ طبیعت میں کچھ سستی بھی ہے کہ خود اپنا کلام کم ہی جریدوں کو بھیجتا ہوں۔ دو تین شاعر دوستوں نے یہ ذمہ داری اپنے سر لے رکھی ہے۔ وہ مجھ سے کلام لے لیتے ہیں اور پھر کبھی وزیر آغا صاحب کبھی سجاد سرور صاحب اور حسام حُر صاحب کو بھیج دیتے ہیں۔
میرا پہلا شعری مجموعہ "دشمن آسماں اپنا" کے عنوان سے الحمد پبلشر نے لاہور سے 95ء میں شائع کیا۔ 190 صفحات کا یہ مجموعہ نظموں اور غزلیات پر مشتمل ہے۔ خاطر غزنوی، نور پرکار اور مصطفیٰ بیگ کی آرا بھی اس کتاب میں موجود ہیں۔ ایک اور اردو مجموعہ "فصلِ فریب" کا مسودہ تیار کر رہا ہوں۔ 1996ء میں پشاور سے پاکستان ہندکو ادبی بورڈ نے اپنی کوشش اور خرچ پر میرا ہندکو مجموعہ "سوچاں تے جگراتے" شائع کیا تھا۔ مختار علی پنڑ اور جناب ش شوکت کے کے تاثرات کتاب میں شامل ہیں جبکہ ایک اور ہندکو مجموعہ کی تیاری بھی کر رہا ہوں۔
اچھی کتاب جو بھی ملے پڑھتا رہتا ہوں، دلچسپی مجھے البتہ ادب اور نفسیات سے ہے۔ قرآن مجید اور دیوان غالب میری پسندیدہ کتابیں ہیں۔
اردو زبان کے متعلق میرے جو خدشات ہیں شاید یہ صفحات اس کے متحمل نہ ہو سکیں مختصراً یہ کہوں گا کہ ہمیں اس سلسلے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔ اردو سے وابستہ لوگ جس طرح اس کا مستقبل دیکھنے کے متمنی ہیں نتیجہ شاید اس کے برعکس ہو۔ دنیا میں ہمیشہ ترقی یافتہ اقوام کی زبانیں اور تہذیبیں ترقی کیا کرتی ہیں۔ پسماندہ اور محکوم قوموں کی پسماندگی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ عموماً وہ اپنی تہذیب اور زبان کے بجائے دوسرے کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی بڑی مثال

پاکستان وہندوستان جہاں اردو کی کسمپرسی کے متعلق آپ بھی جانتی ہیں۔
شاعری میں ہر وہ صنف اظہارِ خیال کے لیے بہتر ہے جس میں تخلیق کار اپنے خیالات کا بطریق احسن اظہار کر سکے۔ غزل کی تنگنائی کا اظہار غالب نے بھی کیا ہے۔ حالی اور اقبال نے اپنے خیالات وافکار کا اظہار نظم میں بہتر طریقے سے کیا۔ تاہم کسی بھی دور میں غزل کی مقبولیت میں کمی نہیں آتی۔ آج بھی اظہارِ خیال کے لیے غزل ہی اہم صنف ہے اس لیے میں غزل کو بہتر سمجھتا ہوں۔
(ب) نثری نظم اور نثری غزل کے بے شک تجربے ہو رہے ہیں لیکن فی الحال یہ تجربات نامکمل ہیں۔ ممکن ہے میری رائے سے آپ اتفاق نہ کریں۔ بہر حال میرے خیال میں تو نظم الگ اور نثر الگ چیز ہے۔ اس لحاظ سے تو نثری غزل اور نثری نظم کی تراکیب سرے سے غلط ہیں۔ بھلا نظم نثر کیسے ہو سکتی ہے اور نثر نظم کیسے ہو سکتی ہے۔ ہاں البتہ ایسی خوبصورت نثر لکھی جا سکتی ہے جس پر نظم کا گمان ہو۔ جیسے محمد حسین آزاد کا اسلوب ان کے متعلق یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے نثر میں شاعری کی۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے نظم نہیں لکھی کہ ہم اسے شاعری کہہ سکیں۔ شاعری کو پرکھنے کے لیے مخصوص کسوٹی ہے اور جب کوئی تخلیق اس کسوٹی پر پورا اترے تو وہ نظم کہلائے گی۔ اب بھلا ایسی نظم کے پیچھے تو کوئی "نثری" کا سابقہ نہیں لگا سکتا۔ ہاں البتہ آزاد نظم کا اپنا ایک مقام ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ نثری نظمیں اور غزلیں کہنے والے زیادہ دیر زندہ رہ سکیں گے۔ ان لوگوں کو تو برداشت کیا جا سکتا ہے جو غزل اور نظم بھی کہیں جو صرف نثری شاعری کی بنا پر خود کو شاعر کہیں انہیں نہیں مانا جا سکتا۔
ماضی میں شاعروں نے ادب کی تخلیق و ترویج میں خاصا اہم کردار ادا کیا ہے۔ حال کی بات ذرا مختلف ہے۔ اب ماضی کی طرح باذوق سامعین تو نہیں رہے۔ اس لیے تجربے میں یہی آیا ہے کہ شعرا سامعین کی ذہنی سطح کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مشاعروں میں سطحی قسم کا کلام سناتے ہیں۔ یہ ادب کی کوئی اعلیٰ خدمت نہیں تاہم شاعر داد لینے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ کویت کی حد تک تو ہم نے اس کی مزاحمت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ جس شعر میں کوئی اعلیٰ فکر پیش ہو سامعین کے سر کے اوپر سے گزر جاتا ہے اور بازاری قسم کے اشعار پر واہ واہ ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں معیاری ادب کی تخلیق ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ بہتر اور اچھا ادب تخلیقی نشستوں سے نہیں بلکہ بڑے تجربات سے عالم وجود میں آتا ہے۔ ہاں البتہ ایسی نشستوں میں بیٹھنے سے ذہن اور فکر کو جلا ضرور مل سکتی ہے جس سے ادب کی تخلیق میں تھوڑی بہت مدد ضرور مل سکتی ہے۔
الیکٹرونک میڈیا میں جس قدر کشش ہے پرنٹ میڈیا واقعی اس کا مقابلہ نہیں

کر سکتا۔ یہ ایک بڑا المیہ ہے۔ میرے خیال میں یہ مسئلہ بہت گھمبیر صورت اختیار کر چکا ہے۔ میری تجویز ہے کہ بین الاقوامی سطح پر تمام بڑی زبانوں کے اہلِ قلم کی ایک کانفرنس منعقد ہونی چاہیے۔ امریکہ کی سوسائٹی اس سلسلے میں بہتر خدمات سرانجام دے سکتی ہے۔ اقوام متحدہ کا تعلیم کا شعبہ بھی اس سلسلہ میں مدد مہیا کر سکتا ہے چونکہ یہ مسئلہ اردو کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کو بھی درپیش ہے۔ کانفرنس کے ذریعہ مختلف اور اعلیٰ تجاویز سامنے آسکتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک عالمگیر تحریک برپا کرنے کی ضرورت ہے جس کے ذریعے لوگوں میں احساس کو بیدار کیا جائے اور کتاب سے محبت کا درس دیا جائے اور اس سلسلے میں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا سے تشہیر کی جائے۔ الیکٹرونک میڈیا کے فوائد گنوانے کی بجائے اس کے نقصانات کو اجاگر کیا جائے۔ ہمیں کتابوں اور جرائد کی بقا کے لیے لانگ ٹرم منصوبہ بندی کرنا ہوگی۔ میری تجویز کے متعلق آپ اپنے احباب اور متعلقہ اداروں سے بات کریں۔ اگر ایسی کوئی کانفرنس منعقد ہو جاتی ہے تو ممکن ہے اس سے بہتر نتائج بھی برآمد ہوں اور بہ صورت زبان و ادب کی ایک بڑی خدمت پر منتج ہوگی۔

یہ تو ایک حقیقت ہے کہ ادب کی ترقی کے لیے تنقید بے حد ضروری ہے۔ نقاد کی مثال تو باغ کے مالی کی سی ہے جس باغ کا مالی ست ہو یا سرے سے موجود ہی نہ ہو تو وہ باغ باغ نہیں رہتا بلکہ جنگل بن جاتا ہے۔ ادب میں دو کام خاصے مشکل ہیں۔ ایک تحقیق اور دوسرا تنقید۔ آج کل کے نقاد ہمعصر شعرا اور ادیبوں کی تخلیقات کے متعلق سچ لکھنے سے کتراتے ہیں۔ شاید ایک دوسرے کا لحاظ کرتے ہیں یا پھر شاعروں اور ادیبوں میں سچ سننے کا مادہ نہیں۔ مجبوراً نقاد نے چپ سادھ لی۔ اردو ادب کے بڑے بڑے نام کبھی جو نئی کتابوں پر آرا لکھتے ہیں تو شدید ادبی بددیانتی کا مظاہرہ کرتے ہیں ممکن ہے انہیں لکھنے والوں کی حوصلہ شکنی کے بجائے حوصلہ افزائی مقصود ہو۔ بہر حال بات جو بھی ہو یہ ادب کے لیے مضر ہے۔ ممکن ہے آپ اتفاق نہ کریں مگر حقیقت یہ ہے کہ پروین شاکر، امجد اسلام امجد اور اس قبیل کے کچھ اور لوگوں کو ان کے قد سے بڑھ کر شہرت ہمارے مڈیا نے دی ہے۔ یہ لوگ قسمت کے دھنی ہیں گرنہ ان کی تخلیقات اس قابل نہیں ہیں۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ اگر آپ کی ان لوگوں سے کسی طرح کی وابستگی ہو تو اسے محض ہماری ذاتی رائے کہہ دیجئے گا۔"

Munir Hyder
P.O.Box 26135
Safat 13122 Kuwait (A.G)

انتخابِ کلام

منیر حیدر

انتا جان کر ڈالنا ناؤ دریا آخر دریا ہے
پتھر، لکڑی، تیز بہاؤ دریا آخر دریا ہے

کودنا سطحِ بھنور پر ایسا بچوں کا کچھ کھیل نہیں
وحشی لہریں، جان بچاؤ دریا آخر دریا ہے

اس برسات کے موسم میں یوں شام کے وقت کنارے پر
سوچ سمجھ کر ڈال پڑاؤ، دریا آخر دریا ہے

دھندلا چاند، سکوت ہے مانا، پار اترنا مشکل ہے
تم سمجھو کچھ پیچ نہ داؤ دریا آخر دریا ہے

دھیرے دھیرے موجیں گہرے ساگر میں نہ گم کردیں
تنہا تنہا بیچ نہ جاؤ دریا آخر دریا ہے

گھومتے پھرتے سنگریزوں سے نہ کوئی رشتہ جوڑو تم
جلتی آگ کا ایک الاؤ دریا آخر دریا ہے

ٹھنڈک ہے، تسکین ہے لیکن جانے کب سیلاب آئے!
اپنا سب اسباب اُٹھاؤ دریا آخر دریا ہے

ہمارے دور کا انصاف ہے یہی تو منیرؔ
قصور سب نے کیے تو مجھے سزا بھی ملی "

منیرؔ

۹ر فروری ۸۹ء

ڈاکٹر منیر الزماں منیرؔ

ایڈیسن امریکا

"ڈاکٹر منیر کچھ اپنے بارے میں فرمایئے گا؟" ہم نے ان سے پوچھا تھا۔ پھر انہوں نے بڑے دھیرج کیا کہا۔ ان کی زبانی سنیے۔

محمد منیر الزماں نام اور منیر تخلص ہے۔ ادبی حلقوں میں ڈاکٹر منیر الزماں منیرؔ کے نام سے یہ خاکسار جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ تعلیمی صداقت ناموں کے لحاظ سے تاریخ پیدائش 22 جون 1946ء ہے اور اسی تاریخ سے حیدر آبادی ہوں۔ والد محترم محمد غوث، محکمہ پولیس میں مہتمم پولیس کے جلیل القدر عہدے سے وظیفہ پر سبکدوش ہو کر 1963ء میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔"

شاعری کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟ ہمارا دوسرا سوال تھا فرمایا:

"نو عمری یعنی 1960ء ہی سے راقم الحروف کو قوالیاں سننے کا بیحد شوق رہا چاہے وہ 'اعراس' کے مواقع پر اسٹیج پر آراستہ کی گئی ہوں کہ فلمی نغموں کی شکل میں ہوں۔ اسی سن کی بات ہے کہ ایک نجی محفل میں حیدر آباد کے ایک گوشہ نشین غزل گو سے فانیؔ مرحوم کی غزل جو انتہائی درد بھری اور اثر انگیز ترنم میں پیش کر رہا تھا، سننے کے بعد مزاج میں ایک انقلاب آیا اور طبیعت شعر گوئی کی جانب مائل ہو گئی۔ فانیؔ مرحوم کی غزل کا مطلع تھا

"موت کی رسم نہ تھی ان کی ادا سے پہلے
زندگی درد بناتی تھی دوا سے پہلے"

فانیؔ کی پوری غزل کو سامنے رکھ کر متعدد مرتبہ بغور مطالعہ کے بعد راقم نے اپنی پہلی غزل مکمل کی جس کا مطلع تھا:

"زندگی خواب پریشاں تھی سحر سے پہلے
ایک الجھا ہوا نغمہ تھی اثر سے پہلے"

اُسی غزل سے ردیف اور قافیے کی پہچان ہوئی اور وزن (بحر) کا بھی اندازہ ہوا۔ رفتہ رفتہ "قواعد العروض" کے ساتھ ساتھ اور بھی عروض پر مبنی کئی کتابیں مطالعہ میں آئیں۔ اس کے بعد ذوقِ شعر گوئی میں اس قدر اضافہ ہوا کہ ہر دن ایک غزل مکمل کرنا فرض اولین سمجھا جانے لگا۔

سکریٹریٹ اردو ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام جولائی 1976ء میں منعقدہ ایک معیاری مشاعرے میں پہلی بار کلام سنانے کا موقع ملا۔ مئی 1976ء میں آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد اور ستمبر 1978ء میں ٹی وی پر پہلی بار کلام سنانے کا موقع ملا جس کا سلسلہ 5 جون 1997ء یعنی امریکہ کو روانگی تک برقرار رہا۔ اس ہیچمداں کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ دوردرشن کیندر حیدر آباد سے ٹی وی پر اردو پروگرام کا آغاز بھی 5 ستمبر 1978ء کو اسی کلام سے ہوا۔

15 فروری 1974ء کو اس ناچیز کا سکریٹریٹ میں بحیثیت L.D.C تقرر عمل میں آیا، مئی 1975ء میں رکن کے ایک کہنہ مشق اور گوشہ نشین شاعر، استاذالاساتذہ علامہ حضرت ابوزاہد سید یحییٰ حسین قدر عریضی کے ذکرۂ تلامزہ میں شامل ہو گیا۔"

"کچھ اپنی تعلیم کے بارے میں بتائیے گا؟"

"اکتوبر 1965ء میں ایچ۔ ایس۔ سی نومبر 1973ء میں پی، یو سی۔ مئی 1980ء میں۔ بی اے اور اکتوبر 1983ء میں ایم۔ اے اوّل نمبر سے کامیاب کرنے کے بعد اپنے شفیق استاد حضرتِ قدر پر مقالہ لکھ کر اگست 1986ء میں جامعہ عثمانیہ سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی اور پھر اسی جامعہ سے "بیسویں صدی میں ارو شعری رجحانات" پر ایک جامع اور مبسوط مقالہ لکھ کر نومبر 1990ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

امریکہ کو مستقل منتقلی تک حیدر آباد اور اضلاع کے کئی ایک معیاری ادبی اداروں سے وابستہ رہا۔ کئی برس، سکریٹریٹ اردو ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اپنے فرائض بڑی ہی خوش اسلوبی سے انجام دیتا رہا۔"

"شاعری کے علاوہ دیگر مشاغل؟"

"شاعری کے علاوہ مجھے افسانہ نویسی سے بھی خاطر خواہ دلچسپی رہی جس کا سلسلہ بہت ہی قلیل عرصہ تک جاری رہا۔ چونکہ مزاج نوعمری ہی سے رومانی رہا ہے اسی لیے شاعری کا آغاز بھی کلاسیکی

شاعری سے ہوا چونکہ استاد محترم بھی کلاسیکی رجحان کے حامل تھے اسی لیے کلاسیکی شاعری اور پھر غزل ہی کی جانب مزاج کا میلان رہا۔ رفتہ رفتہ ترقی پسند شاعری کی جانب زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ میں نہ صرف حیدر آباد سے بلکہ دوسری ریاستوں اور اضلاع کے کئی ایک معیاری کل ہند اور عالمی مشاعروں میں شریک رہا اور اپنے کلام سے عوام کا دل جیتتا رہا اسی طرح ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کے بے شمار اردو ادبی روزناموں، ہفتہ وار، پندرہ روزہ، ماہناموں، ششماہی اور سالناموں کے علاوہ مخصوص جریدوں اور سوونیئرس اور خصوصی شماروں میں 1973ء سے پابندی سے کلام شائع ہوتا رہا ہے۔

نومبر 1985ء میں میرا پہلا شعری مجموعہ "شفق رنگ" کے نام سے منظرِ عام پر آیا جس کی نہ صرف حیدر آباد، ہندوستان بلکہ بیرونِ ہندوستان کے ادبی حلقوں میں اس قدر پزیرائی ہوئی کہ دوسرے ہی سال طبع شدہ پانچ سو نسخے خواہش مند اور قدر شناس احباب کی شخصی لائبریریوں کی زینت بن گئے۔ اس ناچیز کا دوسرا شعری مجموعہ "جرم تمنا" انشاء اللہ بہت جلد منظرِ عام پر آجائے گا۔ اس کے علاوہ ایم۔ فل اور پی ایچ ڈی کے مقالہ جات بھی طبع شدنی ہیں۔"

"کیا آپ اردو زبان کے مستقبل سے پُر امید ہیں؟"

"یہ سچ ہے کہ اردو، دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ لیکن اس زبان کا مستقبل جہاں تابناک ہے وہیں اس کے معدوم ہو جانے کا بھی قوی امکان ہے۔ جب تک اردو بولنے، سمجھنے، لکھنے اور پڑھنے والے اس خطہ اُرض پر آباد ہیں تب تک اردو زبان زندہ و پائندہ رہے گی بر خلاف اس کے خود اردو کو اپنی مادری زبان کہنے والے اور اردو کے شیدائی اس زبان کو اگر ہندی زبان کہنے لگیں جیسا کہ سیاستدان اور غیر اُردوداں کہہ رہے ہیں تو کوئی عجب نہیں کہ اردو زبان ہندی زبان میں تبدیل ہو جائے۔

اس زبان کو زندہ رکھنے والوں میں جتنا حصہ شعر اور ادبا کا ہے اتنا ہی حصہ اردو فلموں اور فلمی نغمے گانے والوں کے ساتھ ساتھ غزل گو اور قوالوں کا بھی ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں اردو فلمیں دکھائی اور دیکھی جائیں گی اور فلمی نغمے گونجتے رہیں گے وہاں وہاں اردو زبان زندہ رہے گی۔ اس زبان میں جو مٹھاس، کیف پروری اور اثر انگیزی کے ساتھ ساتھ انسانوں کے دلوں کو مسخر کرنے کی جو صلاحیت ہے دنیا کی کسی دوسری زبان میں یہ طاقت نہیں ہے افسوس تو اس بات کا ہے کہ خود اردو داں احباب، خالص اردو فلموں اور اردو نغموں کو غیر اردو داں حضرات کی طرح، ہندی زبان سے موسوم کر رہے ہیں جس سے انہیں احتیاط کرنی چاہیے۔"

ڈاکٹر منیر کہتے ہیں "اپنے مکمل خیال کی مکمل اور مسلسل انداز میں جامہ زیبی کے لیے پابند نظم (معریٰ وغیر معریٰ) ہی بہتر صنف شاعری ہے۔ ویسے آج کل غزلیہ شاعری کا دامن بھی بہت کشادہ کر دیا گیا ہے۔ ہر قسم کے خیالات واحساسات کے اظہار کے لیے آج کل شعراء غزل ہی کا

سہارا لے رہے ہیں۔

نثری نظم بھی آج کل جدید شعرا کی پسندیدہ صنف بن گئی ہے جس پر راقم نے اپنے پی ایچ۔ڈی کے مقالہ میں تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اسلاف نے شاعری کی دو اصناف بتلائی ہیں۔

ایک نظم اور دوسری نثر۔ اس تیسری صنف "نثری نظم" کے جس کا ازل سے اردو زبان میں کوئی وجود نہیں ہے ہم پابند شعرا قائل ہیں نہ اس کے طرفدار۔ البتہ پابند نظم کے مصرعہ کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے آزاد نظم میں تبدیل کیا جاسکتا ہے لیکن نثری نظم ایک بے معنی صنف ہے "آزاد غزل" کی طرح۔

نثری نظم کا رجحان ہماری اردو شاعری میں تیزی سے ابھر رہا ہے۔ یہ صنفِ شاعری فارسی زبان میں ایک عرصہ قبل سے مستعمل ہے۔ اس صنفِ شاعری کے ابتدائی نمونے ایران کے شعراء ہمایوں شیخ اور احمد شاملو کے پاس ملتے ہیں۔ غیر پابند اس شاعری میں وارداتِ قلبی کہیں نہیں ملتی بلکہ پرانی قدروں کی شکست و ریخت پر نئی دیواریں کھڑی کی جارہی ہیں۔

اب رہی مشاعروں کی بات تو آج کل مشاعرے جس قدر ادبی تخلیق میں معاون ثابت ہورہے ہیں اسی قدر تخلیق نشستیں بھی ممد و معاون ثابت ہورہی ہیں۔ دونوں کا کردار اپنی اپنی جگہ معقول ہے۔ اس کے باوجود بھی افضلیت کا تاج تو مشاعروں ہی کے سر جاتا ہے۔ اج کل اردو شاعری اس موڑ پر نظر آرہی ہے کہ جس کی کوئی ایک سمت متعین ہو نہ کوئی مرکز۔ غنائی شاعری سے فرار اور گریز کا یہ رجحان آج کل عام نظر آرہا ہے۔

MUNEER -UZ- ZAMAN MUNEER
515 W.STEVENS DR., AM:G02
ADDISON- ILLINOIS - 60101-U.S.A

اِنتخابِ کلام

منیرالزماں منیرؔ

خامشی گفتار سے کہتی ہے کچھ تو بول پھر
تلخئ دوراں بھلا کر دل کا در اب کھول پھر

حادثے منزل کی لمبائی گھٹا سکتے نہیں
جائزہ لے عزم کا اک بار خود کو تول پھر

لے گیا سیلاب اب کے لہلہاتے کھیت بھی
بک گئیں فصلیں اُجالوں میں سبھی بے مول پھر

ان دنوں سنجیدہ چہروں کا بھی پڑھنا ہو محال
پیار، خوشبو کی فضائیں ہو گئیں انمول پھر

گاؤں کی گوری کا چہرہ آج بھی آنکھوں میں ہے
کیوں پھروں شہروں میں لے کر دید کا کشکول پھر

کٹ گئی صحرا نوردی میں تری عمر عزیز
شہر کا ماحول کیوں کر راس آئے بول پھر

کس قدر قیمت گری ہے زندگانی کی منیرؔ
ہو گیا ہے شہر خوشبو میں سکول انمول پھر

بعد مرنے کے ناز ہو جس پہ
ناز اُس سے زندگی کی بات کرو

شوکت علی ناز

۱۲/ ۷/ ۱۹۹۹

شوکت علی ناز

دوحہ قطر

شوکت علی ناز کے فنی سفر کی عمر گو زیادہ نہیں لیکن ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق ان کے اشعار ان کے ہی نہیں بلکہ ایک پڑھے لکھے عام انسان کے احساسات کے بھی ترجمان ہیں۔ ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

کہیں پہچان اپنی کھو نہ بیٹھوں
مجھے میرے ہی چہرے سے نکالو

تمہارا دوست وہ گرچہ نہیں ہے
اُسے دشمن کے زنغے سے نکالو

شوکت علی کا نام ان کے والد محترم احمد دین کا تجویز کردہ ہے اور جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ نام کے اثرات زندگی پر مرتب ہوتے ہی ہوتے ہیں چنانچہ شوکت علی نے بھی اپنی زندگی میں ہر منزل بڑی شان و شوکت سے طے کرنا شروع کر دی۔

31 مارچ 1954ء کو لاہور کے ایک متوسط گھرانے میں انہوں نے جنم لیا۔ ۱۹۷۲ء میں میٹرک کے امتحان میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ ان کے والد کی خواہش تھی کہ بیٹا تعلیمی افق پر چاند سورج کی مانند جگمگائے چنانچہ بیٹے نے باپ کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے ریلوے روڈ لاہور کے پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ کے شعبہ میکنیکل انجینئرنگ میں داخلہ لیا۔ مگر طبیعت خطاطی، مصوری اور رنگوں کی ایک نئی دنیا بسانے کی جانب مائل تھی۔ لہٰذا اس شعبہ کو شوق اور حصولِ رزق کا ذریعہ بنالیا۔ ایسٹرن نیون سائن لاہور میں کمرشیل آرٹسٹ کے طور پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۷۶ء میں قطر آئے اور قطر نیون لائٹ کمپنی سے منسلک ہوئے۔ تاحال اسی میں فورمین کے عہدے پر کام کررہے ہیں۔ طبیعت کی رنگارنگی انہیں ادب کے چمن زار میں لے آئی اب شوکت لفظوں کی مصوری کے ساتھ اشعار پینٹ کرنے لگے۔ صلاحیت، رجحان، شوق اور مطالعہ پشت پناہ ہو تو شخصیت پوری سج دھج کے ساتھ نکھر کر سامنے آتی ہے۔ قطر کی قدیم ترین ادبی تنظیم "بزم اردو قطر" سے وابستہ ہوئے۔ امجد علی سرور جیسے کہنہ مشق شاعر کی انہیں سرپرستی حاصل ہوئی اور یوں فن کی منزلیں طے کرنے کی دیوانگی فرزانگی کا پیکر اختیار کرگئی۔

ایک دبدبہ اور گونج رکھنے والی ریڈیائی آواز میں جب انہوں نے پہلی غزل پڑھی تو سامعین اور ناظرین کے دلوں اور آنکھوں میں بس گئے۔

آوازِ پس آواز کا شاعر 'جیسے خوشبو ہوا کے ساتھ' والی مثال تھی۔ یوں پورے اعتماد کے ساتھ ناز نے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ تنظیم ارباب قلم کے جوائنٹ سیکرٹری۔ ادارہ خیال وفن کے جنرل سیکرٹری اور "بزم اردو قطر" کے سیکرٹری نشرواشاعت کے عہدے سنبھالے۔ ان کا کلام ہندوپاک کے مشاہیر اردو جریدوں میں شائع ہوتا ہے۔

شوکت علی ناز کو کسی دوست کے ذریعے نثر نگاروں کا سوالنامہ موصول ہوا تھا چنانچہ ان کا تعارف انہی سوالات کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیں۔

3- فکشن بے شک ایک لطیف آرٹ ہے، جدیدیت نے اس آرٹ کی طاقت کو اور اس کے حسن کو نکھارا اور سنوارا ہے مجروح کرنے والی کوئی بات نہیں۔

4- چونکہ یہ مشینی دور ہے، ہر شخص وقت کے معاملے میں کفایت شعار ہے اب نہ تو کسی کے پاس اتنا وقت ہے کہ ناول لکھے اور نہ ہی قاری کے پاس اتنا اضافی وقت ہے کہ وہ ناول کا مطالعہ کرے بلکہ اب تو طویل افسانے بھی کم پسند کیے جاتے ہیں۔

5- نہ صرف ادیب بلکہ تمام اہلِ قلم کے لیے سب سے بڑا اور اہم مسئلہ معاشی بحران کا ہے۔ اگر انہیں مالی طور پر معقول وظائف یا اخراجات کی کفالت دی جائے تو پھر خالص ذہن اور یکسوئی سے اپنے مشاہدات کے مطابق سماج کے تمام مسائل پر قلم اٹھا سکیں گے۔

6- معیاری ادب کے لیے فصیح زبان کا استعمال اور خیال وافکار میں اعلیٰ اقدار و نظریت کا

تخلیقات میں زیادہ سے زیادہ لطیف انداز میں پیش کرنا ہمعیاری ادب کا اصل پیمانہ ہے۔

7-چونکہ بیرونِ ممالک شاعری کا میدان اس لیے بھی وسیع ہے کہ شاعری کے ماحول اور مشاعروں کا اہتمام زیادہ سے زیادہ ہوتا ہے، ساتھ ہی عالمی ومقامی مشاعرے تحریکِ شاعری کا سبب بھی ہیں جبکہ سیمینارز اور افسانوں کی محفلیں بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔

الحمدللہ اردو روز بروز ترقی کی منزل کی طرف گامزن ہے۔ فارسی اور عربی اردو کا اثاثہ ہیں۔ اردو کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنے مزاج کے مطابق قابلِ قبول الفاظ کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اور اپنی حلاوت اور شیرینی سے اُنھیں معیاری بنا دیتی ہے۔ اس میں انگریزی کے بھی بے شمار الفاظ ہیں جیسے اسٹیشن، مارکیٹ، اسکول وغیرہ وغیرہ۔ یہ محض خام خیالی ہے یا کچھ لوگوں کی آرا ہو سکتی ہے کہ انگریزی زبان دنیا کی تمام زبانوں سے افضل اور بہتر ہے ورنہ عربی اور فارسی ہر زمانے میں فصیح و بلیغ سمجھی جاتی رہی ہیں۔ اور آج بھی اردو انہیں کی وجہ سے خوبصورت زبان سمجھی جاتی ہے۔

میری زندگی کے اہم واقعات میں سے ایک یہ ہے کہ بہت ہی چھوٹی عمر میں اپنے بڑے بھائی صاحب اور ان کے دوستوں کے ہمراہ نہر پر نہانے جایا کرتا تھا۔ ایک بار میں اپنے بڑے بھائی کے دوست کا بازو پکڑ کر نہر میں ڈبکیاں لگا رہا تھا اچانک خیال آیا کہ میں ان کا ہاتھ چھوڑ کر بھی نہا سکتا ہوں بس ہاتھ چھوڑا اور غرق ہونے لگا۔ یہ ان صاحب کی تیراکی میں مہارت تھی جو انہوں نے فوراً ڈبکی لگائی اور مجھے ہاتھوں پر اُٹھا کر نہر سے باہر پھینکا اور خوب پٹائی ہوئی۔ اس کے بعد سے اب تک پانی سے اتنا خوف آتا ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ کسی پل سے آنے پر پانی کا شور بھی ڈرا دیتا ہے۔

اردو ادب میں تنقید کا کام جتنا اب ہو رہا ہے شاید کسی زمانے میں ہوا ہو۔ ہر سال کوئی نہ کوئی تنقیدی کتاب منظرِ عام پر آتی رہتی ہے بلکہ نقدو نظر کے طور پر مسلسل تقریباً ہر معیاری رسالہ میں کم و بیش تنقیدی مضمون ہوتا ہے بلکہ وہ تنظیم معیاری نہیں سمجھی جاتی، جس میں تنقیدی نشست نہ ہو۔ جہاں تک علمی و نظریاتی ترقی کا مسئلہ ہے تو کچھ مفاد پرست تنگ نظر، کوتاہ فکر اشخاص کی وجہ سے کچھ نہ کچھ رکاوٹیں ضرور ہیں لیکن کلی طور پر اردو زبان کسی عزم، کسی علاقہ کسی مذہب کی محتاج نہیں۔ یہ ہر علاقے ہر ملک ہر مذہب اور ہر عزم میں پسند کی جا رہی ہے اور روز بروز ترقی کی طرف گامزن ہے۔ اسے کسی قسم کے خطرات و نقصانات کا خدشہ نہیں۔ یہ وہ سیلاب ہے جسے اب کوئی بند روک نہیں سکتا۔"

SHAUKAT ALI NAZ
P.O.BOX NO: 714
DOHA QATAR

انتخابِ کلام

شوکت علی ناز

چاند کی، چاندنی کی بات کرو
صاحبو! روشنی کی بات کرو

ذہن کو زنگ لگ نہ جائے کہیں
فکر اور آگہی کی بات کرو

دشمنی شہرِ دل جلاتی ہے
دوستو! دوستی کی بات کرو

نفرتوں کے بُھلا کے گیت سبھی
پیار کی راگنی کی بات کرو

راس آتی نہیں ہے غم کی فضا
ساز چھیڑو، خوشی کی بات کرو

قتل و غارت گری کی دنیا میں
امن اور آشتی کی بات کرو

زندگی تو سبھی کو پیاری ہے
موت سے دلبری کی بات کرو

بعد مرنے کے ناز ہو جس پر
نازؔ! اس زندگی کی بات کرو

ناصرؔ تری اُلفت کا یقیں ہو بھی تو کیونکر
ہر رنگِ محبت سے ترا رنگ جُدا ہے

صلاح الدین ناصر

صلاح الدین ناصر

نیویارک

کبھی ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ سانس لو تو رگِ جاں کٹتی محسوس ہو اور یہاں تو روز سانس نہیں سانسیں لینا پڑتی ہیں۔ ایسے ہی عالم میں نیویارک جانا ہوا۔ تین خوش خیال لوگوں کی محبتیں وہاں میری منتظر تھیں۔ یہ تھے مسرور جاوید، خالد عرفان اور رئیس وارثی جنہوں نے سخن ور دوم اور سوم کے حوالے سے وہاں محفل سجانے کا اہتمام کیا تھا۔ بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں ان میں ایک لیئق مراد آبادی بھی تھے جن کی بزرگانہ شفقت نے جینے کا حوصلہ دیا۔ قمر علی عباسی اور نیلو فر عباسی سے ملاقات ہوئی تو عباسی صاحب کی گفتگو نے اتنا ہنسایا کہ ساری کاربن ڈائی آکسائڈ غائب ہو گئی۔ وہ اپنی گفتگو سے پھولوں کی مہک پھیلاتے ہیں۔ انہی دنوں کسی محفل میں محترم صلاح الدین ناصر سے ملاقات ہوئی اور میں نے پہلی بار انہیں سنا۔ مجھے ان کے چہرے پر وہ طمانیت نظر آئی جو بہت کم چہروں پر دکھائی دیتی ہے۔ اس طمانیت کے پیچھے ایک کیفیت تھی جس سے میں واقف ہونا چاہتی تھی۔ ایک قدر مشترک بھی تھی جس کے تقدس نے مجھے ان سے گفتگو کرنے کا حوصلہ دیا۔ میں شرمندہ تھی کہ سخن ور کا سوالنامہ انہیں اب تک نہیں ملا تھا۔ کسی نے مجھے ان کا پتہ ہی نہیں دیا مگر اس "قدرِ مشترک" نے ملایا۔ وہ قدر مشترک 1989ء کے حضورؐ حاضری تھی۔ گو ہم وہاں یکجا

نہیں ہوئے مگر اس تقدس میں برابر کے حصے دار تھے انہوں نے "طوافِ کعبہ" پر اشعار کہے۔

اک طوافِ کعبہ سے کیا کچھ ملا، کتنا ملا
گنجینۂ دنیا و دیں، سرمایۂ عقبیٰ ملا

کہنے کو انہوں نے بظاہر صرف یہ اشعار کہے ہیں مگر انہوں نے اس کے معانی کو اپنی "کملی" بنا لی ہے۔ ناصر صاحب کسی سے توقعات وابستہ نہیں کرتے اور جس کی مدد کر سکتے ہیں بغیر کسی جزا کی خواہش کے کر دیتے ہیں کیونکہ ان کا یقین ہے کہ مسبب الاسباب تو خدا کی ذات ہے۔ ہم تو محض اس کے ذرائع ہیں۔ اس یقینِ کامل نے ان کی زندگی میں قدم قدم پر رہنمائی کی اور مشکلات آسان تر ہوتی چلی گئیں۔ اپنی زندگی کے دو واقعات بیان کرتے ہوئے ناصر صاحب کہتے ہیں۔

"پہاڑ گنج، دہلی میں ہمارے رشتے کے تایا جان رہتے تھے۔ ہم انبالہ چھاؤنی میں رہتے تھے اور میں بنارسی داس ہائی اسکول میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ مجھے دہلی، پہاڑ گنج میں تایا جان کے ہاں جانا پڑا۔ وہاں مجھے ایک انتہائی ذاتی مسئلہ درپیش ہوا جس کا ذکر میں نے اپنے دوست اور ہونے والے بہنوئی سے بھی نہیں کیا۔ عین دوپہر کے وقت، ان کے مکان کی چھت پر گیا۔ چھت دھوپ سے تپ رہی تھی۔ میں بیٹھ گیا اور اللہ تعالیٰ سے لو لگائی۔ اس پریشانی سے نجات حاصل کرنے کی گڑگڑا کر دعا کی۔ بہت انفعالی کیفیت رہی اور ایسا محسوس ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے میری دعا سُن لی۔ آپ یقین کیجیے کہ اس پریشانی سے نجات ملنا قطعی آسان نہ تھا۔ ٹھوس تدابیر کے علاوہ کافی وقت درکار تھا۔ مگر میری وہ پریشانی ایک آدھ دن میں دُور ہو گئی۔ کوئی اسباب ظاہری نہ تھے۔ محض خداوندِ قدس کی رحمت تھی جو میرے لیے اس پریشانی سے نجات کا باعث بنی۔ اس وقت سے خداوند کریم کی وحدانیت، قادریت اور حاکمیت پر مکمل ایمان ہے۔

دوسرا واقعہ اس وقت کا ہے جب جنرل ہیڈ کوارٹرز، وزارتِ دفاع، راولپنڈی میں ملازم تھا۔ وہاں سے 1967ء میں میرا انتخاب Cento کے لیے ہو گیا۔ یقین نہ آتا تھا کہ میں 35 امیدواروں میں سے "Junior most" ہونے کے باوجود چنا جا سکتا تھا۔ ویسے بھی میری مالی حالت خراب تھی۔ بال بچے تھے۔ مکان سر چھپانے کے لیے بنایا تھا مگر نامکمل تھا تنخواہ چار یا پانچ تاریخ کو ختم ہو جاتی تھی۔ باہر جانے کے لیے کپڑے بھی نہ تھے۔ بہر حال انقرہ پہنچ کر یقین آیا کہ خداوندِ کریم مہربان ہو گیا ہے۔ انقرہ پہنچنے سے پہلے کیا ہوا حج کا ارادہ اور مضبوط ہو گیا۔ لٰہذا میں اور میری بیوی 1969ء میں حج کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ مالی حالت خراب ہونے کی وجہ سے یہ چاہیے تھا کہ میں ایک ایک پیسہ دانت کے نیچے دبا کر رکھتا مگر ایسا نہ کیا۔ حج کے علاوہ بچوں کے ساتھ "ترکی" کی خوب سیر کی اور واپسی پر بھی بچوں سمیت عمرہ کرتے ہوئے واپس پاکستان آئے۔ اس کی وجہ صرف میرا یہ کامل ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اب دیا ہے تو آئندہ بھی دے گا لٰہذا اس کی راہ میں خرچ کرنے کو بہت اہمیت دیتا ہوں اور خدا کا شکر ہے کہ کبھی مالی پریشانی نہیں ہوئی اور اپنی تمام ذمہ داریاں پوری

کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد اور رحمت شاملِ حال رہی۔ (قرآنِ کریم کی ایک آیت ہے "و ممارزقنٰھم ینفقون" (اور جو کچھ ان کو ہم نے دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں)

ان کی شخصیت کا احاطہ کرتے ہوئے مامون ایمن جو شمالی امریکہ میں اردو سرگرمیوں کے بانی، ممتاز شاعر و نقاد اور درس و تدریس کے شعبے سے تین دہائیوں سے وابستہ ہیں اور میرے بڑے بھائی بھی ہیں فرماتے ہیں۔

"زندگی اور بندگی کے درمیان ایک قریبی رشتہ ہے۔ یہ رشتہ، عبد کے لیے ایک ناگزیر حیثیت رکھتا ہے کہ یہ تعارفِ معبود کا منبع تعریف کا مخزن اور عرفان کا معدن ہے۔ تعارف، تعریف اور عرفان یکجا ہوتے ہیں تو اعتراف و احترام سے تقدس کا سراپا اُبھرتا ہے۔ یوں زندگی اور بندگی کے درمیان موجود قریبی رشتہ، رشتہ تقدس کا نام پاتا ہے۔ تقدس نام ہے نورِ بنیادِ کائنات کے اُس دریا کا، جو ازل اور ابد کی پابندیوں اور شرائط سے آزاد اور مبرا ہے۔ اس دنیا کے عام دریاؤں کی طرح، اُس دریا کے بھی دو کنارے ہیں لیکن اُن کی ہیئت نہ مشترک ہے اور نہ ہمسر کہ ایک کنارہ معبود ہے اور سرا کنارہ عبد۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ عبد، معبود کی جانب لپکتا رہتا ہے اور معبود، عبد کی جانب۔ اس لپک کا مقصد ہے وصل۔ رہِ مقصد پر سفر کے اصول بھی ہیں اور آداب بھی اور ترجیحات بھی ہیں، فوقیات بھی صلاح الدین ناصر ان اصولوں، آداب، ترجیحات اور فوقیات کو دل سے مانتا ہے کہ وہ ان کی اہمیت سے آگاہ ہے۔ ناصر کا یہ شعوری عمل اُسے رشتۂ تقدس نباہنے والے عبد کا درجہ دیتا ہے، وہ عبد جو افکار، احساسات، خیالات، نظریات، تجربات اور مشاہدات کو اشعار کے سانچے میں ڈھالنے کے ہنر پر دسترس رکھتا ہے۔ لہٰذا، وہ دُنیائے ادب میں رشتۂ تقدس نباہنے والے شاعر کی حیثیت سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔

رشتوں کا تقدس بھی حسین خواب تھا گویا
ناصرؔ کو خداوند نے دنیا میں دکھایا

اس شعر میں، لفظ "خواب" کسی خواب کی نہیں، ایک حقیقت کی دلالت کرتا ہے، وہ حقیقت جو مناظر اور تغیرات سے سے جاگنے والی آنکھ کو بھی اور سونے والی آنکھ کو بھی اپنے وجود کا ہر وقت احساس دلاتی رہتی ہے۔ یہی احساس ناصر کی شاعرانہ کاوشات کی اساس ہے۔ یہ اساس، اس کی زندگی کے لائحہ عمل کا بنیادی عنصر ہے۔ یہ عنصر اُس کی زبان میں بھی نمایاں ہے اور بیان میں بھی۔

صلاح الدین ناصر 28 اپریل 1929ء کو بستی پٹھاناں (سابقہ ریاست پٹیالہ ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سہارن پور اور انبالہ چھاؤنی میں حاصل کی۔ اکتوبر 1947ء میں والدین کے ہمراہ پاکستان ہجرت کی۔ جون 48ء میں میٹرک کیا اور 63ء میں گارڈن کالج راولپنڈی سے ایم۔ اے کیا۔ جنرل ہیڈ کوارٹرز راولپنڈی اور وزارتِ امور خارجہ اسلام آباد سے وابستگی رہی۔ اسی سلسلے میں کئی ممالک جانا ہوا۔ دوبار 1969ء اور 1989ء میں حج کی سعادت بھی حاصل کی۔ ایک صاحبزادی اور

تین صاحبزادے، نواسے اور پوتے پوتیوں سے ان کی پھلواری آباد ہے۔

1996ء میں حمد و نعت کا پہلا مجموعہ عقیدت کے پھول اور غزلوں کا مجموعہ "دل کے گنبد میں" شائع ہوئے ہیں۔ نعتیہ مشاعرے منعقد کرتے ہیں چنانچہ 97ء، 98ء اور 99 کے مشاعروں کی نعتوں کا مجموعہ گنبدِ خضریٰ کے نام سے مرتب کیا جسے اپنے ادارہ تبلیغ الاسلام (رجسٹرڈ) کے زیرِ اہتمام شائع کیا ہے۔

ناصر کہتے ہیں۔ "میری غزلیں میرے جذبات و احساسات کی ترجمان ہیں۔ میرے مشاہدات اور تجربات کا نچوڑ ہیں، محبت خلوص اور دوستی کی علم بردار ہیں، ہمت عزم اور ثابت قدمی کا درس ہیں اور میری مختلف کیفیات اور واردات کا موثر مظاہرہ ہیں۔ میری نعتیں میرے مذہبی رجحانات کی عکاس ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب پیغمبر سے مکمل وابستگی زندگی کا تقاضہ ہے۔ عشقِ نبیؐ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ میں سادہ اور عام فہم زبان استعمال کرنا پسند کرتا ہوں۔"

کہتے ہیں "دفتری مصروفیات کی وجہ سے زیادہ وقت نہیں ملتا کہ باقاعدہ طور پر کوئی مزید تخلیقی کام کیا جائے۔ عمر اور صحت کے لحاظ سے جو وقت ملتا ہے وہ سماجی، ادبی اور مذہبی تقریبات میں گزرتا ہے۔ شاعری میں غزل کے علاوہ حمد و نعت، نظم، ملی نغمے، ہزل اور سہرے گاہے بگاہے کہہ لیتا ہوں۔ گویا جو وقت ملا وہ شاعری میں صرف ہو گیا اور کسی صنف کی جانب تخلیقی صلاحیتیں بروئے کار لانے کا موقع نہیں ملا۔" ان کا کہنا ہے کہ کسی خاص مکتبِ فکر کی بجائے اساتذہ کے کلام سے متاثر ہونا اہمیت رکھتا ہے خواہ وہ کسی بھی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہر دور میں اساتذہ نے نئے نئے خیالات دیے، سلیقہ دیا اور جذبات و احساسات کے اظہار کے لیے خوبصورت الفاظ اور تراکیب عطا کیں چنانچہ ہر مکتبِ فکر کا احترام کرنا چاہئے۔ کسی ایک کے لیے اپنے آپ کو محدود نہیں کرنا چاہئے۔"

ماہانہ "دنیائے ادب" (کراچی) اور نیویارک کے ہفتہ وار اخباروں میں ان کا کافی کلام شائع ہو چکا ہے اور ہوتا رہتا ہے جس میں غزل، حمد و نعت اور ملی ترانے شامل ہیں۔

کتابوں اور جرائد کی مقبولیت کے سلسلے میں کہتے ہیں: "الیکٹرونک میڈیا کی وجہ سے زندگی کے ہر شعبے میں بہت بڑا انقلاب آیا اور بہت تیزی سے آیا ہے۔ اس کی لپیٹ میں ہر شخص آگیا ہے کیونکہ ہر قسم کے مواد کا "حصول" بہت آسان ہو گیا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ "حصول" مشروط ہے۔ الیکٹرانک میڈیا جہاں دستیاب نہ ہو وہاں کیا کیا جائے گا۔ اس صورت میں "پرنٹڈ میڈیا" سے مدد لینا پڑے گی۔ پرنٹڈ مواد سے آپ کہیں بھی، کسی وقت بھی اور کسی حالت میں بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ سفر و حضر، پکنک، سیر و تفریح یا بیماری کے وقت ہمیں پرنٹڈ مواد درکار ہوگا۔ پرنٹڈ میڈیا ہمیں مستقل، مکمل اور جامع مواد فراہم کرتا ہے جبکہ الیکٹرانک میڈیا میں بے انتہا قباحتیں ہیں جو قاری کو قدم قدم پر محتاجی کا احساس دلاتی ہیں۔

الیکٹرانک میڈیا کا یہ انقلاب، طوفانی اور فوری اثرات کا حامل ہے۔ یہ پرنٹڈ میڈیا کا نعم البدل

نہیں ہے۔ پرنٹڈ مواد کی ضرورت ہمیشہ ہی محسوس ہوگی۔ اس کے لیے ذوق پیدا کیا جائے اور پرنٹڈ مواد نسبتاً سستے داموں فراہم کیا جائے۔ الیکٹرانک میڈیا تک رسائی ہر شخص کے بس میں نہیں ہے جبکہ پرنٹڈ میڈیا تک رسائی بہت آسان ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے کوئی Docement دیکھنے کے لیے کافی تگ و دو کرنا پڑتی ہے جبکہ پرنٹڈ مواد مکمل آپ کے سامنے ہوتا ہے جہاں سے جب چاہے دیکھ لیں، پلک جھپکنے میں آپ تمام صفحات پر نظر جما سکتے ہیں جبکہ الیکٹرانک مواد مکمل طور پر آپ کے سامنے نہیں آتا۔ اس لیے ضروری ہے پرنٹڈ مواد کی اشاعت سستی اور قابلِ خرید ہو۔"

صلاح الدین ناصر اردو کے مستقبل سے بہت پرامید ہیں۔ کہتے ہیں "اردو دنیا کی تیسری زبان ہے جو برصغیر ہندوپاکستان تک محدود نہیں رہی بلکہ دنیا کے تمام ممالک میں اردو بولنے والے پڑھنے والے اور لکھنے والے آباد ہیں اور اپنی حیثیت کے مطابق اہل قلم اردو کی ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔ اردو زبان میں بے پناہ وسعت ہے۔ دوسری زبانوں کے الفاظ اور خیالات کو اپنے اندر خوبصورتی سے جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ہر بڑے ملک میں اردو کی ترویج اور ترقی کے لیے بہت سے ادارے کام کر رہے ہیں۔ خاص طور پر مشاعروں کا اہتمام جس انداز سے کیا جاتا ہے، اُس سے یہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ اردو زبان ایک وسیع میدان فراہم کر رہی ہے اور اہلِ قلم اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ خامیاں، کمزوریاں ہوتی ہیں مگر مثبت پہلو ہمیشہ نمایاں رہے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ انھیں جِلا ملتی رہے گی۔ بالخصوص امریکہ میں، اردو زبان کی ترویج و ترقی کے بارے میں ہمیں پُرامید رہنا چاہیے۔ یہ اردو ادب کا بہت بڑا گہوارہ بنے گا۔ بین الاقوامی تہذیبوں اور امریکہ کی اپنی تہذیب سے متاثر ہو کر ممکن ہے کہ یہاں اردو ادب کا ایک نیا مکتبِ فکر بن جائے جس میں آزادیٔ اظہار کا عنصر بہت نمایاں رہے گا۔

مگر ناصر صاحب ہمارے بچے اور ان کے بچے تو اردو سے یکسر بیگانہ ہیں پھر آپ اتنے پرامید کیسے ہیں؟ س۔م)

MR. SALAHUDDIN NASIR

8E 65TH STREET NEWYOURK NY 10021 U.S.A

انتخابِ کلام

صلاح الدین ناصر

حمد باری تعالیٰ

تری ذات اعلیٰ صفات ہے مرے نطقِ کج سے بیاں نہ ہو
تو ہے قادر دشہہ کن فکاں تیری حمدِ پاک کہاں نہ ہو

تو علیم ہے تو فہیم ہے، تو حکیم ہے، تو عظیم ہے
تری وسعتوں کا میں کیا لکھوں، جو قلم ہی میرا رواں نہ ہو

تو بصیر ہے تو خبیر ہے، تو نصیر ہے تو کبیر ہے
ترا ہاتھ نبضِ حیات پر، کوئی بت تجھ سے نہاں نہ ہو

تو جمیل ہے تو جلیل ہے تو وکیل ہے تو کفیل ہے
تیرا نور حاکمِ حاکماں، جو اسیرِ زمن و مکاں نہ ہو

تیری جستجو تو انہی کو ہے جو ہیں بے خبر کہ تو دل میں ہے
تجھے ڈھونڈتے ہیں وہ ہر جگہ تو یہاں نہ ہو، تو وہاں نہ ہو

مجھے آزمانا ہی ہو اگر، میرا ظرف اتنا وسیع بھی کر
کہ صعوبتیں تو اٹھاؤں میں کبھی لب پہ میرے فغاں نہ ہو

تیرا ذکر دل کو سکون دے، تری حمد تازگی رُوح کی
تیری یاد میں یوں مگن رہوں کہ سوالِ فکرِ جہاں نہ ہو

تو غفورِ عاصی و مذنباں تو رحیم بے بس و بیکساں
تو ہی ناصر و بہی خواہ ورب کہ رہیں، وہم و گماں نہ ہو

ہم جگنوؤں کا گھر چاہے کوئی بھی نہیں لیکن
رستے بہت سے آج بھی روشن ہیں۔ خدا !
۲۹ جولائی ۱۹۹۵ء شاہدہ نسیم سالک

شاہدہ نسیم

سنسناٹی اوہائیو

شاہدہ نسیم کے لیے محترم ڈاکٹر جمیل جالبی کا فرمان ہے کہ ”شاہدہ نسیم میں شعر گوئی کی بہت اچھی صلاحیت ہے۔ انہوں نے انسانی رشتوں کے بنیادی جذبوں کو جس سلیقے سے اپنی شاعری میں بیان کیا ہے وہ یقیناً قابلِ تحسین ہیں۔“

حمایت علی شاعر کہتے ہیں: ”میں نے پہلی بار اس شاعرہ کو ڈاکٹر صہیب خان کے ایک مشاعرے میں سنا تھا۔ لب و لہجے کی اجنبیت سے یہ اندازہ تو ہو گیا کہ اس شاعرہ کی مادری زبان کوئی اور ہے مگر اردو میں سلیقہ اظہار سے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی بنیادیں مضبوط ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد اس کے شوہر ڈاکٹر سالک الدین سے گفتگو ہوئی تو سارا پس منظر سامنے آ گیا۔ ڈاکٹر سالک نے (Aer Space) انجینئرنگ میں پی ایچ ڈی کیا ہے اور آج کل ”ہائی اسپیڈ سپر سانک پلین“ پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ موصوف بہت خوش مزاج، ہنس مکھ اور اتنی سادہ طبیعت کے انسان ہیں کہ تھوڑی ہی دیر میں ایک دوسرے کے دوست بن گئے حالانکہ وہ بہت متشرع اور عبادت گزار ہیں اور میں حسرت سے انھیں دیکھنے والا اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا آرزومند ایک شاعر آزاد منش۔ خدا جانے میری کون سی خوبی انھیں پسند آئی کہ وہ بھی میرے گرویدہ ہو گئے۔ جدید دور میں انسان نے زمینی اور

فضائی فاصلوں کو تسخیر کر لیا ہے مگر یہ انسانیت کا المیہ ہے کہ دلوں کے درمیان فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں لیکن ڈاکٹر سالک الدین جیسے انسانوں کو دیکھ کر یقین آجاتا ہے کہ سائنس پر روحانی اقدار کی فتح بھی یقینی ہے۔ جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

یہ دل ہی کی بات تو ہے کہ ایک "اڑیہ گھرانا" بھی اردو کا شیدائی ہے۔ جیسا کہ مجھے معلوم ہوا۔ اس گھرانے کے بزرگ جنگ آزادی میں سبھاش چندر بوس کے ساتھیوں میں رہے ہیں۔ انہوں نے جیلوں کی تکالیف بھی برداشت کیں اور اپنی زبان کے ساتھ اردو اور فارسی میں بھی درک حاصل کیا۔

اڑیہ زبان کی شاعرہ شاہدہ نسیم، جب سالک صاحب کی زندگی میں آئیں تو ان کا تخلیقی جوہر اور نکھرا۔ "اہل زبان" نہ ہونے کے باوجود، اردو پر اتنی دسترس کہ زندگی کے لطیف ترین احساسات کو شعر کر دیں، اردو سے غیر معمولی محبت اور وسعت قلبی کی دلیل ہے اور اب کہ سارا ماحول مغربی ہے، بچے، بڑے سب انگریزی میں سوچتے ہیں (شاہدہ کی بیٹی "تمنا شیریں" انگریزی میں شاعری کرتی ہے) اڑیہ اور انگریزی کے ساتھ اردو کو اپنے گھر میں بسا لینا اہل اردو پر "احسان" کے مترادف ہے۔ وہاں کے شاعروں اور ادیبوں کے بھی اس سلسلے میں کچھ فرائض ہیں، انہیں اپنی فرسودہ روایات میں جدت کے امکانات تلاش کرنا پڑیں گے۔ وہ پاکستان اور ہندوستان کی معاشرتی زندگی سے تقریباً پانچ سو سال آگے کی دنیا میں سانس لے رہے ہیں، اس لیے انہیں سوچنا پڑے گا کہ ادب صرف تفریح طبع کا ذریعہ نہیں، یہ ایک سنجیدہ تخلیقی عمل ہے، اس میں نئی آگہی اور نئے ادراک کی روح پھونکنی پڑے گی۔

اس حوالے سے جب میں مغرب میں لکھی جانے والی اردو شاعری پر غور کرتا ہوں تو بہت مایوسی ہوتی ہے۔ صرف چند شاعر اور شاعرات ہیں جو تغیر کے مطالبات پر غور کر رہے ہیں، انہیں میں شاہدہ نسیم سالک بھی ایک چھوٹا سا ابھرتا ہوا نام ہے، جو روایت اور جدت کے سنگم سے پھوٹا ہے۔ ان کی ایک نظم "امن و محبت کا گیت" اس کا مظہر ہے۔

امن و محبت کا گیت

کیا کبھی ہوگی سحر ایسی سیاہ راتوں کی
کوئی مہلت بھی ملے گی ہمیں ان باتوں کی

زندگی خوں میں نہائی ہوئی لگتی ہے یہاں
در و دیوار سے حسرت بھی برستی ہے یہاں

لب و رخسار کی باتیں بھی زمانہ بھولا
کج ادائی کا حسینوں کی، فسانہ بھولا

ان پرندوں سے محبت کا سبق کیسے کہیں
ان کی آنکھوں میں محبت کے دیے کیسے جلیں

ہم نے کہنے کو تو کہہ دی ہے شبِ تار کی بات
ظلم کی آگ میں جھلسی ہوئی آزار کی بات

پر میرے دوست! یہ لوگ..........!

زہر آلود فضاؤں میں یہ پلنے والے
زرد بارود کے سائے میں سسکنے والے

گیت وہ کیسے سنیں

جن کو اُلفت نے تری، جن کو محبت نے مری
ایک ناپید زمانے کے لیے، مل کے کیا ہے تخلیق!

سخن ور چہارم کا سوالنامہ جب شاہدہ کو ملا تو انھوں نے مجھے لکھا "میری بیٹی تمنا شیریں میرے مجموعے "حرفِ تمنائی" کی رونمائی کی تقریب میں میری کسی رہنمائی کے بغیر برجستہ کہتی ہے "یہ شاہدہ نسیم سالک جن کو آپ شاعرہ کہتے ہیں وہ شاعرہ سے زیادہ ایک ماں، ایک بیوی اور ایک دوست ہے۔ وہ ان کرداروں کو نبھانے میں اپنا سارا وقت صرف کرتی ہیں۔ اللہ نے انہیں ایک تخلیقی دماغ بھی دیا ہے۔ ہمیں ان پر فخر ہے۔"

شاہدہ کو اپنی بیٹی کا یہ تبصرہ بہت پیارا لگا۔ ابھی ان کی دوسری صاحبزادی روبینہ کوثر اور بیٹے اظہر حبیب عمر کی اس منزل کو نہیں پہنچے کہ ماں کی شاعری کا مطالعہ کریں مگر شاہدہ کو امید ہے کہ وہ اردو زبان اتنی تو سیکھ لیں گے کہ ماں کا کلام پڑھ کر اُسے سراہیں۔ داد دیں۔

شاہدہ اپنا تعارف کراتے ہوئے کہتی ہیں "میرا پورا نام "شاہدہ نسیم سالک" ہے۔ ریاست اڑیسہ کے شہر بھدرک میں پیدا ہوئی اور وہیں اپنی تعلیم مکمل کی اور سیاسیات میں ایم۔ اے کیا۔

میں نے اپنے دادا جان سے اردو اور فارسی پڑھی۔ وہ اڑیسہ میں اردو کی ترویج و ترقی کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ وہ صرف پارلیمنٹ کے ممبر ہی نہیں تھے، اپنی سماجی خدمات کی وجہ سے پورے صوبے میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ انہی کی کوششوں سے صوبے کے اسکولوں اور کالج میں اردو کی کلاسیں شروع ہوئیں جہاں باہر سے اردو کے اساتذہ کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔

آج اللہ کے فضل سے اڑیسہ کے اکثر شہروں میں اردو آنرز اور ایم اے کی کلاسیں ہوتی ہیں۔

میں اپنی شادی کے فوراً بعد یہاں یعنی امریکہ آگئی ہائی اسکول کے زمانے ہی سے کچھ نہ کچھ لکھتی رہی ہوں۔ شاعری میں غزل اور نظم اور نثر میں افسانے وغیرہ لکھتی رہی ہوں۔ شادی کے بعد بھی سالک صاحب کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے لکھتی رہتی ہوں۔ جب بھی زندگی کی بے پناہ مصروفیتوں سے پل دو پل کی مہلت ملتی ہے، شاعری کی دنیا میں آجاتی ہوں۔ میری شاعری کے پیچھے ایک ہی شخص کی محبت ہے، وہی میرا دوست ہے اور دشمنِ جاں بھی اور وہی میرا محسن ہے، یعنی میرے شوہر "سالک" جو ایک نہایت شریف اور سادہ مزاج انسان ہیں۔

میرا کلام کینیڈا میں سب سے پہلے جناب عابدی جعفر نے اپنے رسالے "امروز" میں شائع کیا تھا امریکہ کے معروف اخبار "پاکستان لنک" کے "اردو لنک" میں بھی میری غزلیں اور نظمیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ صدیقی صاحب نے بھی میری بڑی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس کے علاوہ ممبئی کے ماہنامہ "شاعر" ایڈیٹر افتخار امام صدیقی، بہار دربھنگہ کے "ادب" کے ایڈیٹر مجاز نوری اور دہلی کے "نیا سفر" کے ایڈیٹر ڈاکٹر قمر رئیس نے بھی میرا کلام شائع کیا ہے۔ کراچی کے رسالے "اقدار" اور "دنیائے ادب" نے مجھے پاکستان میں متعارف کرلیا۔ دسمبر 1998ء میں میرے کلام کا پہلا مجموعہ "حرف تمنا" شائع ہوا جو دنیائے ادب کے اوج کمال صاحب نے چھاپا ہے۔"

شاہدہ کہتی ہیں "مجھے مطالعے کا بہت شوق ہے۔ کئی رسائل اور کتابیں ہندوستان اور پاکستان سے منگواتی رہتی ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے مذہبی کتابوں کے مطالعے سے بھی دلچسپی ہے۔ یہاں کی مسجد کے اسکول میں پڑھانے کے علاوہ کمیونٹی کی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتی رہتی ہوں۔

اگلے سوال کے جواب میں کہنے لگیں: "ہماری زندگی کے واقعات میں ادبیت کیا ہو سکتی ہے؟ بہر حال آپ نے پوچھا ہے تو ایک واقعے کا ذکر کروں گی جو آج بھی مجھے یاد آتا ہے تو خود ہی حیران ہوتی ہوں۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ بیرونی ممالک کے دوروں پر اکثر جاتی رہتی ہوں۔ ایک بار سویڈن میں سائنسی کانفرنس تھی۔ ہمارے علاوہ دوسرے سائنسدانوں کو بھی ایک بہت خوبصورت ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ جب سارے سائنسدان کانفرنس میں شرکت کر رہے ہوں تو ان کی بیویوں کے لیے سیر و تفریح کے پروگرام ترتیب دیے جاتے ہیں۔ ہم پورے دن ایک گائڈ کے ساتھ ایک بس میں سوار ہو کر پورا شہر دیکھنے اور گھومنے پھرنے نکلے۔ سویڈن کے مشہور تاریخی اور آرٹس سے متعلق مقالات کو دیکھتے ہوئے ہم ایک میوزیم کے سامنے بس سے اترے اور باہر تصویریں لینے لگے۔ اس کے بعد بس میں سوار ہو گئے لیکن کچھ عورتیں پھر اتریں کہ کچھ اور تصویریں کھینچ لیں۔ میں نے یہ دیکھ کر اپنے گائڈ سے کہا میں بھی نیچے جانا چاہتی ہوں، میرا انتظار کیجئے۔ گائڈ ایک سوئڈن عورت تھی جو بے حد سریلی آواز میں انگریزی بول رہی تھی۔ بولی "نو پرابلم!" دوسری عورتیں وہیں اتر گئیں کیونکہ ان کا ہوٹل قریب ہی تھا۔ یہ عورتیں بھی اتر کر وہیں آس پاس گھوم رہی تھیں۔ مجھے

یہ بات معلوم نہیں تھی کہ ان عورتوں کو دوبارہ بس میں نہیں جانا ہے۔ اچانک میں نے دیکھا کہ بس مجھے لیے بغیر ہی چل پڑی۔ بس ڈرائیور نے میرے بارے میں یہی خیال کیا ہوگا کہ میں بھی قریب موجود ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ میں بس کے پیچھے دوڑتی ہوئی گئی اور اسے روکنا چاہا لیکن ناکام رہی۔ اس جگہ اترنے والی عورتیں میری طرح سائنسدانوں ہی کی بیویاں تھی مگر سب کی سب جاپانی تھیں کسی کو بھی انگریزی نہ آتی تھی۔ ایک نوعمر جاپانی لڑکی نے میری پریشانی دیکھ کر انگریزی میں کہا، چلو میں تمہیں بس اسٹاپ کا راستہ بتاتی ہوں۔ تم اپنے ہوٹل کی جو بھی بس آئے اس میں سوار ہو جانا۔ لڑکی کے بتائے ہوئے راستے پر میں چل پڑی۔ راستے میں، میں نے جس سے بھی بات کرنے کی کوشش کی وہ انگریزی سے بالکل نابلد نکلا۔ اتفاق کہ وہاں کوئی ہندوستانی یا پاکستانی شخص بھی نظر نہ آیا، حالانکہ اکثر مقامات پر نظر آجاتے ہیں۔ خیر میں بس اسٹاپ پہنچی اور ایک بس میں سوار ہو کر ڈرائیور سے پوچھا کہ بس فلاں ہوٹل جائے گی یا نہیں؟ ڈرائیور میری بات سمجھا یا نہیں سمجھا، تاہم اس نے مجھے اشارے سے بیٹھ جانے کے لیے کہا۔ میں بیٹھ کر پاس بیٹھے لوگوں سے پوچھتی رہی، یو نو انگلش؟ لیکن سب نے نفی میں سر ہلایا۔ میری گھبراہٹ اور بڑھ گئی کہ ڈرائیور بھی انگریزی نہیں سمجھتا۔ میں اس وقت بے حد نروس تھی اور سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ اتنے میں ایک گورا نوجوان اپنی سیٹ سے اُٹھ کر میرے قریب آیا اور بولا میں بھی اسی ہوٹل میں جارہا ہوں جہاں تمہیں جانا ہے اور میں تمہیں جانتا ہوں۔ تم ڈاکٹر سالک کی بیوی ہو۔ میں بھی اسی کانفرنس میں شریک ہونے لندن سے آیا ہوں۔ میں نے کل تمہیں سالک کے ساتھ دیکھا تھا وہ میرے دوست ہیں۔

پہلے تو میں بہت گھبرائی کہ اجنبی شخص پر کیسے اعتماد کرلوں لیکن اس نے میرے شوہر کا اور کچھ دوسرے لوگوں کا نام لیا تھا اور حالات ایسے تھے کہ اس پر بھروسہ کرنے کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ خیر جلدی ہی مطلوبہ ہوٹل آگیا اور ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے واپس ہوٹل پہنچ گئے۔ میرا خیال تھا کہ میرے مقررہ وقت اور جگہ پر واپس نہ پہنچنے کی وجہ سے سالک بہت پریشان ہوں گے لیکن جب میں ہوٹل پر بس سے اتری تو وہ کہیں نظر نہیں آئے۔ میں نے ہوٹل کے ڈیکس پر معلوم کیا کہ آیا کسی نے مجھے پوچھا اور کوئی پیغام چھوڑا تو جواب نفی میں ملا۔ میں اپنے کمرے میں گئی تو وہاں بھی کوئی چٹ وغیرہ نہ ملی۔ یہ میرے لیے دوسرا صدمہ تھا۔ خیر شام سالک واپس آئے تو انہیں دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں غصے میں آگ بگولہ ہو کر چیخ پڑی آپ نے کس طرح دو تین گھنٹے گزار لیے جبکہ میں مقررہ وقت پر ہوٹل نہیں پہنچ سکی تھی۔ سالک اطمینان سے بولے "میں نے بس دیکھی تو تم نظر نہیں آئیں۔ ایک بہت اہم پیپر تھا جسے سننے کے لیے میں چلا گیا۔"

مجھے سالک کی یہ بے فکری دیکھ کر صدمے سے زیادہ سخت حیرت ہوئی لیکن بعد میں یہ جان کر اطمینان ہوا کہ بات واقعی اتنی پریشانی کی ہرگز نہ تھی لیکن آج بھی یہ واقعہ مجھے عجیب لگتا ہے اور شاید

اس لیے کہ ہم ذہنی طور پر اتنے آزاد نہیں ہیں۔"

اردو کے مستقبل کے سوال پر ان کا کہنا ہے کہ "اردو کے چاہنے والے اردو سے وفا نہیں کر رہے ہیں۔ ہم اردو سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اردو کی محفلیں منعقد کرتے ہیں، مشاعرے کرتے ہیں، اردو فلمیں دیکھتے ہیں، غزلیں سنتے ہیں۔ اس طرح سینکڑوں ڈالر خرچ کر دیتے ہیں لیکن اردو کی کتابوں اور رسائل پر کوئی رقم خرچ کرنا پسند نہیں کرتے۔ اس کے لیے ہمارے پاس کئی وجوہات ہیں، وقت نہیں ہے وغیرہ اگر ہمیں اردو سے واقعی محبت ہے تو ہمیں اس کی بقا ترقی اور ترویج کے لیے بہت ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنا ہوگا، منصوبہ بندی کرنا ہوگی، خصوصاً اپنے بچوں کو اردو لکھنا پڑھنا سکھانا ہوگا۔ امریکہ میں اردو کے لیے لوگ جو کچھ کر رہے ہیں وہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے لیکن ضرورت اس سے کہیں زیادہ عمل کی ہے۔ ہمارے اکثر بچے عربی سے آشنا ہیں ان کے لیے اردو پڑھنا اور لکھنا مشکل نہیں۔ ہمیں اس جانب نہایت سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔"

کتابوں اور جرائد کی مقبولیت کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے لوگوں میں مطالعے کا شوق کچھ کم ضرور ہوا ہے لیکن اس کے باوجود کتابوں کی اپنی جگہ اہمیت ہے اور ہونی چاہیے۔ ہمیں خود اپنے میں مطالعے کا شوق پیدا کرنا چاہیے اور دوسروں خصوصاً بچوں میں بھی یہ شوق پیدا کرنا چاہیے۔ ہمیں کتابوں اور جرائد کو بہت دلچسپ بنانا ہوگا اس کے لیے سخت محنت کی ضرورت ہے۔ آج بھی لاکھوں کی تعداد میں اردو کی کتابیں پاکستان، ہندوستان اور دنیا کے کئی دوسرے ملکوں میں چھاپی جا رہی ہیں۔

SHADA NASIM
8904 SAXTON DRIVE
WEST CHESTER O H.45069 U.S.A

PROF. KHADIM HUSAIN SAHER C/O SHEZAD HUSAIN
P.O.BOX 708 RIYADH, 11421 (K.S.A)

انتخابِ کلام

شاہدہ نسیم سالک

یاد آئی ہے کوئی بات بہت
ہم پہ بھاری ہے آج رات بہت

لوگ لکھتے ہیں دل کی تختی پر
ایک جیسے ہی واقعات بہت

کوئی بستی میں اب نہیں باقی
کر چکے لوگ واردات بہت

دل کی بات ان سے کہہ نہ پائے کبھی
دل کو جن سے ہے التفات بہت

برتِ گل ہو کہ برگِ ریزہ ہو
دل کو لازم ہے احتیاط بہت

راہ، الفت کی پرخطر ہے نسیم
اس میں ہوتے ہیں حادثات بہت

اے ابر محبت تو کہیں اور برسنا!
میں ریت کا صحرا ہوں مری پیاس بہت ہے

ندیم ہمایوں
۷ مارچ ۲۰۰۰ء

فرحت ندیم ہمایوں

کراچی

دورِ حاضر کے جواں سال شاعر فرحت ندیم ہمایوں نے اپنی محنت، لگن اور اپنے اسلوب سے بہت جلد دنیائے ادب میں اپنا ایک مقام بنالیا ہے۔ وہ خوش مزاج بھی ہیں اور سنجیدہ فکر کے مالک بھی۔ ان کے فن کے بارے میں مرحوم رضی اختر شوق نے کہا تھا۔ "فرحت ندیم کی شاعری اہلِ ادب کو اپنی طرف متوجہ کررہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بہت جلد اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔"

قمر علی عباسی کی رائے میں "حُسن کا اظہار جب الفاظ سے ہوتا ہے تو یہ سر بن جاتے ہیں اور اس کا خالق شاعر ہوتا ہے۔ فطرت شعر سے بنی ہے اس لیے دنیا کا ہر حُسن شعر ہے ہر نزاکت شاعری ہے۔ فرحت ندیم ہمایوں خواب دیکھتے ہیں پھولوں کے، بہاروں کے اور زندگی سے بھرپور شعر کہتے ہیں۔"

"پروفیسر سحر انصاری نے انھیں یوں خراجِ تحسین سے نوازا" فرحت ندیم ہمایوں کے شعری ارتقاء کو میں نے بڑی توجہ سے دیکھا ہے اس کا سبب ان کی شخصیت، شاعری سے ان کا انہماک اور ان کی انفرادیت ہے۔ فرحت ندیم مزاح اور سنجیدہ دونوں میں اپنا ایک خاص اسلوب رکھتے ہیں جو مجھے ذاتی طور پر پسند ہے اگر ان کا مجموعہ کلام شائع ہو تو بہتر طور پر اس پر گفتگو کی جاسکتی ہے۔"

میں فرحت کو اس زمانے سے جانتی ہوں جب وہ طالبِ علم تھے۔ ادبی سرگرمیوں میں جوش اور خلوص سے حصہ لیتے تھے اور آج بھی وہی عالم ہے۔ طنز و مزاح میں بھی انہوں نے اپنا ایک مقام بنایا ہے۔ ان کا ایک قطعہ ملاحظہ ہو

تربوز

آپ نے بتلا دیے کیوں فائدے تربوز کے
اب ہمیں تربوز کھانے کی سزا دی جائے گی

ادویہ کی لسٹ میں ہوگا اب اس کا اندراج
اور قیمت پانچ سو فیصد بڑھا دی جائے گی

محمد فرحت اللہ گھر میں ہمایوں کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ فرحت ندیم تخلص کے بعد اب اسی نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ 20 مارچ 1965ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ 1970ء میں کراچی سے میٹرک اور 1974ء میں جامعہ کراچی سے کامرس میں گریجویشن کیا۔ 1994ء میں ہومیو پیتھک ڈاکٹر کی سند بھی حاصل کی مگر اس کا خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا یعنی پریکٹس نہیں کی۔ تقریباً چودہ سال تک اکاؤنٹس کے شعبے سے وابستہ رہنے کے بعد حساب کتاب سے جی اکتایا تو 1995ء میں روزنامہ جنگ سے بحیثیت سینئر سب ایڈیٹر منسلک ہو گئے اور تقریباً 3 سال تک جنگ کے فلمی صفحات ترتیب دیے۔ یوں ادب کے ساتھ شوبزنس سے بھی ربط رہا۔ اخبارات میں قطعہ نگاری بھی کی اس حوالے سے مزاح گو شعرا کی صف میں بھی شمار ہونے لگا۔ مزاح کے حوالے سے دبئی میں جشنِ انور مسعود میں شرکت کی تھی۔ تاریخی ٹی وی سیریل "جناح سے قائد" میں مولانا محمد علی جوہر کا کردار ادا کیا۔ ان کے اجداد کا تعلق بدایوں اور بجنور سے تھا۔ ان کے نانا مرحوم عبدالرب چشتی بھی شاعر تھے اور ماموں مرحوم لیاز بجنوری استاد قمر جلالوی کے شاگردوں میں سے تھے۔ والد مرحوم کا شعری ذوق بھی بہت اچھا تھا یہی ماحول ان کے تخلیقی محرکات کا سبب بنا۔ 1983ء میں شادی ہوئی۔ اب ماشاء اللہ ایک بیٹی اور تین بیٹے ہیں۔

شاعری کا آغاز اسکول کے زمانے سے کیا تھا۔ اسکول میگزین کے لیے پہلی نظم لکھی تھی:

اے مسلماں تری تاریخ کے وہ زندہ نقوش
دیکھ خود تیرے ہی ہاتھوں سے مٹے جاتے ہیں

شاعری کے علاوہ نثر بھی لکھی ہے مگر یہ سلسلہ صرف مضامین کی حد تک رہا ہے۔ رجحان زیادہ تر شاعری ہی کی طرف رہا اور بنیادی طور پر غزل پسندیدہ صنف ہے۔ نظمیں اور ہائیکوز بھی کہی ہیں اور مزاح کے حوالے سے قطعات نگاری بھی کی ہے مگر طمانیت کا احساس صرف غزل سے ملتا ہے۔ غزل میں داغ اور جگر کے اسلوب نے زیادہ متاثر کیا ہے۔ غزل میں جدت کے ساتھ روایت پسندی

کے قائل ہیں۔ روزنامہ امن، محاسبہ اور قومی اتحاد میں ان کے قطعات تواتر کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ نیرنگ خیال، افکار، سیپ، شمع دہلی میں کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ غزلوں کا پہلا مجموعہ "اک عمر کی تنہائی" کے نام سے زیرِ طبع ہے قطعات کا مجموعہ بھی مرتب کر رہے ہیں۔ مطالعے کا بے انتہا شوق ہے۔ چنانچہ سونے سے قبل کسی بھی کتاب کے کم از کم 50اوراق پڑھے بغیر انہیں نیند نہیں آتی۔

اردو زبان کی بقا کے سلسلے میں کہنے لگے۔ "اردو لشکری زبان ہے۔ عربی، سنسکرت، فارسی، ہندی، ترکی زبانوں کے الفاظ اس کے ابتدائی دور میں اس میں شامل تھے۔ اب جوں جوں وقت گزر رہا ہے۔ اردو نے کئی اور زبانوں کے الفاظ بھی اپنے اندر سمو لیے ہیں۔ اب یہ نہ صرف برصغیر جنوبی ایشیا کے لوگوں کے رابطے کی زبان ہے بلکہ دنیا کے ہر خطے میں اردو بولنے والوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ چنانچہ جس زبان کی جڑیں اتنی گہری ہوں کہ وہ عام رابطے کی زبان بن جائے اسے کسی قسم کی سرکاری سرپرستی کی ضرورت نہیں اور نہ ہی کوئی طاقت اس کے فروغ میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔"

ندیم اصنافِ سخن میں نئے تجربات کے حق میں ہیں مگر اس طرح کہ اس صنف کی ہیئت نہ بگڑے کیونکہ شاعری میں موسیقیت نہ ہو تو وہ جی کو نہیں لگتی۔ غزل سے بحر، قافیہ اور ردیف خارج کر دی جائیں تو پھر وہ غزل نہیں رہتی۔ جس طرح لباس کا مقصد جسم ڈھانپنا ہے لیکن لباس میں دلکشی نہ ہو، برہنگی ہو تو ذوق سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ بالکل یہی مثال غزل پر صادق آتی ہے۔"

انہوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "مشاعرے ہماری ثقافتی روایت ہیں مگر یہ کبھی بھی ادب کے فروغ کا ذریعہ نہیں رہے نہ اب ہیں، ہاں ان سے ادب کے ابلاغ کا کام لیا جاتا رہا ہے۔ اب مشاعرے تو ہوتے ہیں مگر ان کا روایتی انداز ختم ہوتا جا رہا ہے اور یہ صرف تفریح کا ذریعہ بن گئے ہیں لیکن تنقیدی اور فکری نشستیں بہتر ہوتی ہیں۔ کسی شاعر کی تخلیق زیرِ بحث آتی ہے اور ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال ہوتا ہے۔ ایسی نشستیں ادب کے فروغ میں بہتر اور معاون ثابت ہوتی ہیں۔ دنیا میں ہونے والی نئی نئی ایجادات اور سائنسی ترقی نے الیکٹرونک میڈیا کی اہمیت کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ الیکٹرونک میڈیا کا تاثر دوسرے میڈیا ز سے زیادہ گہرا اور دیرپا ہے اسی الیکٹرونک میڈیا کی بدولت آج کا بچہ چھوٹی سی عمر میں وہ کچھ جان لیتا ہے جو ہماری نسل نے جوان ہو کر سیکھا یا جانا مگر اس کے باوجود کتب بینی کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ مغربی ممالک میں جو ہم سے کہیں زیادہ ایڈوانس ہیں کتب بینی کا رجحان اب بھی بہت زیادہ ہے۔ اچھے مصنفین کی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں بکتی ہیں۔ ہمارے یہاں یہ اس لیے مسئلہ نظر آتا ہے کہ یہاں تعلیم کا فقدان ہے۔ خواندگی کی جو شرح ہے وہ سب کے علم ہے۔ کتب بینی کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہے تعلیم عام کی جائے۔ خواندگی کی شرح بڑھے گی تو کتابیں پڑھنے کا رجحان بھی بڑھے گا اس کے علاوہ معیاری کتابیں کم نرخوں پر لوگوں کو مہیا کی جائیں۔ فی زمانہ اس مہنگائی کے دور میں مہنگی کتابوں پر

کوئی نہیں خرید سکتا۔

اردو ادب میں تنقید یقیناً بہت اہم چیز ہے۔ تنقید سے معیاری ادب جنم لیتا ہے مگر دورِ حاضر میں یہ برائے نام اس لیے رہ گئی ہے کیونکہ یہ دور خالصتاً تعلقات عامہ کا دور ہے۔ کسی کتاب کی رونمائی میں چلے جایئے وہاں سوائے شاعر یا مصنف کی تعریف اور کتاب اور تخلیق کے بارے میں ایسی گفتگو ہوتی ہے کہ شاعر میر اور غالب کے ہم پلہ معلوم ہونے لگتا ہے اور یہی تخلیق کی موت ہے۔"

MR. FARHAT NADEEM HUMAYON
C-3/5 AYAZ TOWN BLOCK-2 GULSHAN -E- IQBAL KARACHI

منتخب کلام

جس طرح بھی ہو فرحت، زیست کا سفر کاٹو
چاہے اپنے شانوں سے، خود ہی اپنا سر کاٹو

جسم کے قفس میں ہے قید روح کا پنچھی
دو رہائی تم اس کے، اب نہ بال و پر کاٹو

حبس بڑھتا جاتا ہے، زندگی کے زنداں میں
وا کرو کوئی روزن، اس میں کوئی در کاٹو

کتنے کام کرنے ہیں، مختصر سے عرصے میں
وقت کو نہ میری جاں، تم اِدھر اُدھر کاٹو

کیوں کسی سے مانگا تھا، ساتھ زندگی بھر کا
اب سزائے تنہائی، جاؤ عمر بھر کاٹو

سانحہ نہیں کوئی، ریت ہے یہ دنیا کی
جس کے سائے میں بیٹھو، پھر وہی شجر کاٹو

اس زمین کا سر پر، سائبان بننے تک
تیز دھوپ میں غم کی، جلتی دوپہر کاٹو

سوالنامہ میں نے پہلے ہی بھجوادیا تھا۔ اب کے نزہت کا وعدہ تھا کہ وہ جلد ہی جواب لکھیں گی۔ مگر نزہت جانے کہاں کھو گئی تھیں کہ پھر ملاقات ہی نہ ہو پائی۔ اتفاقاً ایک ماہ بعد ہی جناب منیر پرویز نے جشن جون ایلیا اور میر تقی میر سیمینار میں مجھے مدعو کیا جو منیر پرویز اور اطہر رضوی کی محنتوں کا کامیاب ثمر تھا مشاعرے میں چائے کے وقفے میں میرے کندھوں پر کسی نے ہاتھ رکھا اور پھر پلٹنے پر مجھے گلے سے لگالیا۔ وہ نزہت ہی تھیں۔ میری آنکھوں میں شکوہ پڑھ کر نزہت بولیں۔ میں خالی ہاتھ نہیں آئی۔ یہ تصویر، نظمیں، یہ میرے مکلام کا مجموعہ "ندائے امن" لائی ہوں۔ میں نے اس رویے پر نزہت کو پیار کر لیا۔ گھر آکر میں نے سرسری نظر ڈالنے کے لیے ان کے مجموعہ کلام کے اورق پلٹے تو یہ اشعار سامنے آئے

سنا ہے شہر بے اماں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے
ستم کشوں کو دیکھئے جلال کیسے آ گیا
مقامِ جذب تھا تو پھر دوئی کی بات کیوں ہوئی
ہمارے بیچ ذات کا سوال کیسے آ گیا

میں نے ان سے پوچھا تم نے غزلوں میں بھی بڑے خوبصورت اشعار نکالے ہیں مگر تم نے نظمیں زیادہ کہی ہیں۔ کیا وجہ ہے؟

جواب میں نزہت نے مجھے اپنی ایک نظم سنائی اور کہا بے شک ایک شعر میں ایک موثر پیغام دیا جاسکتا ہے مگر وہ محدود ہوگا اور نظم میں اس کی بھرپور وضاحت ہوگی ہاں اگر نظم خوبصورت انداز میں کہی گئی ہے۔ (یہ نظم آپ انتخاب کلام کے صفحے پر دیکھیں گے) میں نے سوالنامہ ان کے سامنے رکھا۔ نزہت نے پہلا سوال دیکھا اور کہا۔

"میں شادی سے پہلے سیدہ نزہت الماس اور شادی کے بعد سے سیدہ نزہت صدیقی کے نام سے لکھتی ہوں کہ والدین کی طرف سے سلسلہ نسب حضرت عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ سے ملتا ہے اور اپنے مرحوم شوہر جناب سلیم صدیقی کے حوالے سے صدیقی کہلاتی ہوں۔

میری پیدائش گلگت آزاد کشمیر میں ہوئی جہاں میرے والد بطور ڈاکٹر ملازمت کے سلسلے میں عرصہ دراز تک مقیم رہے۔ میری تعلیم پنجاب خصوصاً لاہور میں ہوئی جہاں سے لیڈی میکلیگن کالج سے بی ایڈ اور اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا۔ کینیڈ آنے سے پہلے کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج برائے خواتین ساہیوال میں بطور لیکچرار اردو کی تدریس بھی کی۔ ٹرانٹو آنے پر O.I.S.E یونیورسٹی آف ٹرانٹو سے سوشیالوجی ان ایجوکیشن میں ایم۔ ایڈ کرنے کے بعد امنِ عالم کی ضرورت کے تحت پیدا ہونے والے ایک نئے نظریہ پر جو سوشلزم اور کیپٹلزم دونوں کی پیدا کردہ مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ Ph.D کی تحقیق کا کام شروع کیا جو تین، چار سال کی سخت محنت کے بعد میرے شوہر کی طویل علالت اور پھر وفات کی وجہ سے تاحال ملتوی ہو گیا کیونکہ اب میرے

سیدہ نزہت صدیقی
ٹورانٹو، کینیڈا
۹ ستمبر ۱۹۹۹ء

سیدہ نزہت صدیقی

کینیڈا

بجا زنجیر تھی پاؤں میں اپنے
مگر خوابوں پہ تو پہرہ نہیں تھا
مرہم زخمِ غریب الوطنی
وقت کے ہاتھ ہی آیا ہوتا
مرے شعور نے احساسِ آگہی بخشا
اور آگہی کا یہ احساس کھا گیا مجھ کو

نزہت صدیقی اپنے لہجے اور اپنی شاعری کے تیور سے پہچانی جاتی ہیں۔ شعر کہنا بذاتِ خود جہاد ہے اور پھر ان عورتوں کے لیے تو کارِ دارد بھی ہے جو زندگی کے عذابوں کو تنہا سہتی ہیں۔ جہد معاش کا جوا بھی کندھوں پر ڈالے ہوئے ہیں اور تنہا اپنی ذات کی بقا کے لیے ہی نہیں لڑتیں بلکہ اپنے بچوں کی بقا کے لیے بھی گردِ راہ بنی ہوئی ہیں۔ ایسے میں شاعری! اور عذابِ آگہی۔ میرے خدایا۔

جب میں "شامِ فراز" کی تقریب میں شرکت کے لیے کینیڈا گئی تو اشفاق حسین کے گھر میری ملاقات نزہت صدیقی سے ہوئی۔ دیگر باتوں کے علاوہ "سخن ور چہارم" کے لیے نزہت کو

سامنے گھر چلانے کے لیے کسبِ معاش سب سے اہم مرحلہ ہے۔"

نزہت کہہ رہی تھیں "مجھے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر سے وابستگی ہے۔ اپنی شاعری کی کتاب "ندائے امن" کی ابتدا میں بھی میں نے ایک طویل مضمون "مسئلہ امنِ عالم اور ادب" پر تحریر کیا تھا جس میں کرۂ ارض پر موجودہ انسانی معاشرے کے اہم ترین مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے مروجہ معاشرتی نظاموں کے منفی پہلوؤں پر تنقید کرتے ہوئے نئے نظریۂ امنِ عالم کو اردو کے قارئین کے لیے پیش کیا تھا۔

میں ادب برائے زندگی کے مکتبۂ فکر سے متعلق ہوں۔ میرے خیال میں ادب زندگی کا عکاس ہی نہیں بلکہ زمانے کی رو میں نئے شعور کی لہریں پیدا کرنے اور معاشرے کے دھارے کا رخ بدلنے پر بھی قادر ہے۔ میرے خیال میں ادیب، شاعر اور فنکار کسی بھی مفکر کی طرح جب تک اپنی تخلیقات کا رشتہ حقیقی زندگی سے استوار نہ کرے اور انسانی معاشرے کی بقا کی جہدِ مسلسل میں حصہ نہ لے اس وقت تک معاشرے کا فعال رکن نہیں بن سکتا۔ میں نظریہ امن عالم پر یقین رکھتی ہوں۔ نظریۂ امنِ عالم موجودہ نظریات کے پیدا کردہ مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ اس کے بنیادی اصول پورے کرۂ ارض پر انسانی یک جہتی کے ساتھ ساتھ روحانی بالیدگی اور امن کا ایسا تصور ہے جس میں نہ صرف انسان بلکہ کرۂ ارض پر نباتات وحیوانات وجمادات کا تحفظ بھی شامل ہے جن کی تباہ کاری موجودہ نظریات پر مبنی معاشروں کے ہاتھوں اسقدر ہوئی ہے کہ کرۂ ارض پر سلسلۂ حیات کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ اس نظریہ کے تین بنیادی اصول یعنی امنِ عالم، روحانیت اور Ecology یعنی کرۂ ارض پر موجود فطرت کے تمام مظاہر کا تحفظ ہیں اور یہی میری شاعری کے بنیادی عنوانات بھی ہیں۔ یہ نقطۂ نظر اکیسویں صدی کے سفر میں مشعلِ راہ ہے۔

نزہت بتا رہی تھیں کہ وہ ادب کی ہر صنف کا مطالعہ کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ فلسفہ، معاشرتی علوم اور تدریس ان کے بنیادی پسندیدہ موضوعات ہیں۔ انہیں مذاہبِ عالم کے تقابلی مطالعے سے بھی گہری دلچسپی ہے۔

اپنی زندگی کا اہم واقعہ ان کے نزدیک ان کی پاکستان سے ہجرت تھی۔ انھوں نے بتایا "میرے ذہنی سفر کا ایک اہم پڑاؤ میرا پاکستان سے ٹرانٹو، کینیڈا آنا تھا۔ پاکستان میں میں نے ایسے ماحول میں آنکھ کھولی اور شعور کی منازل طے کیں جہاں مذہبی اور معاشرتی رنگا رنگی اور تنوع کا کوئی تجربہ نہیں ہو سکتا۔ وہاں ایک مذہب اور تقریباً ایک ہی طرح کے نظریات کا ماحول تھا جس نے ہمیں انفرادی اور قومی سطح پر اختلاف کو امن و سکون سے برداشت کرنے اور اپنے نظریات سے مختلف نظریات کو مثبت رویوں کے ساتھ پرکھنے کا کوئی موقع فراہم نہیں کیا۔ جس کے نتیجے میں ہم ایک کتاب اور ایک رسول ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے تھوڑے تھوڑے فرق کو بھی برداشت نہیں کر سکتے اور آپس کے نفاق کا بُری طرح شکار ہیں۔

اس پس منظر کے ساتھ ٹرانٹو، کینیڈا آکر ایسے معاشرے کا حصہ بنا جس میں دنیا کی تمام اقوام، تمام مذاہب اور ہر رنگ و نسل کے لوگ برابر کے حقوق کے ساتھ بہت حد تک امن و سکون سے رہتے ہیں۔ میرے لیے بڑا انوکھا اور خوش کن تجربہ تھا جس نے بہت سے پرانے سوال، پھر ان سوالوں کے جواب اور پھر ان جوابوں سے اٹھنے والے نئے سوالوں کا سلسلہ شروع کیا اور ایسی کیفیت نے نظریۂ امنِ عالم کی طرف میری توجہ دلائی۔ دوسرا بڑا اور اہم واقعہ جو میرے ذہنی سفر کی اسی سمت سے متعلق ہے میری خوش قسمتی ہے کہ 80ء کی دہائی میں اتفاقاً مجھے O.I.S.E یونیورسٹی آف ٹرانٹو میں استادِ محترم جناب پروفیسر مدن ہانڈہ میتریا مرحوم جو اس نئے نظریۂ امن کے خالق ہیں اور اس وقت تدریس میں مشغول تھے ان کے ساتھ تحقیق کا موقع ملا۔ تحقیق کے دوران ان کی روحانی بالیدگی اور ان کے تفکر نے مجھے نظریۂ امنِ عالم کا ایسا شعور دیا کہ میں نسلی، مذہبی یا سیاسی اور جغرافیائی حد بندیوں سے نکل کر بنی نوع انسان کی یک جہتی کرۂ ارض پر بسنے والی تمام مخلوق کے ساتھ متوازن رابطے اور انسان کی روحانی سربلندی کو اپنی ذاتی اور تخلیقی زندگی کا نصب العین سمجھنے پر مجبور ہو گئی اور یہ موضوعات میری شاعری میں بھی اظہار پانے لگے۔"

اردو کے مستقبل کے سوال پر وہ بولیں۔ "میں اردو کے بارے میں اسی قدر پر امید ہوں کہ جتنا کسی بھی ایک خطۂ ارض کی ایک بالیدہ زبان کے بارے میں ہوا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں یہ زبان برِ صغیر پاک و ہند کی سب سے زیادہ خلاق اور بولے جانے والی زبانوں میں ہمیشہ شامل رہے گی اور وہاں سے نقلِ مکانی کر کے دنیا کے دوسرے خطوں میں آباد ہونے والے لوگ اسے مسلسل اپنے ساتھ لاتے رہیں گے مگر غیر ممالک میں اردو زبان سے تعلق رکھنے والی ادبی سرگرمیاں میرے خیال میں نقلِ مکانی کرنے والی پہلی نسل برقرار رکھتی رہے گی۔ دوسری اور تیسری نسل تک شاید بولنے میں یہ زبان استعمال ہوتی ہے۔"

سوال نمبر 6 کے جواب میں انہوں نے کہا "شاعری کی تمام اصناف ہی اظہارِ خیال کا ذریعہ ہیں، نثری نظم یا نثری غزل کے عنوان خود اپنے اندر ہی تضاد کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ نظم اور غزل شعری اظہار ہے نثر نہیں۔ یوں ہر دور میں ہر قسم کے تجربے ہوتے ہیں۔ یہ تجربے شعری تاریخ میں کہاں تک اپنا مقام بناتے ہیں اس کا فیصلہ تو وقت ہی کر سکتا ہے۔

مشاعروں کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ مشاعرے اور تخلیقی نشستیں دونوں ہی اپنی اپنی طرح سے ادبی ماحول بنانے اور بہتر ادب تخلیق کرنے میں ممد و معاون ہیں۔ کہنے لگیں یہ درست ہے کہ الیکٹرونک میڈیا کا اثر پرنٹ میڈیا پر ہوا ہے مگر پھر بھی جس قدر کتب اس دور میں چھپی ہیں اور چھپ رہی ہیں انسانی تاریخ میں کبھی نہیں لکھی گئیں۔ دوسری بات جو بہت اہم ہے یہ کہ ان تبدیلیوں کے پیچھے ایک بہت بڑی وجہ آج کے تیز رفتار معاشرے میں وقت کی کمی ہے۔ ڈرائیو کرتے ہوئے ٹیپ تو سنی جا سکتی ہے لیکن کتاب کا پڑھنا ممکن نہیں۔ کمپیوٹر کے ذریعے ہر قسم کی

خبریں بغیر اخبار کے پلندہ کے آپ تک پہنچ جاتی ہیں۔ ٹی وی اور ریڈیو آپ کو ہر قسم کے ادبی پروگرام بھی پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

تنقید کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ ادب کی ترقی کے لیے تنقید ضروری ہے مگر اس تنقید کا غیر جانبدار ہو کر ادب پارے کو پرکھنا ضروری ہے جبکہ دورِ حاضر میں عموماً نقاد ادب پارے سے زیادہ ادیب سے اپنے ذاتی تعلقات کے حوالے سے متاثر نظر آتے ہیں۔ یہ رویہ بہتر ادب کی افزائش کے لیے بہت منفی رویہ ہے۔ ادب پارے کی سچی تنقید نقاد کا فرضِ اوّلیں ہے۔

سیدہ نزہت صدیقی کو ان کے مجموعۂ کلام "ندائے امن" پر عالمی اردو کانفرنس دہلی (ہندوستان) کی جانب سے بہتر ین شاعری کا ایوارڈ جون 1987ء میں دیا گیا۔ نیز انہیں "شاعرہ برائے امن" کا خطاب کینیڈا کے ٹورنٹو اسٹار، گلوب اور میل کی جانب سے دیا گیا، ہندوستان کے نامور صحافی خوشونت سنگھ نے انہیں اخبار ہندوستان ٹائمز میں "امن کی سفیر" کے خطاب سے نوازا۔ مایۂ ناز ادیبہ امرتا پریتم نے کہا کہ نزہت کے کلام نے اردو شاعری کے لیے نئی راہیں متعین کی ہیں۔

SYEDA NUZHAT SIDDIQUI
2-Dalingtion Drive
North York , ONT,
M2J-2G3 CANADA.

اہلِ زمین کے نام

اگر ہمارے رنگ اور ہمارے نام ایک سے نہیں تو کیا
اگر ہماری سرزمین بانٹ دی گئی تو کیا!
اگر ہمارے سر پہ آسماں کے سائباں کی دھجیاں اڑیں تو کیا ہوا!
سنو ہم ایک ہیں!
ہم ایک کارواں کے ہم قدم، ہمارا راستہ بھی ایک
ہماری ابتدا بھی اور ہماری انتہا بھی ایک
ہماری مختصر حیات کے سبھی سراب ایک ہیں
ہم ایک ہیں
ہماری مامتائیں ایک سی، ہمارے بچپنے بھی ایک
ہماری چاہتیں بھی مختلف نہیں
ہمارے رنج ایک سے
ہماری راحتیں بھی مختلف نہیں

ہمارے خواب ایک ہیں
ہم ایک ہیں
ہم ایک ہی زمیں کی گود کے پلے ہوئے
ہم ایک آسماں کے نور میں ڈھلے ہوئے
فضاؤں کی ادائیں ایک سی ہمارے ساتھ
ہمارے مہر و انجم و ماہتاب ایک ہیں
ہم ایک ہیں
ہم ایک ہیں، ہم ایک تھے مگر نہ جانے کب
ہمارے چار سو حصارِ درد کون چن گیا؟
ابھی ہمارے جسم سانس لے رہیں
اور ان پہ تارِ عنکبوتِ مرگ کون بن گیا؟
ہمارے دل کے آئینے پر گرد کس نے ڈال دی؟
ضوِ چراغِ عقل کی کیوں دھواں، دھواں ہوئی؟
یہ سب سوال، ساری الجھنیں اور ان کے سب جواب ایک ہیں
ستم کی سب کہانیوں کے، جبر کی حکایتوں کے سارے باب ایک ہیں
مشقتوں کے بوجھ سے دبے ہوئے، عقوبتوں کے خوف سے ڈرے ہوئے
تمام خستہ تن، سبھی خراب ایک ہیں
مگر صداقتوں کے، امن کے، محبتوں کے خواب ایک ہیں
ذات کے حصار سے نکل کے لامکاں میں پھیل جانے والی
مہرباں رفاقتوں کی خوشبوؤں کے سب گلاب ایک ہیں
ہم ایک ہیں
اگر ہم ایک ہیں تو کیوں نہ بڑھ کے ہاتھ تھام لیں
حصارِ درد میں کوئی شگاف پڑ ہی جائے گا
اگر ہم ایک ہیں تو کیوں نہ اس اور صداقتوں کی راہ سے
مہرباں رفاقتوں کی راہ سے
اسی مقام پر چلیں جہاں سے ابتداء ہوئی۔ جہاں ہم ایک تھے

دیکھنا اس سمت بہہ کے جائے گا
رخ بدلتے وقت کا دریا بھی
نسرین نقاش
۲۴ اگست ۹۹

سیدہ نسرین نقاش

سری نگر

یہ اکتوبر 97ء کی بات ہے۔ سیدہ نسرین نے مجھے اپنا مجموعہ کلام "دشتِ تنہائی" بھیجا تھا۔ جو 1994ء میں شائع ہوا ہے۔ مگر مجھے وہ 98ء میں یوں ملا کہ اس وقت تک میں لاس اینجلس سے پاکستان روانہ ہو چکی تھی۔ واپسی پر میں نے نسرین کا مجموعہ بڑی توجہ سے پڑھا اور جب "سخن ور چہارم" کا کام شروع کیا تو نسرین میری یادوں کے سفر میں میرے ساتھ تھیں۔ چنانچہ آج انہیں آپ سے متعارف کراتے ہوئے مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے کیونکہ ان کے کلام کے بارے میں انہوں نے بھی لکھا ہے جن کی رائے کا میں بھی احترام کرتی ہوں اور ان شخصیتوں سے علم کے حوالے سے ذہنی قربت بھی رکھتی ہوں۔ ان میں موسیقارِ اعظیم جناب نوشاد، محترم رفعت سروش اور قتیل شفائی شامل ہیں۔

محترم نوشاد کہتے ہیں "سچی شاعری کا مقصد ہے بے خواب آنکھوں میں خواب دیکھنے کا حوصلہ پیدا کرنا۔ ساکت وجامد زندگی کو متحرک اور فعال بنا کر نئی بصیرتوں اور بشارتوں کے دریچوں پر دستک دینا۔ سیدہ نسرین نقاش کی شاعری ان خصوصیات کا منظر نامہ پیش کرتی ہے۔"

قتیل شفائی کہتے ہیں۔ "میں نے جتنا بھی نسرین کا کلام تجزیے کے لیے اپنے سامنے پایا ہے اس

پر زیادہ تبصرہ کرنے کے بجائے اگر میں اس کے چند اشعار یہاں لکھ دوں تو آپ میرے کسی فتوے کے محتاج نہیں رہیں گے بلکہ آپ اس خوبصورت اور ذہین شاعرہ کے ادبی مقام اور اس کے وطنی رجحانات سے بخوبی آگاہ ہو سکیں گے۔

تلاش کرتے ہیں یادوں کے کارواں اس کو	ہوائے وقت اڑا لے گئی کہاں اس کو
خلوص و عجز میں وہ میر کی زمیں نکلا	سمجھ رہی تھی میں غالب کا آسماں اس کو

جناب رفعت سروش لکھتے ہیں۔ دشتِ تنہائی میں ایسے اشعار کی تعداد خاصی ہے جن میں ہندوستان کی دھرتی کی سوندھی سوندھی خوشبو ہے۔ اس میں ہندوستانی عورت کا خلوص، وفا، برہا کی آگ میں سلگتا ہوا وجود، دھیما دھیما لہجہ اور میرا کی شاعری کا رس نظر آتا ہے۔

سیدہ نسرین کاشانی جو 3 نومبر 1964ء کو کشمیر ہندوستان میں پیدا ہوئیں نقاش تخلص کرتی ہیں۔ ایک ماہنامہ "سر کتا آنچل" اور سیاسی رسالہ 'الجمہور' کی ایڈیٹر اور پبلشر بھی ہیں۔ ایم۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ ان کے آباؤ اجداد تبلیغ اسلام کے سلسلے میں ایران کے ایک شہر کاشان سے 707 سادات کے ہمراہ کشمیر تشریف لائے تھے اور پھر یہیں بسیرا کر لیا۔

نقاش کو شاعری کے علاوہ تبصروں اور افسانہ نویسی سے بھی دلچسپی ہے۔ چالیس کے قریب افسانے لکھ چکی ہیں اور پچاس کتابوں پر تبصرے کر چکی ہیں۔ انہیں سیاست سے بھی دلچسپی ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر ایک کتاب "لہو پکار رہا ہے" 1995ء میں شائع ہوئی ہے۔ نثر کی دو اور کلام کا ایک مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

نسرین کہتی ہیں "میں اردو کے مستقبل سے قطعاً مایوس نہیں ہوں گو اردو کو ختم کرنے کی سازشیں شروع ہو گئی تھیں وہ اس لیے کہ ہماری تہذیب، تمدن معاشرہ اسی طرح مٹ سکتا ہے کہ ہماری زبان ختم کر دی جائے۔ چنانچہ برسوں سے یہ عمل جاری ہے اور اس کا اثر بھی ہوا ہے۔ مثلاً اترپردیش، جہاں کی دوسری سرکاری زبان اردو ہونی چاہئے تھی۔ کتنی شرم کی بات ہے کہ ہم نے اپنے بچوں کو ہندی میں خط لکھتے ہیں۔ چند فرقہ پرست متعصب لوگوں اقتدار کی ہوس میں اردو کو غیر ملکی یا مسلمانوں کی زبان کہہ کر نقصان پہنچایا ہے مگر مٹا نہیں سکے اس لیے کہ یہ مٹھاس اور یہ تہذیب دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہے۔ آج اردو غزل کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ہندوستان میں کم سے کم دس دوسری زبانوں کے شاعر بھی غزل کہنے لگے ہیں مگر جہاں تک روزی روٹی سے جڑنے کا مطلب ہے اردو کے ساتھ سوتیلا سلوک جو ہو رہا ہے اس میں قصور ہمارا بھی ہے کہ ہم سرکار کے آگے جھولی پھیلائے کھڑے رہتے ہیں اول تو اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے اور اگر ہے تو ہم اردو والے بے حس ہیں کہ اپنی زبان کو زندہ نہیں رکھ سکتے۔ ہم سینکڑوں روپے فضول چیزوں پر خرچ کر سکتے ہیں لیکن اردو کا اخبار خرید کر نہیں پڑھ سکتے اور جو اردو والے صاحب ثروت ہیں انہیں چاہے انگریزی نہ آتی ہو مگر اخبار انگریزی کا آتا ہے۔ میرا تو اردو والوں کے لیے بس یہی مشورہ ہے کہ ہم

ایک ہو کر اس بے حسی کے جال توڑ دیں غیر سرکاری طور پر ہم بیس کروڑ ہیں۔ پانچ کروڑ نکال دیں اور صرف پندرہ کروڑ یہ قسم کھالیں کہ ہم ایک روپیہ روز اردو کے لیے جمع کریں اور کوئی معتبر تنظیم بنائیں تو آپ کچھ ہی عرصے میں اردو میڈیم کے کالج، ٹیکنیکل کالج کھول سکتے ہیں جہاں اردو والے طلبا اور خاص طور سے لڑکیاں ہنر مند ہو کر نکلیں، شادی نہ ہو تو وہ باپ پر بوجھ نہ بنیں۔ شادی ہو تو وہ شوہر کے پیر کی جوتی نہ بنیں۔ آج ہندوستان کے متوسط خاندانوں میں لڑکیوں کی شادی کو ایک سنگین مسئلہ بنادیا گیا ہے سرمایہ دار جہیز کی لعنت بڑھاتے بڑھاتے اس حد تک لے آئے ہیں کہ متوسط شخص جس کی دو بیٹیاں ہوں اس کا جہیز منڈپ کی سجاوٹ دیکھ کر ہی ہارٹ فیل ہو جائے۔ کاش! یہ مسلمان اپنے فرض کو پہچانیں اور وہ دو ڈھائی لاکھ روپے جو منڈپ کی سجاوٹ میں فضول خرچ ہوتے ہیں اس پیسے سے غریب لڑکیوں کی کلائیوں میں سہاگ کی چوڑیاں پہنا دیں۔ کسی ر۔۔الے یا کسی اخبار کے بند ہونے کی نوبت نہ آئے جب کوئی اردو کا رسالہ یا اخبار بند ہوتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ ایک عظیم انسان کا قتل ہو گیا ان نامساعد حالات کے باوجود بھی مجھے یقین ہے کہ چند سالوں بعد اردو دنیا میں رابطے کی دوسری زبان ہو گی۔

اصناف سخن میں نسرین نقاش غزل پر فدا ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ولی دکنی سے لے کر آج تک ہر شاعر نے شاعری کا آغاز غزل سے کیا ہے اور شاعری کی سب سے مشکل اور خوبصورت صنف غزل ہے۔ غزل ہو یا پابند نظم میں ایک سلیقہ تو ہوتا ہے جو بات نظم کے چار چار مصرعوں کے چھ بند ادا کریں گے غزل اس طویل کہانی کو دو مصرعوں میں قید کر دے گی جیسے :

آج میں نے اسے نزدیک سے جا دیکھا ہے
وہ دریچہ تو مرے قد سے بھی اونچا ہے

نثری نظم اور نثری غزل کی تک آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ حرکتیں وہی شاعر کر رہے ہیں جو پابند شعر نہیں کہہ سکتے ارے بھئی کسی ڈاکٹر نے تو کہا نہیں کہ آپ شاعر بنئے بلاوجہ اس صنف کا مذاق کیوں اڑا رہے ہیں مگر ان اصناف کا انجام وہی ہو گا جو تحریری شاعری یا افسانہ نگاری کا ہوا تھا۔

رہی مشاعروں کی بات تو اردو زبان اور شاعری کی نمائندگی کے لیے مشاعروں کی افادیت سے تو کسی طرح بھی انکار نہیں کیا جاسکتا مگر اب مشاعرے کہاں ہو رہے ہیں؟ اب تو گلوکاری، اداکاری اور حُسن کی ادائیں تالیاں بجوا رہی ہیں۔ اب کوئی سخن فہم اور سنجیدہ شخص مشاعرے میں جانے کو گالی سمجھتا ہے۔ مشاعرے اگر معیاری ہوں اور شعراء کا انتخاب صحیح اور ایمانداری سے ہو تو مشاعروں سے بہتر نمائندگی کہاں ہو گی۔

جہاں تک شعری مخصوص نشستوں کا سوال ہے وہاں یقیناً بہتر سے بہتر شعر سننے کو ملتے ہیں ان سے شعرا بھی خوشی کے پھولوں سے دامن کو بھر لیتے ہیں۔

آپ نے پوچھا ہے کہ برقی وسائل کی وجہ سے کتابوں کی اشاعت متاثر ہوئی ہے جبکہ میں اسے مفروضہ سمجھتی ہوں ویسے الیکٹرونک میڈیا تو اس گندگی کا نام ہے جو ماں بیٹی بہن بھائی اور باپ ایک ساتھ بیٹھ کر دیکھ نہیں سکتے اور جو زبردستی انگریزوں کی ناجائز اولاد بن کر اس تہذیب کو اوڑھنا بچھونا بناتے ہیں وہ انجام بھی جلد ہی پا لیتے ہیں اس کے علاوہ الیکٹرونک میڈیا کی گھٹیا ترین اور مبتذل تخلیقات جلد ہی سمجھ میں آجاتی ہیں اور وقت بھی کم لگتا ہے جبکہ ایک تاریخی کتاب "آگ کا دریا" جیسا ناول یا غالب کا دیوان پڑھنے کے لیے وقت بھی چاہئے اور ذہانت بھی۔ اگر ہم تن آسانی سے گریز کریں اور اچھے ادب کو کسی بھی طرح وقت نکال کر پڑھیں اور جو بھی پڑھیں چاہے ادب سائنس یا مذہب سے متعلق اسے فرض سمجھ کر پڑھیں تو کچھ کہنے اور کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔

تنقید کے سلسلے میں عرض کروں گی کہ تنقید واقعی اب برائے نام رہ گئی ہے ترقی پسندوں کے دور میں یہ بدعت شروع ہوئی کہ من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو سب ایک دوسرے پر لکھتے تھے اور صرف اچھا لکھتے تھے اس لیے ان کے قد بڑے ہو گئے۔ آج بھی گروپ بندی جو جس کے گروپ میں ہے وہ اگر گالی بھی لکھ رہا ہے تو شربت سمجھ کر پی رہے ہیں اگر کسی جیالے نے صحیح اعتراض کر دیا تو جیسے اس نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا جان بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ ہمارے یہاں بہت تیز نظر رکھنے والے ناقد باقی رہ گئے ہیں۔ اب تو تنقید کا یہ معیار ہو گیا ہے کہ ہر نقاد کچھ تنقیدیں، مرعوب کرنے کے لیے لکھتے ہیں کچھ مغربی ادیبوں، شاعروں، دانشوروں وغیرہ کے اقوال لکھ رہے ہیں کیونکہ ان حوالوں کے بغیر ان کو معتبریت کیسے حاصل ہو گی یہ سوچے بغیر کہ امریکہ کی تہذیب، رہن سہن، سماجی قدریں، معاشرہ ہم سے مختلف ہے مگر حوالہ ضرور دیں گے اور وہ جو ریڈی میڈ، تنقیدیں ہیں کہ صاحب کتاب کی کتاب کو ادھر ادھر سے دیکھ کر جو فٹ ہوا فٹ کر دیا اس میں نہ برائی ہوتی ہے نہ بھلائی جبکہ تنقید نگار کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف فقرہ یا جملہ بلکہ اس لفظ کے بارے میں بھی سوچے کہ کیا یہاں اس لفظ کا نعم البدل ہو سکتا ہے مگر وائے افسوس کہ ہمارے نقاد، دانشور وغیرہ خود ہی اپنے ملک کی شاعری کو پاکستان کی شاعری سے کمتر درجہ کی سمجھتے ہیں جبکہ بیچاروں نے تقریباً بیس تیس برس سے کسی شاعر کا مجموعہ نہ کسی ناول نگار کا ناول نہ تحقیقی مضامین، نہ افسانے کچھ بھی نہیں پڑھا۔ صحت مند تنقید تو یقیناً ادب کو نکھارنے کا سنوارنے کا یقینی ذریعہ ہے کاش کہ ہمیں یہ میسر ہو۔

SYEDA NASREEN NAQQASH
P.O.BOX NO:G.P.P SRI NAGAR 190001
KASHMIR, INDIA.

انتخابِ کلام

سیدہ نسرین نقاش

ہر حال میں جینے کی دعا دے کے گئے ہیں
کیوں لوگ ہمیں ایسی سزا دے کے گئے ہیں

اے وقت کے جھونکو نہ بجھاؤ کہ ابھی وہ
ہاتھوں میں مرے شمعِ وفا دے کے گئے ہیں

گلشن کو بہاروں کے مہکتے ہوئے جھونکے
نادیدہ خزاؤں کا پتہ دیے گئے ہیں

دنیا کی صلیبوں پہ ہر اک دور میں ہم لوگ
تاریک سویروں کو ضیاء دے کے گئے ہیں

یہ دل میں اُترتے ہوئے معصوم سے چہرے
ہر موڑ پہ اک زخم نیا دیے گئے ہیں

اس کٹھن دور کی ناگفتہ صداقت لوگو!
میری ہی ذاتِ گرامی سے روایت ہو گی

3/5/99

نوشاد نوری

ڈھاکہ

آج 14 ستمبر 99ء ہے۔ دل و ذہن کئی دنوں سے تعاون پر آمادہ نہیں۔ آخری تعارف 6 ستمبر 99 کو لکھا تھا۔ میں ان دنوں صرف کتابیں رسالے پڑھ رہی ہوں۔ ٹی وی دیکھ رہی ہوں کہ دل و دماغ لکھنے پر آمادہ نہیں۔ ان کی خفگی بھی بے وجہ نہیں۔ اسد اللہ خان غالب نے ہر موقع کے لیے ایک معنی آفریں شعر کہا ہے

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

چائے کی پیالی سامنے رکھ کر اپنے بیگ سے چند لفافے نکالے۔ پہلا تعارف جو سامنے آیا۔ ڈھاکہ بنگلہ دیش کے شاعر محترم نوشاد نوری کا ہے۔ میں نے تعارف پڑھا اور مہمیز لگی۔

میں نے نوشاد نوری صاحب سے چند سوالات پوچھے اور پھر سوال نمبر 4 سامنے آیا۔

سوال نمبر 4 ہے اپنی زندگی کا کوئی یادگار دلچسپ اور اہم واقعہ سنایئے۔

فرمایا ”کیا ضروری ہے؟“ اس سوال پر بہت سوں نے خفا ہو کر لکھا ہے کہ ہماری زندگی میں کوئی دلچسپ اور اہم واقعہ ہے ہی نہیں۔ کسی نے فرمایا، پوری زندگی ہی ایک دلچسپ واقعہ ہے یا یہ کہ

بے شمار واقعات بھرے پڑے ہیں۔ کہاں تک سنائیں اور بہت سوں نے بڑے اہم، دلچسپ، موثر اور ایسے یادگار واقعات بتائے ہیں کہ اب یقیناً وہ اردو ادب کی تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ یہ واقعات سبق آموز بھی ہیں اور سچے ایسے کہ ادیبوں کی زندگی کے یہ واقعات ہی علیحدہ سے مرتب کیے جائیں تو بہت سی نئی باتیں سامنے آئیں گی۔

نوشاد نوری صاحب نے بھی بہر حال ایک واقعہ سنایا۔ اس میں مولانا ماہر القادری کا ذکر ہے۔ اس پر مجھے خود ایک واقعہ یاد آگیا ہے۔ ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

میں کراچی کے ایک مشاعرے میں نووارداں میں سے تھی۔ ایک شاعرہ و سماجی خاتون میرے برابر بیٹھی تھیں۔ خواتین سامعین میں بیٹھی تھیں اور مرد حضرات اسٹیج پر۔ خاتون نے مجھ سے گزارش کی کہ میں ان کا ایک پیغام مولانا ماہر تک پہنچادوں۔ خاتون نے کہا۔ مولانا ماہر سے میرا نام لے کر اس سوال کا جواب لے آؤ کہ وہ اپنی آنکھوں میں سرمہ کیوں لگاتے ہیں۔ میں گڑبڑا گئی کہ یہ سوال میں کیسے پوچھوں؟ انہوں نے میری ٹھوڑی چھو کر کہا پلیز! میں اسٹیج پر گئی۔ خاتون کا نام لیا۔ سوال پوچھا انہوں نے خاتون کی طرف دیکھا پھر بڑی میٹھی مسکراہٹ کے درمیان کہا۔ "بس ایسے ہی۔" جیسے مروت میں ٹال دیا ہو۔ اس وقت مولانا ماہر کے چہرے پر جو معصومیت، پاکیزگی اور تقدس کا حسن تھا وہ میں نہیں بھولی۔ پھر جب انہوں نے اپنے رب کے شہر میں آخری سانسیں لیں اور وہیں جگہ پائی تو بہت بہت بعد میں، جب میں نے مولانا کو پڑھا تو یہ آگہی عطا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنے نیک بندوں کو شر اور شر پسندوں سے بچاتا ہے۔ مولانا کی زندگی میں تو ایسے کئی مراحل آئے ہوں گے جب بقول غالب

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد

والے مقامات سے بھی گزرے ہوں گے اور بخیر و خوبی گزر گئے ہوں گے ورنہ انہیں آخری آرام گاہ کے لیے وہ سرزمین کیسے ملتی جس کی آرزو میں لوگ تڑپتے ہیں۔

تو بات آرہی ہے اب نوشاد نوری صاحب کی جانب۔ ان کی زبانی ان کی زندگی کا یہ اہم واقعہ سنیئے۔

ہندوستان میں گیارہ، پشتوں پر مشتمل، ہمارے شجرہ نسب میں کوئی ایسا نام نہیں ملتا جس کی تخلیق ادب سے دلچسپی رہی ہو۔ ایک واقعہ نے پہلی بار میری توجہ شعر و شاعری پر مرکوز کی۔ پر میرے کنبے میں خربوزے کو دیکھ کر خربوزے نے رنگ پکڑنے شروع کردیے۔

اکتوبر 1934ء میں ہندوستان کے شمالی صوبہ بہار میں شدید زلزلہ آیا تھا۔ اس میں ایک لاکھ سے زائد جانیں تلف ہوئی تھیں۔ میرے گاؤں کے تقریباً تمام مکانات گر گئے تھے۔ زلزلے کے وقت میرے نانا مسجد کے صحن میں، تختے پر خوش نویسی کی مشق کرا رہے تھے۔ اسی وقت میری عمر آٹھ سال کی تھی زلزلے کے جھٹکے نے مجھے خوف زدہ کردیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ خوفناک

گڑگڑاہٹ اور زمین میں کپکپی کیا ہے۔ میں بدحواسی میں ایک چھوٹے سے متصل کمرے میں گھس گیا اور ایک کونے سے لگ کر کھڑا ہو گیا جہاں بجنور کے مدینہ اخبار کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ جب جھٹکے تیز ہوئے تو میں بیٹھ گیا اور آنکھیں موند لیں۔ کتابوں سے بھری ہوئی ایک الماری اسی گوشے پر آکر گری لیکن دو دیواروں سے لگ کر معلق ہو گئی۔ پھر ایک زوردار دھماکہ ہوا مسجد کا مینار اسی کوٹھری کی چھت پر آگرا۔ چھت بیٹھ گئی لیکن اس الماری نے گرنے والی چھت سے مجھے محفوظ رکھا۔ چھت گرنے کی وجہ سے کوٹھری کے دروازے بند ہو گئے تھے۔ الماری میں پردادا کے زمانے کی جمع کی ہوئی قلمی کتابیں تھیں۔ تقریباً سبھی فارسی میں تھیں۔ زلزلے کے زوردار جھٹکے کی وجہ سے، عمر خیام، عطار، شمس تبریز، حافظ، قاآنی، اردو کی اور رومی کے قلمی نسخوں نے الماری سے نکل کر مجھے تقریباً ہر چہار طرف سے حصار میں لے رکھا تھا۔ میں بے بسی میں سامنے پڑے ہوئے مدینہ اخبار پر نظر جمائے "جگر پارے" اور "محسوسات ماہر" کے عنوان کے تحت لکھی ہوئی غزلیں پڑھ رہا تھا۔ جگر مراد آبادی اور ماہر القادری کی غزلیں انہی عنوانات کے تحت مدینہ اخبار کے ہر شمارے میں چھپتی تھیں۔ ایک گھنٹے کے بعد میرے نانا، ایک طرف سے شق ہو جانے والی دیوار پار کر کے کمرے میں داخل ہوئے اس وقت ان کی عمر ستر سال سے زیادہ تھی۔ مجھے زندہ اور سلامت دیکھ کر اچھل پڑے مجھے کھینچ کر کمرے سے باہر کیا۔ خاندان میں یہ بات چل نکلی کہ صوفیائے کرام کے قلمی دیوان نے مجھے اینٹ اور پتھر سے بچایا ہے لہٰذا میں بھی اپنے دور کا مولانا روم یا شیخ عطار ہوں گا۔ اسی طرح میری ذاتِ حزیں پر زبانِ فارسی اور فریضہ نماز کا دباؤ بڑھا دیا گیا۔ یہ مشق مجھ پر پانچ سال تک جاری رہی مگر اس دوران میرا زیادہ وقت جگر پارے اور "محسوسات ماہر" کو بغیر سمجھے بوجھے پڑھنے میں صرف ہوتا تھا۔ میں نے شعر نگاری کی ابتدائی تعلیم جگر جیسے بادہ گسار اور ماہر القادری جیسے تہجد گزار سے پائی۔ لہٰذا حیرت کی کوئی بات نہیں کہ چوتھی دہائی کے پسندیدہ شاعر فیض احمد فیض اور ن۔ م راشد تھے۔"

بقول نوشاد نوری ان کی شعر گوئی کی تعلیم جگر اور ماہر کی مرہونِ منت ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ انہوں نے اپنے دور کے جن دیگر ترقی پسند شعراء کو پڑھا ان کی شاعری کے اثرات بھی قبول کیے ہوں گے۔ نوشاد نوری کی شاعری اس کی عکاس بھی ہیں۔

دراصل شعر کی اصلی عظمت حیات کے قابل اور روزمرہ کے امور اعلیٰ انکشافات اور دلچسپیوں کو پیش کرنے کی قوت اور خوبی میں مضمر ہے۔ شعر ایک صفت ہے اس لیے اس کا مطمح نظر ہمیشہ انبساط قلب بھی ہونا چاہئے۔ حزینہ المیہ شاعری بھی انبساط کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ تہذیب اخلاق بھی شعر کا ایک حصہ ہے اور یہی چیزیں شعر کو حیات کے ساتھ گہری وابستگی عطا کرتی ہیں کیونکہ شاعری حیات سے پیدا ہوتی ہے، حیات سے تعلق رکھتی ہے حیات کی ترجمانی کرتی ہے اور حیات ہی کے لیے زندہ رہتی ہے۔

ان کا نام ویسے تو محمد مصطفیٰ معصوم ہاشمی ہے لیکن قلمی نام نوشاد نوری ہے۔ 21 اکتوبر 1926ء

ہندوستان کے صوبہ بہار کی تحصیل دربھنگہ اور گاؤں بسنت پور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم بی۔اے تک حاصل کی۔ پھر 1952ء سے 1960ء تک ڈھاکا کراچی اور کوئٹہ میں سرکاری ملازمت کی۔ 1961ء سے 1971ء ایڈیٹر ہفت روزہ روداد میں رہے جو نیشنل عوامی پارٹی بھاشانی گروپ کا ترجمان تھا۔ اور ایڈیٹر ہفت روزہ "جریدہ" رہے جو عوامی لیگ کا ترجمان تھا۔

نوشاد نوری کہتے ہیں "میں ایک انحطاط پذیر گھرانے میں پیدا ہوا والد وکیل تھے۔ میں 1951ء میں پٹنہ سے ڈھاکے آیا۔ ملازمت کی، صحافت کا پیشہ اختیار کیا اور قیام بنگلہ دیش کے بعد ڈھاکے میں بودوباش اختیار کرلی۔" مزید معلومات فراہم کرتے ہوئے انہوں نے بتایا میں صرف نظمیں لکھتا ہوں، افسانے دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ شعری اور افسانوی ادبیات کے تنقیدی مطالعہ کا شوق ہے اور ترقی پسندوں کی ادبی روایات سے متاثر ہوں۔ چنانچہ صرف ترقی پسند رسالوں میں لکھتا ہوں۔ ادب لطیف لاہور اور فنون لاہور میں لکھتا رہا ہوں۔ افکار کراچی میں مستقل لکھتا ہوں۔ گاہے گاہے ارتقاء کراچی کبھی کبھی منشور کراچی اور اکثر "آئندہ" کراچی میں لکھتا ہوں۔ منتخب نظموں کا مجموعہ "رہ و رسم آشنائی" کے نام سے کلکتہ میں طباعت کے آخری مرحلے میں ہے۔ میرے مطالعہ میں نظم، افسانے، غزل اور ان اصناف پر تنقیدی مضامین اور کتابیں رہتی ہیں اور ایسے نظم نگار، افسانہ نویس، غزل گو اور ناقد کی تخلیقات دلچسپی سے پڑھتا ہوں جن کی فنی اور فکری حیثیت مسلم سمجھی جاتی ہے۔ (ان کا مجموعہ کلام اب شائع ہو گیا ہے)۔

سوال نمبر 5 کے جواب میں ان کا کہنا ہے۔

اردو کو دنیا کی تیسری بڑی زبان سمجھنے میں مجھے تامل ہے۔ اس زبان کا مستقبل تاریک ہے۔ برما اور بنگلہ دیش سے خاتمہ ہو چکا ہے۔ ہندوستان میں ترقی یافتہ زبان کی بلندی سے اتر کر گھروں اور علاقوں میں ایک Deleet کی حیثیت اختیار کر چکی ہے (زبان ہندی، زبان ملتانی، زبان گجراتی، اودھی، دکنی اور ریختہ) اس کے اسباب ہیں۔ پاکستان میں اس کی مقبولیت مجروح ہو رہی ہے اس کے وجوہات ہیں۔ رہا غیر ممالک میں تارکین وطن کا سوال اور ان کی تخلیقی گہما گہمی، ہماہمی اور سرگرمیاں تو دراصل لوگ زمین و آسمان کے درمیان معلق خواب میں اڑ رہے ہیں۔

نوشاد نوری اظہار خیال کے لیے نظم اور اظہار فن کے لیے غزل کو موزوں سمجھتے ہیں۔ انہوں نے کہا "نثری نظم، نثری غزل، آزاد غزل یا ہائیکو قسم کی چیزیں سنجیدہ ادبی ذوق کی تسکین کا باعث نہیں ہوتیں۔ تخلیقی نشستیں بہتر کردار ادا کر سکتی ہیں۔

ان کے خیال میں سنجیدہ ادب، سنجیدہ ادیب اور سنجیدہ ادب کے قاری الیکٹرونک میڈیا کی گرفت سے باہر ہیں اس نے چیپ لٹریچر کے مصنفین، چیپ لٹریچر اور چیپ لٹریچر کے قاری کو بری طرح متاثر کیا ہے اور ایک اعتبار سے اچھا ہے۔"

کہتے ہیں ادبی رسالوں اور ادبی کتابوں کی بقا کا معاملہ مصنفین کے دائرہ اختیار میں نہیں۔

تنقید کے ضمن میں ان کا کہنا ہے کہ فروغ اب اور معیار ادب کے لیے تنقید ضروری ہے۔ ادبی تنقید، ایک ادبی ضابطہ اور فکری نظام کی پابند ہوتی ہے اور ادبی ضابطے اور فکری نظام ہی بڑے شاعر، بڑے افسانہ نگار بڑے ناول نویس اور بڑے ناقد کا تعین کرتے ہیں اور جہاں یہ سب نہ ہو، وہاں آئندہ کئی صدی تک مختلف شعبہ تخلیق میں عصمت، منٹو، بیدی، کرشن چندر۔۔ جوش، فیض، راشد، میراجی۔۔۔ احتشام حسین، حسن عسکری، مجنوں گورکھپوری، ممتاز حسین ہی "گولیور" نظر آئیں گے باقی سب "لی لی پوٹین۔"

7/6 LAL MATIA, BLOCK -D ,DHAKA -1207
BANGLADESH- PH:818645

کسے میں داستانِ غم سناؤں
تمنائیں کہاں اظہار پائیں
کدھر دستِ رفاقت میں بڑھاؤں
میں کس کے وصل کی مانگوں دعائیں
میں کس کے ہجر میں آنسو بہاؤں

پسِ پردہ، نہ کوئی روبرو ہے
نہ افواہیں، نہ امکانات کوئی
نہ اکتاہٹ، نہ کوئی آرزو ہے
نہ کوئی زیست کا پل جاوداں ہے
نہ کوئی عمر کا لمحہ لہو ہے

امنگوں کی سبھی لہریں تھمی ہیں
نگاہیں خوبصورت آئینے میں
خود اپنی مسخ چہرے پر جمی ہیں

آج کی شاعرات

اس عنوان سے ۱۹۷۳ء میں، میں نے کتاب شائع کی تھی، جس میں ایک سو چار شاعرات کا تعارف تھا۔ یہ تعارف بھی میں نے شاعرات سے اس وقت لیا تھا، جب میں روزنامہ "جنگ" میں ہر ہفتے ایک شاعر یا شاعرہ کا تعارف شائع کرتی تھی۔ ان شاعرات کے نام کی فہرست درج ذیل ہے۔ (سلطانہ مہر)

فہرست بوئے گل

۱۔ راحیل اختر
۲۔ اختر یگانہ
۳۔ خلیق تبسم
۴۔ ثریا حیا
۵۔ رئیس بانو نقوی
۶۔ زیب النساء زیبی
۷۔ حسینہ شفق
۸۔ خورشید بانو شمع
۹۔ عسکری شہناز
۱۰۔ صنوبر منصور
۱۱۔ عظمیٰ ناہید
۱۲۔ شوکت فرخ
۱۳۔ سعیدہ ناز
۱۴۔ فہمیدہ نسرین
۱۵۔ نعیم حسین نگار
۱۶۔ محمودہ ہیر
۱۷۔ عشرت جہاں آفریں
۱۸۔ خورشید اعظم پروانہ
۱۹۔ ریحانہ رضوی
۲۰۔ سکندر حیا بریلوی
۲۱۔ زہرہ اشتیاق
۲۲۔ سحر میمن
۲۳۔ شفیق بانو بریلوی
۲۴۔ نور شمع
۲۵۔ شہناز وصی
۲۶۔ ضمیر فاطمہ جعفری
۲۷۔ عشرت جہاں پشاوری
۲۸۔ مہ جبیں فاطمہ ماہ
۲۹۔ شاہدہ سلطانہ ناز
۳۰۔ نسیم قمر
۳۱۔ نگار حفیظ نگار
۳۲۔ گلنار آفریں
۳۳۔ پروین شاکر
۳۴۔ خاتون حجاب
۳۵۔ خورشید فاطمہ
۳۶۔ آل زہرہ نقوی
۳۷۔ سردار بانو
۳۸۔ بشریٰ شمس
۳۹۔ شمیم اختر شمیم
۴۰۔ صائمہ خیری
۴۱۔ عظمت عزمی
۴۲۔ محترم عشرت جہاں
۴۳۔ مہر نگار تیموری
۴۴۔ عابدہ ناز
۴۵۔ نسیم ہدیٰ نسیم
۴۶۔ عذرا ہما
۴۷۔ انوپا
۴۸۔ آنسہ پنہاں

۴۹۔ حسنہ زیدی
۵۰۔ رضیہ ابو جعفر
۵۱۔ زیب گلشن دہلوی
۵۲۔ عدیہ روشن
۵۳۔ شمسہ صدیقی
۵۴۔ شمیم رحمان شمیم
۵۵۔ عابدہ بانو آسیہ
۵۶۔ عزیزہ بدایونی
۵۷۔ فائزہ صدیقی
۵۸۔ رحمت النساء ناز
۵۹۔ نوشابہ نرگس
۶۰۔ نصیرہ ملک
۶۱۔ فریدہ ہما

نالۂ دل

۶۲۔ ادا جعفری
۶۳۔ شہاب قزلباش
۶۴۔ شائستہ زیدی
۶۵۔ پروین سید فنا
۶۶۔ معینہ انور معین
۶۷۔ وحیدہ نسیم
۶۸۔ سیدہ حنا
۶۹۔ ڈاکٹر [illegible] سلطانہ
۷۰۔ طلعت اشارت
۷۱۔ فہمیدہ ریاض
۷۲۔ منور سلطانہ لکھنوی
۷۳۔ زہرہ نگاہ
۷۴۔ ربیعہ فخری رزمی
۷۵۔ محمودہ جبیں سوز
۷۶۔ عرفانہ عزیز
۷۷۔ نور بانو محجوب
۷۸۔ کشور ناہید
۷۹۔ رابعہ نہاں
۸۰۔ ثریا زیبا
۸۱۔ رشیدہ سلیم سیمیں
۸۲۔ میمونہ غزل
۸۳۔ سعیدہ عروج مظہر
۸۴۔ ثریا محمود ندرت

دودِ چراغِ محفل

۸۵۔ زاہدہ انجم
۸۶۔ بلقیس جمال بریلوی
۸۷۔ تراب النساء علوی
۸۸۔ رشیدہ بیگم عیاں
۸۹۔ سیدہ نسیم فاطمہ بریلوی
۹۰۔ رضیہ انور امروہوی
۹۱۔ کنیز فاطمہ حیا
۹۲۔ سروری عرفان اللہ روحی
۹۳۔ میمونہ غزالہ بریلوی
۹۴۔ انور الصباح بیگم
۹۵۔ بغدادی بیگم
۹۶۔ بیگم خورشید آرا
۹۷۔ صفیہ شمیم ملیح آبادی
۹۸۔ بیگم قمر القادری
۹۹۔ نور جہاں
۱۰۰۔ رابعہ پنہاں
۱۰۱۔ خیاب علوی
۱۰۲۔ عذرا عزمی
۱۰۳۔ قمر جہاں چندوسوی
۱۰۴۔ نور بدایونی

سخن ور حصہ اول

سخن ور حصہ اول میں ساٹھ پاکستانی شعراء کا تذکرہ تھا۔ سن ۲۰۰۰ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے، جس میں مزید شعراء کا تعارف شامل کیا گیا ہے۔ اس کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ احسان دانش
۲۔ اطہر نفیس
۳۔ اقبال عظیم
۴۔ انجم اعظمی
۵۔ ابن انشاء
۶۔ ذوالفقار علی بخاری
۷۔ بہار کوٹی
۸۔ بہزاد لکھنوی
۹۔ تابش دہلوی
۱۰۔ صوفی غلام مصطفی تبسم
۱۱۔ تحسین سروری
۱۲۔ حبیب جالب
۱۳۔ سید محمد جعفری
۱۴۔ جوش ملیح آبادی
۱۵۔ جون ایلیا
۱۶۔ حفیظ جالندھری
۱۷۔ حفیظ ہوشیارپوری
۱۸۔ شان الحق حقی
۱۹۔ عبدالعزیز خالد
۲۰۔ خالد علیگ
۲۱۔ راغب مراد آبادی
۲۲۔ سید آل رضا
۲۳۔ رئیس امروہوی
۲۴۔ سحر انصاری
۲۵۔ سرور بارہ بنکوی
۲۶۔ سعید رضا سعید
۲۷۔ سلیم احمد
۲۸۔ حمایت علی شاعر
۲۹۔ شاعر لکھنوی
۳۰۔ شبنم رومانی
۳۱۔ شکیب جلالی
۳۲۔ منظور حسین شور
۳۳۔ شورش کاشمیری
۳۴۔ صہبا اختر
۳۵۔ سید ضمیر جعفری
۳۶۔ سراج الدین ظفر
۳۷۔ ظہیر کاشمیری
۳۸۔ سید عابد علی عابد
۳۹۔ عارف عبدالمتین
۴۰۔ جمیل الدین عالی
۴۱۔ عظیم عباسی
۴۲۔ عبیداللہ علیم
۴۳۔ عندلیب شادانی
۴۴۔ احمد فراز
۴۵۔ فضل احمد کریم فضلی
۴۶۔ فیض احمد فیض
۴۷۔ قابل اجمیری
۴۸۔ قتیل شفائی
۴۹۔ قمر جلالوی
۵۰۔ ماہر القادری
۵۱۔ محسن احسان
۵۲۔ محسن بھوپالی
۵۳۔ محشر بدایونی
۵۴۔ عزیز حامد مدنی
۵۵۔ مصطفی زیدی
۵۶۔ منظر ایوبی
۵۷۔ منظر صدیقی
۵۸۔ ناصر کاظمی
۵۹۔ احمد ندیم قاسمی
۶۰۔ وزیر آغا

تیسرے ایڈیشن میں ان شعراء کا اضافہ کیا گیا ہے۔

۶۱۔ مخمور اکبر آبادی
۶۲۔ رعنا اکبر آبادی
۶۳۔ صبا اکبر آبادی
۶۴۔ نعیم نقوی
۶۵۔ نسیم امروہوی
۶۶۔ دلاور فگار
۶۷۔ کرار نوری
۶۸۔ اقبال صفی پوری
۶۹۔ ساقی جاوید
۷۰۔ احسن احمد اشک
۷۱۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری
۷۲۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین

تذکرہ شعراء و شاعرات، سخن ور حصہ دوم ۱۹۹۶ء

نمبر	نام	مقام
۱۔	اظہار اثر	دہلی
۲۔	اختر سعید خان	بھوپال
۳۔	سید حنیف اخگر	نیویارک
۴۔	ارشد عثمانی	کینیڈا
۵۔	ارم انصاری	مشی گن
۶۔	سید اسد اللہ حسین	لاس اینجلس
۷۔	افضال رودس	ہیوسٹن
۸۔	اکبر حیدر آبادی	لندن
۹۔	عتیق الظفر	دوحہ۔قطر
۱۰۔	باقر زیدی	میری لینڈ
۱۱۔	تجمل فاروق بانی	کینیڈا
۱۲۔	بشر صہبائی	بھوپال
۱۳۔	سکینہ ساجد پنہاں	ٹیکساس
۱۴۔	یعقوب تصور	ابوظہبی
۱۵۔	جاوید اختر	ممبئی
۱۶۔	حسن چشتی	شکاگو
۱۷۔	حمیدہ معین رضوی	انگلینڈ
۱۸۔	حمید الرحمٰن	نیویارک
۱۹۔	ڈاکٹر حنیف ترین سنبھلی	سعودی عرب
۲۰۔	حیدر اعظمی	دوحہ قطر
۲۱۔	حیدر قریشی	جرمنی
۲۲۔	ڈاکٹر خالد سہیل	کینیڈا
۲۳۔	عقیل دانش	لندن
۲۴۔	اطہر راز	لندن
۲۵۔	علی طباطبائی راز لکھنوی	لاس اینجلس
۲۶۔	محمد ممتاز راشد	دوحہ قطر
۲۷۔	راہی شہابی	جے پور
۲۸۔	سید شمیم رجز	لاس اینجلس
۲۹۔	رحمت قرنی	لندن
۳۰۔	رحمٰن صدیقی	لاس اینجلس
۳۱۔	رشی خان	جرمنی
۳۲۔	رئیس الدین رئیس	علی گڑھ
۳۳۔	تسلیم الٰہی زلفی	کینیڈا
۳۴۔	ساحل صدیقی	ساؤتھ افریقہ
۳۵۔	رحمٰن واگلے ساز	لاس اینجلس
۳۶۔	سحر مہدی	انگلینڈ
۳۷۔	امجد علی سرور	دوحہ۔قطر
۳۸۔	رفعت سروش	دہلی
۳۹۔	سلطان الحسن فاروقی	انگلینڈ
۴۰۔	اشرف شاد	آسٹریا
۴۱۔	شاہد علی خان شاہد	بحرین
۴۲۔	ڈاکٹر شبانہ نذیر	دہلی
۴۳۔	مرتضیٰ شبلی	سری نگر
۴۴۔	ڈاکٹر شبیر احمد	فلوریڈا

نمبر	نام	مقام
۴۵۔	رخسانہ شمیم	جرمنی
۴۶۔	فرحت شہزاد	لاس اینجلس
۴۷۔	شمشیر سنگھ شیر	ڈنمارک
۴۸۔	ضیاء خان	سعودی عرب
۴۹۔	سید مظفر احمد ضیاء	شکاگو
۵۰۔	طہٰ آفندی	بحرین
۵۱۔	ظفر عظیمی	دوحہ۔ قطر
۵۲۔	عبدالحمید سوکر ظہور	مسقط۔ عمان
۵۳۔	عابد جعفری	کینیڈا
۵۴۔	عابدہ کرامت	کویت
۵۵۔	عبدالرحمن عبد	نیویارک
۵۶۔	خواجہ ریاض الدین عطش	اسلو گلی۔ اے ناوے
۵۷۔	عطیہ نیازی	لاس اینجلس
۵۸۔	استاد ایم العریفی عنایت	بحرین
۵۹۔	غوثیہ سلطانہ	اے ناوے۔
۶۰۔	سعید قیس	بحرین
۶۱۔	کرامت غوری	کویت
۶۲۔	سیدہ کنیز فاطمہ کرن	آسٹریلیا
۶۳۔	بلراج کومل	دہلی
۶۴۔	گلزار	ممبئی
۶۵۔	گلشن کھنہ	برطانیہ
۶۶۔	مرزا محبوب بیگ	لاس اینجلس
۶۷۔	عبداللطیف خان محفوظ	سویڈن
۶۸۔	ڈاکٹر مختار الدین احمد	برطانیہ
۶۹۔	مخمور سعیدی	دہلی
۷۰۔	جمشید مسرور	اوسلو۔ ناروے
۷۱۔	خضر مسیحا	لاس اینجلس
۷۲۔	مونا شہاب	میری لینڈ
۷۳۔	افشاں مہرین	سعودی عرب
۷۴۔	ناصر نظامی	ہالینڈ
۷۵۔	واجد ندیم	شکاگو
۷۶۔	افتخار نسیم	شکاگو
۷۷۔	نسیم سید	کینیڈا
۷۸۔	نسیمہ کلثوم	اے ناوے
۷۹۔	آصفہ نشاط	لاس اینجلس
۸۰۔	نعیمہ ضیاء الدین	جرمنی
۸۱۔	سرفراز نواز اعظمی	مدینہ منورہ
۸۲۔	نور جہاں نوری	لندن
۸۳۔	نوشاد	ممبئی
۸۴۔	نیر جہاں	لاس اینجلس
۸۵۔	نیاز جیراج پوری	ممبئی
۸۶۔	رشید نیاز	دوحہ، قطر
۸۷۔	نیاز گلبرگوی	شکاگو
۸۸۔	سیدہ حسن جہانگیر ہمدم	سان فرانسسکو

سخن ور سوم۔ تذکرہ شعراء و شاعرات

نمبر	نام	مقام
۱۔	اعزاز احمد آذر	لاہور
۲۔	مجید اختر	لاس اینجلس
۳۔	ہمایوں اختر	کراچی
۴۔	سلطانہ ذاکر ادا نقوی	سان فرانسسکو
۵۔	محمد آفاق صدیقی	کراچی
۶۔	اسد محمد خان	کراچی
۷۔	اسلم کولسری	لاہور
۸۔	محمد اشرف شاہین	کراچی
۹۔	محمد کمال اظہر	کویت
۱۰۔	اقبال مجیدی	کراچی
۱۱۔	امجد اسلام امجد	لاہور
۱۲۔	امداد نظامی	کوئٹہ
۱۳۔	ثاقب انجان	کراچی
۱۴۔	انور مسعود	اسلام آباد
۱۵۔	سید صادق علی جعفری بدر	کراچی
۱۶۔	ثروت سلطانہ ثروت	کراچی
۱۷۔	ثمر بانو ہاشمی	ملتان

۱۸۔ جاوید آفتاب — لاہور
۱۹۔ مسعود جاوید — کراچی
۲۰۔ جمال نقوی — کراچی
۲۱۔ جوہر غوری — لاس اینجلس
۲۲۔ اقبال حیدر — کراچی
۲۳۔ امین خیال — گوجرانوالہ
۲۴۔ رفیع الدین راز — کراچی
۲۵۔ زین صدیقی — دہران
۲۶۔ امتیاز ساغر — کراچی
۲۷۔ سکندر سالم — بریڈفورڈ
۲۸۔ سرشار صدیقی — کراچی
۲۹۔ سعدیہ روشن — ابوظہبی
۳۰۔ محمود شام — کراچی
۳۱۔ محمد ہارون صدیقی شاہد — کراچی
۳۲۔ شاہدہ حسن — کراچی
۳۳۔ شعاع درانی — حیدرآباد۔ سندھ
۳۴۔ انور شعور — کراچی
۳۵۔ شمس وارثی — کراچی
۳۶۔ عبدالعلی شوکت — کراچی
۳۷۔ شہاب کاظمی — نیوجرسی
۳۸۔ محمد سبکتگین صبا — کراچی
۳۹۔ عبدالقوی ضیاء — سڈبری
۴۰۔ ضیاء الحق قاسمی — کراچی
۴۱۔ سعید الظفر — اوکاہاما
۴۲۔ افتخار عارف — اسلام آباد
۴۳۔ عارف شفیق — کراچی
۴۴۔ لیاقت علی عاصم — کراچی
۴۵۔ عاصی کرنالی — ملتان
۴۶۔ عذرا عباس — کراچی
۴۷۔ الیاس عشقی — حیدرآباد۔ سندھ
۴۸۔ مرزا عظیم بیگ — مشی گن

۴۹۔ عظمیٰ جون — بی۔ بلوچستان
۵۰۔ عمر شریف — کراچی
۵۱۔ عقیل عباس جعفری — اسلام آباد
۵۲۔ رشیدہ عیاں — نیوجرسی
۵۳۔ ڈاکٹر غزالہ خاکوانی — ملتان
۵۴۔ ذکیہ غزل — کراچی
۵۵۔ غوث متھراوی — کراچی
۵۶۔ فاطمہ حسن — کراچی
۵۷۔ کاوش عباسی — ریاض
۵۸۔ پیرزادہ قاسم — کراچی
۵۹۔ ڈاکٹر قمر آرا قمر — لاہور
۶۰۔ قمر جمیل — کراچی
۶۱۔ ریحانہ قمر چودھری — لاس اینجلس
۶۲۔ لیث قریشی — کراچی
۶۳۔ مقصد الہ آبادی — مشی گن
۶۴۔ منصور ملتانی — کراچی
۶۵۔ جاوید منظر — کراچی
۶۶۔ ڈاکٹر فہیم باٹلاناوان — لاس اینجلس
۶۷۔ رحمت النساء ناز — کراچی
۶۸۔ ناہید ورک — مشی گن
۶۹۔ اصغر ندیم سید — لاہور
۷۰۔ روشن آرا نزہت — لاہور
۷۱۔ نقاش کاظمی — کراچی
۷۲۔ نگار سجاد — کراچی
۷۳۔ نگار صہبائی — کراچی
۷۴۔ رخسانہ نور — لاہور
۷۵۔ شہناز نور — کراچی
۷۶۔ احمد نوید — کراچی
۷۷۔ وضاحت نسیم — کراچی
۷۸۔ وکیل انصاری — نیویارک
۷۹۔ ڈاکٹر بلال نقوی — کراچی
۸۰۔ احمد ہمیش — کراچی
۸۱۔ یاسمین — لاہور
۸۲۔ یونس جاوید — لاہور

گفتنی اول، نثر نگاروں کا تذکرہ ۲۰۰۰ء

۱۔	گفتنی اول	ڈاکٹر جمیل جالبی
۲۔	بزبان شاعر بقلم حمایت	حمایت علی شاعر
۳۔	نیابت	ابراہیم جلیس
۴۔	میں سرخرو رہی	سلطانہ مہر

۱۔	احمد خان	شکاگو
۲۔	احمد سہیل خان	ٹیکساس
۳۔	اختر جمال	کینیڈا
۴۔	ارشاد احمد صدیقی	کیلیفورنیا
۵۔	ارمان شمسی	ڈھاکہ
۶۔	آصف الرحمٰن طارق	نیوجرسی
۷۔	امراؤ طارق	کراچی
۸۔	پروفیسر آفاق احمد	بھوپال
۹۔	اکرام بریلوی	کینیڈا
۱۰۔	انور خواجہ	کیلیفورنیا
۱۱۔	انور سلیمی	کیلیفورنیا
۱۲۔	انور شیخ	برطانیہ
۱۳۔	انور نزہت	دہلی
۱۴۔	ایوب جوہر	ڈھاکا
۱۵۔	بانو ارشد	برطانیہ
۱۶۔	بشریٰ رحمان	لاہور
۱۷۔	بشیر مالیر کوٹلوی	مالیر کوٹلہ
۱۸۔	پروین کمال	جرمنی
۱۹۔	تسنیم ثنا خان	کیلیفورنیا
۲۰۔	تصدق سہیل	برطانیہ
۲۱۔	تقی عابدی	کینیڈا
۲۲۔	ثریا شہاب	جرمنی
۲۳۔	جاوید چودھری	برطانیہ
۲۴۔	ڈاکٹر جمیل جالبی	کراچی
۲۵۔	جمیل زبیری	کراچی
۲۶۔	جوگندر پال	دہلی
۲۷۔	جیتندر بلّو	برطانیہ
۲۸۔	جیلانی بانو	حیدرآباد دکن
۲۹۔	چاند کرن شرما	برطانیہ
۳۰۔	حسن ہاشمی	کراچی
۳۱۔	ڈاکٹر شان الحق حقی	کینیڈا
۳۲۔	سیدہ حنا	پشاور
۳۳۔	حیدر طباطبائی	برطانیہ
۳۴۔	حیدر قریشی	جرمنی
۳۵۔	ڈاکٹر خاور جمیل	کراچی
۳۶۔	ڈاکٹر خلیق انجم	دہلی
۳۷۔	خورشید عالم	کینیڈا
۳۸۔	خورشید علی خان	کراچی
۳۹۔	ڈاکٹر خیر النساء مہدی	ممبئی
۴۰۔	ذکیہ مشہدی	پٹنہ
۴۱۔	رالف رسل	برطانیہ
۴۲۔	رحیم انجان	کینیڈا

آئندہ جب بھی اردو کی عالمی سطح پر پذیرائی کی تاریخ
لکھی جائے گی تو سلطانہ مہر کی یہ کتاب بنیادی ماخذ کے
طور پر استعمال کی جائے گی۔

مشفق خواجہ